دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

# جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

فروری 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK




عزیزانِ من... السلام علیکم!

لیجیے، فروری 2012ء کا دوسرا شمارہ پیش نظر ہے... ابھی نئے سال پر تیس دنوں کی دھول بھی جمنے نہ پائی تھی کہ اس سے وابستہ امیدوں، خوشیوں، تمناؤں اور سپنوں کے سارے بلند و بالا مینار ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ دل ایک بار پھر انہی اندیشوں، وسوسوں اور خطروں سے دہلنے لگا جن سے پچھلے برس بھی نبرد آزما رہا تھا... ماہرین سماجیات کہتے ہیں کہ حکومت کی کارکردگی کو جانچنا ہے تو فرد کی ذہنی صحت کو جانچو۔ اگر معاشرہ ذہنی طور پر صحت مند ہو تو سمجھ لو کہ قیادت اور حکومت، دونوں فلاح کی راہ پر گامزن ہیں مگر یہاں... کہتے ہیں کہ قیادت کا قبلہ درست ہو تو وہ ریاست، حکومت اور فرد... سب کو کامیابی کی راہ پر لے جاتی ہے۔ اس کی ایک دو نہیں، متعدد مثالیں تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں... مگر لگتا ہے کہ اب ہمارے ہاں بڑے لوگ پیدا نہیں ہوتے... پیدا ہو جائیں تو ملک میں ٹھہرتے نہیں اور ٹھہر جائیں تو بہت جلد اوپر والے کے پاس پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ارفع کریم کو ہی لے لیجیے... اس دور بنا رساں میں اس بچی نے ملک کا جو نام روشن کیا، وہ ایک لازوال مثال ہے۔ کمپیوٹر کی دنیا کے بے تاج شہنشاہ، بل گیٹس نے اس بچی کی جو تعریف کی... وہ اس بات کی سند ہے کہ ہم مسائل اور بحران پیدا کرنے کے علاوہ بڑے لوگ بھی پیدا کر سکتے ہیں مگر کیا کریں... اوپر والے کو ہماری ناقدری اور بے حسی کا علم ہے، تبھی تو وہ بھی چل دی خالق کے پاس... سچ ہے کہ جو نعمتوں کی قدر نہیں جانتے، نعمتیں ان کی دسترس سے اٹھالی جاتی ہیں... جب ایک عام انسان کی جان بے مول ہو جائے تو انمول جانوں کی قدر کیا ہوگی... سچ ہے کہ ہمارا دامن ہر شعبے میں بڑے لوگوں سے خالی ہو چکا ہے۔ جدھر دیکھو خالص جدیہ مفقود ہے۔ بڑے لوگوں کی بات چھوڑیں... ہم نے تو 'جذبۂ انسانیت' کو بہت احتیاط سے خود غرضی کی قبر میں دفن کر دیا ہے۔ مرض کی ضرورت دوا ہے... مگر دادو بیچیے اس بے حسی کو۔ دوائے دل مانگنے والوں کو بھی جعلی دوا، وہ بھی اتنی مہلک کہ تادمِ تحریر سو سے زائد افراد موت کی نیند سو گئے۔ ہزاروں وہ ہیں جو مہلک جعلی دوا استعمال کر کے موت و زندگی کی دہلیز پر جنتائے کشمکش ہیں... کہنے کو الفاظ نہیں، صرف احساس باقی ہے۔ کاش کہ یہ احساس ان بے حسوں میں بھی جاگ اٹھے کہ جو دوا کے نام پر موت بانٹتے ہیں اور نوٹ کماتے ہوئے وہ دو گز زمین بھول جاتے ہیں... جہاں پہنچ کر صرف اعمال ساتھ رہتے ہیں۔ جعل سازوں کی بھیانک بے حسی پر بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت سستے داموں جہنم خرید رہے ہیں... شاید یہ ماہِ مبارک ان کے دلوں کی سیاہی کو دور کر دے۔ سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ کے میلاد مبارک کے باسعادت دنوں میں ہم ربِ ذوالجلال کی بارگاہ میں عجز و انکسار سے دست بہ دعا ہیں کہ اے پروردگار! ہم پر رحم فرما، اپنے حبیبؐ کے صدقے ہمیں انسانوں اور انسانیت سے محبت کا جذبہ لوٹا دے۔ ہماری تہی دامن قوم کو خلوص اور دردمندی سے آشنا کر دے کہ ان ہی کی کوکھ سے ستھری قیادت اور سیادت جنم لیتی ہے... آمین۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں آپ کی بزم میں جہاں آپ کے ارسال کردہ نامے منتظر ہیں اظہار کے لیے!

بھوانہ سے جعفر حسین کی پُرخلوص لفاظی اور خیالات "نئے سال کا پہلا دن اور جاسوسی کا پہلا شمارہ... مگر سارے خوش کن تصورات لیبوٹری آنٹی کو دیکھ کر یوں بھک سے اڑ گئے جیسے نور جہاں کو دیکھ کر شہزادہ سلیم کے ہاتھوں کے طوطے اور نور جہاں کے ہاتھوں سے کبوتر اڑ گئے تھے۔ (یہ تو غضب کر دیا) محفل میں پہلے تو نامور محمود صاحب کو مہاتما بدھ کی طرح گیان میں پایا... ن۔م اخوند صاحب! آپ کو نام کی تبدیلی مبارک ہو۔ شاید اب آپ کا شناختی کارڈ بن جائے۔ سید محی الدین صاحب رائٹرز کے انٹرویوز شائع کرنا ایک ایسا بر مودا ٹرائی اینگل ہے جس پر امریکا کی طرح ادارے نے بھی چپ سادھ رکھی ہے۔ (سسٹری!) تصویر صاحبہ! آپ کو لکھتے وقت صفحات کم پڑتے محسوس ہوتے ہیں جبکہ ہمیں لگتا ہے کہ صفحات زیادہ پڑ گئے ہیں اور آپ نے میرا نام کس خوشی میں تبدیل کر دیا؟ شکریہ ساتھ میں مبارکباد بھی لگا۔ راج صاحب! طویل تحریر کے لیے آپ کے معیار کا اندازہ ہمیں بخوبی آپ کے انتخاب سے ہو رہا ہے۔ مختصر کہانیوں میں سب سے پہلا نمبر لگنے کا چانس پڑا ہے۔ شوبز کی پاپولر لڑکیاں جو دو آرٹسٹوں کے درمیان پروفیشنل جلسی کو جنم دینے کے بجائے معاملات کو اناؤنس تک لے گئیں، ایک معیاری تحریر تھی۔ ایک عام سوچ کے حامل دو مختلف کرداروں کی روداد جسے کو تیسرا مختصر ہونے کے باوجود متاثر کن رہی۔ خوب صورت احساسات اور گداز جذبوں کے ایک کو دوسرا سمجھ کر ہر لمحہ محسوس کرنا بھارتی، امریکی و مغربی مغرب سے درآمد بہترین تحفہ تھا۔ سسپنس، تجربہ، تھرل اور ماورائی انہونیوں کا مرقع تین نسل بعد [illegible] کی حال... اپنے انداز کے خاص تسلسل سموئے ہوئے تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی کا شکار مارٹن کا ماجرائے عبرت لیے جائے پناہ کچھ خاص نہیں لگی۔ کچھ اور لکھنے کی وجہ سے [illegible] کی بے پناہ داد و تحسین کی بے پناہ داد و تحسین کی بے پناہ داد و تحسین

مارٹن اپنی ہی غلطی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جیسن نے کافی مہارت اور خوب صورتی سے اپنی ماں کے قاتل کو انجام تک پہنچایا۔ جیسے کوئٹہ اختر اکثر جامع تحریر رہی۔ برف کی چوری، نک ویلوٹ اپنے انداز میں نظر آئے اور کیا خوب صورت طریقے سے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ بہت اچھے۔ جائے پناہ بھی اچھی تحریر رہی۔ سرورق کے رنگوں میں پہنچے۔ پہلا آغاز ایک اور لوا سٹوری سے کیا۔ پڑھ کر داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ احمد اقبال نے کیا شاہکار تخلیق کیا۔ بیرونِ ملک جانے اور نئے خواب سجانے والے نوجوانوں کے لیے ایک سبق... شہاب الدین کا انجام دیکھ کر کوئی دکھ نہیں ہوا البتہ اس کے باپ کا افسوس ہوا پوری عمر کی ایمانداری کرتے کرتے آخر کیا ملا غریب کو۔ تیسری کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی بھی جاسوسی کی خاص سوغات رہی۔ پہلی کہانی بازگشت کا کشف زبیر کی عمدہ رہی۔ آخر میں جاسوسی کا بہت بہت شکریہ جو سالِ نو کی جوابی یادگار کہانیاں پڑھنے کو دیں۔" (آپ کے خوب صورت تبصرے کا بھی از حد شکریہ)

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کے مرحبا" جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل حسینہ تو ٹھیک تھی لیکن منصف و جاہت سے کوئی دشمنی چل رہی ہے شاید۔ ناصر محمود صاحب! ماشاء اللہ پہلی دفعہ میں ہی چھا گئے ونگ سیٹ مبارک ہو۔ زیب حسن صاحب! میں کہانی ضرور لکھوں گا شائع ہونے کی گارنٹی نہیں مگر ناقابلِ اشاعت میں نام ضرور آجائے گا (ہاہاہا) اگر آپ کو بھی جوش چڑھا ہوا ہے تو بھائی دیر کس بات کی؟ کسی لڑکے کی نہ سہی اپنی لکھ دیں یا اس کے لیے بھی بہت ٹائم درکار ہے؟ عاطف گجر بھائی! آپ تو میری اصل عمر تک پہنچ گئے... بھئی ظاہر ہے ہم ایک دوسرے کو تحریر سے ہی پہچان لیتے ہیں۔ (کیا بات ہے) عثمان اینڈ فوزان! صحیح فرمایا آپ نے تعلیم کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں اگر کسی اکیڈمی میں میٹرک کے اسٹوڈنٹس میں آپ کا اضافہ ہو جائے تو اس اکیڈمی والوں کو خوشی ہو گی۔ تصویر العین جی! آپ کا تبصرہ پسند آیا، تحریر مبارک۔ میں پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کر رہا ہوں۔ (اللہ آپ کو کامیاب کرے، آمین) ماسٹر ضیاالرحمن خان نیازی! آپ کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ دل سے دعا ہے کہ آپ کے چچا جلد آپ سے ملیں، آمین۔ آپ کو اور آپ کے خاندان کو سلام پیش کرتا ہوں۔ ماہا! ایمان جی! کہاں گم ہیں محفل میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ (مراقبے میں ہیں) آمنہ پٹھانی! تبصرہ بہت اچھا تھا۔ سفیان ہاشمی! بکس جرنے کا آئیڈیا ذرا پہلے دیتے، اب تو میرا ایڈمیشن بھی ہو گیا اردو کی بکس میرے کسی کام کی نہیں۔ لکار میں تابش اور عمران کی فائٹ زبردست لگی۔ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ایکشن مووی دیکھ لی۔ گیتا نے انفارمیشن تو دیں مگر جان بھی دے دی۔ چھوٹے سرکار اجیت رائے مدد لے کر پہنچ گیا۔ رنجیت پانڈے بھی بالآخر انجام کو پہنچ گیا۔ طاہر جاوید محفل صاحب اتنی اچھی قسط لکھنے پر ویلڈن۔ گرداب میں ماہا نور اور اسلم دونوں ہی پریشان ہیں۔ (پریشانیاں اپنے وقت پر ہی ختم ہوتی ہیں) سرورق کی دوسری کہانی میں شہاب الدین غوری اور شبانہ کی محبت ناکام ہوئی اور شہاب کے حصے کی سزا باپ کو کیوں دی گئی؟ سانگرہ نمبر میں احمد اقبال کا دیکھی انداز پسند نہیں آیا۔ جاسوسی کی نئی تبدیلیاں پسند آئیں۔ سرورق کے رنگوں کا نام تبدیل کر کے پہلی، دوسری اور تیسری کہانی رکھ دیا گیا۔ (شکر ہے کسی نے ٹوٹ کیا) باقی جاسوسی زیرِ مطالعہ ہے۔ لحاف میں بیٹھ کر چکن تکا کھاتے ہوئے اجازت۔" (واہ بھئی کیا بات ہے)

مقصود الحسن طاہر، چوکی ضلع قصور سے لکھتے ہیں" ویسے تو جاسوسی کے ساتھ چاہت پرانی ہے لیکن چین، نکتہ چینی میں حاضری پہلی بار دے رہا ہوں۔ (خوش آمدید) جاسوسی کا سانگرہ نمبر کافی دیر کے بعد ملا چونکہ آج کل مصروفیات کے سلسلے میں شمالی علاقہ جات میں ہیں۔ اسی لیے شمارہ بھی کافی دیر سے پہنچا۔ سرورق کی حسینہ نہ جانے کس بات پر مسکرا رہی ہے۔ (اسی بات پر کہ آپ اس قدر دوم میں شمالی علاقہ جات میں کیا کر رہے ہیں) کرپی صدارت بھائی ناصر محمود کے حصے میں آئی جو کہ میری طرح پہلی بار شامل ہوئے۔ شمارے پر جو تبصرہ لکھا واقعی وہ کمال کا تھا۔ زیب حسن! کس نے آپ کو کہا کہ آپ نئے ہیں۔ بہار تو آخر بہار ہوتی ہے۔ جب بھی آئے، کیا خیال ہے؟ (بالکل، بجا خیال ہے) محمد نعمان پیارے! خوشبو تو آپ واقعی اچھی لگاتے ہیں کہ جس سے پوری محفل معطر ہو جاتی ہے۔ آپ کی خوشبو کے کیا ہی کہنے۔ سید محی الدین اشفاق صاحب! انسان عمر کے اس دور میں داخل ہوتا ہے تو نائٹل کہاں اچھے لگتے ہیں۔ (کیا مطلب بھئی؟) تصویر العین! ہمیں نے اپنی حاضری کا حق ادا کر دیا۔ آپ کی برتھ ڈے 19 دسمبر ہے یہ بھی انشاء اللہ یاد رہے گی۔ ہمایوں سعید راج اور بھائی محسن علی موم! تھیٹس بھی یہ گرُ بتا دیں کہ اتنا اچھا تبصرہ کیسے لکھا جاتا ہے۔ لگتا ہے محی الدین نواب صاحب کے شاگردوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے آپ دونوں صاحبان کو۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ آپ کے اوپر کوئی جادو چلتا ہے، ذرا ہمیں بھی بتا دیجیے گا۔ تاکہ کوئی مخالف نہ رہے۔ (کیوں تیاری پکی ہے کیا؟) اب چلتے ہیں اپنی کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے اپنے پیارے طاہر جاوید محفل صاحب کی لکار پڑھی۔ پہلی قسط سے لے کر آج 25 قسط تک ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا کہ ہم اس کے سحر سے نکل سکے ہوں۔ تحریتیں لکھنے والے مصنف کی یہ شاہکار اور منفرد کاوش نے واقعی اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے۔ نک ویلوٹ سے برف کی چوری بھی کیا خوب رہی۔ مزہ آگیا۔ اسما قادری صاحبہ گرداب پر مکمل گرفت کیے ہوئے ہیں اور واقعی اپنے اس شاہکار کو لکھنے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ بہت ہی خوب صورت قسط تھی۔ اب اس شمارے میں جو عرصہ دراز کے بعد ایک حیرت انگیز تبدیلی دیکھنے کو ملی، وہ بھی سابقہ ادوار کی طرح سرورق کے تین رنگ سبز، سلاٹ رنگ کا کشف زبیر اور دوسرے رنگ کی حسین برسات احمد اقبال کے ہاتھوں ہوئی اور اختتام ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے کیا۔ یقین کریں پچھلی یادیں تازہ ہو گئیں۔"

اعجاز احمد کی یادیں ساہیوال سے" سالِ نو کا پہلا شمارہ میرے اپنے جاسوسی کی سانگرہ کا خصوصی نمبر، دیدارِ شوق کے لیے ترستی ہوئی آنکھوں کے لیے یقیناً راحت بن کر آیا۔ لیجیے صاحبو! ایک دفعہ پھر طویل غیر حاضری کے بعد آپ کے درمیان موجود ہوں۔ یقین کیجیے کہ اب اس محفل سے دور رہنا ایسے ہی لگتا ہے جیسے کوئی اپنا ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کسی بھی ساتھی نے ہم کو بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔ (یہ کیا بات کی؟ آپ ہمیں بہت اچھی طرح یاد ہیں اور قارئین کو بھی) کتنا کٹھن ہے یہ یادوں کا سفر بھی... وہ پہنے وہ انتظار وہ امیدیں جو ہمیشہ زندہ ہیں۔ جو یقین دلاتی ہیں شب ہجراں میں سسکتی زندگی کے لیے ابھی خوشیوں کی سحر باقی ہے اور انہی خوشیوں کی تلاش میں ہم احساسات و جذبات کے تلاطم سمندر میں غوطہ زن ہوئے یعنی محفل صاحب کی لکار پڑھی۔ عمران اور گیتا کھبی کی آنکھ مچولی خوب رہی۔ تابش کا کردار بہت اہم رہا۔ جل پانی والوں کی بروقت آمد خوب رہی۔ طاہر جاوید صاحب یقیناً امیدوں پر پورا اترے۔ گرداب میں اسما قادری کی کہانی پر گرفت مضبوط رہی۔ رنگوں میں تینوں رنگ ہی زبردست رہے۔ بہرحال بھٹی صاحب کا طرفہ تماشا زبردست اور بازگشت ونڈر فل رہا۔ اس دفعہ جاسوسی کو پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ ابتدائی صفحات پر موجود سلیم فاروقی صاحب حاصل لاحاصل کے ساتھ موجود تھے۔ زبردست اسٹوری تھی۔



جائے پناہ، فائنل لیول، تین نسل بعد، برف کی چوری، عمدہ اسٹوریز تھیں۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ بانیِ محفل ناصر محمود! ویلڈن۔ سید محی الدین اشفاق! پہلے دنوں فتح پور جانے کا اتفاق ہوا تو آپ بہت یاد آئے۔ محمد نعمان پیارے کی خوشبو بھری باتیں اچھی لگیں۔ جعفر حسین کا تجزیہ بھی خوب رہا۔ تصویر العین صاحبہ کی شکایت خوب رہی۔ ایم اے ہاشمی کا تبصرہ خاصا جاندار لگا۔ بہرحال محفل میں ماہ تاب گل رانا، ایس ایس ناز فرام وہاڑی، جہانگیر اسلم گوندل، شہزادہ کوسار، کبیر عباسی اور بھائیوں جیسے دوست آغا فرید احمد خان کی کمی خاصی محسوس ہوئی۔"

قلعہ دیدار سنگھ سے سمیعہ عباسی کے تڑکے" انکل جی پہلی دفعہ جاسوسی کے پلیٹ فارم پر اظہارِ خیال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ (ضرور کیجیے) نائٹل پر 2012 دستاروں کے جھرمٹ میں جگمگ کر رہا تھا۔ اگر حسینہ کی آنکھیں یا S شکل کے جھمکے نہ ہوتے تو وہ بالکل پیاری نہ لگتی ویسے مجھے نائٹل کی حسینہ ماہ جبینہ بہت کم پسند آتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی کمی ہمیشہ رہ جاتی ہے۔ (مکمل تو کوئی شے نہیں ہوتی۔ سوائے ایک کے) خیر چھوڑیے۔ ناصر محمود بھائی پہلی بار آئے اور چھا گئے۔ خیر سے مبارکاں۔ محفل میں اکثر صابر کلاں کے تبصرے پر تبصرہ کرتے نظر آئے اور تفسیر عباس پر تعریف کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے خیر سے وہ اس قابل بھی ہیں۔ لکار واہ کیا کہانی ہے، کیا کہنے۔ لکار کو پڑھتے ہوئے عجیب سی توانائی محسوس ہوتی ہے اور اسی توانائی کی وجہ سے ہر قسم کے حالات میں ہشاش بشاش رہتی ہوں۔ (گریٹ) گرداب میں لگتا ہے اسلم کا آخری وقت آگیا ہے۔ حاصل لاحاصل پڑھ کر دل درد سے بھر گیا۔ جس انسان کی زندگی کا محور ہی اس سے بدگمان ہو جائے تو پھر کچھ نہیں سوجھتا۔ محمد عفان آزاد نے بہت اچھا لکھا۔ غلطی اگرچہ چھوٹی سی ہوتی ہے، اگر اس کو اسی وقت سدھارا نہ جائے تو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ کیا کمال ہے شکار اور شکاری ایک ہے اب انجانے میں شکار کس کو ہونا تھا۔ مختار آزاد نے امریکیوں کی سفاکی اور خود غرضی دکھانے کی اچھی کوشش کی۔ شکر ہے ابلیس بُرے ہاتھوں میں جانے سے بچ گئی۔ تین نسل بعد مریم کے خان کی ڈراؤنے والی کہانی تھی۔ مریم جب بھی لکھتی ہیں، انوکھا لکھتی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، آمین۔ نک ویلوٹ برف چرانے آئے لیکن برف چرائی تو نہیں گئی وہ تو ایڈمرل لیک کی رضا سے ایسا ہوا لیکن اس کو حقیقت معلوم نہیں تھی۔ جائے پناہ میں بے چارہ مارٹن وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا، بہت تکلیف دہ بات ہے کہ انسان جو نہ کرنا چاہے وہی کروایا جائے۔ فائنل لیول میں وہی اسٹیج تھی جب رسل اپنے بیٹے کو آرام سے سمجھا سکتا تھا لیکن اس نے غصہ کیا اور بہت زیادہ کیا... افسوس۔ کاشف زبیر کی بازگشت بار بار سنائی دی۔ حنا کو اپنے باپ کو دیکھے بنا محبت تھی جس نے اسے بہادر بنا دیا اور وہ اپنے باپ کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ویل ڈن کاشف زبیر۔ شہاب الدین نے اپنی غرض کے لیے باپ کی عمر بھر کی ایمانداری کو مٹی میں ملا دیا اور کتنوں کی خوشیاں چھینیں۔ طرفہ تماشا یہ کیا ابھی شروع کی تھی ختم بھی ہو گئی اتنی جلدی۔ چھوٹی سی اچھی لوا سٹوری تھی۔ باپ بیٹے کی پسند پر فدا ہو گیا خیر سے۔ آخر میں پرانے دوستوں کی بہت یاد آتی ہے۔ خاص طور پر لیپسند سیال کی تڑکا لگا کے۔"

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کی محبتیں" نئے سال کا پہلا شمارہ 4 جنوری کو دستیاب ہوا۔ دوشیزہ سرورق مسکرانے کی ناکام کوشش میں خاصی خوفناک دکھائی دے رہی ہیں کیوں جیسے مصنوعی دانتوں کی بتیسی... کسی نے ٹیبل پر رکھ دی ہو۔ اب کس نے رگبی پہ مت پوچھیے گا کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں جو کہ اب... گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ دوشیزہ کے کانوں میں تو جیسے کیچوے لٹکا دیے ہیں اپنے ذاکر صاحب نے۔ ساتھ ہی پستول والے صاحب... یقیناً کسی تخریبی سازش کا تانا بانا بن رہے ہیں۔ چین، نکتہ چینی میں آپ کی اثر انگیز گفتگو۔ مسندِ صدارت پر ہزارہ سے ناصر محمود کی چٹکی چوری باتیں... بھی خوب رہیں۔ بہت بہت مبارکاں۔ لاہور سے زیب حسن! بھئی ظاہر ہے جب آپ اولڈ مینیجرز ہاؤس کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے تو تم۔ الف (ماہا ایمان) ہی دروازہ کھولیں گی نا۔ آئندہ محتاط رہیے گا۔ کھاریاں سے عاطف گجر! آپ کا خلوص سر آنکھوں پر لیکن ایسا کچھ نہیں ہے... میانوالی سے احسان سحر! جب آمنہ پٹھانی کی نظر کم ہو رہی ہے تو ظاہری بات ہے تبصرہ بھی کم ہونا لازمی بات ہے وہی... جرم ضعیفی کے تلخ تقاضے... بھوانہ سے جعفر حسین! آپ محبت خلوص اور ایمانیت سے ہمیں اولڈ از گولڈ کا خطاب دے رہے ہیں تو آپ کا خلوص ہمیں بصد شوق قبول ہے لیکن جناب ہم اتنے اولڈ بھی نہیں ہیں کہ آپ ہم سے اپنے زمانے میں لڑی گئی پہلی جنگ عظیم کے قصے سننے کی فرمائش کر دیں۔ لیہ سے سید محی الدین اشفاق! عمر زیادہ ہو یا کم... ہے تو اول درجے کی بے وفا چیز۔ اس پر اور صنفِ نازک کے کسی وعدے یا دعوے پر اعتبار کر گویا اپنی بے وقوفی کے سرٹیفکیٹ پر دستخط خود... بدست خود... ملہ گنگ سے اے بی صاحب! آپ نے ہمارا تبصرہ طویل سمجھ کر گول کر دیا۔ تو آپ اتنی طویل کہانیاں کیسے پڑھتے ہیں یا صرف... تصویریں دیکھ کر ہی خوش ہو لیتے ہیں۔ اوکاڑہ سے تصویر العین! اگر آپ ادارے سے متفق ہیں تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے اور ایک گزارش کے لیے۔ احمد نواز ش۔ بونیر سے ایم اے ہاشمی! بھائی یہ آپ کا حسنِ نظر ہے ورنہ کہاں سورج کہاں چراغ۔ بنوں سے ہمایوں سعید! ہم نہیں سدھرے... بالکوٹ سے محسن علی موم! کوشش جاری رکھیے... آپ شاعری کی جانب گامزن ہیں۔ راولپنڈی سے سارہ راجپوت۔ اللہ آپ کے سر پر ہمیشہ آپ کے والدین کا سایہ قائم و دائم رکھے اور آپ کی والدہ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ لیہ سے آمنہ پٹھانی! ہم نے ایسی کیا لفاظی کر دی کہ آپ کو اپنے دل میں کچھ کچھ ہونے کا گماں گزرا۔ کہانیوں میں حسبِ روایت اس بار بھی مغلِ اعظم نے میلہ لوٹ لیا۔ خاص صفحات پر سکیم فاروقی کی حاصل لاحاصل عام سی تحریر ثابت ہوئی۔ آغاز قدرے بہتر تھا لیکن اختتام نہایت گجلت میں کیا گیا شاید فاروقی صاحب کو گماں ہو گیا کہ اب تب میں بجلی بند ہونے والی ہے سو انہوں نے بجلی بند ہونے سے پہلے ہی حاصل لاحاصل کا باب بند کر دیا۔ پہلا رنگ کاشف زبیر کی بازگشت سالِ نو کا تحفہ خاص ثابت ہوا۔ خون کے پانی ہونے کا دل فگار قصہ۔ ایک اور لوا سٹوری اکثریوں بھی ہوتا ہے کہ خواب پورے ہونے کے بعد عذاب بن جاتے ہیں۔ شہاب الدین۔ بے تعبیر خوابوں اور سرابوں کے تعاقب میں ادھر کا رہا نہ ادھر کا گویا نہ ہی خدا ملا نہ وصالِ صنم۔ طرفہ تماشا بس ٹھیک ہی رہی۔"

سکھر سے آغا فرید خان کی رائے" ڈاکر انکل نے ہر سال کی طرح اس سال بھی ایک عدد دلچسپ عمر کی خاتون کو سرورق پر بٹھا دیا جس کی مستقبل قریب میں بھی شادی متوقع نہیں۔ (کیوں آپ نے کرنی؟) فہرست کے ملاحظے کے بعد نئے سال کی چینی، نکتہ چینی میں وارد ہوئے۔ ہزارہ سے ہمارے نئے دوست ناصر محمود صاحب آتے ہی چھا گئے۔ بہت بہت مبارک۔ زیب حسن لاہور! بھائی ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ عاطف گجر، کھاریاں! سلطانہ کا غم اتنا بھی نہ کریں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ تابش کو بُرا لگے یا وہ کسی شک و شبے میں پڑ جائے۔ احسان سحر میانوالی! غصہ نہ کریں کیونکہ ماہا ایمان کی تصویر دی گئی تھی تو بھلا اس میں ذاکر انکل کا تو قصور نہیں حالانکہ یہ چاروں نے بہت ساری ایڈیٹنگ بھی کی تھی پھر بھی ایسی ہی بن کے دی۔ سفیان ہاشمی کراچی! بھئی آپ نے تو جرابوں پر کافی ساری ریسرچ کر رکھی ہے۔ محمد لعمان پیارے علیمہ! حسینہ کو نشہ دیتے وقت صبا گل نے آپ کو دیکھ لیا تھا یار۔ اے بی، حلہ گنگ! آپ کا تبصرہ اچھا تھا لیکن پلیز حلہ گنگ کے معنی بتا دیں۔ تصویر الحسن، او کاڑہ سٹی! آپ کی مبارک سرآنکھوں پر، دعوے سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی عورت کسی اور عورت کی اس طرح تعریف نہیں کر سکتی جس طرح آپ سب سرورق کی حسینہ کی جھوٹ موٹ کی تعریف کرتی ہیں، اگر خدانخواستہ مقصود ہو تو خط بھیج کر لکھیں کہانی سمجھ کر نہیں۔ انفال مرزا اینڈ صاحبہ مرزا، چکوال! اچھا تبصرہ تھا۔ ام شامہ، جھنڈا باجی پچھلے دنوں ایک دوست کے ساتھ آپ کے شہر جھنڈوا آیا تو بے اختیار آپ کی یاد آ گئی۔ آپ کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں، آتی رہا کریں۔ ایم اے ہاشمی، بونیر! آمنہ بی بی کے حوالے سے آپ کو سولہ آنے ٹھیک لگتا ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ سب سے پہلے لالکار بڑھی۔ یہ قسط تیز اور ہنگامہ خیز رہی۔ اہم دشمن رنجیت پانڈے جہنم رسید ہو گیا، اس کے علاوہ اینڈرسن بھی مارا گیا۔ ڈاکٹر چوہان کی موت افسردہ کر گئی۔ زرگاں میں محکم جی کی حکومت ختم اور چھوٹے سرکار تخت نشین ہوئے۔ کہانی اب پلٹتی نظر آ رہی ہے۔ دوسرا سلسلہ گرداب اب ہمارے سندھ کے شہر جیکب آباد تک آ پہنچا ہے۔ اسلم کے اور بھی دشمن منظر پر آ گئے ہیں۔ اس بار سرورق کے تین رنگ دیے گئے جس کے لیے شکریہ۔ پہلا رنگ بازگشت، کاشف زبیر کی دل کو چھونے والی تحریر تھی۔ دوسرا رنگ ایک اور لوآسٹوری، احمد اقبال کی اچھی کاوش تھی۔ تیسرا رنگ طرفہ تماشا تھی جسے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے اپنے خوب صورت جملوں میں ڈھالا۔ زرینہ اور بلخ شیر کی محبت نے اپنی منزل پا لی اور ان کی وجہ سے مالدار عورت تو بیہ کی زندگی بچ گئی۔ اب خاص طور پر حاصل لاحاصل کا ذکر کروں گا۔ سلیم فاروقی صاحب اتنی اچھی کہانی لائے لیکن اس کہانی کے انجام سے میں تو کیا کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ دوران مطالعہ ایسے مقامات بھی آئے جو جذبات میں آ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی نکل گئی، لیکن خرابی آخری صفحے پر ہوئی۔ جمال دستی کی فیصلہ اچھی کاوش تھی۔ اس کے علاوہ فائنل لیول، جائے پناہ، برف کی چوری، تین نسل بعد، امریکی پروفیسر جیسے کوتیسا اور غلطی کا پھل بھی اچھی کہانیاں تھیں۔"

آمنہ پٹھانی، رفیع پور لیہ سے لکھتی ہیں" نئے سال کا سالگرہ نمبر 3 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل سالگرہ نمبر کے شایانِ شان نہیں لگا۔ ٹائٹل گرل کی مخمور آنکھوں کے علاوہ کچھ بھی نیا پن محسوس نہیں ہوا۔ ویسے بھی گزشتہ کچھ ماہ سے سرورق یکسانیت لیے ہوئے ہے۔ بزمِ دوستاں میں پہنچتے تو نامر محمود کو خوب صورت تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ سو مبارک باد۔ عاطف گجر! اطمینان خاطر رکھیے ہم دو چار بھی آپ جیسے فصلی بٹیروں کو فٹ نائم دیں گی۔ احسان سحر! ہمیں بونگیاں مارنی تو آتی نہیں اس لیے کم لکھتی ہوں اور جامع لکھتی ہوں۔ ایم اے ہاشمی! آپ کا تبصرہ پڑھنے کے بعد ہمیشہ مجھے خمیرہ گاؤزبان اور دماغی ٹانک استعمال کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ہمایوں سعید! آپ تبصرہ بہت اچھا لکھتے ہو بھئی، پر یہ کیا کہ ہم پر تجسّی کا الزام دھر دیا۔ محسن علی! مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کہیں شیطان کی تانیث کا وجود ہو؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ابتدا سلیم فاروقی کی حاصل لاحاصل سے کی۔ کہانی درمیانی درجے کی ثابت ہوئی۔ وہی زر، زمین، دولت کا حصول کچھ بھی منفرد نہیں لگا۔ ویسے انکل اٹھہرا و والے انداز کی کہانی کو سلیم فاروقی کیسے سرپٹ بھگا دیتے ہیں؟ یہ فن مجھ میں نہیں آیا۔ (یہ فن انہی پر ختم ہے) لالکار کے دھنی عمران اور تابی نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر عکم کی فوج کو شکست دے ڈالی۔ گرداب میں اسلم کی جسارتیں بڑھتی جاری ہیں۔ ماہا تو ارک جاؤ کہ کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے۔ سرورق کا پہلا تحفہ، کاشف زبیر کی تحریر بازگشت بہت ہی زبردست تحفہ ثابت ہوئی۔ سطر سطر تجسس میں ڈوبی یہ کہانی مدتوں یاد رہے گی۔ دوسرا رنگ ایک اور لوآسٹوری احمد اقبال کافی عرصے بعد آئے اور بہت پیارا تحفہ لے کر آئے۔ کہانی کا انجام انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ تیسرا رنگ قدرے پھیکا سا رنگ۔"

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی کراری باتیں" نخوت آلود دانتوں اور کریلے جیسی صورت... سرورق کی حسینہ ٹھہری۔ ذاکر صاحب کا بھی قصور نہیں، ہمارے جیسا حسن اب کہاں؟ اب تو معیارِ حسن گورا لکھ، اسوڑے، چھوہارے اور ریگن نما شکلوں تک آ گیا ہاؤسی سے گزارہ کرو۔ (کیا بات ہے) چینی، کی نکتہ چینی میں سب سے پہلے معراج رسول کی خیریت سے مطلع کریں۔ عجب بے حسی ہے نہ کوئی پوچھتا ہے نہ کوئی بتاتا ہے۔ خط لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ (قدرے بہتر ہے۔ آپ سب ساتھیوں کی دعاؤں کے طلب گار ہیں) قصرِ صدارت پر نامر محمود کو دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ کیا تاک تاک کے نشانے لگائے ہیں کو ہستانی بھائی۔ بہت بہت مبارک ہو۔ میرا تعلق مانسہرہ ہزارہ سے ہے۔ اس طرح آپ میرے پڑوسی ہوئے۔ کہانیوں میں پہلے جاوید مغل کی للکار بڑھی۔ ایڈیٹرسن نے جو بھی کیا تابی کو وہ ہمیں کرنا چاہیے تھا مگر کیا کیا جائے کہ جنگ میں کوئی ضابطہ اخلاق نہیں ہوتا۔ رنجیت پانڈے کی اتنی آسان موت پسند نہیں آئی۔ گرداب کی وڈی چودھرائن کے آخری ایام پر ترس آیا۔ میری ہمیشہ سے عادت ہے مظلوم سے زیادہ ظالم پر ترس آتا ہے۔ (بڑی الٹی عادت ہے آپ کی) مریم کے خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ اس دفعہ مریم کے خان نے مایوس کیا ہے اور وقت الگ ضائع ہوا۔ سلیم فاروقی اچھا لکھتے ہیں مگر اب کی بار ان کی حاصل، لاحاصل رہی۔ کوئی بہن ایسا کر سکتی ہے کہ اپنے بھائی اور وہ بھی اتنا مہربان اس پر تو اعتبار نہیں مگر نئے وارد ہونے والے چچا پر اتنا بھروسا ہے۔ دیگر کہانیاں نک ویلوٹ کی برف چوری سمیت پھیکی اور بے مزہ تھیں اور سرد رکا باعث بنیں۔ (یہ جان کر بہت افسوس ہوا) آخری رنگوں میں کاشف زبیر کی بازگشت میں حنا کے ابو نے تو وطن کے لیے بیوی، بچے اور سب آسائشیں خود پر حرام کر دی تھیں، صلہ کیا ملا؟ اور آفیشل فورس کی بھی خوب رہی۔ چراغ کے جن کی طرح الماری سے دھماکے چار چار نکل آئے لیکن ایک معمولی درجے کے قاتل کو نہ روک سکے۔ کیا آپ اپنے پڑھنے والوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے آفیشل لوگ اس قدر نکمے ہیں عجب کہانی ہے کہ ایک بھائی تو وطن کے لیے مر مٹا اور دوسرا اس قدر ہوس پرست اور گھٹیا کہ غیر قانونی کام کے لیے بھائی کے مرنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ (پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یہ بات آپ کو معلوم ہو گی شاید) دوسرا رنگ احمد اقبال کا تھا جو ہمیشہ سے آئے اور چھا گئے کی پالیسی پر گامزن ہیں اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایک اور لوآسٹوری تینوں رنگوں پر بھاری، تیز اور نٹ کھٹ تھی۔ احمد اقبال کی تحریروں میں طنز، مزاح، سبق اور آگہی کے سارے لوازمات ہوتے ہیں اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جو فی الوقت ہو رہا ہے۔ قاری کو کم رلانے اور زیادہ ہنسانے پر مجبور کرنے والے احمد اقبال میرے فیورٹ ہیں، اللہ کرے زورِ قلم اور



زیادہ۔ جاسوسی کی سالگرہ کا تیسرا خاص تحفہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا طرفہ تماشا گزارے لائق یعنی ٹھیک ہی تھا۔"

کرم پورے سے نادیہ خان وسیر کی خوشی" سب کو نیا سال مبارک۔ سب کو فیر حاضری کی وجہ بتا دوں کہ دو ماہ تک خط نہ لکھ سکی کیونکہ آپ کی نادیہ خان رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو چکی ہیں۔ اس وجہ سے معذرت۔ (بہت بہت مبارک ہو اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے، آمین) جس جس نے پیٹھ پیچھے بُرا بھلا کہنا ہے اب کہہ دے۔ (کوئی کچھ نہ کہے ہم نے تو کہہ دیا شادی کے بعد پہلی سالگرہ مبارک ہو) چینی، نکتہ چینی میں کرسیِ صدارت ناصر محمود سنبھالے بیٹھے تھے۔ تبصرہ اچھا تھا۔ سفیان ہاشمی آہا ایسے تھوڑی پھسلتے ہیں اور آپ کا اک راز ہمارے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ آپ مدہوش جرابوں کی مہک سے ہوتے ہیں اور آپ کا تبصرہ پڑھ کر مفت مشورہ سب کو مل گیا ہے کہ کسی نے بی اے ایم اے کرنا ہو تو سلیس بکس پر پیسے خرچ نہ کریں بلکہ کسی نزدیکی لائبریری میں ڈاکا ڈالیں۔ جعفر حسنین کا تجزیہ نما تبصرہ اچھا لگا۔ لو جی اب منصب لنگور بھی اپنی عمر چھپانے لگے۔ سیدنجی الدین اشفاق، تصویر الحسن! آپ کے تبصرے نے محفل کی رونق بڑھا دی۔ ڈبل مرزا خاص طور پر سلام قبول کریں کیونکہ آپ کے نام میں نہیں بھول سکتی جو میں نے رکھا ہے ڈبل مرزا۔ ام شامہ، ایم اے ہاشمی اور آمنہ پٹھانی کے شکوے شکایتیں پسند آئیں۔ آفرید، دلنشین اور تفسیر بھائی محفل میں واپس آئیں۔ کہانیوں میں حاصل لاحاصل بہت اچھی لگی۔ پڑھ کر تھوڑا عجیب لگا بس یہ دعا مانگی کہ آج کے دور میں اللہ پاک ہم سب کو منافقت، شک اور حرص سے بچائے، آمین۔ جیسے کو تیسا تو ایسا ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ لالکار پڑھ رہی ہوں باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے اس لیے تبصرے سے قاصر ہوں۔" (اس دفعہ رعایت دے رہے ہیں۔ شادی کی وجہ سے۔ آئندہ ماہ بھرپور تبصرہ ہونا چاہیے میاں پر... او ہو بھئی کہانیوں پر...)

میر اسیال اور پریشے سیال کی ناراضی... اور خوشی منڈی بہاؤالدین سے" جاسوسی حسبِ معمول بہت لیٹ 9 جنوری کو ملا۔ آپ سب سنگ دلوں، بے مروت دوستوں نے تو ہمیں بھلا ہی دیا ہے۔ ٹائٹل پر جلوہ افروز حسینہ اتنے دلکش انداز میں اسائل پاس کر رہی تھی کہ ہم رہ نہ سکے اور بے ساختہ کاغذ قلم تھام کر بیٹھے۔ حالانکہ دل و دماغ میں ایک کشمکش جاری تھی۔ (وہ کیوں اور کس کے لیے؟) جاسوسی متاعِ تلیس کی طرح دل کو کھینچ رہا تھا اور دماغ ہمیں یہ کہہ رہا تھا۔

وہ مجھے بھلا بیٹھا ہے اب تجھ پہ بھی لازم ہے
خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

(اس قدر غصہ... بددعائیں تو نہ دیں) ایک ہی جست میں اپنی ست رنگی محفل میں پہنچے۔ مسٹر نامر! پہلے ہی ملے میں میدان مار لیا۔ اس جرأت پر مبارک باد۔ بزمِ دوستاں میں اپنے شہر کے دو بھائیوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی اور دور اصل اسی وجہ سے ہمیں بھی چٹکی لکھنے کی ہڑک اٹھی۔ سیدنجی الدین صاحب! آپ فیڈرمنہ میں لے کر کس طرح ایم اے کریں گے؟ ہماری معلومات کے مطابق تو بی اے بھی وداؤٹ شناختی کارڈ ناممکن ہے۔ خیر ہمت مرداں مدد خدا۔ عینا اور ام شامہ کے تبصرے کافی کیوٹ تھے۔ دل کو بھائے۔ ماسٹر نیازی کے چھاؤں کا سن کر افسوس بھی ہوا اور پاکستانی فوج پر فخر بھی۔ جنہوں نے ہمیشہ پاکستان کی ناموس پر جانیں قربان کی ہیں۔ بات ہو جائے ذرا لالکار کی۔ عمران کی معاملہ فہم اور دور اندیشی نے ہمیشہ متاثر کیا ہے لیکن انکل پلیز اب ان کو وطن واپس لا کر شہود اور ثروت سے ملا دیں۔ گرداب میں آفتاب اور کشور تو شاید اس جہاں سے ہی کوچ کر گئے ہیں۔ وڈی سیالی بی بی ماہا نو اپنے ساتھ کچھ بلائیں چمٹا لائی ہیں۔ میں سب کو بتاتی چلوں کہ ہم دونوں نے گوجرانوالہ بورڈ کی زیادتیوں اور نہ جانے کے بوجو انٹرمیڈیٹ سال اوّل کو فرسٹ ڈویژن سے کراس کر لیا ہے۔ (بہت بہت مبارک۔ یہ کراس آپ نے پاس کرنے کی جگہ اچھا استعمال کیا) انکل جی! میری نیتی پریشے سیال کی سالگرہ 9 فروری کو ہے۔ آئی ہوپ آپ محفل میں خوش آمدید کہتے ہوئے پذیرائی کریں گے اور یہ میری زندگی کی سب سے خوش گوار سالگرہ ہوگی۔ (ڈبل کراس پہ ڈبل مبارک باد) خدا کرے ہمارا یہ سال پُرامن اور خوش حال گزرے، آمین۔"

منور حسن کی مبارک باد کا شربت سے" جاسوسی کی محفل میں پہلی مرتبہ حاضر ہو رہا ہوں امید ہے کہ میرے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے اور میری درخواست قبول فرمائیں گے۔ (لوٹ آمد ہے) میں جاسوسی کا خاموش قاری ہوں۔ (سب ہی خاموش قاری ہیں۔ کوئی چلّاتا ہوا چیختا ہوا نظر آ رہا ہے) سب سے پہلے للکار پڑھی پھر گرداب۔ دونوں گزارے لائق ہیں۔ احمد اقبال صاحب کی ایک اور لوآسٹوری تو بہت اچھی تھی۔ حاصل لاحاصل نے تو ریکارڈ توڑ دیا۔ (کس چیز کا؟) تصویر الحسن، ام شامہ، ناصر محمود، زیب حسن اور طارق محمود راہی صاحب کے تبصرے جان دار تھے۔ آخر میں دعا ہے کہ جاسوسی اتنی ترقی کرے کہ ہم دنیا کے جس کونے میں جائیں اسے پہلے پائیں۔" (آمین)

ایم اے ہاشمی کی تجویز اور تحفید ضلع بونیر سے" اس دفعہ 2012 جنوری کا چاند 4 تاریخ کو افق پر نمودار ہوا اور ہم نے کھلی بانہوں سے ویلکم کیا۔ ٹائٹل ایک دم صفر تھا۔ لڑکی بس صرف لڑکی تھی۔ (پچھلی لڑکیاں... لڑکے نما تھیں؟) حسینہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ (اچھا اب سمجھیں) سالِ نو کے ساتھ جہاں شمارے میں بہت سی تبدیلیاں آئیں وہاں الفاظ میں کافی غلطیاں ہو گئیں۔ جیسے سفیان ہاشمی کو سفیان ہاشم بنا دیا۔ (معذرت چاہتے ہیں) بادشاہت نامر کو ہستانی کو ملی تھی۔ بادشاہ سلامت! آپ نے تو آتے ہی انکل جی کو ایسا ٹھکن لگایا کہ وہ بے چارے پھسل گئے۔ (نالائق یہ کیا کہہ رہے ہو) اے بی ملک صاحب! آپ کے لیے مفت مشورہ۔ بجی زمین پر ننگے کی مدد سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے سے ہینڈ رائٹنگ بہتر ہو جاتی ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ تصویر الحسن! آپ کو ہوا کیا ہے بھئی؟ آپ کا نام اعتراض رکھنا چاہیے تھا۔ آپ دو بیویوں کے بارے میں مرد حضرات سے پوچھو۔ وہ یا تو مزے کرتے ہیں اور یا پھر فیصلے کرتے ہیں۔ اور وں سے آپ کو کیا۔ اپنے بارے میں سوچو۔ آمنہ بی بی! آپ خط لکھنے سے پہلے اپنے آپ پر ایک دفعہ سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ گرداب پڑھتے ہوئے اسلامی پراس لیے غصہ آیا کہ انہوں نے آفتاب اور کشور کو کہاں اور کیوں غائب کر دیا ہے؟ کہانی جھینگی ہی ہے۔ اسلم کی ماں کی بے بسی اور کسمپرسی پر بے پناہ ترس آیا۔ میرے خیال میں اسلم اور ماہا نو کی شادی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ (کیوں؟) اس میں مجھے بہت سی قباحتیں نظر آتی ہیں۔ بہرحال دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ چودھری افتخار



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر بُرا وقت آنے والا ہے' کہتے ہیں کہ فیصلے کی گھڑی بڑی کڑی ہوتی ہے اور عنقریب یہی کڑی گھڑی چودھری کو بوجھ بننے والی ہے۔ اب بات ہو جائے اس جوان رعنا کی جس کے اندر للکار بھری ہوئی ہے۔ اس قسط کا اسلوب، انداز بیاں اور دلچسپی ایسی تھی کہ پڑھتے ہوئے قطعی احساس نہ ہوا کہ کب ختم ہوئی۔ گیتا کھلی کے زبردست انکشاف نے فتح کا رخ مسلمانوں کی طرف کر دیا اور زرگاں نے وہ تباہی دیکھی جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کہانی کی شان اور زندہ دلوں کی پہچان عمران نے ہمیشہ کی طرح ایک زندہ کردار ادا کیا۔ معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ سلیم فاروقی صاحب کی کہانیوں کا جذباتی پن مجھے پسند نہیں۔ پہلا رنگ کا شف زبیر کی ایک عمدہ تحریر تھی۔ کہیں بھی کوئی جھول نہیں تھا۔ اس میں ہمارے معاشرے کے ان رذیل سیاہ کاروں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اپنی نام نہاد شرافت اور سفید پوشی کی آڑ میں اخلاقی قدروں کو پامال کر رہے ہیں۔ دوسرا رنگ بس ٹھیک ہی تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے اپنی کہانی حسب روایت اپنے مخصوص انداز میں رقم کی تھی۔ مختصر کہانیوں میں غلطی کا پھل اچھی کہانی تھی اور انکل صاحب! خطوط سے متعلق آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے۔ کانٹ چھانٹ تو ہوتی ہی ہے۔ آپ ایسا کریں کہ خطوط کی ایک مقدار مقرر کر لیں کیونکہ خط کو آپ ہماری محبت سمجھ لیں۔" (اور ہم زیادہ سے زیادہ قارئین کی شمولیت کو محبت کا حق ادا کرنا سمجھتے ہیں)

راولپنڈی سے سیارہ راجپوت کی کوشش "اس بار کزن نے جاسوسی 3 تاریخ کو لا کر دیا اور ساتھ خاص ہدایت بھی کی کہ خط میں اس کا بھی تذکرہ کیا جائے۔ (کزن صاحب یہ نیکی کرنے پر آپ کا بہت شکریہ!) میرے بچپن کا دوست، ہم دم اور ساتھی۔ مجھ سے بس ایک ہفتہ بڑا ہے۔ خیر، تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ سرورق بہت زبردست تھا۔ حسینہ کے ائر رنگز بہت پسند آئے۔ (چڑا مت لینا) تمام نکتہ چینیوں کی نکتہ چینیاں دلچسپ تھیں۔ لیکن تمام پرانے ساتھی ہابا ایمان، دلنشین بلوچ، نمرتی حسنین بلوچ، بابر عباس اور دیگر محفل سے غائب تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ للکار پڑھی۔ بلاشبہ یہ قسط اب تک کی بہترین قسط تھی۔ اس کہانی نے شروع سے ہمیں ایک حصار میں رکھا ہے۔ ہم بھی اس کے کرداروں کے ساتھ جیتے ہیں۔ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔ منظر نگاری اس قدر بھرپور اور واقعات اس قدر مسلسل میں تھے کہ ارد گرد کا ہوش نہ رہا۔ رنگوں میں کا شف زبیر کی بازگشت ایک اچھی کہانی تھی۔ کا شف زبیر کو پہاڑی علاقے بہت پسند ہیں ان کی تمام کہانیوں کا پس منظر کوئی پہاڑی علاقہ ہی ہوتا ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ جھیل کی بھی کچھ خبر لائیں۔ دوسرا رنگ بھی بہتر تھا اور ربط و تسلسل کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ طرفہ تماشا بلکے بھلکے انداز میں ڈاکٹر صاحب کے مخصوص طرز تحریر سے ہٹ کر لکھی گئی ایک اچھی کہانی تھی۔ مخصوص صفحات پر سلیم فاروقی کی لاحاصل کا تاثر شروع میں اچھا تھا لیکن بعد میں رائٹر کی گرفت کہانی پر کمزور لگی۔ اختتام بہت جلد بازی میں کیا گیا۔ مختصر کہانیوں میں مریم کے خان کی تین نسل بعد نے بہت متاثر کیا۔ غلطی کا پھل، محمد عفان آزاد نے بہت خوب صورتی سے شوبز اور گلیمر کے پردے کے پیچھے کے حالات کا تجزیہ کیا۔ جیسے کو تیسا اور فائنل لیول بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی بس نارمل تھیں۔ مجموعی طور پر 2012ء کا پہلا شمارہ کافی اچھا تھا۔" (شکریہ)

انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے یادآوری "سانگرہ نمبر کا سائل مسکراتی ہوئی لڑکی کے منظر کے ساتھ کافی دلکش تھا۔ بڑی کہانیوں کی تصاویر ڈیزائن اور کمپوزنگ میں کشادگی بھی جاذب نظر تھی۔ تصاویر کا معیار اس شمارے میں خاصا بہتر معلوم ہوا، کاغذ بھی قدرے صاف تھا۔ خطوط کی محفل میں خوب رونق تھی۔ غلطی کا پھل، جیسے کو تیسا، تین نسل بعد، برف کی چوری، فیصلہ اچھی تحریریں تھیں۔ حاصل لاحاصل آخری رنگوں سے بہتر تھی۔ لیکن خرم اگر قانونی طریقے سے اپنے چچا کو بے نقاب کرتا تو زیادہ بہتر تھا۔ بازگشت کا اختتام اچھا تھا۔ گرداب اور للکار زیر مطالعہ ہیں۔ فائنل لیول میں بچے کا رویہ کچھ زیادہ ہی منفی اور انتہا پسندانہ ہو گیا۔" (جی ہاں آپ کی کہانیاں مل گئی ہیں)

علی پور سے محمد جاوید بلوچ کے انکشافات "تحصیل علی پور میں جاسوسی وقت پر ملا۔ ایسا حسن اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے۔ ستاروں کے جھرمٹ میں کھلکھلاتی ہوئی استعانیہ گرل کی مسکان متاثر کن نہ تھی۔ میری حسن شناس نگاہوں کو دیگر نقوش بھی جاذب نگاہ لگے۔ (کیا کہنے آپ کے حسن نظر کے) نجمی الدین اشفاق ہاتھ میں پانی والا پسل اٹھائے... ابھی تو میں بچا ہوں، 100 سال کا چھوٹا بچہ ہوں، ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ سلیم فاروقی کی حاصل لاحاصل میں بامحبت مذرخم کی تمام کوششوں پر ناقص العقل شانو کی نادانی نے پانی پھیر دیا۔ غبار آزاد کی امریکی پروفیسر شروع میں بور لگنے والی کہانی نے کچھ دیر بعد غور سے پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ کئی حضرات کی لڑائی مول لینے کے بعد ایلس کو اس کا پسندیدہ مرد ڈنر کی شکل میں مل ہی گیا۔ ویسے مغرب میں عورت ذات ایک مرد پر گزارہ کرے، ناممکن سی بات ہے۔ (بہت کچھ ممکن بھی ہے) گرداب ملک دولت کے لیے جاسوسی میں واحد لکھی جانے والی اسٹوری ہے اور اس کی مقبولیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا میں گرویدہ ہوں۔ (سب لوگ کان کھول کر سن لیں۔ یہ اعلان... پھر مت کہیے گا ہم نے سنا نہیں تھا) للکار میں حکم جی کی موت جارج کی طرح اذیت ناک ہونی چاہیے۔ طاہر جاوید تاہش کو بھی عمران کا ہم پلہ ہونا چاہیے۔ مریم کے خان کی تین نسل بعد انتہائی بارا سٹوری تھی۔ تحریر ریاض کی فائنل لیول مار دھاڑ سے بھرپور منفی جذبات کو پروان چڑھانے والی ویڈیو گیمز کی تباہ کاریوں پر مشتمل حساس کہانی تھی۔ جائے پناہ اپنے دیہاچے کے عین مطابق تھی۔ نک ویلوٹ بھی ہمیشہ کی طرح کامیاب رہا۔ جیسے کو تیسا بابر نعیم کی اچھی دریافت تھی۔ ایم عفان آزاد کی غلطی کا پھل بظاہر عام سی لگنے والی اسٹوری میں قاری کے غور سے پڑھنے کا کافی مواد موجود تھا۔ نشے کی زیادتی کے باعث ہو جانے والی غلطی کا خمیازہ مارلن کو اپنی موت کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ پہلے رنگ میں حنا کی ہمت کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ بختیار جیسے پوشیدہ سر فروش وطن دوست محسنوں کو دل سلام کہتا ہے۔ دوسرے رنگ کا انجام چونکا دینے والا تھا۔ شہاب کی بدد یانتی نے کئی گھر اجاڑ دیے۔ تیسرا رنگ عبدالرب بھٹی جیسے سنجیدہ اور منجھے ہوئے لکھاری کے شایان شان نہیں تھا۔ سال نو کا پہلا شمارہ خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ اچھا لگا۔ (شکریہ!) نامرحمود کو مال گاڑی کی طرح جھٹکے لیتا ہوا پہلا محبت نامہ جس کی ہر سطر سیب کے موتی طرح جگمگا رہی تھی، میں نے کئی بار توصیفی ستائشی نگاہوں سے پڑھا۔ ایسے پُرمغز تبصرے کم کم ہی محفل کی زینت بنتے ہیں۔ تفسیر عباس کو لفظوں کا کھلاڑی کا خطاب دیر سے ہی سہی مگر درست خطاب دیا گیا ہے۔ لفظوں کا کھلاڑی کا خطاب ملتے ہی کئی چوٹیوں نے دانت چبائے ہوں گے۔ تفسیر عباس دو تین شعری مجموعوں کے مصنف بھی ہیں، بہت کمال کے سنجیدہ شاعر ہیں۔ (اوہو) اے بی آپ کا نام کہیں اللہ بچایا کا مخفف تو نہیں اور کیا تبصرہ طویل ہو تو نہیں پڑھنا چاہیے؟ کمال ہے آپ تو عجیب باتیں بھی کر لیتے ہیں۔ (یہ کمال کم لوگوں میں ہوتا ہے... ہے نا) انفال اینڈ صبا مرزا ضروری نہیں کہ اساقاری کی اسٹوری آپ دونوں کی طرح موتی ہو۔ بے جا تنقید نہ کریں، زیادہ صفحات کی



حامل کہانی بھی وجہ طوالت کا باعث بنتی ہیں۔ ضیاالرحمن نیازی ہمارے اپنوں میں جتنے سادہ لوگ ہیں اس سے زیادہ تعداد غداروں کی ہے۔ ایم اے باجی کے جوابات زبردست تھے۔"

خانیوال سے محمد بلال حیدر کی فراوانی "اس دفعہ جاسوسی جنوری کی شمشرقی شام کو 7 بجے اسلام آباد کی ایک بک شاپ سے 2 تاریخ کو ملا۔ چینی، کاغذ چینی سے کئی کتراتے ہوئے للکار پر پہنچے جواب واقعی للکار بن چکی ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر لگتا ہے تاوان کی یادیں تازہ ہو گئی ہیں لیکن اس میں طاہر انکل تابی کے ہاتھوں ایک ایک کر کے سارے دشمنوں کو مروا تے جا رہے ہیں۔ ہم تو سوچ رہے تھے پانچ ایک یا دو گروشمن ہوں گے۔ طاہر انکل سے گزارش ہے کہ شکر کی طرح کوئی دشمن ہو جو کہانی کے اینڈ تک تابی کو بھی ناکوں چنے چبوائے تاکہ کہانی کا مزہ دوبالا ہو۔ باقی کہانی بہت اچھی ہے۔ اس کے بعد پہنچے گرداب پر۔ ماسٹر آفتاب اور کشور تو سرے سے غائب ہیں۔ اساجی پلیز کہانی میں انہیں واپس لائیں۔ پہلی کہانی سلیم فاروقی کی حاصل لاحاصل پڑھی۔ بہت جاندار کہانی تھی۔ کاشف زبیر کی طرح یہ رائٹر بھی ہمارے پسندیدہ رائٹرز بنتے جا رہے ہیں۔ اس دفعہ ایک ساتھ پسندیدہ رائٹرز کو پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ چھوٹی کہانیوں کو چھوڑ کر رنگوں پر پہنچے۔ اس دفعہ ایک ساتھ تین رنگ رسالے کو چار چاند لگا گئے۔ پتا نہیں اب یہ سانگرہ نمبر کی خوشی میں تین رنگ تھے... (درست سمجھے...) ابھی باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ جیسے جیسے کام سے فارغ ہوتا ہوں پٹ سے ایک کہانی چٹ کر جاتا ہوں کہ وقت کو بھی کسی طرح پاس کرنا ہے نا... اور وقت بھی کیسا کہ جو کسی کی یادوں کے سہارے گزر رہا ہے۔ (کس کی) شاعر کہتا ہے کہ میں زندگی کو کہیں زندگی مجھے گزار رہی ہے۔ پتا نہیں اب یہ سچ ہے کہ نہیں۔ بہرحال، رسالہ مجموعی طور پر بہت اچھا تھا اور اب اسی طرح کے اگلے رسالے کا بے چینی سے انتظار ہے۔"

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی پسند ناپسند "سانگرہ نمبر بہت سی دلکش تبدیلیوں سمیت 2 جنوری کو موصول ہوا۔ زیب برادر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس دن چوکیداری کے فرائض ہاشمی صاحب سرانجام دے رہے تھے، اسی نے گیٹ کھولا ہوگا۔ عاطف گجر صاحب! افسوس نما حیرت ہوئی کہ آپ کے ہاں بندہ چالیس سال کے بعد ماسٹر ز میں ایڈمیشن لیتا ہے۔ محترمہ ام شامہ جی! میں نے نہایت اعلیٰ ادبی چال چلتے ہوئے آپ کے الفاظ پکڑ کر مروڑے تھے مگر آپ خاک نہ سمجھیں گی شکند باجی۔ حیرت کے جھٹکے تو تصویر العین نے دیے جو تفسیر کو پاکے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ سفیان صاحب! آپ تو سیاست داں معلوم ہوتے ہیں، کبھی فرماتے ہیں کہ حسینہ کی مدہوشی میں جزاروں کا ہاتھ ہے اور کبھی چلّا چلّا کر سوار کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ اشفاق میاں بھی دلنشیں صاحبہ کو اپنی پھنکار برساتی صورت تیزی سی اڑتے بالوں اور مریل ہوتے وجود کا راز بتانے اور سمجھانے میں ہلکان نظر آئے۔ اے بی ملک صاحب! اگر آپ تصویر بی بی کی عمر شریف جاننے کے لیے اتنے بے چین ہیں تو ہم بتائے دیتے ہیں کہ انہوں نے 19 دسمبر کو اپنی اکیسویں سانگرہ منائی۔ یہ سو فیصد درست اطلاع ہے برادر! ہاشمی صاحب کو اپنے لیے دعا گو دیکھ کر بے پناہ خوشی ہوئی۔ میں نے سنا ہے کہ بزرگوں کی دعائیں جلد اثر دکھاتی ہیں۔ محسن صاحب بھی کسی ماہر سیلز مین کی طرح دلنشیں کے آگے بجھے جا رہے تھے۔ طارق محمود صاحب! خیر ہے کیسا چل رہا ہے تمہارے کا سمیٹکس کا دھندا؟ آمنہ صاحبہ! تفسیر میاں کا بھی ایک اصول ہے کہ وہ جادو چلانے سے پہلے عمر، وزن، قد، رنگت وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ اس بار انکل نے سرورق کے تینوں رنگ دے کر جی خوش کر دیا۔ کاشف زبیر کی بازگشت ہمیشہ کی طرح نمبر ون رہی۔ ایک اور لو اسٹوری مدتوں یاد رہنے والی کہانی ثابت ہوئی۔ استاد گلشن اور بے ساختہ مزاح، جی خوش کر دیا۔ عبدالرب بھٹی کی طرف تماشا کچھ خاص رنگ نہ جما سکی۔ ابتدائی صفحات کا حق سلیم فاروقی نے بخوبی ادا کیا۔ خرم کی ہمت و استقلال نے متاثر کیا۔ جیسے کو تیسا میں مصنف نے مختصر ترین کہانی کا کریکارڈ بنانے کے چکر میں پیغام واضح کیا ہی نہیں کہ وہ دونوں شکاری آخر یہ شکار کرتے کیوں تھے۔ وجہ کیا تھی آخر۔ ویڈیو گیمز کے نقصانات کو اجاگر کرتی فائنل لیول بھی دلکش کاوش ثابت ہوئی۔ ہالی وڈ کے گرد گھومتی غلطی کا پھل ان کی فلموں کی طرح بے ذائقہ لگی۔ ایک بار پھر جاسوسی کو سانگرہ کی ڈھیروں مبارک باد۔"

محمد قدرت اللہ نیازی سکیم ٹاؤن خانیوال سے حاضر ہیں "2012ء کا پہلا شمارہ یکم دسمبر کو ملا۔ سنہری رنگوں سے سجا سرورق نئے سال کی مبارک دے رہا تھا۔ چینی، ان کے دلکش پرنامر محمود پھیل کر پیش نظر آئے مبارک ہو جی۔ پہلی باری خدا کی شمولیت اور ساتھ میں کرسی صدارت بھی' واہ مزے آ گئے۔ احسان سحر! فائنل انتظار تو نہیں تھا جتنا آپ کو لگا۔ ملیان باجی! باروں سے بچنا؟ ناٹ بچنا اور نسوار سونگھنے سے نشہ نہیں چڑھتا جب تک کھانہ لیں۔ تصویر العین! آپ کو ارشد سے ارشی... مبارک ہو۔ تو آپ کی بدقسمتی ہوئی الموس ہوا یہ جان کر۔ سانگ تو کرا آپ کی سلطانہ سے کیا دشمنی تھی جو آپ کو اس کی موت کی خوشی ہوئی۔ ہما ماسٹر ضیاالرحمن بیاری الحفل میں دلکم اور خانیوال میں کہاں رہائش ہے آپ کی؟ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی کی حاصل لاحاصل پڑھی، ٹھیک تھی۔ للکار میں طاہر جاوید نے ساں باندھ دیا کئی واقعات ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئے۔ اساقادری کی گرداب بھی اس دفعہ بہتر رہی۔ گو آفتاب اور کشور غائب تھے تاہم باقی تمام کرداروں کے حوالے سے واقعات کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ تحریر ریاض ہمیشہ کی طرح ترجمہ شدہ کہانی جائے پناہ لے کر آئے۔ سلیم انور کی فائنل لیول جدید دور کی ویڈیو گیمز کے ضرر رساں پہلوؤں کو اجاگر کرتی عبرت انگیز تحریر تھی۔ مریم کے خان تین نسل بعد لے کر آئیں، بکا راجا گو کہ ایک تخیلاتی کردار تھا تاہم جب شیر فگ جنگل میں ان کے نرغے میں پھنس گیا تو بڑا خوف محسوس ہوا۔ کافی عرصے بعد جاسوسی سرورق کے تین رنگوں سے مزین تھا۔ پہلا رنگ کا شف زبیر کا بازگشت اچھا تھا۔ دوسرا رنگ احمد اقبال کا ایک اور لو اسٹوری بہت غیر متوقع انجام لیے ہوئے تھا' ہم تو آس لگائے ہوئے تھے کہ شہاب الدین بہت بڑا آدمی بنے گا مگر اس کی پرواز تو صرف دبئی تک رہی۔ تیسرا رنگ طرفہ تماشا مزاحیہ پوزیشن کے ساتھ ایک خوب صورت تحریر تھی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

حوالدار آصف ٹلوکر، انگ۔ صائمہ جان ٹلوکر، خانقاہ سرا جیہ۔ عجاب کنول خان، ملک وال۔ رخ ماہ تاب، نوشہرہ۔ آمنہ عباسی، سری۔ ماہ تاب گل رعنا، راجن پور۔ صبا گل، مالاکنڈ ایجنسی۔ انجینئر عمر شہزاد ضلع ہنگو۔ اے بی فرام حلہ گنگ۔ رانا حبیب الرحمٰن، لاہور۔ تصویر العین، اوکاڑہ۔ ریاراج، لاہور۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ، خانیوال۔ احتشام رضا، سرگودھا۔ حسنین عباس بلوچ، سرگودھا۔ محمد نعمان پیارے، تلمبہ، دلنشین بلوچ، نیکسلا۔ محمد سلیم شلی، ملتان۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



# ایک تھا راجا

ایچ اقبال

محبت ایک سچا جذبہ ہے ... جو خلوص اور پسند کی فصل سے آبیاری حاصل کرتا ہے ... لیکن جنون کا نام خردرکھ دینے والے انا پرستی ... خود غرضی اور حرص و ہوس کو یہ نام دے کر ارد گرد کے لوگوں کو بھی فریب دیتے ہیں ... بھول جاتے ہیں کہ جو مقدر میں لکھ دیا گیا، وہ ضرور حاصل ہوگا ... جو تقدیر میں نہیں ہے ... وہ کسی طور ہاتھ نہیں آئے گا ... قدرت کا یہ اٹل اصول ہر راجا اور رجواڑے پر لاگو ہوتا ہے ... جو اس رمز کو پالیتا ہے ... وہ زندگی میں کامران اور خوش رہتا ہے ... ورنہ پورا جیون روتے ... سلگتے ... حسرتوں پر ماتم کرتے گزرتا ہے ... چند ایسے ہی کرداروں کی نادانیوں اور بھول بھلیوں کی تصویر کشی ...

**چاہتوں اور نفرتوں کی دھندلائی راہوں سے گزرتی ایک بے مثال کہانی**

ایک فائر ہوا۔

زیبا بُری طرح گھبرا گئی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی چیز اس کے قریب کی کھڑکی کے شیشے سے رگڑتی ہوئی گزری تھی۔ فائر کیونکہ اسی وقت ہوا تھا، اس لیے زیبا کے دماغ میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ جو چیز اس کی کار کے شیشے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری تھی، وہ گولی ہی ہوگی۔

وہ ایک رہائشی علاقہ تھا۔ سڑک کی دونوں جانب بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ فٹ پاتھ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے درخت لگے ہوئے تھے۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت وہاں گاڑیوں کی آمد و رفت بہت کم رہتی تھی۔ کبھی آدھا ایک منٹ ایسا بھی گزرتا تھا جب دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آتی تھی۔

جہاں اس وقت فائر ہوا، وہاں سے صرف زیبا کی کار گزر رہی تھی۔

بے اختیار ایکسلریٹر پر زیبا کے پیر کا دباؤ بڑھا۔ کار کی رفتار یک لخت تیز ہوئی۔ اس وقت پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا شوفر گل محمد بھی گھبرا گیا۔ اس کا منہ کھلا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کی آواز نکلنے سے پہلے ایک اور فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کار کا اگلا دایاں ٹائر برسٹ ہوا۔ ٹائر پھٹنے کی آواز فائر کی آواز سے مختلف تھی اس لیے ذہن میں یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ تیسری گولی بھی چلی تھی۔

زیبا نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ دائیں جانب قدرے جھک گئی اور ساتھ ہی اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا اسٹیئرنگ بھی اس کے قابو سے باہر ہونے لگا۔

اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی زیبا کو خاصی زیادہ طاقت استعمال کرنا پڑی ورنہ کار فوراً ہی کسی بنگلے کی دیوار یا فٹ پاتھ پر لگے ہوئے کسی درخت سے جا ٹکراتی۔

"روکیے گا نہیں بی بی صاب!" گل محمد چیخا۔ چیخنے کے باوجود اس کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

خوف کا سبب ان دو فائروں کے علاوہ حالات بھی تھے۔ شہر میں کافی عرصے سے دہشت گردی جاری تھی۔ ہفتہ پندرہ دن یا ایک مہینا قدرے سکون سے گزر پاتا تھا کہ پھر ٹارگٹ کلنگ شروع ہو جاتی تھی۔

زیبا کو ان حالات کا علم ٹی وی چینلز یا اخبارات سے ہوتا رہتا تھا۔ وہ صرف تین دن پہلے لندن سے کراچی آئی تھی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کراچی پہنچنے کے چوتھے ہی دن اس قسم کے واقعے سے دوچار ہو جائے گی۔

کسی جانب سے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی جو بہت تیزی سے قریب آرہی تھی۔

زیبا بمشکل ہی کار کو قابو میں رکھتے ہوئے اس کی رفتار کم کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ گل محمد کے مشورے کے مطابق اس نے کار روکی نہیں لیکن ٹائر پھٹنے ..... کی وجہ سے کار کی رفتار برائے نام ہی رہ گئی۔ اس سے زیادہ رفتار کی صورت میں اسٹیئرنگ .... کو قابو میں رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پولیس۔" گل محمد کے منہ سے نکلا۔ اس وقت بھی اس کی آواز میں لرزش تھی۔

اس وقت دوسرا فائر ہوئے دو منٹ گزر چکے تھے۔ تیسرا فائر نہیں کیا گیا تھا۔ شاید فائر کرنے والے کو احساس ہو گیا ہو کہ زیبا کی کار اب اس کے ہتھیار کی رینج سے باہر نکل چکی تھی۔

پولیس موبائل تیزی سے قریب آتی چلی گئی۔ اس وقت سامنے سے بھی دو کاریں آتی دکھائی دی تھیں۔ ان کاروں میں بیٹھے ہوئے لوگ شاید اسی علاقے میں رہتے تھے یا وہاں کسی سے ملنے آرہے تھے۔ پولیس موبائل کے سائرن اور پولیس موبائل کی تیز رفتاری دیکھ کر وہ یقیناً گھبرا گئے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی گاڑیوں کی رفتار بے حد سست کر دی۔

پولیس موبائل زیبا کی کار کے برابر آ گئی۔

"رک جائیں۔" موبائل میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد زیبا علاقے کے پولیس اسٹیشن میں تھی۔ وہ جس صورتِ حال سے دوچار ہوئی تھی، اس نے موقع پر ہی پولیس کو آگاہ کر دیا تھا لیکن پولیس اسٹیشن میں اس کا بیان باقاعدہ ریکارڈ کیا گیا... ایک پولیس آفیسر نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔

"آپ کی ایف آئی آر تو درج کی جا چکی ہے۔" پولیس آفیسر نے تمہید کے طور پر کہا۔ "لیکن معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ میں آپ سے کچھ سوالات کروں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، وہ ٹارگٹ کلنگ ہی کا ایک حصہ ہو۔ ہمیں اس امکان پر بھی نظر رکھنا ہوگی کہ شاید کسی نے ذاتی دشمنی کی وجہ سے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی ہو لیکن آپ کی خوش قسمتی سے وہ صحیح نشانہ نہ لگا سکا ہو۔"

"یہاں میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ میرے گزشتہ چار سال تو انگلینڈ میں گزرے ہیں۔ میں تین روز پہلے وہاں سے آئی ہوں۔ تین سال قبل صرف تین دن کے لیے آئی تھی۔"

"اس سے پہلے آپ مستقل یہیں تھیں؟"

"جی۔"

"انگلینڈ میں چار سال کیوں گزارے؟"

"تعلیم حاصل کر رہی تھی۔"

"آپ نے ابھی تک اپنے کسی سرپرست یا کسی کو بھی اس صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا حالانکہ موبائل فون آپ کے ہاتھ میں ہے؟"

"یہاں اب میرا کوئی نہیں ہے۔" زیبا نے کچھ افسردگی سے کہا۔ "میری والدہ کا انتقال تو اس وقت ہو گیا تھا جب میں سال بھر کی تھی۔ جب آٹھ دس سال کی ہوئی تو والد بھی چل بسے۔ اس کے بعد میری پرورش میرے چچا رانا سکندر نے کی۔ انہوں نے مجھے ماں باپ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بے اولاد تھے۔"

زیبا پولیس آفیسر کی طرف دیکھے بغیر، کھوئے کھوئے سے انداز میں بولتی ہی چلی جا رہی تھی کہ پولیس آفیسر پوچھ بیٹھا۔

"تھے؟... کیا مطلب؟"

"تین سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" زیبا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میرا شوق دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے انگلینڈ بھیجا تھا۔ میرے جانے کے بعد ہی وہ ایک موذی مرض میں مبتلا ہو گئے مگر انہوں نے مجھے اطلاع نہیں دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں حصولِ تعلیم کے دوران میں ذہنی انتشار کا شکار ہو جاؤں۔ لیکن سال بھر بعد جب ڈاکٹروں ہی نے کہہ دیا کہ اب..." زیبا کی آواز بھرا گئی۔ الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آ گئی۔

پولیس آفیسر نے فوراً اس کے لیے پانی منگوایا۔ زیبا نے چند گھونٹ لیے۔ اس نے اپنی جذباتیت پر جلد ہی قابو پا لیا اور بولی۔ "جب ڈاکٹروں ہی نے جواب دے دیا تو انہوں نے مجھے اطلاع دی۔ میں دوسرے ہی دن کراچی آ گئی۔"

"یعنی تین سال پہلے؟"

"جی۔" زیبا نے جواب دیا۔ "اور میں بروقت پہنچ گئی تھی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میری آمد کے صرف ایک گھنٹے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔" زیبا کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ اس نے فوراً میز سے گلاس اٹھا کر پانی کے دو گھونٹ لیے۔ اس کے بعد بولی۔ "وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بات کرنا بھی ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ایک وکیل کا کارڈ دیا اور اس سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے سب سے پہلے ایڈووکیٹ بختیاری ہی کو فون پر اطلاع دی۔ بختیاری صاحب فوراً آ گئے۔ میں تو غم سے بے حد نڈھال تھی۔ انکل کی تدفین انہوں نے اور بابا مینائی نے کروائی تھی۔"

پولیس آفیسر فوراً پوچھ بیٹھا۔ "یہ بابا مینائی کون ہیں؟"

"وہ انکل کے بہت پرانے ملازم ہیں۔ زمینوں کے معاملات کی دیکھ بھال انکل نے انہی کے سپرد کر رکھی تھی۔"

"آپ کے انکل جاگیردار تھے؟"

"جی ہاں۔ پنجاب میں ان کی خاصی زمین ہے۔ وہیں





ہمارے اجداد کی ایک حویلی بھی ہے۔ میں بچپن میں دو ایک بار وہاں گئی ہوں۔ دراصل میرے والد اور انکل نے کیونکہ کراچی ہی میں تعلیم حاصل کی تھی اور شادیاں بھی یہیں کی تھیں، اس لیے انہیں اس شہر سے بہت زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد دونوں بھائی یہیں آ بسے تھے۔ اگرچہ یہاں ان دونوں کے الگ الگ گھر تھے لیکن دونوں بھائیوں میں بے انتہا محبت تھی۔ وہ..."

پولیس آفیسر نے اس کی بات کاٹی۔ "زمینیں آپ کے والد کے پاس نہیں تھیں؟"

"یہ کیسے ممکن ہے آفیسر کہ ایک بھائی جاگیردار ہو اور دوسرا نہ ہو۔" زیبا نے جواب دیا۔ "دادا کے بعد ان کی ساری جاگیر دونوں بھائیوں کے حصے میں آئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد میں ہی ان کی زمینوں کی مالک ہوں لیکن دونوں بھائیوں نے ابتدا ہی میں یہ وصیتیں کر دی تھیں کہ جب بھی ان میں سے کوئی دنیا سے سدھار جائے اور اگر اس کی اولاد بالغ نہ ہو تو اس کی بلوغت تک دوسرا بھائی ہی ان زمینوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ میں کیونکہ اپنے والد کی وفات کے وقت بالغ نہیں تھی اور انکل نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا، اس لیے میری زمینوں کے معاملات بھی انہوں نے ہی سنبھال لیے تھے۔"

"گویا ان زمینوں کے معاملات بھی آپ کے انکل نے بابا مینائی کے سپرد کر دیے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔" زیبا نے جواب دیا۔ "انکل نے ایڈووکیٹ بختیاری سے جو وصیت تیار کروائی تھی، اس میں یہ بات بھی بہت واضح ہے کہ بابا مینائی نہایت شریف، ایمان دار اور ذمے دار آدمی ہیں۔ انکل نے اپنا سب کچھ میرے نام کر دیا تھا لیکن میرے لیے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ میں اپنی تعلیم مکمل ہونے تک اپنا دھیان صرف تعلیم پر رکھوں۔ زمینوں کے معاملات بابا مینائی ہی دیکھتے رہیں گے۔ البتہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اگر میں سمجھوں کہ ان معاملات کو میں اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہوں تو پھر جیسا چاہوں کروں... لیکن بابا مینائی اور گھر کے دیگر ملازمین کو الگ نہ کروں کیونکہ انہوں نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔"

زیبا نے خاموش ہو کر میز سے گلاس اٹھایا جو آدھا ہی خالی ہوا تھا۔ زیبا اس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی متفسرانہ نگاہوں سے پولیس آفیسر کی طرف دیکھنے لگی۔

"تین دن ہو چکے ہیں آپ کو کراچی آئے۔" پولیس آفیسر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے بابا مینائی کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کیا ہے؟"

"میں نے انہیں ان کی ذمے داریوں سے سبکدوش نہیں کیا۔" زیبا نے جواب دیا پھر غور سے پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا آپ یہ شبہ کر رہے ہیں کہ وہ مجھے قتل کرانا چاہتے ہوں گے؟ اگر آپ کی یہ سوچ ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ قطعی بے بنیاد ہے۔ وہ مجھے ختم کرا کے ان زمینوں کے مالک تو نہیں بن سکتے۔"

پولیس آفیسر نے زیبا کی باتوں پر دھیان دیے بغیر پوچھا۔ "رانا سکندر کو بابا مینائی پر مکمل بھروسا کیوں تھا؟"

"انہوں نے جب بھی حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی، انہیں کبھی کہیں ایک آدھ روپے کا فرق بھی نظر نہیں آیا۔"

"گزشتہ تین برسوں میں تو حساب کتاب چیک نہیں کیا گیا ہوگا؟"

"ظاہر ہے۔" زیبا نے جواب دیا۔ "جب انکل کو بابا مینائی پر اتنا اعتماد تھا تو میں حساب کتاب دیکھنے کے لیے اپنی تعلیم چھوڑ کر یہاں کیوں آتی؟"

"اب آپ یہاں آئی ہیں، تب تو آپ نے کچھ دیکھا ہوگا؟"

"جی ہاں، دیکھ چکی ہوں۔ اب بھی مجھے کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی۔"

پولیس آفیسر کچھ سوچنے لگا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے کی ہر زاویے سے جانچ پڑتال کرنا چاہتا ہے۔

"آپ کے والد اور چچا کا کوئی اور کاروبار نہیں تھا؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ دونوں ہی بھائیوں کا مزاج کاروباری نہیں تھا۔ وقت گزاری بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ دوست احباب کافی تھے۔ دونوں ہی بھائیوں کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وہ خود تو ادیب یا شاعر نہیں تھے لیکن ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی اپنے گھر میں بھی ادبی نشستیں کر لیا کرتے تھے۔ ٹینس کا شوق دونوں بھائیوں کو تھا۔"

"آپ کے انکل کی بیگم؟"

"وہ شادی کے تین سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ شادی محبت کی تھی۔ انکل نے ان کے بعد کسی دوسری عورت کو ان کی جگہ لانا گوارا نہیں کیا۔"

زیبا جواب تو دیے جا رہی تھی لیکن اب اس کے انداز سے اکتاہٹ کا اظہار ہونے لگا تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ جواب دیتی رہی۔ پولیس آفیسر کے استفسار پر اس نے اپنے والد اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چچا کے دوستوں کے نام بھی لکھوا دیے... یہ بھی بتا دیا کہ ایڈووکیٹ بختیاری ان دنوں کراچی میں نہیں تھا، کسی مقدمے کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی دو ایک دن میں متوقع تھی۔

پولیس آفیسر بولا۔ ”آپ کی باتوں سے ظاہر ہوا ہے کہ مینائی بابا آپ کے ملازم سہی مگر ان کی کچھ اہمیت ہے... پھر بھی آپ نے انہیں بھی اس واقعے کی اطلاع نہیں دی؟“

”میں ایک خود اعتماد لڑکی ہوں آفیسر!“ اس مرتبہ زیبا کا لہجہ کچھ کمزور ہو گیا۔ ”ہر قسم کے حالات کا سامنا میں تن تنہا کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی وجہ سے کسی دوسرے کو پریشان کرنا میری فطرت نہیں۔“

اسی وقت میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پولیس آفیسر نے ریسیور اٹھایا۔ دھیمی آواز میں کسی سے کچھ بات چیت کی پھر ریسیور رکھ کر زیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جب آپ کی کار پر گولیاں چلیں، اس وقت آپ کہاں جا رہی تھیں؟“

زیبا کو اندازہ تھا کہ پولیس اسٹیشن میں کسی جگہ اس کے شوفر گل محمد سے بھی پوچھ گچھ کی جا رہی ہوگی۔ اس نے کچھ بتایا ہوگا۔ اسی بارے میں ٹیلی فون پر اس پولیس آفیسر کو کچھ بتایا گیا ہوگا جو اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

”میں ائرپورٹ جا رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”کار آپ خود کیوں ڈرائیو کر رہی تھیں جبکہ شوفر موجود تھا؟“

”مجھے خود ڈرائیونگ کرنا پسند ہے۔“ زیبا نے جواب دیا۔ ”شوفر کو اپنے ساتھ اس لیے رکھا تھا کہ وہ ائرپورٹ سے کار واپس لے آئے۔ مجھے ایک فلائٹ سے لاہور جانا تھا۔“

پولیس آفیسر نے اس طرح سر ہلایا جیسے جواب اس کے لیے متوقع ہو۔ وہ بولا۔ ”آپ بتا چکی ہیں کہ آپ کی زمینیں پنجاب میں ہیں۔ کیا لاہور کے گرد و نواح میں ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”آپ زمینوں پر ہی جا رہی تھیں؟“

”جی۔“ زیبا نے جواب دیا۔ ”میں نے ابھی شاید بتایا تھا کہ وہاں ہمارے اجداد کی حویلی ہے۔ وہ بہت عرصے سے خالی پڑی ہے۔ میں جا کے دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کس حال میں ہے۔“

پولیس آفیسر نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اب تو آپ کی فلائٹ کا وقت گزر چکا ہوگا۔“

”جی ہاں۔ اب رات کی کوئی فلائٹ دیکھوں گی۔“

”بہتر ہوگا کہ آپ دو تین روز تک اپنی شہر میں رہیں۔ مزید بہتری اس میں ہے کہ خود کو اپنے گھر تک محدود رکھیں۔“

”کیوں؟“ زیبا نے تعجب سے پوچھا۔

”ممکن ہے کہ آپ کی زندگی خطرے میں ہو۔ کوئی آپ کو ہلاک کرنا یا کروانا چاہتا ہو۔“

ذرا دیر پہلے زیبا سوچ چکی تھی اور اس نے پولیس آفیسر سے بھی کہا تھا کہ یہ ٹارگٹ کلنگ کے سلسلے کا کوئی واقعہ ہو سکتا ہے لیکن اب اسے کوئی اور خیال آیا۔

”دو تین دن سے کیا فرق پڑے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہمیں تحقیقات سے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا پس منظر کیا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اندازہ ہوا کہ یہ ٹارگٹ کلنگ دہشت گردی کے سلسلے کا کوئی واقعہ تھا اور ٹارگٹ کلر کامیاب نہیں ہو سکا تو پھر آپ کی زندگی کے سلسلے میں فکرمندی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ ٹارگٹ کلر کا مقصد محض دہشت گردی ہو تو وہ بار بار کسی ایک ہی کو نشانہ نہیں بناتے۔ لیکن دوسری صورت میں یعنی اگر کوئی آپ کا دشمن ہے تو عین ممکن ہے کہ آپ کو ختم کرنے کی دوسری کوشش بھی کی جائے... اور یہ ہمارا فرض ہے کہ اگر آپ کی زندگی خطرے میں ہے تو ہم آپ کو محفوظ رکھنے کی حتی الوسع کوشش کریں۔ یہاں سے آپ اپنے گھر بھی ایک پولیس موبائل میں جائیں گی اور اس کے ساتھ ایک موبائل اور بھیجی جائے گی جو آپ کے گھر کے سامنے موجود رہے گی۔“

زیبا کچھ پریشان ہوئی لیکن اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا اور بولی۔ ”مجھے اپنے گھر تک محدود رہنے میں تو مشکل ہوگی۔“

”آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ آپ یہ مشکل برداشت کر لیں۔“

پولیس آفیسر خاموش ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پولیس آفیسر نے ریسیور اٹھایا۔ مختصر بات کے بعد اس نے ریسیور رکھا۔ اس کے چہرے سے فکرمندی ظاہر ہوئی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے زیبا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ٹی وی چینلز اور اخبار کے لوگ تو جیسے بو سونگھ لیتے ہیں۔ باہر جمع ہو گئے ہیں اور انتظار میں ہیں کہ آپ باہر نکلیں۔“

”مجھے تو بہت الجھن ہوگی۔“ زیبا نے جلدی سے کہا۔

”میں خود بھی نہیں چاہتا کہ اس وقت آپ ٹی وی چینلز پر نظر آئیں۔ میں آپ کو پچھلے دروازے سے نکلوا دوں گا۔ ان لوگوں کو اس کا خیال نہیں ہوگا کہ آپ دوسری طرف سے نکل





جائیں گی۔ اور ہاں، آپ کی گاڑی ہمارے پاس رہے گی، کل تک واپس کر دی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“

پولیس آفیسر نے ریسیور اٹھایا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد زیبا اپنے گھر پر تھی۔ شوفر گل محمد بھی اس کے ساتھ پولیس موبائل میں آیا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے مینائی بابا نے ان دونوں کو پولیس موبائل سے اترتے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

”اندر چلیں۔“ زیبا اس سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

گل محمد باہر ہی رک گیا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر زیبا نے اسے بتایا کہ کیا واقعہ ہوا تھا۔

”ٹارگٹ کلنگ!“ مینائی بابا کے منہ سے نکلا۔

”ابتدا میں مجھے بھی یہی خیال تھا۔ پولیس اسٹیشن میں مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ حرکت راجا بھینو کی بھی ہو سکتی ہے۔“

مینائی بابا نے جلدی سے پوچھا۔ ”آپ نے پولیس کو بتایا اس کے بارے میں؟“

”نہیں مینائی بابا! میں کوئی خاص منصوبہ بنائے بغیر آپ کی بیٹی کی زندگی خطرے میں کیسے ڈال سکتی ہوں۔“

مینائی بابا کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا شبہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔ شاید اسے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ زمینوں پر پہنچ رہی ہیں۔“

”میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ گل محمد بھی صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ میں کہیں باہر جا رہی تھی۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ میری نگرانی کی گئی ہو۔ ٹکٹ کروانے تو میں خود ہی گئی تھی۔“

”لیکن راجا بھینو کو آخر دھڑکا کس بات کا ہوا ہوگا؟“ بابا مینائی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”آج بھی جب اس نے فون پر مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے یہی جواب دیا تھا کہ آپ نے ابھی تک حساب کتاب نہیں دیکھا۔“

زیبا نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، آپ نے مجھے بتایا تھا۔“

اس بات کے بعد چند لمحے گزر گئے۔ زیبا کچھ سوچتی رہی۔ جب وہ خاموش ہی رہی تو بابا مینائی بھی مزید کوئی بات کیے بغیر، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ زیبا بدستور خیالات میں ڈوبی رہی۔

انگلینڈ سے آنے کے بعد اس نے چوبیس گھنٹے تو گھر ہی میں گزارے تھے۔ گزشتہ شام اس نے اپنی پرانی شناسا لڑکیوں اور اپنے نوعمری کے دوست شکیل سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس نے ان میں سے کسی کو بھی اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی جس کا کوئی سبب بہرحال نہیں تھا۔ جب وہ گھر سے روانگی کے لیے تیار ہو چکی تھی تو اس کی توقع کے خلاف بابا مینائی اس سے سوال کر بیٹھے تھے۔

”زمینوں کا حساب کب دیکھے گا آپ؟“

”دیکھا جائے گا مینائی بابا۔“ زیبا نے ہنس کر کہا تھا۔

”ٹھیک ہی تو نہیں ہے۔“ مینائی بابا نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

زیبا اس جواب سے خاصی چونک گئی۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

جواب میں مینائی بابا نے جو واقعات بتائے، وہ زیبا کے لیے غیر متوقع تو تھے ہی لیکن سنسنی خیز بھی تھے۔ اس نے اس واقعے سے متعلق وہ ویڈیوز بھی دیکھیں جو بابا مینائی کو کسی نے کوریئر سروس سے بھیجی تھیں۔

ان حالات نے زیبا کو یکایک یہ احساس بڑی شدت سے دلایا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو باور کرا سکی کہ اب اسے خود اعتماد ہو جانا چاہیے۔ پہاڑ سی زندگی وہ خود اعتمادی کے بغیر نہیں گزار سکتی تھی۔

اپنے آپ کو خود اعتماد بنانے کے لیے اس نے دو اہم فیصلے کیے۔ ایک یہ کہ تن تنہا اپنی زمینوں پر جا کے وہاں کے حالات کا جائزہ لے اور دوسرے اس نے انگلینڈ فون کر کے زین سے بھی اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا۔

زین سے وہ انگلینڈ میں ملی تھی۔ وہ کوئی کورس کرنے کے لیے انگلینڈ میں تھا۔ صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں زیبا اور وہ ایک دوسرے کو اس حد تک پسند کرنے لگے تھے کہ وہ پسندیدگی قریب قریب ”محبت“ کے دائرے میں داخل ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے شادی کے عہد و پیماں تو نہیں کیے تھے لیکن دونوں کے تیور کچھ ایسے ہی تھے۔ زین کو پسند کرنے کے باوجود زیبا اس سے شادی کرنے کا فیصلہ مزید سوچ بچار کے بعد کرنا چاہتی تھی۔

زین بھی کراچی ہی سے انگلینڈ گیا تھا۔ اس کی واپسی کچھ دن بعد ہونا تھی۔ زیبا اس سے پہلے کراچی اس لیے آئی تھی کہ وہ زین کی آمد سے پہلے ہی اس کے گھر والوں اور اس کے حسب نسب کے بارے میں اپنے طور پر تھوڑی بہت چھان بین کر لے لیکن اسے اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مینائی بابا کی سنائی ہوئی داستان نے اسے دوسرے ہی دن ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی دوستوں اور اپنے واحد مرد دوست شکیل کو بھی اس نے ابھی تک اپنی واپسی سے باخبر نہیں کیا تھا۔

جب وہ نوعمری میں انگلینڈ گئی تھی، اس وقت شکیل بیس سال کا تھا۔ اس کے والد شامی صاحب زیبا کے والد کے بہت قریبی دوست تھے۔ شکیل سے زیبا کی دوستی بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں جا لیٹی، تب بھی اس کا دماغ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے ایک الجھن یہ بھی لاحق تھی کہ اس کے گھر پر پولیس کا پہرا لگ گیا ہے۔ پولیس آفیسر نے اس سے یہ بات بھی کہی تھی کہ وہ دو تین روز تک اپنے گھر سے نہ نکلے۔ اس دورانیے میں تحقیقات سے اندازہ ہو جاتا کہ اس پر جو گولیاں برسی تھیں، وہ کسی ٹارگٹ کلر نے چلائی تھیں یا کسی نے اسے ہلاک کرنا چاہا تھا۔

اگر وہ سب کچھ واقعی اسے ہلاک کرنے کے لیے ہوا تھا تو اس کی کوشش صرف راجا بھنیو ہی کی طرف سے کی جا سکتی تھی۔

اس سلسلے میں زیبا کے لیے ایک الجھا ہوا سوال یہ تھا کہ اسے ہلاک کرنے سے راجا بھنیو کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کی ہلاکت کے باعث پولیس حرکت میں آجاتی اور وہ سب کچھ آشکارا ہو جاتا جو راجا بھنیو چھپانا چاہتا تھا۔

بابا مینائی کے بیان کے مطابق راجا بھنیو کو انہوں نے یہی بتایا تھا کہ زیبا ابھی تک ان حالات سے بے خبر تھی اور اس نے خود بھی زمین کے حسابات چیک نہیں کیے تھے۔

لیکن بہرحال، وہ ان زمینوں کی مالک تھی جن سے کئی کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت خود سارے حسابات دیکھنا چاہتی تو بابا مینائی اسے روک نہیں سکتے تھے۔

اس سارے معاملے میں اس قسم کی دو ایک الجھنیں اور بھی تھیں جو زیبا کو دماغی طور پر انتشار میں مبتلا کیے ہوئے تھیں۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے زیبا کو خیالات کے اس بھنور سے نکالا۔

''کون؟'' اس نے چونک کر بلند آواز سے پوچھا۔

''میں ہوں بی بی صاحبہ!'' باہر سے مینائی بابا کی آواز آئی۔ ''شکیل صاحب آئے ہیں آپ سے ملنے۔''

''شکیل؟'' زیبا حیرت سے کہتی ہوئی بستر سے اٹھی۔

''جی۔'' مینائی بابا کی آواز آئی۔ ''شامی صاحب کے بیٹے۔''

زیبا کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے اس وقت تک بھی شکیل یا اپنی دوسری دوستوں کو اپنی آمد سے باخبر نہیں کیا تھا۔

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اتفاق سے اس نے ابھی تک شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا۔

''کہاں ہے؟'' زیبا نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔

''ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔'' مینائی بابا نے جواب دیا۔

''اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ میں آگئی ہوں؟'' زیبا بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلی اور پھر چونک کر اس نے مینائی بابا سے پوچھا۔ ''پولیس نے اسے روکا نہیں؟''

''روکا تھا۔'' مینائی بابا نے جواب دیا۔ ''انہوں نے کسی طرح پولیس والوں کو مطمئن کر دیا ہوگا پھر بھی پولیس والوں نے مجھے بلا کر ان کی شناخت کرائی تھی۔''

زیبا سر ہلا کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ مینائی بابا اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولے۔ ''چائے وغیرہ منگواؤں؟''

''ہاں۔'' زیبا نے جواب دیا اور پھر چلتے چلتے غور سے مینائی بابا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت آپ پہلے سے بھی زیادہ پریشان نظر آرہے ہیں۔''

''جی... وہ...'' مینائی بابا کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ ''شکیل صاحب آئے ہیں نا۔''

''اوہ۔'' زیبا کے منہ سے نکلا پھر اس نے کہا۔ ''جب میں آپ سے وعدہ کر چکی ہوں تو اب آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے... جب تک میں کوئی منصوبہ بندی کر کے خود مطمئن نہیں ہو جاؤں اور آپ سے مشورہ نہ کر لوں، کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی... شکیل تو کیا، کسی کو بھی نہیں۔ میں کیسے چاہ سکتی ہوں مینائی بابا کہ آپ کی بیٹی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔''

''شکر یہ بی بی صاحبہ!'' مینائی بابا کی آواز بھرا گئی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ آگیا تھا۔ مینائی بابا وہیں رک گیا اور زیبا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

شکیل صوفے پر بیٹھا ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا جو اس نے سینٹر ٹیبل سے اٹھایا ہوگا۔ زیبا کی آہٹ سنتے ہی اس نے نظر اٹھا کر زیبا کی طرف دیکھا اور پھر رسالہ ایک طرف ڈالتے ہوئے جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''واؤ۔'' زیبا مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ ''ان تین برسوں میں تو تم خاصے بھرپور نظر آنے لگے ہو۔''





زیبا نے اسے تین برس پہلے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب اس کے چچا کی وفات ہوئی تھی۔

شکیل نے ہنس کر اس کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی تو نہایت بھرپور ہو گئی ہو زیب۔''

اس بات پر زیبا بالکل نہیں شرمائی۔ وہ گزشتہ کئی برس مغرب میں گزار کر آئی تھی جہاں اس قسم کی باتوں کو اس انداز میں محسوس نہیں کیا جاتا جس طرح مشرق میں محسوس کیا جاتا ہے۔

''بیٹھو، بیٹھو۔'' وہ شکیل کے قریب جاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں حیران ہوں۔ تمہیں علم کیسے ہوا کہ میں انگلینڈ سے آگئی ہوں؟ کل میرا ارادہ تو ہوا تھا کہ تمہاری طرف آؤں گی لیکن ایک الجھن میں پڑ کے گھر سے نکل ہی نہیں سکی۔''

''ایک فون تو کر دیا ہوتا کہ آگئی ہو۔''

''فون نہیں کیا، پھر بھی تمہیں معلوم ہو گیا؟'' زیبا ہنسی۔

شکیل نے جواب دینے کے بجائے شکایتی انداز میں کہا۔ ''تمہیں کم از کم ان حالات میں تو مجھے فون کرنا ہی چاہیے تھا۔''

زیبا چونکی۔ ''کن حالات میں؟''

''کیا کل تمہاری گاڑی پر گولیاں نہیں برسیں؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' زیبا نے تیزی سے پوچھا۔

''اسے اتفاق کہہ لو۔ میں کچھ دیر پہلے اپنی کار میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ یہاں میں نے موبائل کھڑی دیکھی تو چونک گیا۔ کار کھڑی کر کے میں پولیس والوں کے پاس پہنچا۔ انہوں نے مجھے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ وہ وہاں کیوں ہیں۔ میں نے انہیں بتایا بھی کہ یہ میرے والد کے ایک مرحوم دوست کا گھر ہے لیکن انہوں نے سخت انداز اختیار کیا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں ان سے زیادہ حجت کیے بغیر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ تمہیں فون اس لیے نہیں کیا کہ تم سے اچانک ملاقات کر کے تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے ادھر کا رخ کرنے سے پہلے بھی فون نہیں کیا تھا۔ میں نے موبائل فون پر اس علاقے کے ایس ایچ او سے رابطہ کیا۔ دراصل یہ مجھے معلوم تھا کہ یہاں کھڑی ہوئی موبائل اسی علاقے کی ہے۔ ایس ایچ او میرا بہت پرانا دوست ہے۔ میں نے اس سے اس بارے میں استفسار کیا اور اس گھر سے اپنے تعلق کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے اس شرط پر ساری تفصیل بتائی کہ میں میڈیا کے کسی فرد سے بھی اس کا ذکر نہیں کروں گا۔'' شکیل نے وضاحت سے جواب دیا پھر کہا۔ ''ایس ایچ او میری اس حوالے پر قدغن نہیں لگا سکتا تھا لہٰذا میں اس سے بات کرنے کے بعد پھر پولیس والوں کے پاس پہنچا۔ مجھے دوبارہ دیکھ کر ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے لیکن جب میں نے ایس ایچ او کا حوالہ دیا تو انہوں نے وائرلیس پر اپنے افسر سے بات کی۔ ایس ایچ او نے ان سے غالباً رسمی طور پر کہہ دیا ہوگا کہ گھر کے کسی فرد سے میری شناخت کروا کے مجھے اندر جانے دیا جائے لہٰذا مینائی بابا سے میری شناخت کروائی گئی اور پھر مجھے اندر آنے دیا گیا۔''

زیبا نے سب کچھ خاموشی سے سنا۔

''ہاں شکیل!'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''میں خاصی الجھن میں پڑ گئی ہوں۔''

''اس کے باوجود مجھے فون نہیں کیا؟'' شکیل نے پھر شکایت کی۔

''دراصل مزاج ہی کچھ ایسا ہے میرا۔'' زیبا نے جواب دیا۔ ''اپنی وجہ سے میں کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔''

''دوستوں کو بھی نہیں؟'' اس مرتبہ شکیل کے لہجے میں خفگی تھی۔

زیبا دھیرے سے ہنسی۔ ''اچھا اب جھگڑا نہ شروع کرو۔ معلوم تو ہو گیا نا تمہیں... اور غالباً اچھا ہوا۔ میں خود کو دماغی طور پر کچھ ہلکا محسوس کرنے لگی ہوں۔''

''یہ کچھ غلط نہیں کہا جاتا کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔''

''اور سناؤ، یہاں کے حالات اتنے خراب کیوں ہو گئے ہیں؟ یہ ٹارگٹ کلنگ...''

''ان باتوں کو فی الحال جہنم میں ڈالو۔ یہ بتاؤ کہ... میرا مطلب ہے، بس اپنی بات کرو۔''

''اپنی بات کیا کروں؟ تمہیں معلوم تو ہو گیا سب کچھ۔''

زیبا، شکیل کو بھی اپنے اصل مسئلے سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

شکیل بولا۔ ''یہ تو نہیں معلوم ہوا کہ تم پر گولیاں کیوں برسی تھیں؟''

''دہشت گردی ہی کا معاملہ ہوگا۔ یہاں میرا کوئی دشمن تو ہو نہیں سکتا۔ بس تمہارے دوست ایس ایچ او صاحب نے مجھے گھر میں قید رہنے پر مجبور کر دیا ہے اور یہاں پر پہرا بھی بٹھا دیا ہے۔''

اسی وقت ایک ملازم چائے لے کر آگیا۔

ملازم کے واپس جانے کے بعد شکیل نے کہا۔ ''فرض کر لو، اگر آج تم پر سے پابندیاں ہٹا لی گئیں تو تم کیا کرو گی؟ ایس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایچ او نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تم پر اس وقت گولیاں برسائی گئی تھیں جب تم لاہور جانے کے لیے ائرپورٹ کے راستے کی طرف جارہی تھیں۔"

"ہاں۔" زیبا نے جواب دیا۔ "میں اپنی زمینوں پر جانا چاہتی ہوں۔ پابندیاں ہٹ گئیں تو میں لاہور ہی جاؤں گی۔"

"میں بھی چلا چلوں گا تمہارے ساتھ۔" شکیل نے کہا۔

زیبا اپنی زمینوں پر اکیلی ہی جانا چاہتی تھی لیکن یہ وہ شکیل سے نہیں کہہ سکی۔

"چلنا۔" اسے رسماً کہنا پڑا۔

شکیل بولا۔ "ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ تمہاری وہ حویلی کیسی ہے۔"

پھر چائے پینے کے دوران میں شکیل نے اس موضوع پر بات چھیڑ دی کہ لندن میں زیبا کا وقت کس طرح گزرا... یہ باتیں ہوئیں تو زیبا نے اپنے دوست زین کا ذکر بھی کیا۔

"وہ چند دن میں کسی وقت بھی آسکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیسے ہیں وہ حضرت؟" شکیل نے بہت گہری نظر سے زیبا کی طرف دیکھا۔

زیبا ہنس پڑی۔ "تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے لیکن میں اسے پسند کرتی ہوں۔"

"کس حد تک پسند کرتی ہو... اور کیوں؟ کوئی خاص بات ہے اس میں؟"

زیبا پھر ہنس دی۔ "اتنے متجسس کیوں ہو رہے ہو اس کے بارے میں؟"

"تمہاری پسندیدگی کے باعث تجسس تو ہوگا۔" شکیل مسکرایا۔

"اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جس کی میں نشاندہی کرسکوں لیکن وہ مجھے بس اچھا لگا۔"

"کس حد تک؟" شکیل نے زور دے کر پوچھا۔ "میرا پہلا سوال تو یہی تھا۔"

"میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔" زیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "دراصل میں اور زین ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

یک لخت شکیل کا چہرہ کچھ عجیب سا ہوگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے اوپر قابو بھی پالیا۔ اس وقت زیبا کی نظر چند لمحے کے لیے کسی اور جانب ہوگئی اس لیے وہ شکیل کا "اچانک تاثر" نہیں دیکھ سکی اور اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"زین نے بھی اظہار تو نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے شادی کا شدید خواہش مند ہے۔ ممکن ہے، یہاں آنے کے بعد وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرے۔"

شکیل اندرونی طور پر خاصا بے چین ہوگیا۔ وہ بولا۔ "جب تم بھی اس سے محبت کرتی ہو تو شادی تم بھی اس سے کرنا چاہو گی۔"

"ابھی میں نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ضروری تو نہیں کہ جس سے محبت ہو، اس سے شادی بھی کی جائے۔ شادی کے بعد زندگی کے طور طریقے بدل جاتے ہیں شکیل! محبت تو کسی سے ساری زندگی کی جاسکتی ہے لیکن شادی کے بعد زندگی کے تقاضے بدل جاتے ہیں۔ بڑھی ہوئی توقعات دونوں ہی فریقوں کو ہوتی ہیں جو اکثر پوری نہیں ہوتیں جس سے دونوں ہی فریقوں کو ایک دوسرے سے اختلافات ہونے لگتے ہیں جو کبھی کبھی تلخیوں میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔"

"بہت گہری باتیں کرنے لگی ہو۔"

"جب کسی کا سرپرست نہ رہے تو خصوصاً اسے ایسے ہی انداز میں سوچنا چاہیے۔"

"لیکن سب اس طرح نہیں سوچتے۔"

"جو نہیں سوچتے، انہیں زندگی میں کبھی پچھتانا بھی پڑتا ہے۔ خصوصاً عورت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔" زیبا یکا یک ہنسی۔ "میں نے کسی سے سنا تھا۔ کسی مزاح نگار کی کتاب کی رونمائی میں ایک ادیبہ نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ بیوی بننا، محبوبہ کی شدید خواہش ہوتی ہے مگر شادی کے بعد اس کی ساری زندگی اس کوشش میں گزرتی ہے کہ وہ پھر محبوبہ بن جائے۔"

شکیل دھیرے سے ہنس دیا۔

زیبا بولی۔ "تمہاری ہنسی کا انداز بتا رہا ہے کہ تم اس بات سے کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوئے۔"

شکیل بات ٹال گیا اور بولا۔ "زین کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟"

"ہے لیکن ابھی میں نے وہ سوٹ کیس نہیں کھولا جس میں البم ہے۔ نکالوں گی تو دکھاؤں گی تمہیں... تم بہت زیادہ متجسس ہوگئے ہو اس کے بارے میں۔" زیبا نے جواب دیا پھر ہنس کر کہا۔ "کہیں تم جیلس تو نہیں ہو رہے ہو اس سے؟"

"کیوں؟" شکیل جلدی سے بولا۔ "میں جیلس کیوں ہوں گا؟"

"شاید تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔" زیبا مسکرا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی۔

"توبہ!" شکیل بولا۔ "تم جیسی فلسفی لڑکی سے تو شادی وہ کرے جس کی شامت آئی ہو۔"

"شادی اور محبت، دو الگ باتیں ہیں۔"

"اچھا اب یہ فلسفہ چھوڑو بلکہ اب مجھے چلنا... چاہیے۔" شکیل نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"خاصی گپ شپ ہوگئی۔ میں کل پھر آؤں گا۔ موبائل فون پر تو کسی وقت بھی رابطہ ہوسکتا ہے۔ تم پر سے پولیس کی پابندی ہٹے تو چلتے ہیں لاہور... میرا خیال ہے کہ پابندی ہٹ ہی جائے گی۔ یہ معاملہ دہشت گردی ہی کا ہوسکتا ہے۔"

زیبا نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

شکیل رخصت ہوا تو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید اس کے دماغ میں زین ہی چکرا رہا تھا۔

☆☆☆

زیبا پھر اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ اس کا دماغ بدستور الجھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بستر سے اٹھی۔ اس نے شیلف کی ایک دراز میں سے ایک سی ڈی نکالی جو اسے مینائی بابا سے ملی تھی۔ وہ اس نے سی ڈی پلیئر میں لگائی، ٹیلی ویژن آن کیا اور ریموٹ ہاتھ میں لیے پھر بستر پر آلیٹی۔ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ چند لمحے بعد اسکرین پر ایک نوجوان لڑکی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ مینائی بابا کی بیٹی ریشم تھی جس کی شادی مینائی بابا نے زیبا کے مرحوم چچا رانا سکندر کی زندگی ہی میں کردی تھی۔

مینائی بابا کی دو اولادیں تھیں۔ ریشم اور رفیق... رفیق، ریشم سے دو سال بڑا تھا۔ مینائی بابا کے اپنی بیوی سے تعلقات نہایت ناخوشگوار تھے اس لیے وہ رانا سکندر ہی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے بچوں سے ملنے دو ایک گھنٹوں کے لیے گھر چلا جاتا تھا۔ بیوی سے بول چال تک نہیں تھی مگر ان تینوں کے اخراجات مینائی بابا ہی پورے کیا کرتا تھا۔

رفیق اس زمانے میں گریجویشن کرنے والا تھا جب رانا سکندر شدید علیل ہوگئے۔ انہی دنوں یہ ہوا کہ رات کے وقت کچھ لوگ گھر میں گھس کر رفیق کو اٹھا لے گئے۔ پولیس میں رپورٹ کرائی گئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نہ جانے کس طرح یہ بات بھی اڑی کہ اسے کسی ایجنسی کے لوگ اٹھا لے گئے ہیں لیکن رفیق کی کوئی ایسی ایکٹیوٹی سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے ایسا ممکن ہوتا نظر آتا، تاہم ان برسوں میں کیونکہ ایجنسیوں پر اس قسم کے الزام لگتے رہے تھے اس لیے رفیق کا شمار بھی "مسنگ پرسن" میں ہوگیا۔

مینائی بابا نے سربرآوردہ شخصیات کو خطوط لکھے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر مینائی بابا کو صبر آ گیا یا صبر کرلیا گیا۔

سال بھر قبل مینائی بابا نے اپنی بیٹی ریشم کی شادی ایک لڑکے زاہد سے کردی جسے ریشم پسند کرنے لگی تھی۔ زاہد اگرچہ مینائی بابا کو پسند نہیں تھا لیکن بیٹی کو اس کے لیے پاگل ہوتا ہوا دیکھ کر اس نے وہ شادی کی نہیں تھی بلکہ برداشت کی تھی۔ اس کا دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ ان دنوں ریشم کی ماں خاصی علیل رہنے لگی تھی اور سمجھنے لگی تھی کہ اب وہ زندہ نہیں بچے گی اس لیے اپنی آنکھوں کے سامنے بیٹی کو دلہن بنتے ہوئے دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اس کی علالت کا آغاز بیٹے کے "اغوا" کے بعد ہی ہوگیا تھا۔ بیٹی کی شادی کے کچھ ہی دن بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

زاہد شادی کے بعد ہی ریشم کو لے کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ غائب ہونے سے دو ایک روز قبل ریشم نے باپ سے ذکر کیا تھا کہ زاہد ساؤتھ افریقا جانا چاہتا ہے جہاں اس کا کوئی دوست اسے کوئی بہت بڑا کام دلوا سکتا ہے۔

ذکر کا انداز فیصلہ کن نہیں تھا لیکن دو دن بعد وہ دونوں اچانک غائب ہوگئے تھے۔ اس کے چند دن بعد مینائی بابا کو ... کوریئر سروس کے ذریعے ایک پیکٹ ملا۔ اس پیکٹ میں وہ ویڈیو تھی جو اس وقت زیبا ٹی وی اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔

ریشم کے چہرے سے شدید خوف و دہشت ظاہر ہو رہی تھی اور وہ کہہ رہی تھی۔ "راجا نے مجھے بہت اذیتیں پہنچائی ہیں بابا!"

نہ جانے کیوں زاہد کی عرفیت "راجا بھینو" پڑ گئی تھی۔ ریشم اسے راجا ہی کہا کرتی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے لیکن یہ ویڈیو بنوانے کے لیے مجھے اسی نے مجبور کیا ہے۔ یہ ویڈیو وہی بنا رہا ہے اور اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں آپ کو یہ سب کچھ بتا دوں۔ راجا چاہتا ہے کہ اب اسے آپ سے جو کام لینا ہے، اس کے لیے آپ سے خود رابطہ کرے گا اور اگر آپ نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ میرا جینا دوبھر کردے گا۔ مجھے معاف کردیجیے گا بابا کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی اور راجا سے شادی کرنے کی ضد پر اڑی رہی۔ مجھے نہیں معلوم بابا کہ راجا اب آپ سے کیا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ نے اس کی بات نہیں مانی تو یہ مجھے لہولہان کرکے میری ویڈیو آپ کو بھیجے گا اور اگر پھر بھی آپ نے اس کی بات نہیں مانی تو یہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے نہیں معلوم بابا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ کراچی میں راجا مجھے بہانے سے ایک ویران ساحل پر لے گیا تھا۔ وہاں سے اس نے مجھے اس لانچ پر سوار کرایا جس





میں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ لانچ پر راجا نے مجھے کچھ سونگھا کر بے ہوش کردیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں تھی۔ راجا کا کہنا ہے کہ اس نے مجھے کئی دن بے ہوش رکھا ہے اور اب میں اس کے ساتھ ساؤتھ افریقا کے کسی شہر میں ہوں۔"

ریشم کا یہ فقرہ مکمل ہوتے ہی اسکرین سے اس کی تصویر غائب ہوگئی اور صرف روشنی جھلملاتی رہ گئی۔

زیبا نے ایک طویل سانس لے کر ریموٹ سے سی ڈی پلیئر بند کردیا۔ وہ یہ ویڈیو کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔

مینائی بابا کے بیان کے مطابق اسے جس دن ویڈیو موصول ہوئی تھی، اسی شام کو زاہد یا راجا بھینو نے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا تھا۔ بابا مینائی کچھ شکوک و شبہات کا شکار تھا۔ اس نے راجا بھینو سے کہا کہ وہ اس کی بات ماننے سے پہلے اپنی بیٹی کو دیکھ کر اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے کہ راجا بھینو نے اس کی ویڈیو بنانے کے بعد اسے مار نہ ڈالا ہو۔

پھر دو تین دن بعد ہی بابا مینائی کو "کوریئر سروس" سے ایک اور ویڈیو موصول ہوئی۔ اس ویڈیو میں ریشم لہولہان نظر آئی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی کہ راجا بھینو نے اس پر بہت زیادہ تشدد کیا ہے۔

زیبا وہ ویڈیو بھی دیکھ چکی تھی۔

ویڈیو بھیجنے کے بعد راجا بھینو نے پھر بابا مینائی سے رابطہ کیا تھا۔

بابا مینائی کو ریشم سے اتنی محبت تھی کہ اسے لہولہان دیکھ کر وہ روتا ہی رہا۔ راجا بھینو نے اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے اپنی مالکن یعنی زیبا کو اس کی خبر دی یا پولیس سے رابطہ کیا تو وہ اس کی بیٹی کو ہلاک کردے گا۔

دوسری ویڈیو کے بعد راجا بھینو نے موبائل فون پر بابا مینائی سے پھر رابطہ کیا۔ غم سے نڈھال بابا مینائی نے اس کی بات مان لی لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ جب زیبا انگلینڈ سے آئے گی تو وہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔ اس کے خیال کے مطابق زیبا ہمدرد دل کی مالک ہے اس لیے وہ اس کی بیٹی کی زندگی خطرے میں نہیں پڑنے دے گی اور معاملات کو ٹھیک کرنے کے لیے کوئی محتاط منصوبہ بنائے گی۔

اب زیبا آ بھی گئی تھی لیکن اس نے فوری طور پر کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ بنا ہی نہیں سکی تھی۔ اس نے فی الحال اس اتنا سوچا تھا کہ اپنی زمینوں پر جا کے کچھ دن اپنی حویلی میں گزارے گی اور وہاں کے حالات کا جائزہ لے گی۔

یورپ کی زندگی نے اس خاصا نڈر بنا دیا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے اسے کسی وقت نیند آ گئی۔ دوسری صبح اسے بابا مینائی نے بتایا کہ پولیس وہاں سے جا چکی ہے۔ زیبا نے فوراً پولیس آفیسر کو فون کیا۔ اس کے استفسار پر پولیس آفیسر نے کہا۔

"دراصل اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم نے تحقیق کرلی ہے۔ اطمینان ہوگیا ہے کہ وہ دہشت گردی ہی کا معاملہ تھا۔ کسی اور وجہ سے آپ کی زندگی خطرے میں نہیں ہے، البتہ اگر آپ پستول یا ریوالور احتیاطاً اپنے ساتھ رکھیں تو بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے... میں اس کا انتظام کرلوں گی۔"

"کیا اب بھی آپ لاہور جانا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں... میں آج رات یا کل کسی وقت لاہور کے لیے روانہ ہوجاؤں گی۔"

اس گفتگو کے بعد وہ ناشتے کی میز پر پہنچی۔

"کچھ معلوم ہوا بی بی صاحبہ؟" مینائی بابا نے پوچھا۔

"پولیس کے خیال کے مطابق وہ دہشت گردی ہی کا معاملہ تھا۔" زیبا نے جواب دیا۔ "کسی نے خاص طور سے مجھے ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی اس لیے اب پولیس کو میری حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"شکر ہے۔"

"مجھے یہ ایک الجھن ہے مینائی بابا کہ ویڈیوز آپ کو ساؤتھ افریقا سے بھیجی جاتی ہیں لیکن راجا بھینو یہاں میری زمینوں پر سرگرم عمل ہے۔"

"اسے یہاں سرگرم عمل رہنے کی کیا ضرورت ہے بی بی صاحبہ!" مینائی بابا نے جواب دیا۔ "وہ ہر سال اپنا کام کرکے واپس ساؤتھ افریقا چلا جاتا ہوگا۔"

اسی وقت ایک ملازم نے آ کر شکیل کی آمد کی اطلاع دی۔ زیبا نے اسے وہیں بلوالیا۔

"آؤ، ناشتا کرلو۔" زیبا نے اس سے کہا۔

"میں ناشتا کر کے گھر سے چلا تھا۔ بہرحال، ایک کپ چائے تو پی ہی لوں گا۔" شکیل نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

مینائی بابا اس وقت ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔

"ابھی اس پولیس آفیسر سے بات ہوئی ہے میری۔" زیبا بولی۔

"میں راستے میں تھا جب... اس کی کال آئی تھی مجھے اس سے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔" شکیل نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم اپنی زمینوں پر جانے کے لیے اتنی بے چین کیوں ہو؟ مجھے پولیس آفیسر ہی نے بتایا ہے کہ تم شاید آج ہی روانہ ہونا چاہتی ہو۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جب میں دل میں کچھ ٹھان لیتی ہوں تو بس ٹھان لیتی ہوں۔“

انہی چند جملوں کے دوران میں شکیل نے خود ہی ایک پیالی میں اپنے لیے چائے بنانا شروع کر دی تھی۔

☆☆☆

اسی رات کی فلائٹ سے زیبا لاہور روانہ ہو گئی۔ وہ ایک چھوٹا پستول بھی خرید چکی تھی جسے آسانی سے لباس میں چھپایا جا سکتا تھا۔ شکیل کے ہمراہ ہونے سے اس نے کچھ تقویت تو محسوس کی تھی لیکن پریشان بھی تھی۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، اس کے لیے رازداری ضروری تھی لیکن شکیل کے ساتھ ہونے کے باعث وہ راز افشا ہو سکتا تھا.... راز افشا ہونے سے مینائی بابا کی بیٹی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی جو اسے گوارا نہیں تھا۔

”اپنی زمینوں پر تم لاہور سے اسی وقت جاؤ گی؟“

”نہیں۔“ زیبا نے جواب دیا۔ ”وہاں پہنچنے کے لیے ایک خاصے ویران راستے سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ سفر بھی تین ساڑھے تین گھنٹے کا ہے۔ رات کے وقت وہ سفر کرنا میں مناسب نہیں سمجھ رہی ہوں۔ لاہور میں... رات کسی ہوٹل میں گزارنا ہو گی۔ صبح ناشتے کے بعد نکلیں گے زمینوں کی طرف۔“

”تو پھر کراچی سے اس وقت روانگی ضروری تو نہیں تھی، صبح کی فلائٹ بھی پکڑی جا سکتی تھی؟“

”بس دل چاہا تھا کہ روانگی میں دیر نہیں لگاؤں۔“ زیبا نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ دراصل اس نے اپنی روانگی راز میں رکھنے کے لیے رات ہی کا وقت مناسب سمجھا تھا۔ جواب دینے کے بعد اس نے شکیل کی طرف نہیں دیکھا لیکن محسوس کیا کہ شکیل اسے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔

ذرا سا رک کر زیبا نے شکیل کی طرف دیکھا تو شکیل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

زیبا کو ایک پریشان کن شبہ ہوا کہ شکیل اسے پسند کرتا ہے، یا شاید اس سے محبت کرتا ہے لیکن اگر ایسا تھا تو یہ جذبات صرف ایک دن کے نہیں ہو سکتے تھے۔ شاید وہ اسے اس وقت سے پسند کرنے لگا ہو جب وہ انگلینڈ نہیں گئی تھی۔

اگر زیبا کا یہ شبہ درست ثابت ہوتا تو یہ معاملہ اس کے لیے کسی قدر پریشانی کا سبب بنتا۔ اس نے شکیل کو کبھی ایک دوست سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ زین سے اس نے شادی کا فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن وہ پسند اسی کو کرتی تھی۔

”تمہاری زمینوں پر وہاں تمہارا کوئی ذمے دار شخص تو ہوگا۔“ شکیل یکا یک بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ منیجر وغیرہ؟“

”ہاں۔“ زیبا نے جواب دیا۔ ”منشی خراسانی ہے۔“

”خراسانی؟“ شکیل نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں۔“ زیبا خفیف سا مسکرائی۔ ”اس کے آباؤ اجداد ایران سے غیر منقسم ہندوستان آ گئے تھے۔ اس کا باپ بھی منشی خراسانی ہی کہلاتا تھا۔ دادا کی آخری زندگی میں جب اس کا انتقال ہوا تھا، اس سے پہلے ہی دادا نے زمینوں کی ذمے داری اس کے بیٹے کو سونپ دی تھی۔ اس کا پورا نام مجھے معلوم تو تھا لیکن اب یاد نہیں۔ سب منشی خراسانی ہی کہتے تھے اس لیے مجھے بھی بس اتنا ہی یاد رہ گیا۔“

”خاصی عمر کا آدمی ہوگا وہ اب؟“

”ہاں، ستر سال کا تو شاید ہو۔ میرے انگلینڈ جانے سے پہلے وہ دو ایک مرتبہ کراچی آیا تھا تو میں نے اسے دیکھا تھا۔“

”تم نے اسے اطلاع تو دے دی ہو گی اپنے آنے کی؟“

”نہیں۔“ زیبا نے جواب دیا۔

”دینا تو چاہیے تھی۔“ شکیل نے کہا۔ ”اس کے پاس جیپ یا کسی بھی قسم کی گاڑی تو ہو گی... وہ ہمیں لینے آ جاتا۔“

”ہوٹل سے کرائے پر گاڑی لے لیں گے۔“

شکیل ہنسا۔ ”گویا تم سرپرائز وزٹ کرنا چاہتی ہو؟“

زیبا مسکرائی۔ ”یہی سمجھ لو۔“

”کوئی خاص وجہ؟“ شکیل نے ایک بار پھر اسے بڑے غور سے دیکھا۔

”نہیں، کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس یونہی۔“

”زیبا!“ شکیل سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ تم کوئی خاص بات چھپا رہی ہو۔“

”ارے واہ۔“ زیبا ہنسی۔ ”خاص بات بھلا کیا ہو گی؟“

”یہ تو تم ہی بتا سکتی ہو۔“

”ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے تو کیا بتا سکتی ہوں۔ تم خوامخواہ الٹی سیدھی باتیں نہ سوچو۔“

شکیل ہنسا۔ ”چلو نہیں سوچتا۔“

لیکن زیبا سوچنے لگی کہ شکیل کو کسی قسم کے شکوک و شبہات ضرور ہیں اور وہ شبہات بلاوجہ بھی نہیں تھے۔

زیبا کو ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ شکیل کو حقیقت سے آگاہ کر دے لیکن اسے مینائی بابا سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد آیا کہ وہ یہ راز کسی پر آشکارا نہیں کرے گی۔

مگر کیا یہ ممکن تھا؟





یہ سوال بھی زیبا کے دماغ میں ابھرا کیونکہ شکیل اس کے ساتھ ہو لیا تھا اس لیے کسی وقت بھی کوئی خاص بات اس کے علم میں آ سکتی تھی جس سے اس کے شکوک و شبہات اور بڑھ جاتے۔ وہ زیبا سے پھر استفسار کرتا اور اس وقت حقیقت چھپانا زیبا کے لیے مشکل ہو جاتا۔

لاہور ائرپورٹ سے وہ دونوں ایک ٹیکسی میں ہوٹل روانہ ہو گئے۔

ہوٹل میں دو کمرے لیے گئے۔ زیبا نے ہوٹل میں یہ اندراج کروایا کہ وہ دونوں دوست ہیں اور ایک آدھ دن کے لیے لاہور آئے ہیں۔ نیز یہ کہ پھر زیبا اپنی زمینوں پر چلی جائے گی۔

شکیل نے کھانا زیبا ہی کے کمرے میں کھایا، پھر کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

زیبا بستر پر نہیں لیٹی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے دماغ پر دباؤ تو اسی وقت بڑھ گیا تھا جب اسے بابا مینائی سے حالات کا علم ہوا تھا۔ پھر کار پر فائرنگ بھی اس دباؤ میں اضافے کا سبب بنی تھی لیکن اب جبکہ دوسرے دن اسے اپنی زمینوں پر ہونا تھا، دباؤ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

شکیل کے بیان کے مطابق وہ ”سرپرائز وزٹ“ اس لیے کر رہی تھی کہ اسے منشی پر شبہ تھا۔ شبہ تو کیا، وہ یقین کرنے پر مجبور تھی۔ منشی کی شمولیت کے بغیر وہ گڑبڑ ممکن ہی نہیں تھی۔ زیبا کو تعجب بھی تھا کہ منشی اس فراڈ میں کیوں شامل ہو گیا؟ کیسے شامل ہو گیا؟ رانا سکندر، مینائی بابا کی طرح منشی پر بھی اندھا اعتماد کرتے تھے۔ مرحوم نے خاصا ٹھوک بجا کر دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں نے کبھی کوئی ذرا سی بھی ہیر پھیر نہیں کی تھی۔

اچانک اور پہلی مرتبہ زیبا کو خیال آیا کہ راجا بھینو نے کیا... بابا مینائی کی طرح منشی کو بھی کسی خطرناک جال میں پھانس کر اس فراڈ پر آمادہ کیا ہو گا؟

ممکن تو ہے۔ زیبا نے ٹہلتے ہوئے سوچا۔ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ منشی سے موبائل فون پر ایک مرتبہ بات تو کرے۔ وہ منشی کے لب و لہجے سے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر سکتی تھی اور اس کوشش میں کامیابی کا امکان بھی تھا۔

بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے اس نے اپنا موبائل اٹھا لیا اور پھر ٹہلنے لگی۔ منشی سے رابطہ کرنے کے معاملے میں وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی۔

ایک مرتبہ وہ نمبر ملاتے ملاتے رکی بھی لیکن دوسری مرتبہ اس نے نمبر ملا ہی لیا۔ دوسری طرف سے کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ منشی سو چکا ہو۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ آواز سے بھی ظاہر ہوا کہ بولنے والا غنودگی میں ہے۔

”کیا سو گئے تھے منشی جی؟“ زیبا نے کہا۔

”کون؟“ اس مرتبہ غنودہ آواز سنبھل گئی تھی۔

زیبا کو خیال آیا کہ اس کے موبائل کا نیا نمبر منشی کے علم میں ہو گا ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ موبائل فون پر فوری طور پر آواز پہچاننا اکثر ممکن نہیں ہوتا۔ ویسے بھی چار سال پہلے کی بہ نسبت، زیبا کی آواز میں کچھ نہ کچھ فرق تو آیا ہی تھا۔

”میں زیبا بول رہی ہوں منشی جی۔“ زیبا نے کہا۔

”ارے بی بی صاحبہ!“ منشی چونکا۔ اب اس کی آواز میں غنودگی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بولا۔ ”آپ انگلینڈ سے آ گئیں؟“

”ہاں۔“

”مینائی بابا نے مجھے خبر ہی نہیں دی۔“ منشی کے لہجے میں خفیف سا انداز شکایت کا تھا۔

”میں نے ہی منع کر دیا تھا انہیں۔“

”کیوں بی بی صاحبہ؟“

”میں نے سوچا تھا کہ اچانک زمینوں پر پہنچ کر آپ کو حیران کر دوں۔“ زیبا نے ہنس کر کہا۔ ”لیکن اس وقت یہ ارادہ بدل دیا۔ یعنی آپ کو حیران کرنے کا۔“

”کب آ رہی ہیں آپ؟“ منشی کے انداز میں اشتیاق تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ وہاں کچھ دن گزاروں۔ حویلی کس حال میں ہے؟“

”سامان تو وہی پرانا ہے لیکن میں مہینے میں ایک بار وہاں کی صفائی ضرور کروا دیتا ہوں۔“

”آخری بار صفائی کب کروائی تھی؟“

”پندرہ دن تو ہو گئے ہوں گے بی بی صاحبہ! جب آپ آئیں تو بس ایک دن پہلے اطلاع دے دیجیے گا۔ اچھی طرح صفائی کروا دوں گا وہاں کی۔“

زیبا نے ان باتوں کے دوران میں محسوس کیا تھا کہ منشی اس کی آمد کی خبر سے پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کے برخلاف اس کو اس خبر سے خوشی ہوئی تھی کہ زیبا وہاں آ رہی ہے۔ اس سے زیبا نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ منشی فراڈ میں شامل نہیں تھا۔

یہ زیبا کے لیے مزید الجھن کی بات تھی کیونکہ منشی کی شمولیت کے بغیر وہ فراڈ ممکن نہیں تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گویا معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ تھا۔

"آپ چپ ہوگئیں بی بی صاحبہ!" منشی کی آواز آئی۔

"کب آرہی ہیں آپ؟"

زیبا جو سوچ میں پڑ جانے کی وجہ سے چپ ہوگئی تھی، بولی۔ "میں لاہور تو پہنچ چکی ہوں۔ کل صبح ناشتا کرنے کے بعد یہاں سے نکلوں گی۔ دوپہر تک پہنچ ہی جاؤں گی۔"

"لاہور آچکی ہیں آپ؟" منشی کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کیا کار سے آئی ہیں؟"

"نہیں، ہائے ائر ہی آئی ہوں۔ یہاں سے زمینوں پر آنے کے لیے کرائے کی کار لے لوں گی۔"

"پچھلے دنوں کی شدید بارشوں کی وجہ سے راستہ بہت خراب ہوگیا ہے بی بی صاحبہ! کار کا اس راستے پر آنا تو بہت مشکل ہوگا۔ اور پھر کرائے پر کار لینے کی ضرورت کیا ہے... آپ کس ہوٹل میں ٹھہری ہیں؟"

زیبا نے ہوٹل کا نام بتایا۔

منشی بولا۔ "میں اپنے بیٹے ٹیپو کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ میری جیپ لے کر آجائے گا۔ اس کے ساتھ آجائیے گا آپ۔"

"ٹیپو!" زیبا نے حیرت سے کہا۔ "مجھے اب یاد تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کے بیٹے کا نام کچھ اور تھا؟"

"بس وہ... کیا کہوں بی بی صاحبہ!" منشی کے لہجے میں شرمندگی سی تھی۔ "اس کی مرحوم ماں بچپن ہی سے اس کو ٹیپو کہنے لگی تھی۔ یہی نام میری زبان پر چڑھ گیا۔"

"چلیں خیر، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ساڑھے نو بجے تک یہاں پہنچ جائے۔" زیبا نے کہا۔

"میں اسے فجر کی نماز کے بعد یہاں سے روانہ کردوں گا۔ حویلی کی صفائی بھی اسی وقت سے شروع کروادوں گا۔"

"آپ کس سے صفائی کرواتے ہیں؟"

"ماریوں ہی سے کرواتا ہوں بی بی صاحبہ... اور کس سے کرواؤں گا۔"

"انہیں کچھ پیسے بھی دیتے ہیں اس اضافی کام کے؟"

منشی فوراً جواب نہیں دے سکا۔

زیبا بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔ یہ مناسب نہیں ہے منشی جی کہ ان غریبوں سے بیگار لی جائے۔ خیر، اس مرتبہ تو میں خود آکر ان لوگوں کو حویلی کی صفائی کرنے کا انعام دوں گی۔ آئندہ آپ خیال رکھیے گا۔"

"بہتر بی بی صاحبہ!" منشی کا لہجہ اس مرتبہ دھیما تھا۔

"اچھا تو کل صبح ٹیپو کو بھیج دیجیے گا۔ وہ ریسپشن پر آکے میرا نام لے گا تو مجھے اطلاع دے دی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے بی بی صاحبہ!"

جواب سننے کے بعد زیبا نے رابطہ منقطع کیا۔ اس کے بعد بھی وہ موبائل ہاتھ میں لیے سہلاتی رہی۔ یہ سوال اس کے لیے مزید الجھن کا سبب بن گیا تھا کہ منشی نہیں تو پھر کون؟

دوسری صبح وہ اپنے ہی کمرے میں شکیل کے ساتھ ناشتا کر رہی تھی۔ اس نے شکیل کو بتا دیا کہ اس نے "سرپرائز وزٹ" کا ارادہ ترک کرکے رات کو منشی سے موبائل پر بات کرلی ہے۔

"ان کا بیٹا ٹیپو ساڑھے نو بجے تک جیپ لے کر ہمیں لینے آئے گا۔"

شکیل نے مسکرا کر کہا۔ "تم اپنے ملازمین کا ذکر احترام سے کرتی ہو۔"

"منشی جی عمر میں تو مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ عمر کا بھی تو احترام ہوتا ہے۔ کیا میں مینائی بابا کا احترام نہیں کرتی؟ ملازم تو وہ بھی ہیں اور پھر تم بھی تو مینائی بابا کا احترام کرتے ہو۔"

"تم نے تو بحث چھیڑ دی۔" شکیل ہنس کر بولا۔ "میں شاید سوچے سمجھے بغیر بول پڑا تھا۔"

"آئندہ سوچ سمجھ کر بولنا۔" زیبا بھی ہنسی۔

"سوچ ہی میں تو پڑا ہوا ہوں۔" شکیل سنجیدہ ہوگیا۔ "اور ڈر بھی لگ رہا ہے کہ کہیں دیر نہ ہوجائے۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ کہنا چاہتا ہوں تم سے۔"

زیبا کو پہلے ہی شبہ ہوچکا تھا کہ شکیل کے دل میں کیا ہے اس لیے وہ بات ٹال گئی۔ اس نے کہا۔ "میں زمینوں پر کچھ دن گزاروں گی۔ تم بور تو نہیں ہو جاؤ گے یہاں کی زندگی سے؟"

"میرا تو کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ دامن کوہ میں... ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔"

زیبا کو اس بات کے جواب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ زیبا کو ریسپشن سے ٹیپو کے بارے میں بتایا گیا۔

☆☆☆

ٹیپو پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ نقش و نگار معمولی لیکن صحت قابل رشک تھی۔

ہوٹل سے روانگی کے وقت ڈرائیونگ سیٹ پر وہی تھا۔ زیبا اور شکیل پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔

"کسانوں کے کیا حالات ہیں ٹیپو؟" زیبا نے اس سے پوچھا۔





"ٹھیک ہیں بی بی صاحبہ! میں ہی ان کے دکھ سکھ کا خیال رکھتا ہوں بابا کی ہدایت پر۔"

وہ "بابا" منشی ہی کو کہہ سکتا تھا۔

زیبا بولی۔ "غریبوں کا خیال رکھا جاتا ہے تو وہ کام بھی محنت سے کرتے ہیں۔"

"جی بی بی صاحبہ۔"

"کچھ پڑھا ہے تم نے؟"

"پرائمری اسکول ہے گاؤں میں... وہیں پڑھا ہے لیکن بابا نے مجھے زیادہ پڑھایا ہے۔ اردو، فارسی تو وہ خوب جانتے ہیں، آپ کو پتا ہی ہوگا۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی انہی سے پڑھی ہے لیکن اتنی نہیں کہ بول بھی سکوں۔ تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں بس۔"

"کچھ زیادہ شوق نہیں ہوگا تمہیں پڑھنے کا۔ گوجرانوالہ قریب ہے۔ وہاں تو ہائی اسکول ہوگا۔"

"شوق کی بات نہیں بی بی صاحبہ!" ٹیپو نے جواب دیا۔ "بابا کی آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں تو زمینوں کی دیکھ بھال وغیرہ میں وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنے لگے تھے۔ اور اب تو ساری ہی ذمے داری انہوں نے مجھ پر ڈال دی ہے۔ آنکھیں بہت کمزور ہوگئی ہیں ان کی۔ کچھ پڑھتے بھی ہیں تو مشکل سے۔"

شکیل کے چہرے سے اکتاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جیپ اب شہری حدود سے نکل آئی تھی۔

زیبا کے دماغ میں یہ شبہ کلبلانے لگا کہ جب منشی نے ساری ذمے داری ہی بیٹے کو سونپ دی ہے تو پھر شاید وہ بے قصور ہی ہو۔ ٹیپو اس فراڈ میں شریک ہوسکتا تھا۔ وہ ابھی نوجوان تھا۔ زیبا جانتی تھی کہ اس زمانے کے نوجوانوں میں جلد از جلد دولت حاصل کرنے کی ہوس بہت زیادہ ہے۔

"آپ کتنے دن رکیں گی بی بی صاحبہ؟" ٹیپو نے پوچھا۔

"بس چار پانچ دن... کیوں؟"

"ایسے ہی پوچھ لیا۔"

زیبا سوچنے لگی کہ ایسے ہی پوچھ لیا یا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟

جیپ اب ایک کچے راستے پر چل رہی تھی جو خاصا ناہموار تھا۔ زیبا اور شکیل کو جھٹکے لگنے لگے تھے۔

"اگلی سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیں بی بی صاحبہ۔" ٹیپو بولا۔ "آگے کا راستہ اور زیادہ خراب ہے۔"

زیبا کو خیال آیا کہ اس راستے پر کار کا سفر خاصا مشکل ہوجاتا۔

"سامنے سے کوئی گاڑی آرہی ہے بی بی صاحبہ۔" ٹیپو بولا۔

زیبا نے بھی وہ گاڑی دیکھ لی تھی لیکن ابھی وہ بہت دور تھی۔

"پتا نہیں کون ہے۔" اس مرتبہ ٹیپو کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔

"ان علاقوں میں ڈاکو وغیرہ تو نہیں ہیں؟" زیبا نے تشویش سے پوچھا۔

"اب تو یہاں امن ہے بی بی صاحبہ!" ٹیپو نے جواب دیا۔ "تین سال پہلے بہت گڑبڑ تھی۔ ایک ڈاکو تھا، راجا بھینو۔ پولیس سے بھی ان لوگوں کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔"

"تو اب وہ ڈاکو کہاں چلے گئے؟"

"پولیس کا خیال ہے کہ راجا بھینو کسی مقابلے میں مارا گیا۔ اس کا کوئی ریکارڈ پولیس کے پاس نہیں تھا۔ آخری مقابلے میں جو ڈاکو مارے گئے، انہی میں شاید راجا بھینو بھی ہوگا جسے راجا بھینو کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا جاسکا مگر اس کے بعد ہی اس کے ساتھی تتر بتر ہوگئے۔"

سامنے سے آنے والی گاڑی اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ ڈرائیونگ کوئی مرد کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں کوئی عورت یا لڑکی بیٹھی تھی۔

"ارے!" ٹیپو کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو اپنا ٹھیکے دار جامو ہے۔"

آنے والی جیپ میں بیٹھا شخص پگڑی باندھے ہوئے تھا لیکن اس کے برابر میں بیٹھی لڑکی کچھ زیادہ خوب صورت تو نہیں لیکن خاصی فیشن ایبل تھی۔

ناہموار راستے کی وجہ سے جیپ کی رفتار کم ہی تھی لیکن ٹیپو نے اسے اور کم کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے دو باتیں تو کر لوں بی بی صاحبہ! وہ فصل دیکھنے آیا ہوگا۔"

"ہوں۔" زیبا بڑے غور سے جیپ کے دونوں سواروں کو دیکھ رہی تھی۔

دونوں جیپ برابر برابر کریں۔

"کیا حال ہے ٹھیکے دار؟" ٹیپو نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"فصل دیکھنے آیا تھا۔" ٹھیکے دار جامو نے زیبا اور شکیل پر اچٹتی سی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم سے بات بھی کرنا تھی لیکن منشی جی نے بتایا کہ تم کسی کو لینے لاہور گئے ہوئے ہو۔"

"ہاں۔" ٹیپو نے جواب دیا۔ "یہ اپنی زمینوں کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مالک ہیں۔" اس کا اشارہ زیبا کی طرف تھا۔

ٹھیکے دار جامو نے مسکرا کر زیبا کو سلام کیا اور پوچھا۔

"کیا آپ یہاں رکیں گی بیگم صاحبہ؟"

"بس چند دن۔" زیبا نے جواب دیا۔

ٹھیکے دار جامو کی بیٹی بالکل خفا بیٹھی رہی۔ زیبا نے اس کے انداز میں طنطنہ محسوس کیا۔

"اب تم سے بات کس طرح ہوگی ٹیپو؟"

"واپس چلو۔"

"نہیں، ابھی تو مجھے ذرا جلدی ہے۔ لاہور میں کام ہے کچھ... اب تین چار دن بعد آسکوں گا۔"

"فضل بس تیار ہی سمجھو۔"

"دیکھ لیا ہے میں نے۔ اچھا ایسا کرتا ہوں، کل اسے بھیج دوں گا بات کرنے کے لیے۔" ٹھیکے دار جامو نے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میری بیٹی نہیں، بیٹا ہے۔"

لڑکی اس وقت ٹیپو کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی لیکن جیسے ہی زیبا نے براہِ راست اس کی طرف دیکھا، اس نے ٹیپو سے نظریں چرالیں لیکن زیبا کن انکھیوں سے ٹیپو اور اس لڑکی کی آنکھوں کا تصادم دیکھ چکی تھی اور اس کے اندازے کے مطابق وہ بے معنی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیکے دار جی!" ٹیپو نے ہنس کر کہا۔ "اسے بھیج دینا۔ یہ آتی تو رہتی ہے یہاں۔"

ٹھیکے دار اپنی جیپ کا انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس نے دو ایک مرتبہ سوالیہ نظروں سے شکیل کی طرف دیکھا لیکن اسے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ٹھیکے دار نے زیبا سے کہا۔ "آپ یہاں رک رہی ہیں تو میں دو چار دن بعد آؤں گا آپ کو سلام کرنے... آپ حویلی ہی میں ٹھہریں گی نا؟"

"جی ہاں ٹھیکے دار صاحب۔" زیبا نے کہا۔ "آیئے گا آپ۔"

دونوں جیپیں اپنے اپنے راستے پر ہولیں۔

"ٹھیکے دار کی لڑکی۔" زیبا بولی۔ "حیرت انگیز طور پر ماڈرن ہے۔ جینز پہنے ہوئے تھی۔ میں اسے حیرت انگیز اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کا باپ تو یہاں کے روایتی لباس میں تھا۔"

"پڑھی لکھی ہے نا بی بی صاحبہ۔" ٹیپو نے جواب دیا۔ "اور باپ کی بہت لاڈلی بھی ہے۔"

زیبا ہنسی۔ "کیا میں پڑھی لکھی نہیں ہوں؟ میں تو یورپ بھی دیکھ آئی ہوں لیکن میں شلوار قمیص پہنے ہوئے ہوں۔"

"جی... جی ہاں۔" ٹیپو کچھ سٹپٹا گیا۔ اسے کوئی معقول جواب نہیں سوجھ سکا۔

"نام کیا ہے اس کا؟" زیبا نے پوچھا۔

"ثروت۔"

"زیادہ ثروت کی خواہش بھی ہوگی اسے۔"

"میں سمجھا نہیں بی بی صاحبہ۔"

"خیر چھوڑو۔" زیبا نے کہا اور شکیل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "تم نے تو بالکل چپ سادھ رکھی ہے۔"

"میں بور ہو رہا ہوں اس ماحول سے۔" شکیل نے منہ بنا کر کہا۔ "میں یہاں اس خیال سے آیا تھا کہ دیہات کی روایتی ہریالی دیکھوں گا۔"

"بہت ہریالی دیکھیں گے آپ صاحب جی۔" ٹیپو بول پڑا۔ "ابھی تو ہم ایسے علاقے سے گزر رہے ہیں جہاں کی زمین ٹھیک نہیں ہے۔ اسے کاشت کے قابل بنانے کے لیے بہت پیسا اور وقت خرچ ہوگا اور اس زمین کا مالک بہت بے پروا ہے۔ دولت بہت ہے نا اس کے پاس۔"

ٹیپو نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں ہریالی ہی ہریالی تھی۔ راستے کی دونوں جانب درخت بھی نظر آرہے تھے۔

"اب ہماری زمینیں شروع ہوگئی ہیں بی بی صاحبہ۔" ٹیپو بولا۔

"اچھا!" زیبا نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "فصل تو تیار لگ رہی ہے۔"

"جی بی بی صاحبہ! تین چار دن بعد اس کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔ ٹھیکے دار جامو اسی لیے تو آیا تھا۔"

اسی وقت شکیل بول پڑا۔ "اب موسم دھوپ ہونے کے باوجود خوشگوار محسوس ہونے لگا ہے۔"

"لیکن یہ جھٹکے..." زیبا نے منہ بنایا۔

جیپ کا کوئی پہیا اچانک کسی جگہ نرم زمین میں دھنس جانے کے باعث یکا یک جھٹکا لگتا تھا اور سنبھلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ وہ شکیل سے یا شکیل اس سے ٹکرا گیا۔ ایک دو مرتبہ زیبا کو یہ شبہ بھی ہوا کہ شکیل جان بوجھ کر اس سے ٹکرایا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی زیبا کے گھٹنے پر رکھ دیا تھا۔

زیبا کو یہ بات ناگوار گزری تھی۔ اس نے شکیل کے بارے میں بہت کچھ سوچ ڈالا لیکن ایک بار اسے یہ خیال بھی آیا کہ شاید اس کا شبہ غلط ہی ہو۔ شکیل جان بوجھ کر اس سے نہ





ٹکرایا ہو۔

☆☆☆

جب حویلی کے سامنے جیپ رکی تو وہاں اس کے استقبال کے لیے عورتیں اور بچے جمع تھے۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ ان کی مالکن وہاں آرہی ہے۔ زیبا ان سب کی طرف دیکھتی، مسکراتی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی جیپ سے اتری۔ منشی تیزی سے جیپ کے قریب آچکا تھا۔ زیبا نے اسے کئی برس بعد دیکھا تھا مگر پہچان گئی۔ ان گزرے ہوئے برسوں میں منشی خاصا تبدیل ہوا تھا۔ صحت ٹھیک ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے یا شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس نے نہایت موٹے عدسوں کی عینک لگا رکھی تھی۔

"کیسے ہیں منشی جی؟" زیبا نے مسکرا کر پوچھا۔

"مالک کا احسان ہے بی بی صاحبہ۔" منشی نے کہا۔

جیپ سے شکیل بھی اتر آیا تھا۔ زیبا نے منشی سے اس کا تعارف اپنے دوست کی حیثیت سے کرایا جو دیہی زندگی دیکھنے کے شوق میں اس کے ساتھ آیا تھا۔

حویلی میں داخل ہو کر زیبا نے کسی قسم کی اجنبیت نہیں محسوس کی۔ انگلینڈ جانے سے قبل وہ دو تین مرتبہ وہاں آچکی تھی۔

حویلی کا سارا فرنیچر نہایت قدیم زمانے کا لیکن بہترین لکڑی کا تھا۔

"واہ منشی جی!" زیبا نے تعریف کی۔ "صفائی تو آپ نے اس خوبی سے کروائی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ حویلی پہلے ہی سے آباد ہو۔"

"پندرہ آدمیوں کو صفائی پر لگایا تھا بی بی صاحبہ۔"

"خوب! میں انہیں خود انعام دوں گی لیکن ابھی تو میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ جیپ کے سفر نے جسم کا جوڑ جوڑ دکھا دیا ہے۔"

"یہ تو میں نے فون پر کہا تھا آپ سے۔ راستہ بہت خراب ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کے آرام کے لیے وہ کمرا ٹھیک کروایا ہے جہاں مرحوم سرکار آرام کیا کرتے تھے۔"

"مرحوم سرکار" سے منشی کی مراد زیبا کے دادا سے تھی۔

ٹیپو سے دو تین قدم پیچھے زیبا اور شکیل، منشی کے ساتھ چل رہے تھے۔

"ان کے لیے کس کمرے کا بندوبست کیا ہے؟" زیبا نے شکیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"حویلی میں کمروں کی کیا کمی ہے بی بی صاحبہ!" منشی نے کہا۔

"میرا کمرا ان کے قریب ہونا چاہیے۔" شکیل بولا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔" منشی نے کہا۔ پھر زیبا سے بولا۔ "جن کسانوں کو آپ انعام دینا چاہتی ہیں، انہیں کس وقت بلا لوں اور کھانا آپ کب کھائیں گی؟ میں نے سب انتظام کروا دیا ہے۔ تازہ چپاتیاں تلوانے میں تو پندرہ منٹ لگیں گے۔"

"تکان کی وجہ سے بھوک کا احساس مٹ گیا ہے۔ میں آرام کرنے کے بعد ہی کھاؤں گی۔ کیوں شکیل؟"

"ہاں۔" شکیل نے جواب دیا۔ "پہلے آرام کر لیا جائے تو بہتر ہے۔"

زیبا نے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کھانے کے بعد بلائیے گا ان کسانوں کو۔"

"ایک لڑکا شاموبھی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"شاموا!" ٹیپو نہ صرف چونکا بلکہ اس نے سر گھما کے دیکھا بھی... اس کا ایک قدم بھی ذرا رک کر اٹھا تھا۔

منشی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور زیبا سے کہا۔ "دراصل وہ آپ کے پیر چھونا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ مالکن تو بالکل دیوی سمان ہیں۔"

"ہندو ہے؟" زیبا نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ ہمارے کسانوں کے گاؤں میں بس یہی ایک ہندو گھرانا ہے۔ میں تو اس بات پر شاموکو ڈانٹ دیتا لیکن مجھے آپ کی وہ بات یاد آگئی تھی جو آپ نے فون پر کہی تھی۔"

"خیر۔" زیبا نے کہا۔ "آپ اس کو بلا تو لیں مگر اسے پیر چھونے کی اجازت تو میں ہرگز نہیں دوں گی۔ اس کا عقیدہ اپنی جگہ لیکن میں بہرحال مسلمان ہوں۔ میں گناہ گار کیوں بنوں۔"

ٹیپو دونوں سوٹ کیس سنبھالے ایک کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"یہ ہے آپ کا کمرا۔" منشی بولا۔

ٹیپو کے پیچھے زیبا، شکیل اور منشی بھی اس کمرے میں داخل ہوئے۔ زیبا اس کمرے میں لگے ہوئے بستر کو دیکھ کر جذباتی ہو گئی۔

"یہاں دادا جان لیٹتے تھے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ٹیپو نے دونوں سوٹ کیس ایک جگہ رکھ دیے۔

"میں جاؤں بابا؟" اس نے منشی سے پوچھا۔

"دونوں سوٹ کیس آپ ہی کے ہیں بی بی صاحبہ؟" منشی نے پوچھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں، ایک تو ان کا ہے۔" زیبا نے شکیل کی طرف اشارہ کیا پھر ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ بھی کیا۔

"یہ سوٹ کیس اٹھالو۔" منشی نے ٹیپو سے کہا پھر شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلیں صاحب! آپ بھی اپنا کمرا دیکھ لیں۔"

شکیل نے اثبات میں سر ہلا کر زیبا سے کہا۔ "میں اپنا کمرا دیکھ کر ابھی آتا ہوں۔"

"شکیل پلیز!" زیبا نے کہا۔ "بہت تھکن ہوگئی ہے۔ آرام کرنا چاہتی ہوں۔ دو گھنٹے تم بھی آرام کرلو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" شکیل نے کہا۔

جب وہ تینوں کمرے سے چلے گئے تو زیبا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے مرحوم دادا کے بستر کی طرف گئی۔ وہ جذباتی تو خیر ہوگئی تھی لیکن اس کا دماغ دو ایک سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔

بابا مینائی کے بیان سے تو یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اس سارے معاملے میں راجا بھینو مرکزی کردار تھا۔

ٹیپو نے کہا تھا کہ پولیس کے خیال کے مطابق وہ ڈاکو تین سال پہلے کسی پولیس مقابلے میں مارا جا چکا تھا لیکن حالات بتا رہے تھے کہ راجا بھینو زندہ ہے۔ کسی وجہ سے اس نے ڈکیتی کی زندگی چھوڑ دی ہوگی اور شاید وہ دوسری نوعیت کے جرائم میں پڑ گیا ہوگا۔

زیبا بستر پر لیٹی تمام باتوں پر غور کرتی رہی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ منشی کی بصارت خاصی کمزور ہوگئی ہے اور اس نے زمینوں کے سارے کام ٹیپو کے سپرد کردیے ہیں تو زیبا کو خیال آیا تھا کہ ایسی صورت میں ٹیپو ہی اس فراڈ میں ملوث ہو سکتا ہے جس کا مرکزی کردار بظاہر راجا بھینو معلوم ہوتا تھا۔

زیبا جسمانی طور پر تو بستر پر لیٹی آرام کر رہی تھی مگر اس کا دماغ مسلسل الجھتا رہا۔ اسے وہ وقت بھی یاد آیا جب ٹھیکے دار جاموکی بیٹی ثروت اور ٹیپو کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ وہ انداز ایسا تھا جیسے ان میں کسی قسم کا تعلق ہو اور تعلق بھی ایسا جس میں رازداری ضروری تھی۔

تو اگر ان دونوں میں تعلق تھا تو وہ یقیناً تعجب خیز بات تھی۔ کسی حد تک پڑھی لکھی اور فیشن ایبل لڑکیاں ایسے نوجوانوں کو پسند نہیں کرتیں جو دیہی زندگی گزار رہے ہوں اور پڑھے لکھے بھی نہ ہوں۔ صورت شکل کے اعتبار سے بھی وہ کچھ خاص نہیں تھا۔

وہ سوچتی رہی... مسلسل سوچتی رہی۔ وہ یہاں اس ارادے کے ساتھ آئی تھی کہ اس فراڈ کا سراغ لگائے گی لیکن یہ فیصلہ وہ اب بھی نہیں کرسکی تھی کہ اس معاملے میں اس کا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ وہ کسی سے بھی پوچھ گچھ کا آغاز کرتی، راجا بھینو کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم ہو جاتا اور وہ سمجھ لیتا کہ بابا مینائی نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ایسی صورت میں بابا مینائی کی بیٹی ریشم کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

خاصی سوچ بچار کے باوجود وہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

☆☆☆

زیبا جب تک اس حویلی میں رہتی، اس وقت تک کے لیے منشی نے حویلی کے لیے چار ملازمین کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کے دو شادی شدہ جوڑے تھے۔ دونوں عورتوں کو کچن ..... کا کام سونپا گیا تھا۔ دونوں مرد حویلی کی صفائی ستھرائی اور زیبا کی خدمت کے لیے تھے۔

کھانے کے بعد منشی ان دونوں کو دیوان خانے میں لے آیا۔ اس نے کہا تھا کہ زیبا جن لوگوں کو حویلی کی صفائی کے سلسلے میں انعام دینا چاہتی تھی، انہیں دیوان خانے ہی میں بلا لیا جائے گا۔

وہ لوگ آئے تو زیبا نے مناسب رقم دے کر ان کی دل جوئی کی۔ وہ سب زیبا کو دعائیں دے کر رخصت ہوگئے۔

زیبا نے منشی سے پوچھا۔ "وہ لڑکا شاہو نہیں آیا؟"

"وہ تو پتا نہیں کہاں غائب ہوگیا ہے بی بی صاحبہ۔" منشی نے کہا۔ "میں نے بلوایا تھا اسے... وہ اپنے گھر پر تھا ہی نہیں۔ یہ نئی نئی عمروں کے لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں بی بی صاحبہ! نکل گیا ہوگا کسی طرف... آئے گا کسی وقت۔"

زیبا مسکرا دی۔ اسے منشی کے منہ سے "نئی نئی عمروں کے لڑکے" کہنا دلچسپ لگا تھا۔

"اب میں ذرا حویلی سے نکل کر ادھر ادھر گھومنا چاہتی ہوں۔" زیبا نے منشی سے کہا۔

"جیپ باہر کھڑی ہے بی بی صاحبہ۔" منشی نے کہا۔ "آپ جب تک یہاں ہیں، وہ آپ کے لیے وقف رہے گی۔ ڈرائیونگ کے لیے میں ٹیپو کو بلواؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈرائیونگ میں بھی جانتی ہوں اور میرے یہ دوست بھی....." پھر وہ شکیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تمہارا کیا ارادہ ہے؟ حویلی ہی میں رکو گے یا..."

"حویلی میں اکیلا کیا کروں گا؟ میں بھی چلتا ہوں۔"

"تو آؤ۔" زیبا کھڑی ہوگئی۔





وہ دونوں گاؤں کی آب و ہوا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے حویلی سے نکلے۔ جیپ سامنے ہی کھڑی تھی۔

"میں ہی چلاؤں گی۔" زیبا نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ توقع درست ثابت ہوئی کہ چابی جیپ ہی میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ شکیل اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

جیپ چلی ہی تھی کہ شکیل سوال کر بیٹھا۔ "ٹیپو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کیوں؟" زیبا نے چونک کر شکیل پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "کوئی خاص بات؟"

"دیہاتی نہیں معلوم ہوتا۔"

"ہوں۔" زیبا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے دماغ میں کچھ سوالات چکرا گئے۔ کیا شکیل صرف یہی جتانا یا کہنا چاہتا تھا کہ ٹیپو دیہاتی نہیں معلوم ہوتا؟ یا اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی؟ کیا اس نے بھی ٹیپو اور ٹھیکے دار کی بیٹی ثروت کی نگاہیں تاڑ لی تھیں؟

یہ سوچتے ہوئے زیبا نے ہنس کر کہا۔ "میں نے کئی ایسے شہری دیکھے ہیں جو دیہاتی معلوم ہوتے ہیں لہٰذا یہ میرے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ٹیپو دیہاتی نہیں معلوم ہوتا۔"

"میں کیسا معلوم ہوتا ہوں؟" شکیل کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

زیبا دھیرے سے ہنس دی۔ "تم پھر اس موضوع کی طرف آنا چاہتے ہو جس پر گفتگو لاحاصل ہوگی۔"

شکیل مسکرایا۔ "تم کیا سمجھتی ہو... میں کس موضوع کی طرف آنا چاہتا ہوں؟"

"یہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔"

"تم سے زیادہ کیوں؟"

"اس لیے کہ تم ہی وہ موضوع چھیڑنا چاہتے ہو۔"

ان باتوں کے دوران میں جیپ گاؤں کی حدود سے نکل کر کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے ایک راستے پر دوڑنے لگی تھی۔

"اس ویرانے میں کیوں نکل آئیں تم؟" شکیل نے پوچھا۔

"گاؤں سے نکل کر ویران راستوں ہی کا رخ کیا جا سکتا تھا۔"

زیبا نے جواب دیا۔ دراصل اس ویرانے کا رخ اس نے شکیل کو آزمانے کے لیے کیا تھا۔ گاؤں کی طرف آتے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ جیپ کو جھٹکا لگنے کے باعث شکیل جان بوجھ کر اس سے ٹکراتا رہا تھا۔ وہ احساس زیبا کی غلط فہمی بھی ہوسکتی تھی اس لیے اب اسے یہ جاننا تھا کہ وہ اس کی غلط فہمی تھی یا اس نے صحیح سمجھا تھا۔ اگر شکیل کوئی غلط حرکت کرتا تو زیبا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ وہ حویلی سے پستول اپنے ساتھ لے کر چلی تھی لیکن اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا دوست ذہنی طور پر اتنا پست نہ ہو۔

کھیتوں ہی میں ایک جگہ راستہ دائیں جانب مڑتا نظر آیا تو زیبا نے گاڑی اسی طرف موڑ لی۔

"کیا تم ان راستوں سے بھی واقف ہو؟" شکیل نے پوچھا۔

"نہیں۔" زیبا نے جواب دیا۔ "مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ کھیتوں میں دور دراز تک کھاد پہنچانے کے لیے ایسے راستے بنائے جاتے ہیں جن پر بیل گاڑیاں چل سکیں۔ یہ کچا راستہ بارش کی وجہ سے خاصا خراب ہوگیا ہے اس لیے بیل گاڑی کے پہیوں اور بیل کے پیروں کے نشانات صاف نظر آرہے ہیں۔"

اس کچے راستے پر بھی جیپ کو دھچکے لگ رہے تھے لیکن ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ شکیل اس سے ٹکرایا ہو۔

"مگر اس طرف آنے کا مقصد؟"

"ارے۔" زیبا پھر دھیرے سے ہنسی۔ "تم ہی لاہور سے آتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہریالی نظر نہیں آرہی ہے۔ اب دیکھو، دونوں جانب ہریالی ہی ہریالی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"ایک مہک سی پھیلی ہوئی ہے۔"

"اس میں تمہاری مہک بھی تو شامل ہے۔"

"تم پھر بہک رہے ہو شکیل۔" زیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم بہت اچھے دوست ہیں۔ ہمیں اسی حد تک محدود رہنا چاہیے۔ رومانس کی طرف مت جاؤ۔"

"کیا زین تمہیں بہت پسند ہے؟"

"میں تمہیں اس بارے میں کبھی کچھ بتا چکی ہوں۔ اب پھر وہ موضوع نہ چھیڑو تو اچھا ہے۔"

شکیل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "اچھا تم بتاؤ، ہم کس موضوع پر بات کریں؟"

"موضوع تو بہت ہیں۔"

اسی وقت زیبا کی نظر کھیتوں کے اندر بنی ہوئی ایک جھونپڑی پر پڑی۔ لیکن اس جھونپڑی کی خستہ حالی بتا رہی تھی کہ شاید اسے بہت عرصے سے استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ وہاں کوئی ہل یا ٹریکٹر بھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن زیبا کی توجہ اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف ایک کتے کے بھونکنے کی وجہ سے ہوئی تھی جو بار بار جھونپڑی میں جارہا تھا اور باہر آکے بھونکنا شروع کر دیتا تھا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" زیبا بڑبڑائی۔

"پاگل کتا معلوم ہوتا ہے۔" شکیل نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس کا انداز تو پاگلوں جیسا نہیں ہے۔"

"تم چاہتی کیا ہو؟" شکیل نے منہ بنایا۔

"دیکھنا چاہیے، کیا چکر ہے؟" زیبا متجسس ہو رہی تھی۔

"فضول بات ہے۔" شکیل کا منہ بنا رہا۔ "بارش کی وجہ سے کیچڑ ہوگی۔ پیر لت پت ہو جائیں گے۔ کپڑے بھی خراب ہوں گے۔ بس نکل چلو، رفتار بڑھاؤ۔"

زیبا نے جیپ موڑ لی۔ اسی وقت اس کی نظر چند دیہاتیوں پر پڑی جو کھیتوں میں دوڑتے ہوئے اس جھونپڑی کی طرف جارہے تھے۔

"وہ بھی کتے کے بھونکنے ہی کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔ وہ کتا اسی گاؤں کا ہوگا۔"

"ارے چھوڑو... تم بھی کن خرافات میں پڑ رہی ہو، ہوگا کچھ۔"

☆☆☆

حویلی پہنچ کر زیبا اور شکیل جیپ سے اترے ہی تھے کہ زیبا کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ زیبا نے موبائل نکال کر اسکرین پر نمبر دیکھا اور پھر اس کا بٹن دبا کر اپنے کان کی طرف لے جاتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"انگلینڈ سے زین کی کال ہے۔"

"ہیلو زین!" زیبا نے حویلی کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "کیا آرہے ہو کراچی؟ ہیتھرو ائرپورٹ پر ہو کیا؟"

دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ "میں کراچی ائرپورٹ پر ہوں۔"

"ارے... کیا تمہارا نمبر..."

"انگلینڈ کا ہی موبائل ہے ابھی میرے پاس... میں نے کہا نا... ابھی میں ائرپورٹ سے باہر نکلا ہی ہوں۔ یہاں کا نمبر میرے پاس ابھی کہاں ہوگا۔"

"خوشی ہوئی کہ تم کراچی آگئے ہو لیکن تم سے ملاقات دو ایک دن بعد ہوگی۔"

"دو ایک دن بعد کیوں؟ میں اپنے گھر جانے سے پہلے سیدھا تمہارے گھر پہنچوں گا۔"

زیبا ہنسی۔ "لیکن میں اس وقت اپنے گھر پر نہیں ہوں۔"

"کہیں بھی ہو، جلدی سے گھر پہنچو۔"

"جلدی سے نہیں پہنچ سکتی۔ بہت دور ہوں اس وقت..... اپنی زمینوں پر آئی ہوئی ہوں۔"

"ارے... تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ کل ہی تو تم سے بات ہوئی تھی۔"

"آج صبح اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ میں اب کسی وقت فون کر کے تمہیں بتاتی۔"

"اچانک پروگرام... کوئی خاص بات؟"

"کراچی آؤں گی تو بتاؤں گی۔"

"کب آرہی ہو؟"

"امکان ہے کہ پرسوں آجاؤں گی۔"

"اچھا لیکن ابھی میں تمہارے گھر ہی جاؤں گا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم نے انگلینڈ سے روانگی کے وقت کچھ چیزوں کے لیے کہا تھا کہ وہ تمہارے لیے لیتا آؤں۔ وہ خرید لی ہیں میں نے۔ میں وہ اٹیچی کیس تمہارے گھر چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔ وہاں وہ ہوں گے نا... تم ذکر کیا کرتی تھیں... مینائی بابا!"

"ہاں، مینائی بابا تو تمہیں گھر پر مل جائیں گے لیکن ایسی جلدی کیا ہے تمہیں؟ میں آؤں گی تو لے لوں گی۔"

"تم نے اپنا جو پتا مجھے بتایا تھا، وہ پوری طرح میرے ذہن میں ہے۔ ساری زندگی کراچی ہی میں گزری ہے میری... تمہارے گھر کے آس پاس..... کا سارا نقشہ میرے ذہن میں ہے۔ مجھے اپنے گھر پہنچنے کے لیے تمہارے گھر کے قریب سے گزرنا پڑے گا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اٹیچی کیس اپنے گھر نہ لے جاؤں۔ میری بہنیں تجسس میں پڑ جائیں گی کہ اس اٹیچی کیس میں کیا ہے جو میں انہیں نہیں دکھا رہا ہوں۔ میں ابھی گھر والوں کو تمہارے بارے میں نہیں بتانا چاہتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" زیبا نے ہنس کر کہا۔ "دے جاؤ میرے گھر... میں ابھی مینائی بابا کو بھی فون کیے دیتی ہوں ورنہ وہ اٹیچی گیس لیتے ہوئے ہچکچائیں گے۔ آج کل کراچی کے حالات کچھ ایسے ہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کر دو فون... پرسوں ضرور آجانا۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

"اب ایک شکایت میں بھی کروں تم سے؟ تم تو کر چکے ہو کہ میں اپنی زمینوں پر آگئی اور کل رات تم سے بات ہوئی تھی تو میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ میں تو خیر اچانک پروگرام کی





وجہ سے آئی ہوں لیکن تم نے کراچی آنے کا پروگرام اچانک نہیں بنایا ہوگا۔ رات کو جب میں نے تم سے بات کی تھی تو تم اپنی سیٹ بک کرا چکے ہو گے لیکن تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی پھر کہا گیا۔ "میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"چلو خیر، اب پرسوں ملاقات ہوگی۔"

زیبا نے سلسلہ منقطع کیا اور پھر مینائی بابا کا نمبر ملانے لگی۔ اس دوران میں وہ اور شکیل حویلی میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ دیوان خانے میں جا کر بیٹھ بھی چکے تھے۔ شکیل سوچ میں ڈوبا ہوا خاموشی سے زیبا کی طرف دیکھتا رہا۔

زیبا نے مینائی بابا کو ہدایت دینے کے بعد موبائل بند کرتے ہوئے مسکرا کر شکیل کی طرف دیکھا۔

"زین صاحب آخر تشریف لے ہی آئے۔" شکیل بولا۔

"تمہارے لہجے سے ایسا لگا ہے شکیل جیسے زین کی آمد تمہیں گراں گزری ہو۔" زیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہارے احساسات ایسے نہیں ہونا چاہئیں۔ میں اور تم صرف دوست ہیں۔"

شکیل کے انداز سے ظاہر ہوا جیسے اس نے زیبا کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"کیا خیال ہے، چائے پی جائے؟" وہ بولا۔

"پہلے تو میں نہا کے کپڑے بدلوں گی۔ کھیتوں میں اتنا وقت گزار کر کپڑے بھی گرد آلود ہوتے ہیں اور جسم بھی... تمہاری حالت بھی مجھے ایسی ہی نظر آرہی ہے۔ تم بھی نہا کر کپڑے تبدیل کر لو۔ چائے اس کے بعد پئیں گے۔"

شکیل سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

زیبا نے اپنے کمرے کا رخ کرنے سے پہلے ملازمہ کو ہدایت کر دی کہ بیس منٹ بعد چائے تیار ملے۔ شکیل اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

زیبا سوچ رہی تھی کہ اگر شکیل کے انداز میں تبدیلی نہ آئی تو زین کی وجہ سے کسی وقت بدمزگی بھی ہو سکتی ہے۔

ہر چند زیبا نے ابھی زین سے شادی کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن وہ اس سے محبت تو بہرحال کرتی تھی۔ شکیل اس کا صرف دوست تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شکیل اس حد سے آگے بڑھے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شکیل کو اس قسم کی باتوں سے کس طرح باز رکھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں دیوان خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

زیبا کو ڈر تھا کہ شکیل پھر کوئی ایسی بات چھیڑ دے گا کہ اب وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ سکے گی اور اس کا پارا چڑھ جائے گا جو اس کی دانست میں مناسب نہیں ہوتا اس لیے اس نے ماضی کے اس وقت کے قصے چھیڑ دیے جب وہ لندن نہیں گئی تھی۔ اس زمانے میں شکیل اپنے والد کے ساتھ اس کے گھر آیا کرتا تھا۔ شامی صاحب کو شطرنج سے دلچسپی تھی۔ رانا سکندر بھی اچھی خاصی شطرنج کھیل لیا کرتے تھے چنانچہ وہ دونوں بساط بچھا کر بیٹھ جاتے۔ زیبا کو شطرنج سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شکیل کے ساتھ لان میں نکل جاتی۔ وہاں وہ دونوں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ شکیل کبھی پوائنٹ اسکورنگ میں بے ایمانی کر جایا کرتا تھا۔ اس پر ان دونوں میں جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے کبھی کبھی زیبا اپنے چچا کو منصف یعنی ریفری بنا لیا کرتی تھی لیکن ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب شامی صاحب اور رانا سکندر شطرنج کھیلنے کے بجائے گپ شپ میں مصروف ہوا کرتے تھے۔

رانا سکندر کی موجودگی میں شکیل بے ایمانی نہیں کر پاتا تھا اور زیادہ تر زیبا ہی جیتا کرتی تھی۔ ان باتوں میں خاصا وقت گزر گیا۔

"اب بھی پہلے ہی کی طرح اناڑی ہو کیا؟" زیبا نے ہنس کر کہا۔ "اس زمانے میں تو بس بے ایمانی کر کے ہی جیتا کرتے تھے۔"

شکیل مسکرایا۔ "میں سمجھ گیا ہوں کہ تم نے اتنی دیر سے یہ باتیں کیوں چھیڑ رکھی ہیں۔ تم نہیں چاہتیں کہ میں زین کے بارے میں کچھ کہوں۔"

اس طرح شکیل وہ موضوع چھیڑ ہی بیٹھا تھا جس پر وہ کچھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس معاملے میں بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ منشی بوکھلایا ہوا سا وہاں آیا تھا۔

"شامو کو کسی نے قتل کر دیا بی بی صاحبہ!" وہ کسی قدر ہانپ رہا تھا۔

"کیا؟" زیبا جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

"جی بی بی صاحبہ۔" منشی نے کہا۔ "اس کی لاش کھیتوں میں ایک جھونپڑی میں پڑی تھی۔"

زیبا کے دماغ میں وہ سارا منظر چکرا گیا جو اس نے کھیتوں میں دیکھا تھا۔

"وہ جھونپڑی ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔" منشی کہہ رہا تھا۔ "ابھی تو پتا بھی نہیں چلتا شامو کی لاش کا۔ وہ تو گاؤں کا ایک کتا ادھر جا نکلا۔ اس نے لاش دیکھی تو بھونکنا شروع کر دیا۔ اس کے بھونکنے کی وجہ سے گاؤں کے چند لوگ جو کچھ دور کھیتوں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کام کر رہے تھے، جھونپڑی کی طرف...''

زیبا نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ شامو وہی لڑکا ہے جو مجھ سے ملنا چاہتا تھا؟''

''جی بی بی صاحبہ! گاؤں میں سب لوگ ڈرے ہوئے ہیں لیکن سبھی شامو کے گھر کے باہر جمع ہو گئے ہیں۔''

''لاش کہاں ہے؟'' شکیل نے پوچھا۔ اب وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''لاش تو جھونپڑی سے اٹھا لائے ہیں۔ کسی نے اسے بڑی بیدردی سے ذبح کر ڈالا ہے۔''

''پولیس کو اطلاع کر دی؟'' زیبا نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ پولیس آتی ہی ہو گی۔''

''مجھے اس کے گھر لے چلیے۔'' زیبا نے بے تابی سے کہا۔ ''میں اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو زیبا۔'' شکیل بولا۔ ''ایسی لاش کس طرح دیکھ سکو گی؟ اسے ذبح کیا گیا ہے۔''

''میں دیکھوں گی۔'' زیبا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''چلیے منشی جی!'' پھر اس نے شکیل سے کہا۔ ''تم نہیں دیکھنا چاہتے تو یہیں رکو۔''

زیبا نے منشی کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ ان کے پیچھے شکیل بھی چل پڑا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ زیبا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ شکیل اس کے برابر میں اور منشی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس خیال سے زیبا کے جسم میں سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی کہ شامو اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن اسے قتل کر دیا گیا اور وہ اس سے نہیں مل سکا۔ کیا وہ اسے کچھ بتانے کے لیے اس سے ملنا چاہتا تھا؟ لہٰذا کسی نے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

مگر کس نے؟ کیا شامو...؟

زیبا اس سے زیادہ نہیں سوچ سکی۔ دو تین منٹ میں ہی جیپ شامو کے گھر پہنچ گئی جہاں لوگ جمع تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سہمے ہوئے ہیں۔ شامو کے گھر سے رونے دھونے کی بلند آوازیں آ رہی تھیں۔

زیبا انجن بند کر کے جیپ سے اترنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ کال مینائی بابا کی تھی... زیبا سمجھ گئی کہ زین ایجنسی کیس اس کے گھر چھوڑ گیا ہو گا اور مینائی بابا اسی کی اطلاع دینا چاہتا ہو گا۔

وہ زیبا کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے اس نے بات کیے بغیر موبائل کا سوئچ آف کر دیا۔ اس وقت اس کا دماغ شامو میں الجھا ہوا تھا اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ مینائی بابا ایک رسمی سی بات بتانے کے لیے بار بار فون کرے۔

اسی وقت پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ ایک اے ایس آئی کے ساتھ تین کانسٹیبل تھے۔ وہ چاروں شامو کے گھر میں گھس گئے۔

زیبا، شکیل اور منشی جیپ سے اتر آئے۔ گاؤں کے لوگ زیبا اور شکیل کو سلام کرنے لگے۔ انہیں اشارے سے جواب دیتے ہوئے وہ شامو کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھے۔

''کہاں جا رہی ہیں بی بی صاحبہ؟'' کسی طرف سے ٹیپو ان کے سامنے آ گیا۔

''لاش گھر میں ہی ہے نا؟''

''جی ہاں۔''

''میں وہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اس کی آدھی گردن کٹی ہوئی ہے بی بی صاحبہ! آپ نہیں دیکھ سکیں گی۔''

''میں دیکھوں گی۔'' زیبا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

لیکن یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے شامو کی لاش دیکھنے کی اتنی شدید خواہش کیوں تھی۔ وہ تیزی سے شامو کے گھر کی طرف بڑھی اور رونے دھونے کی تیز آوازیں اس کی سماعت پر خراشیں ڈالنے لگیں۔ منشی اور شکیل اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے لیکن ٹیپو جہاں تھا، وہیں رک گیا۔

زیبا کو شامو کے گھر میں داخل ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے ایک کانسٹیبل نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔

زیبا کو اس پر تھوڑی سی جھنجلاہٹ تو ہوئی لیکن غصہ یوں نہیں آیا کہ اسے روکنا کانسٹیبل کا فرض تھا۔ اسے دروازے پر کھڑا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ کسی کو اندر نہ داخل ہونے دے۔

''سنو!'' زیبا نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''میرا نام زیبا ہے۔ میں ان زمینوں کی مالک ہوں جہاں شامو کام کیا کرتا تھا۔ میں اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

کانسٹیبل نے منشی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں۔'' منشی نے اس سے کہا۔ ''یہ بی بی صاحبہ ہیں ہماری... ان زمینوں کی مالک۔''

''ایک منٹ رکیں آپ۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''میں صاب کو بتا دیتا ہوں۔'' وہ اندر چلا گیا۔

جلد ہی کانسٹیبل واپس آیا اور زیبا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ذرا سا انتظار کیجیے... صاب ابھی...''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کانسٹیبل کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اے ایس آئی باہر آ گیا۔ اس نے زیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے احترام سے کہا۔ ”مجھے معلوم تو ہو گیا تھا کہ رانا سکندر کی وفات کے بعد آپ ہی ان زمینوں کی مالک ہیں لیکن آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”میں کئی برس بعد یہاں آئی ہوں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے چچا کی وفات کے بعد میں یہاں پہلی مرتبہ آئی ہوں۔“

”شامو کی لاش ایسی حالت میں ہے کہ آپ دیکھ نہیں سکیں گی۔“

”ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن میں چاہتی ہوں...“

”خیر، آپ دیکھ لیجیے گا لیکن پہلے میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہوں گا۔“

”تنہائی؟“ زیبا نے اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے ہجوم کی طرف دیکھا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اے ایس آئی نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔ ”ہم ٹہلتے ہوئے کچھ دور نکل جاتے ہیں، آیئے۔“ اے ایس آئی نے ایک طرف قدم بڑھائے۔

زیبا اس کے ساتھ چل دی۔ منشی ان کے ساتھ آنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن شکیل نے قدم بڑھا دیے تھے۔

اے ایس آئی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ میرے دوست ہیں۔“ زیبا جلدی سے بول پڑی۔ ”میں آج صبح ہی یہاں آئی ہوں۔ یہ میرے ساتھ آئے ہیں۔“

اس مرتبہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے اس انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کی جیسے اب اسے شکیل کے ساتھ آنے پر کوئی اعتراض نہ ہو۔

”گاؤں والوں نے ایک بڑی غلطی کی ہے۔“ اے ایس آئی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لاش کو وہیں رہنے دیا جانا چاہیے تھا جہاں وہ پائی گئی تھی۔ خیر، آپ سے بات کر کے مجھے اس جھونپڑی کا معائنہ کرنے بھی جانا ہے۔ میں نے لاہور اطلاع کر دی ہے۔ وہاں سے ایک ٹیم آ رہی ہے۔ شامو کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی جائے گی۔“

زیبا کو خود بھی اندازہ تھا کہ یہ سب کچھ تو ہو گا۔ اے ایس آئی ایک درخت کے نیچے رک گیا۔ اب ہجوم ان سے اتنا دور تھا کہ ان کی آوازیں اس تک نہیں پہنچ سکتی تھیں لیکن سبھی لوگ انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اے ایس آئی بولا۔ ”شامو کے قتل کے سلسلے میں آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا سکتی ہیں جس سے تفتیش میں کچھ مدد مل سکے؟“

”سوری... میں تو آج ہی صبح یہاں آئی ہوں۔“ زیبا نے جواب دیا۔ ”ان سبھی لوگوں کو میں نے برسوں بعد دیکھا ہے۔ میں چھوٹی تھی جب یہاں آئی تھی۔ شامو تو اس وقت شاید بہت ہی چھوٹا ہو۔ مجھے ابھی اس کی عمر کا علم نہیں۔ صرف نام سنا تھا اس کا۔“

”نام کس سلسلے میں سنا تھا؟“

”اوہ۔“ زیبا سوچ میں پڑ گئی۔

”کوئی خاص بات؟“ اے ایس آئی اسے غور سے دیکھنے لگا۔

زیبا نے ایک سانس لی اور کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ یہ کوئی خاص بات ہے یا نہیں... دراصل میں خود بھی گاؤں کے کچھ لوگوں سے ملنا چاہتی تھی۔ اس وقت منشی جی نے مجھے بتایا تھا کہ شامو کو بھی مجھ سے ملنے کی خواہش تھی۔“

”خواہش کا سبب؟“ اے ایس آئی نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ ہندو تھا نا... منشی جی نے بتایا تھا کہ وہ میرے پیر چھونا چاہتا ہے کیونکہ میں اسے بالکل دیوی سمان معلوم ہوتی ہوں لیکن جب میں گاؤں کے لوگوں سے ملی تو شامو ان میں نہیں تھا۔“

”اوہ، تو وہ آپ سے نہیں ملا اور اس کے بعد کسی نے اسے قتل کر کے اس جھونپڑی میں ڈال دیا یا شاید اس جھونپڑی ہی میں لے جا کر قتل کیا ہو۔“

”شاید... میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔“

”میں ابھی جھونپڑی کا معائنہ کرنے جاؤں گا تو اندازہ ہو جائے گا۔ آپ یہ بتایئے کہ وہ آپ کے صرف پیر چھونا چاہتا تھا یا آپ کو کچھ بتانا چاہتا تھا؟“

اے ایس آئی کی بات زیبا کے شبہے کے مطابق تھی لیکن اس نے کہا۔ ”میں کیسے جان سکتی ہوں کہ اس کے دل میں کیا تھا؟“

اے ایس آئی کے چہرے سے غور و فکر کا اظہار ہونے لگا۔

”اچھا۔“ اے ایس آئی نے طویل سانس لی۔ ”آیئے۔“ وہ مڑا۔ ”لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا کہ آپ





شامو کی لاش نہیں دیکھ سکیں گی۔ وہ آپ کے لیے کیا، مردوں کے لیے بھی ایک لرزہ خیز منظر ہے۔ ہم پولیس والے تو عادی ہو چکے ہیں۔“

”ضد چھوڑ دو زیبا۔“ شکیل بھی بول پڑا۔

”اچھا۔“ زیبا نے طویل سانس لی۔

”آپ یہاں کب تک ہیں؟“ اے ایس آئی نے پوچھا۔

”پرسوں تک تو ہوں۔“

”یہ اچھا ہے۔ لاہور سے جو پولیس پارٹی آ رہی ہے، شاید وہ بھی آپ سے بات کرنا چاہے۔ میں تو فی الحال اس جھونپڑی کی طرف جاؤں گا، اس کے بعد شامو کے گھر والوں اور گاؤں کے کچھ لوگوں کا، خصوصاً منشی جی اور ان کے بیٹے کا بیان قلم بند کروں گا۔“

زیبا کچھ نہیں بولی۔ وہ تینوں ہجوم کے قریب پہنچ گئے تھے۔ زیبا نے شکیل کے ساتھ جیپ کی طرف قدم بڑھائے تو منشی نے بھی ان کے ساتھ چلنا چاہا۔

”منشی جی۔“ اے ایس آئی بول پڑا۔ ”آپ رکیں۔ مجھے آپ کا بیان لینا ہے۔“

”میں بی بی صاحبہ کو حویلی پہنچا کر آ جاتا ہوں۔“ منشی نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں منشی جی۔“ زیبا بول پڑی۔ ”آپ رک جائیں۔ میں اور شکیل چلے جائیں گے۔“

منشی کو چھوڑ کر زیبا اور شکیل جیپ میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

”میرا خیال ہے۔“ زیبا بولی۔ ”پوسٹ مارٹم کے بعد کل تک تو پولیس اس کی لاش واپس دے دے گی۔“

”تم اس کی ارتھی میں شریک ہو گی... ایک مسلمان ہوتے ہوئے؟“

”کیسی متعصبانہ بات کر رہے ہو شکیل۔“ زیبا نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ اسی گاؤں کا ایک فرد تھا۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ سبھی اس کے لیے مغموم ہیں۔ گاؤں کے سبھی لوگ اس کی ارتھی میں شریک ہوں گے۔“

شکیل خاموش رہا۔ زیبا سوچ میں ڈوبی ہوئی ڈرائیونگ کرتی رہی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شامو کے قتل کا تعلق اس معاملے سے ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہاں آئی تھی۔

حویلی پہنچنے کے بعد زیبا نے شکیل سے پوچھا۔ ”اس قتل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”گاؤں وغیرہ میں اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ انتقامی قتل بہت ہوتے ہیں اور...“ شکیل ذرا سا جھجکا۔ ”بعض اوقات اس قسم کے معاملوں میں لڑکیاں بھی واردات کا سبب بنتی ہیں۔“

یہ جواب غیر منطقی نہیں تھا لیکن زیبا کے دماغ میں کچھ اور ہی سمایا ہوا تھا۔

☆☆☆

منشی دو گھنٹے بعد حویلی آیا۔

”پولیس پارٹی لاہور سے آ گئی ہے بی بی صاحبہ۔“ اس نے بتایا۔ ”لاش لے جانے کے لیے ایمبولینس بھی آئی ہے۔“

”آپ نے ان لوگوں کو کیا بتایا؟“

”میں کیا بتاتا بی بی صاحبہ! میں تو شور سن کر گھر سے نکلا تھا۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ کھیتوں کی ایک جھونپڑی میں شامو کی لاش پڑی تھی اور لوگ وہ لاش وہاں سے اٹھا لائے تھے۔ بس یہی بتایا میں نے پولیس کو۔“

”شامو کی عمر کتنی ہو گی؟“ زیبا نے پوچھا۔

”سولہ سترہ سال کا ہو گا بی بی صاحبہ۔“

”پڑھا لکھا تو نہیں ہو گا؟“

”بس پرائمری تک پڑھا تھا۔ قریب کے قصبے میں ایک چھوٹا سا اسکول ہے۔ گاؤں کے کچھ لوگ بس وہیں پڑھے ہیں۔“

زیبا کوئی اور سوال کرنا چاہتی تھی کہ ملازمہ نے آ کر کھانا تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔

زیبا بولی۔ ”اس واقعے کی وجہ سے میری تو بھوک اڑ گئی ہے۔“

”اور میرے پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔“ شکیل بولا۔

”ایسا ہے تو چلو، تھوڑا بہت کھا لوں گی۔“

منشی جی نے ملازمہ کو ہدایت کی کہ کھانا لگا دیا جائے۔

پھر آدھ گھنٹے میں کھانے سے فراغت ملی ہی تھی کہ منشی نے پولیس کے آنے کی اطلاع دی۔

”یہ لاہور سے آئی ہوئی پارٹی کے ہیں۔“ منشی نے بتایا۔ ”وہ لوگ نئے سرے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں دیوان خانے میں بٹھا دیا ہے۔“

”مجھے توقع تھی اس کی۔“ زیبا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

وہ اور شکیل منشی کے ساتھ دیوان خانے میں پہنچے۔ وہاں صرف ایک انسپکٹر بیٹھا تھا۔ ایک کانسٹیبل بیرونی دروازے کے قریب کھڑا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسپکٹر نے نہ صرف زیبا سے بلکہ شکیل سے بھی پوچھ گچھ کی۔ پوچھ گچھ کا انداز اے ایس آئی ہی جیسا لیکن قدرے آڑے ترچھے انداز میں تھا۔ جیسے کسی سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی جائے لیکن یہ انداز اپنانے سے انسپکٹر کا کوئی مقصد تھا تو وہ پورا نہیں ہوسکا۔ زیبا نے قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کے شبے کے مطابق شاموا سے شاید کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

پوچھ گچھ کر کے انسپکٹر، کانسٹیبل کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی منشی اندر آیا۔

''کچھ پریشانی تو نہیں ہوئی بی بی صاحبہ؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں؟ پریشانی کیوں ہوتی؟''

''یہ شہر سے جو پولیس افسر آتے ہیں نا، ان کے سوال بڑے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی منشی جی۔'' زیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آپ اب جائیں۔ میں بھی آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں شامو کے گھر جاؤں گا۔ ان لوگوں کی کچھ ڈھارس میں بھی بندھاؤں۔ گاؤں کے بھی کچھ لوگ وہیں ہیں۔ میں ٹیپو سے .... بھی کہہ آیا تھا کہ وہیں رکے۔''

''لاش تو پوسٹ مارٹم کے لیے چلی گئی ہوگی؟''

''وہ تو اسی وقت چلی گئی تھی بی بی صاحبہ! میں نے بتایا تو تھا کہ شہر سے پولیس کے ساتھ ایمبولینس بھی آئی تھی۔''

''ہاں بتایا تھا آپ نے، خیال نہیں رہا مجھے۔''

منشی سلام کر کے رخصت ہوا تو زیبا کھڑی ہوگئی۔

''میں بھی اچانک بہت تھکن محسوس کرنے لگا ہوں۔''

''اچانک ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو شاید ایسا ہوتا ہی ہے کہ تھکن محسوس ہونے لگے۔'' زیبا نے اس کی تائید کی۔

حقیقتاً زیبا کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل تھکن محسوس نہیں کر رہی تھی۔ دراصل اسے کچھ سوچنا تھا اور سوچنے کے لیے تنہائی ضروری تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بولٹ کیا اور سوچ میں ڈوبی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ اسے کپڑے تبدیل کرنے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ اس کے دماغ میں بہت دیر پہلے ہی یہ بات چکرانے لگی تھی کہ جب منشی نے اسے شامو کی خواہش سے آگاہ کیا تھا تو صرف ٹیپو ہی قریب تھا۔

زیبا کے دماغ میں یہ سوال چکرانے لگا تھا کہ شامو کا قاتل کیا ٹیپو ہوگا؟

زیبا اپنی زمینوں کے مالی معاملے کی خرد برد ہی کی کوئی ٹوہ لینے کے لیے وہاں آئی تھی اور جو حالات سامنے آئے تھے، ان کی روشنی میں اسے ٹیپو ہی مشتبہ معلوم ہو رہا تھا۔ منشی نے اپنی بینائی کم ہو جانے کے باعث تمام معاملات ٹیپو کے سپرد کر دیے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ گاؤں کی طرف آتے ہوئے راہ میں ملنے والا ٹھیکے دار جامو گاؤں اسی لیے آیا تھا کہ فصل کے سلسلے میں ٹیپو سے بات کر سکے۔ ٹیپو کے نہ ملنے کے باعث ہی وہ گاؤں میں رکنے کے بجائے لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ٹیپو سے کہا تھا کہ اگلے دن وہ ٹیپو سے بات کرنے کے لیے اپنی بیٹی ثروت کو بھیج دے گا۔

ثروت خوب صورت بھی تھی اور زیبا کے اندازے کے مطابق تیز و طرار بھی۔ ٹیپو سے اس کا تعلق بھی زیبا پر ظاہر ہو چکا تھا لہٰذا اس بات کا امکان تھا کہ اسی نے ٹیپو کو ورغلا کر اس فراڈ پر آمادہ کیا ہو۔ اس کا امکان زیبا کی نظر میں یوں بھی زیادہ تھا کہ ثروت جیسی خوب صورت اور تیز طرار لڑکی ٹیپو جیسے معمولی شکل وصورت کے لڑکے کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ٹیپو کو صرف اس لیے پھانس سکتی تھی کہ اس کے ذریعے سے دولت حاصل کر سکے۔

زیبا یہ سب کچھ شامو کے گھر سے حویلی کی طرف آتے ہوئے سوچ چکی تھی۔ اب وہ بستر پر لیٹی تو اس کے ذہن نے ایک جست اور لگائی۔ اس سارے معاملے کا اصل دماغ ٹھیکے دار جامو بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے شامو کو پھانسنے کے لیے اپنی خوب صورت بیٹی کو آلۂ کار بنایا ہو۔

لیکن کیا کوئی باپ اپنی بیٹی سے یہ کام لے سکتا ہے؟

اب اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ زیبا کے دماغ میں خیال آیا۔

زیبا کی سوچ کا دائرہ اس وقت ٹوٹا جب دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' زیبا چونک کر اٹھ گئی۔

''میں ہوں۔'' باہر سے بلند آواز میں کہا گیا۔ آواز شکیل کی تھی۔

''خیریت؟'' زیبا دروازے کی طرف بڑھی۔

باہر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ زیبا نے دروازہ کھولا۔ سامنے شکیل کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا موبائل بھی تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''تم نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا ہے؟''

زیبا نے چونک کر اپنا موبائل نکالا اور ایک طویل سانس لے کر اسے آن کرتے ہوئے بولی۔ ''جب ہم شامو کے گھر





پہنچے تھے تو مینائی بابا کی کال آئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ زین کے بارے میں بتانا چاہتے ہوں گے کہ وہ اپنی کیس دے گیا ہے۔ وہ اطلاع میرے لیے کسی اہمیت کی حامل ہی نہیں تھی اور دماغ بھی شامو کے قتل میں الجھا ہوا تھا اس لیے میں نے موبائل بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد اسے کھولنے کا خیال ہی نہیں آیا لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا موبائل بند ہے؟''

''میرے ہاتھ میں موبائل تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن پتا چلا کہ تمہارا موبائل بند ہے۔''

''کیا بات کرنا چاہتے تھے؟'' زیبا نے موبائل پر مینائی بابا کا نمبر ملاتے ہوئے پوچھا۔

''سنتا رہا ہوں کہ گاؤں وغیرہ کی صبحیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔ میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ صبح جلدی اٹھ جاؤ تو باہر کہیں گھومنے کے لیے نکلیں۔''

زیبا جواب میں کچھ کہنے نہیں پائی تھی کہ اس نے اپنے موبائل..... میں مینائی بابا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔

''آپ کا فون کیوں بند تھا بی بی صاحبہ! میں کئی گھنٹے سے کوشش کر رہا تھا کہ آپ سے بات ہو جائے لیکن...''

''ہاں۔'' زیبا نے اس کی بات کاٹی۔ ''بے خیالی میں فون بند کر بیٹھی تھی۔ آپ مجھے یہی اطلاع دینا چاہتے ہوں گے کہ زین اٹیچی کیس دے گئے ہیں۔''

''اٹیچی کیس تو وہ دے گئے تھے لیکن کسی نے انہیں گولی ماردی ہے۔''

''کیا؟'' زیبا چیخ پڑی۔

''کیا ہوا؟'' شکیل نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

لیکن زیبا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سکتے کی سی حالت میں کھڑی دوسری طرف سے آنے والی مینائی بابا کی آواز سن رہی تھی۔ ''بی بی صاحبہ! وہ ٹیکسی میں آئے تھے۔ ٹیکسی باہر ہی رکوالی تھی۔ اٹیچی کیس لے کر وہ پھاٹک سے اندر آئے تھے تو میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور پھر اٹیچی کیس دے کر جانے لگے۔ پھاٹک کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔''

مینائی بابا پھاٹک کے ذیلی دروازے کو پھاٹک کی کھڑکی ہی کہا کرتا تھا۔

اب زیبا کے جسم پر ہلکی سی لرزش طاری ہو گئی تھی اور وہ مینائی بابا کی آواز سن رہی تھی۔ ''زین صاحب نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھنا ہی چاہا تھا کہ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اس وقت میں نے صاحب کو ہلکا سا جھٹکا کھاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور مجھے ان کی گردن کے پاس خون کی سرخی بھی دکھائی دی تھی۔ پھر وہ ٹیکسی ہی میں گر گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور شاید گولی چلنے کی آواز سن کر گھبرا گیا تھا۔ اس نے ٹیکسی دوڑا دی اور جانے کہاں چلا گیا۔''

''اس بات کو تو کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' زیبا کی آواز اس وقت بھرائی ہوئی سی تھی۔

''آخر ہوا کیا ہے زیبا؟'' شکیل نے دوبارہ پوچھا۔ اس کے لہجے سے بے تابی مترشح تھی۔

اس وقت زیبا، مینائی بابا کا جواب سن رہی تھی۔ ''جی ہاں بی بی صاحبہ! کافی دیر ہو گئی۔''

زیبا نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے شکیل کو مزید بولنے سے روکا اور مینائی بابا کی آواز سنتی رہی۔ ''گولی کی آواز سن کر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ایک پڑوسی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انہیں بتا دیا۔ انہوں نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس آ گئی۔ میں جتنا جانتا تھا، وہ میں نے انہیں بتا دیا۔ میں اتنا ہی جانتا تھا کہ ان صاحب کا نام زین تھا اور وہ آپ کے لیے ایک اٹیچی کیس دے گئے تھے۔ انہوں نے آپ کا موبائل نمبر پوچھا۔ میں نے وہ بھی انہیں بتا دیا لیکن یہ بھی کہا کہ میں نے آپ کو فون کیا تھا لیکن گھنٹی بجنے کی آواز کے بعد آپ کا فون بند ہو گیا اور جب سے اب تک بند ہی مل رہا ہے۔ پولیس کے آنے تک میں کئی مرتبہ آپ کا نمبر ملا چکا تھا۔''

''زین کا کچھ پتا چلا؟'' زیبا کی آنکھوں میں اب نمی آ گئی تھی۔

شکیل نے چونکے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''جی نہیں۔'' مینائی بابا نے جواب دیا۔ ''پولیس والوں نے یہاں خاصے لوگوں سے پوچھ گچھ کی تھی مگر ان میں سے کوئی بھی اس ٹیکسی کا نمبر نہیں بتا سکا۔ خود میں بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر پولیس افسر نے مجھے ایک کارڈ دیا اور کہا کہ جب بھی آپ سے میرا رابطہ ہو، میں اس کارڈ پر لکھے ہوئے نمبر پر اطلاع دوں اور آپ کو بھی وہ نمبر بتا دوں تاکہ آپ بھی ان سے رابطہ کر سکیں۔''

''نمبر بتائیں۔'' زیبا کی سانس پھولنے لگی تھی۔

مینائی بابا سے نمبر لینے کے بعد زیبا نے رابطہ منقطع کر دیا پھر وہی نمبر اپنے موبائل پر ملاتے ہوئے بولی۔ ''زین کو کسی نے گولی ماردی ہے شکیل۔''

''کیا؟'' شکیل کے منہ سے نکلا پھر تیزی سے بولا۔ ''کیا وہ...''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں۔" زیبا چیخ پڑی۔ "ایسی ویسی کوئی بات منہ سے مت نکالنا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ زندہ ہوگا۔ مینائی بابا نے بتایا تھا کہ..."

زیبا اپنی بات پوری نہیں کر سکی۔ اس نے موبائل پر جو نمبر ملایا تھا وہاں سے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"آپ زیبا صاحبہ ہی بول رہی ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی ہاں، زین کا کچھ معلوم ہوا؟"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" جواب دینے کے بجائے پوچھا گیا۔

"میں اپنی زمینوں پر ہوں۔ زین..."

اس مرتبہ دوسری طرف سے زیبا کا سوال پورا نہیں ہونے دیا گیا۔

"آپ جلد از جلد کراچی آنے کی کوشش کریں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"میں زین کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" روہانسی زیبا جھنجلا گئی۔

"جب آپ کراچی آجائیں گی، تبھی آپ کو کچھ بتایا جا سکے گا۔"

"لیکن..."

زیبا کے مزید کچھ بولنے سے پہلے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ زیبا موبائل اپنے چہرے کے سامنے لا کر اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مجھے کچھ بتاؤ تو زیبا!" شکیل نے کہا۔

"پانی منگواؤ۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔"

شکیل نے ایک ملازم کو آواز دی۔ زیبا ڈگمگاتے قدموں سے چلتی ہوئی بستر کے قریب گئی اور اس پر گر پڑی۔ اس وقت سے پہلے اسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ زین کو اتنی شدت سے چاہنے لگی تھی۔

پانی پینے کے بعد اس نے شکیل کو وہ سب کچھ بتایا جو اسے مینائی بابا سے معلوم ہوا تھا اور پولیس افسر سے جو گفتگو ہوئی تھی۔

"مائی گاڈ!" شکیل نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پولیس آفیسر نے اس پر اصرار کیوں کیا کہ تم کراچی پہنچو گی، تبھی تمہیں کچھ بتایا جا سکے گا؟"

"میرا دماغ شل ہوا جا رہا ہے شکیل۔"

"ہمت... ہمت سے کام لو زیبا! بلکہ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں یہاں سے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"جلدی سے کیا فائدہ؟ ہمیں کوئی فلائٹ نہیں مل سکتی۔"

"چانس لیا جا سکتا ہے زیبا۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں ملازم سے منشی اور ٹیپو کو بلواتا ہوں۔ ٹیپو کو تو ساتھ لینا ہی ہو گا۔ ہم خود بھی جیپ چلا سکتے تھے لیکن جیپ واپس لانے کے لیے بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔"

شکیل نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بیس منٹ بعد ہی ان کی روانگی عمل میں آگئی۔ زیبا نے اپنا کارڈ منشی کو دیتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اگر شاموں کے سلسلے میں پولیس کو اس سے کوئی بات کرنا ہو تو اس کے فون نمبر پر کی جا سکتی ہے۔

ڈرائیونگ اس وقت بھی ٹیپو ہی کر رہا تھا۔ شکیل اور زیبا پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔

"میں تمہاری شکر گزار ہوں شکیل۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد زیبا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیوں؟" شکیل نے اس کی طرف دیکھا حالانکہ اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کو صاف نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"میں تو یہی سوچ کر رہ جاتی کہ صبح سے پہلے کوئی فلائٹ نہیں ملے گی اور یہ انتظار مجھ پر قیامت بن کر گزرتا۔ میں جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہتی ہوں شکیل! پولیس آفیسر کے اس جملے سے مجھے ہول آرہا ہے کہ جب میں کراچی پہنچوں گی، تبھی مجھے کچھ بتایا جائے گا۔ یہ تو اسی صورت میں کہا جاتا ہے جب..." زیبا کی بھرائی ہوئی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم کیا سمجھ رہی ہو۔ ایسی بات اسی صورت میں کہی جاتی ہے جب اطلاع ایسی ہو کہ فون پر نہ دی جا سکتی ہو لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ خود پر اتنی مایوسی طاری نہ کرو۔"

"تم بہت اچھے ہو شکیل۔" زیبا نے ٹیپو کی وجہ سے انگریزی میں کہا۔ "مجھے تو یہ خیال آسکتا تھا کہ زین کے بارے میں ایسی ویسی کوئی اطلاع تمہارے لیے خوشی کا سبب بنے گی۔"

"کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیوں آسکتا تھا؟" شکیل بھی انگریزی میں بولا۔

"تم نے کھل کر کچھ نہیں کہا لیکن میں اپنے لیے تمہارے جذبات کا اندازہ لگا چکی ہوں۔ تمہیں یہ جان کر اچھا





"جی... جی ہاں... کہا تو یہی تھا۔" ٹیپو کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ کچھ سٹپٹا گیا ہو۔

اس کا سٹپٹا جانا معنی خیز تھا لیکن اس وقت زیبا کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس پر غور کر سکتی۔

سامنے سے آنے والی جیپ ہی تھی۔ اس کے قریب آجانے پر ٹیپو نے رفتار کم کی۔ سامنے سے آنے والی جیپ کی رفتار بھی کم ہوئی تھی۔ اس راستے کی چوڑائی اتنی ہی کم تھی کہ آمنے سامنے سے آنے والی گاڑیوں کو اپنی اپنی رفتار کم کر کے احتیاط سے ہی گزرنا پڑتا تھا۔

بہت قریب ہو جانے پر ہیڈ لائٹس میں ثروت کا چہرہ نظر آگیا۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر خاصی مضبوط لڑکی ہے۔ تین ساڑھے تین گھنٹے کا راستہ اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے طے کرنا ہر لڑکی کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔

ثروت نے بھی ٹیپو کو پہچان لیا اور اسے رکنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے بولی۔ "کہاں جا رہے ہو ٹیپو؟"

دونوں جیپیں سڑک کے دائیں بائیں رک گئیں۔

"ہمیں جلدی ہے ٹیپو۔" زیبا جھنجلا کر بولی۔

ٹیپو جلدی سے جیپ کو دوبارہ حرکت میں لاتے ہوئے بلند آواز سے بولا۔ "تم گاؤں پہنچو ثروت! بابا سے باتیں کرنا، میں لاہور ائیر پورٹ سے ابھی واپس لوٹوں گا۔"

جیپ ثروت کی جیپ سے آگے نکل گئی۔ ثروت نے زیبا اور شکیل کو گھور کر دیکھا تھا۔

"واپس آکے اس سے فصل کی بات کرنا ہے بی بی صاحبہ۔" ٹیپو بولا۔ "دو ایک دن میں فصل کے پیسے آپ کو روانہ کر دیے جائیں گے۔"

"اتنی رات کو آرہی ہے وہ؟"

"ڈیڑھ بجا ہے بی بی صاحبہ! اسے گاؤں پہنچتے پہنچتے پانچ ساڑھے پانچ بج جائیں گے۔ اس وقت تک گاؤں میں جگار ہو جاتی ہے۔"

"پھر بھی۔" شکیل بول پڑا۔ "اتنی جلدی آنا تو ضروری نہیں تھا۔"

"موڈی لڑکی ہے صاحب وہ۔"

"اور غالباً نڈر بھی ہے۔" شکیل نے کہا۔

ٹیپو کچھ نہیں بولا۔ پندرہ منٹ بعد جیپ لاہور کی حدود میں داخل ہو گئی۔

جب شکیل اور زیبا ائیر پورٹ پہنچ کر جیپ سے اترے تو

لگا تھا کہ میں زین سے محبت کرتی ہوں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی... پھر شکیل نے اس کی طرف رخ کیے بغیر سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ "تم نے میرے جذبات کا صحیح اندازہ لگایا تھا زیبا! لیکن مجھے بحیثیت انسان پرکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔ ایسا برا انسان نہیں ہوں کہ زین کے بارے میں کوئی منفی خبر میرے لیے خوشی یا طمانیت کا سبب بن جاتی۔"

"آئی ایم سوری شکیل۔"

"تمہاری اس وقت کی حالت سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ زین کے لیے تمہاری چاہت کتنی شدید ہے۔"

"مجھے بھی آج سے پہلے اپنے جذبات کی اس شدت کا اندازہ نہیں تھا۔"

"تم دیکھو گی زیبا! میں اب صرف تمہارا ہی نہیں، زین کے لیے بھی اچھا دوست ثابت ہوں گا۔ تمہارے دل کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ زین زندہ ہوگا۔ وہ صرف زخمی ہو کر ٹیکسی میں گرا ہوگا۔ ٹیکسی ڈرائیور گھبراہٹ میں بھاگ نکلا۔"

"ایسی صورت میں پولیس کو علم تو ہو جانا چاہیے۔" زیبا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کچھ علم ضرور ہو چکا ہوگا لیکن کوئی ایسی بات ہوگی جو فون پر بتانا مناسب نہیں سمجھا گیا ہوگا۔"

"ایسی آخر کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"یہ وہاں پہنچنے ہی پر معلوم ہوگا۔"

زیبا چپ ہو گئی۔ شکیل نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ ٹیپو چپ چاپ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ زیبا کی ہدایت پر اس نے جیپ کی رفتار حتی الامکان تیز رکھی تھی۔ اس ناہموار راستے پر اس سے زیادہ تیز رفتاری کسی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔

ان باتوں کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک شکیل اور زیبا میں کوئی طویل گفتگو نہیں ہوئی۔ کبھی کبھار ایک دو جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ جب جیپ لاہور کے قریب پہنچ چکی تھی تو سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔

"یہ اس وقت کون آرہا ہے ادھر؟" شکیل بولا۔ "تم نے بتایا تھا نا ٹیپو کہ یہ راستہ صرف تمہارے گاؤں کے لوگ استعمال کرتے ہیں اور گاؤں میں کسی اور کے پاس گاڑی نہیں ہے؟"

"شاید ٹھیکے دار جامو ہو۔ وہ صبح ہی صبح پہنچ کر مجھ سے ملنا چاہتا ہوگا۔"

زیبا کو کچھ خیال آیا تو وہ بول پڑی۔ "مگر اس نے تو کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو بھیج دے گا؟"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوا دو بجے تھے۔ انہوں نے ٹیپو کو رخصت کر دیا۔

"آرام کیے بغیر اتنی لمبی ڈرائیو اب تم پھر کرو گے؟" شکیل نے اس سے کہا۔

"میں اس سے زیادہ ڈرائیونگ کا بھی عادی ہوں صاحب۔" ٹیپو نے جواب دیا۔

شکیل اور زیبا تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ان دونوں نے انکوائری کی طرف رخ کیا۔

فوری طور پر انہیں جو کچھ معلوم ہوا، اسے سن کر زیبا کو اپنا دل سینے میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ اس رات باہر سے آنے والی کوئی فلائٹ نہیں تھی جو کراچی جاتی لیکن شکیل کے استفسار پر جو دوسری بات معلوم ہوئی، وہ اس حد تک اطمینان بخش تھی کہ چار بجے تک انتظار کرنے کے بعد وہ کراچی کے لیے روانہ ہو سکتے تھے۔ چار بجے ایک بوئنگ کراچی جانے والا تھا۔ شکیل نے اسی میں سیٹیں ریزرو کروالیں جو آسانی سے ہو گئیں۔ بوئنگ کسی حد تک خالی ہی روانہ ہونے والا تھا۔

"اتنی بھاگ دوڑ بیکار ہی گئی۔" کاؤنٹر سے لوٹتے ہوئے زیبا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لیکن غلطی تو ہم ہی سے ہوئی ہے شکیل! ہم اگر گاڑی سے فون کر لیتے تو بھی معلوم ہو جاتا کہ اس وقت کوئی بیرونی فلائٹ براستہ لاہور، کراچی نہیں جا رہی ہے۔"

"ہاں۔" شکیل نے تائید کی۔ "ہڑبڑاہٹ میں مجھے بھی خیال نہیں آیا ورنہ ہم اطمینان سے بھی آسکتے تھے۔ بہرحال، اب ڈیڑھ گھنٹے بعد تو ہم یہاں سے روانہ ہو ہی جائیں گے۔"

زیبا نے شکیل کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے موبائل پر مینائی بابا سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔

"مینائی بابا!" زیبا نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "میں ڈیڑھ گھنٹے بعد لاہور سے روانہ ہونے والی ہوں۔ شوفر سے کہہ دیجیے کہ وہ ساڑھے پانچ بجے ائرپورٹ پہنچ جائے۔"

"بہت اچھا بی بی صاحبہ! میں بہت پریشان تھا۔ اچھا ہوا کہ آپ جلدی آ رہی ہیں۔"

"کوئی خاص بات؟" یہ سوال کرتے ہوئے زیبا کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ شاید راجا بھیجو نے مینائی بابا کو فون کیا ہو۔

"جی نہیں بی بی صاحبہ! جو کچھ آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، اس کے علاوہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔" مینائی بابا نے کہا پھر پوچھا۔ "آپ نے پولیس والوں سے بات کی؟"

"کر چکی ہوں۔" زیبا نے کہا۔ "گاڑی وقت پر پہنچ جائے۔" اس کا لہجہ تاکیدی تھا پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

شوفر کراچی ائرپورٹ پر موجود تھا جب شکیل اور زیبا کراچی پہنچے۔ کار ان دونوں کو لے کر روانہ ہوئی۔

"میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑتی ہوئی نکل جاؤں گی۔" زیبا نے کہا۔

"میرا خیال ہے، تم سب سے پہلے تو پولیس اسٹیشن ہی جاؤ گی؟"

"ہاں۔"

"تو پھر میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ مجھے بھی تو اطمینان ہو جائے کہ معاملہ کیا ہے۔"

زیبا سر ہلا کر موبائل پر پولیس آفیسر سے رابطہ کرنے لگی۔

دوسری طرف سے کچھ غنودہ سی آواز آئی۔ "زیبا صاحبہ؟"

"ہاں۔" زیبا نے کہا۔ "میں کراچی پہنچ گئی ہوں۔ ائرپورٹ سے روانہ ہو گئی ہوں۔ سیدھی آپ کے پاس آ رہی ہوں۔ آپ شاید سو رہے تھے۔"

"جی ہاں لیکن پندرہ منٹ بعد پولیس اسٹیشن میں ہی ہوں گا۔ آپ کتنی دیر میں پہنچ رہی ہیں؟"

"اندازہ لگا لیجیے کہ ائرپورٹ سے پولیس اسٹیشن پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔"

زیبا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا اس لیے کار تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ فاصلہ جیسے جیسے کم ہوتا جا رہا تھا، زیبا کے دل کی دھڑکنیں اس خیال سے بڑھتی جا رہی تھیں کہ پولیس اسٹیشن پہنچ کر اسے نہ جانے کیا معلوم ہو۔ اس کا بڑھا ہوا اضطراب اسے بار بار پہلو بدلنے پر بھی مجبور کر رہا تھا۔ شکیل اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ اس نے زیبا کی کیفیت محسوس کر لی ہوگی۔

زیبا نے شوفر کو ہدایت دے دی تھی اس لیے کار پولیس اسٹیشن کے احاطے ہی میں جا کے رکی۔ اس کے رکتے رکتے زیبا نے اترنے کے لیے اپنی طرف کا دروازہ کھول لیا تھا۔ اس کی بے تابی اتنی ہی بڑھی ہوئی تھی۔

وہ اور شکیل برآمدے میں پہنچے ہی تھے کہ وہاں کھڑے





ہوئے پولیس کانسٹیبل نے پوچھا۔ "آپ زیبا صاحبہ ہیں؟"

"ہاں۔" زیبا ٹھٹک کر رکی۔

"صاحب ہی نے مجھے یہاں آپ کا انتظار کرنے کے لیے کہا تھا... آیئے۔" کانسٹیبل یہ کہتے ہوئے ایک طرف بڑھا۔

اس وقت پولیس اسٹیشن میں کسی قسم کی سرگرمی نہیں تھی البتہ اِکّا دُکّا کانسٹیبل اِدھر اُدھر موجود تھے۔

برآمدے میں ملنے والے کانسٹیبل نے زیبا اور شکیل کو ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں چالیس بیالیس سال کا ایس ایچ او ٹہل رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ رکا۔

"زیبا صاحبہ؟" وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

"جی۔"

ایس ایچ او کی نظریں شکیل کی طرف گئیں۔

"یہ میرے دوست ہیں۔" زیبا بولی۔

"یعنی شکیل صاحب... مجھے آپ کے ملازم مینائی بابا نے بتایا تھا کہ یہ آپ کے ساتھ ہیں۔"

"جی۔"

"مجھے آپ سے تنہائی میں بات کرنا ہے۔"

"اوہ۔" زیبا کے منہ سے نکلا۔

"ٹھیک ہے۔" شکیل آہستہ سے بولا۔ "میں باہر چلا جاتا ہوں۔"

"شکریہ۔" ایس ایچ او نے کہا۔

زیبا کے دل کی بڑھی ہوئی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ ایس ایچ او اسے تنہائی میں جانے کیا بتانا چاہتا تھا۔

شکیل کے باہر جانے کے بعد ایس ایچ او نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر زیبا کی طرف بڑھایا۔ "یہ بند ہے۔ آپ میرے سامنے ہی اسے چاک کر کے پڑھ لیں کہ اس میں درج ہوئے پرچے میں کیا لکھا ہے۔ مجھے یہی ہدایت کی گئی تھی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ جو کچھ آپ پڑھیں، اس کا جو ردِعمل آپ کے چہرے پر نظر آئے، وہ کوئی اور نہ دیکھ سکے۔ آپ کے دوست شکیل صاحب بھی نہیں۔"

زیبا نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ چاک کر کے اس میں سے پرچہ نکالا جس پر کسی حد تک مختصر سی تھی۔ وہ مختصر تحریر پڑھتے ہی خوشی کی ایسی لہر زیبا کے رگ و پے میں دوڑی کہ اسے اپنا سارا جسم ٹھنڈا ہوتا محسوس ہوا۔ کبھی کبھی خوشی کی شدت میں ایسا ردِعمل بھی ہوتا ہے۔

وہ تحریر زین ہی کی تھی۔ زیبا اسے اچھی طرح پہچانتی تھی۔ زین نے لکھا تھا۔

"زیبا! عجلت ہے۔ تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اپنے گھر پہنچو اور کسی کو بھی میرے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔

زین!"

زیبا کا دل چاہا، وہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو اپنے کلیجے میں رکھ لے۔

ایس ایچ او جو بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "غالباً کوئی اچھی خبر ہے۔"

"آپ کو نہیں معلوم؟" زیبا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"آپ کو یہ لفافہ کس نے دیا تھا؟"

"میرے ایک افسر نے... اور ہدایت کی تھی کہ جب بھی آپ سے فون پر رابطہ ہو، آپ کو کراچی بلا کر یہ لفافہ آپ کے حوالے کر دیا جائے۔"

یہ بڑی عجیب سی بات تھی لیکن زیبا خوشی سے سرشار تھی۔ وہ اس بارے میں غور نہیں کر سکی۔ اس نے پرچہ اور لفافہ اپنے پرس میں ٹھونسا۔

"شکریہ آفیسر۔" وہ کہہ کر واپسی کے لیے مڑی۔

کمرے سے نکلتے وقت اسے زین کی یہ تاکید بہرحال یاد رہی کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو، اس لیے اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے چہرے سے اس کی خوشی ظاہر نہ ہو۔

باہر شکیل سوچ میں ڈوبا ہوا اس کا منتظر تھا۔

"آؤ۔" زیبا نے اس سے کہا اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر زیبا نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ دوسری طرف سے شکیل بیٹھا۔

"چلو۔" زیبا نے شوفر سے کہا۔

کار آہستگی سے حرکت میں آئی۔

شکیل بولا۔ "کیا تم میرے صبر کا امتحان لے رہی ہو؟ مجھے نہیں بتاؤ گی کہ پولیس آفیسر نے تم سے کیا کہا؟"

"صرف یہ کہ میں اپنے گھر جاؤں اور فی الحال ایک آدھ دن تک گھر میں رہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ اس نے نہیں بتایا۔"

"میں تمہارے چہرے پر اطمینان دیکھ رہا ہوں۔ تم مضطرب نہیں ہو۔"

زیبا نے اپنے چہرے پر خوشی کے تاثرات نہیں آنے دیے تھے لیکن اتنی اداکاری نہیں کر سکی تھی کہ اتنی ہی مضطرب نظر آتی جتنی مضطرب پولیس اسٹیشن آتے ہوئے تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں وہ۔" زیبا جلدی سے بولی۔ "پولیس آفیسر نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ دو ایک دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ جواب ایسا نہیں تھا جو شکیل کو مطمئن کر سکتا۔ وہ زیبا کو گھورنے لگا۔ زیبا نے اس سے نظریں چرا لیں پھر شوفر سے کہا۔ "پہلے خالد بن ولید روڈ کی طرف چلو۔"

زیبا جانتی تھی کہ شکیل کا گھر خالد بن ولید روڈ پر ہے۔

"زیبا!" شکیل آہستہ سے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

"ارے نہیں۔" زیبا دھیرے سے ہنس پڑی۔ "میں کیا چھپاؤں گی تم سے؟"

"یہ میں کیسے جان سکتا ہوں لیکن تمہارا اس طرح ہنس پڑنا بھی کچھ معنی رکھتا ہے۔ گاؤں سے یہاں پہنچنے تک تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہیں آئی تھی۔"

زیبا کو فوراً خیال آیا کہ وہ کبھی اچھی اداکارہ نہیں بن سکتی۔

"پلیز شکیل!" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ میں فی الحال تمہیں کچھ اور نہیں بتا سکتی۔"

شکیل چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ زیبا کا جواب اسے گراں گزرا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے شکیل کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی۔

پھر شکیل کے گھر تک ان میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

اپنے گھر پر کار سے اترتے وقت شکیل نے کہا۔ "بہرحال... اگر تم کسی مشکل میں پڑو یا کوئی پریشانی ہو تو مجھے فون کرنے میں خجالت محسوس نہیں کرنا۔"

"میں خجالت کیوں محسوس کروں گی شکیل! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔"

شکیل نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اپنا سوٹ کیس لے کر کار کا دروازہ بند کر کے تیزی سے اپنے بنگلے کے پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔

"چلو۔" زیبا نے شوفر سے کہا۔

کار پھر حرکت میں آ گئی۔ زیبا کو یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ اس نے شکیل کو مکدر کر دیا تھا لیکن وہ زین کی تاکید نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

اب اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ زین اس کے گھر پر کیوں تھا اور بابا مینائی نے اسے یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی؟

جب وہ گھر پہنچ کر کار سے اتری تو مینائی بابا برآمدے میں موجود تھا۔

"کہاں ہے زین؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"جی وہ... وہ... ڈرائنگ روم میں..." مینائی بابا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اسے ڈر ہو گا کہ زیبا اس پر ناراض ہو گی کہ اسے زین کے بارے میں کیوں نہیں بتایا گیا۔

لیکن زیبا اس سے کچھ کہے بغیر تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ زین سامنے ہی کے صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے..... کش لے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ صرف قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپری دونوں بٹن کھلے ہوئے تھے۔ گلے کی بائیں جانب کراس بینڈیج دکھائی دے رہی تھی۔

زیبا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ برق کی طرح زین کی طرف جھپٹی۔ زین جلدی سے کھڑا نہ ہو جاتا تو زیبا اس پر گر ہی پڑتی۔ وہ زین کے سینے سے لپٹ گئی۔ اسے مینائی بابا کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔

مینائی بابا اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آیا تھا لیکن وہ صورتِ حال دیکھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"شکر ہے تم زندہ ہو۔" زیبا کی آواز میں لرزش تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس طرح زین کے سینے سے لگی تھی۔ پہلے بھی وہ دونوں اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوئے تھے۔

زین بولا۔ "اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہو رہا ہے کہ تم مجھے اتنی شدت سے چاہتی ہو۔ تمہیں مینائی بابا کا خیال بھی نہیں رہا۔"

زین کا آخری فقرہ سننے سے پہلے ہی زیبا بوکھلا کر اس سے الگ ہوئی اور اس نے مڑ کر دیکھا۔

زین ہنسا۔ "مینائی بابا خود ہی شرما کے باہر نکل گئے ہیں۔"

زیبا نے جھینپے ہوئے انداز میں زین کی طرف دیکھا۔

"یہ زخم..." زیبا نے زین کی گردن کی طرف دیکھا۔

"معمولی ہے۔" زین نے کہا۔ "گولی گردن کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ یہ تکلیف میرے لیے ناقابلِ برداشت نہیں ہے۔ بیٹھو! مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"باتیں تو مجھے بھی کرنا ہیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے تم پر گولی چلائی؟ میرا دماغ بہت الجھا ہوا ہے۔ سوال پر سوال آ رہے ہیں۔ تم نے وہ پرچہ پولیس آفیسر کو کیوں دیا تھا؟ اور تم میرے گھر میں کیسے رک گئے؟ مینائی بابا نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟"





زین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا اور بولا۔ "سب بتا دوں گا لیکن تمہیں بھی بہت کچھ بتانا ہے۔ میں نے وہ پرچہ پولیس آفیسر کو اس لیے دیا تھا کہ تم وہاں کوئی ہنگامہ نہ کر سکو۔"

"کیا مطلب؟"

"مینائی بابا نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم چار بجے کی فلائٹ سے آ رہی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم سیدھی پولیس اسٹیشن ہی جاؤ گی اور جب تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا تو تم پولیس والوں پر برس پڑو گی، انہیں ان کی ناکارکردگی پر برا بھلا کہو گی۔ تم نہ جانے کیا کیا کہہ بیٹھتیں اس لیے مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔"

"لیکن پولیس والوں نے تمہاری بات کیوں مان لی؟ اور تم میرے گھر میں کیسے رک گئے؟ مینائی بابا نے تمہیں یہاں رکنے کیسے دیا؟"

"سب بتا دوں گا۔ ذرا دھیرج سے کام لو۔ آج تم مجھ سے جس انداز میں لپٹی ہو، اس سے مجھے تمہاری محبت کی شدت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اب میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ تم ذرا بھی قیاس نہیں کر سکتیں کہ میں کس قسم کا کورس کرنے کے لیے لندن گیا تھا۔ میں تمہیں پہلے اسی بارے میں بتاؤں گا ورنہ باقی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکیں گی۔"

"کوئی خفیہ کورس؟" زیبا نے پلکیں جھپکائیں۔

"کہہ سکتی ہو۔" زین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہلے میں یہ بتا دوں کہ میں یہاں کی ایک خفیہ ایجنسی میں کام کرتا ہوں۔"

زیبا چونک گئی۔

"ہاں۔" زین نے سر ہلایا۔ "میرے ادارے نے مجھے برطانیہ اس لیے بھیجا تھا کہ میں وہاں کے ایک ادارے سے ایک خاص نوعیت کی تربیت حاصل کروں۔"

زیبا جیسے سناٹے میں آ گئی۔ وہ واقعی یہ قیاس نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

زین نے جو کچھ بتایا، وہ زیبا کے لیے کسی جاسوسی کہانی کی طرح تھا۔ کہانی اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب زین نے بتایا تھا کہ اس کا تعلق کسی خفیہ لافورس منٹ ایجنسی سے تھا۔

ائرپورٹ پر وہ اپنے گھر فون کر کے گاڑی بھی منگوا سکتا تھا لیکن اس نے ٹیکسی کو اس لیے ترجیح دی تھی کہ اسے پہلے زیبا کے گھر پہنچ کر وہ سامان دینا تھا جو وہ زیبا ہی کی فرمائش پر انگلینڈ سے لے کر آیا تھا۔ اس نے موبائل پر ہی یہ بات زیبا کو بتا دی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنے گھر سے کار منگواتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی دونوں بہنیں اسے لینے کے لیے ائرپورٹ پہنچ جاتیں۔

مینائی بابا کو اٹیچی کیس دے کر جب وہ واپس جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا تو اس پر سامنے کی فٹ پاتھ سے گولی چلائی گئی تھی۔ گولی اس طرف کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی آئی تھی اور زین کی گردن زخمی کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زین کو اندیشہ تھا کہ اس پر مزید گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں اس لیے اس نے خود کو ٹیکسی میں گرا دیا جس کا دروازہ وہ پہلے ہی کھول چکا تھا۔ اسی نے ڈرائیور سے کہا تھا کہ وہ ٹیکسی دوڑا دے۔ مینائی بابا کا یہ اندازہ غلط تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور گھبراہٹ میں بھاگ نکلا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کو وہ اپنے ادارے کے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں سبھی لوگ اسے جانتے تھے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ وہ اسی روز برطانیہ سے واپس آنے والا ہے لیکن اس بات نے انہیں چونکا دیا کہ زین کی گردن زخمی تھی۔

زین کے زخم کی ڈریسنگ وہیں ہوئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ بھی بتا دیا کہ اس پر گولی کہاں چلائی گئی تھی۔ اس کا ایک ساتھی چونک گیا۔ اس کے چونکنے کا سبب زین کے بیان کا وہ حصہ تھا جس میں زیبا کا اور اس جگہ کا نام آیا تھا جہاں زین پر گولی چلائی گئی تھی۔

زیبا کی کار پر دو تین روز پہلے فائرنگ کی جا چکی تھی جس کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے پولیس نے زین کے محکمے سے بھی مدد لی تھی۔ اسی لیے زین کے اس ساتھی کو زیبا کے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعے کا علم تھا۔ اس نے زین کو ان تمام باتوں سے آگاہ کیا۔ زین کے لیے وہ سب کچھ معنی خیز اس لیے بن گیا کہ اس کا زیبا سے تعلق تھا اور ان دونوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں یکسانیت بھی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ زیبا زخمی نہیں ہوئی تھی۔

زین کو اس معاملے میں کسی سازش کی بو محسوس ہوئی چنانچہ اس نے نجی طور پر اس معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کیا۔

ٹیکسی اس سارے وقت میں پولیس ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں موجود رہی۔ محکمے کے دو معمولی سپاہیوں سے اس کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا خون اور اس کے دھبے صاف کروا دیے گئے تھے۔

زین اسی ٹیکسی میں زیبا کے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن پھر اسے کچھ خیال آیا تو وہ اس علاقے میں پہنچ کر پولیس اسٹیشن کا رخ کر بیٹھا۔ ٹیکسی ڈرائیور یہ جان کر اس کا بندہ بے دام بنا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا تھا کہ اسے ایک بڑے افسر کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔

پولیس اسٹیشن میں زین نے ایس ایچ او کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور اپنا نام بھی بتایا۔ اپنے اوپر چلائی جانے والی گولی کی کہانی بھی سنائی تو ایس ایچ او بوکھلا سا گیا۔ اس نے فوراً اس سب انسپکٹر کو طلب کیا جسے اس نے مینائی بابا کے فون کرنے کے بعد زیبا کے گھر بھیجا تھا۔ پریشان سب انسپکٹر نے زین کے سامنے سارے واقعات بیان کردیے۔

زین نے زیبا کی کار پر ہونے والی فائرنگ کے بارے میں بھی ایس ایچ او سے پوچھ گچھ کی جس سے کوئی خاص نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا مگر اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس پر اور زیبا کی کار پر چلائی جانے والی گولیاں کسی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

زین نے اس بارے میں مینائی بابا سے پوچھ گچھ کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ وہ سب انسپکٹر کے ساتھ زیبا کے گھر پہنچا اور مینائی بابا سے تنہائی میں پوچھ گچھ کی۔ سب انسپکٹر کو تو مینائی بابا نے اپنے معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی لیکن زین کی پوچھ گچھ کا انداز مختلف تھا۔ اس نے جو تربیت حاصل کی تھی، پولیس اس تربیت سے مستفید نہیں ہوتی تھی۔ زین کو احساس ہو گیا کہ زیبا کا اپنی زمینوں پر جانے کا معاملہ کوئی خاص معنی رکھتا تھا۔ یہ احساس ہونے کے بعد اس نے مینائی بابا پر تابڑ توڑ سوالات کی بھرمار کی تو مینائی بابا سب کچھ اگلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ وہ زین کے سامنے گڑگڑایا کہ اس کی بیٹی کی زندگی خطرے میں نہ پڑنے پائے۔ اس نے بتایا کہ اس کی مالکن یعنی زیبا نے بھی اس معاملے میں پولیس سے رابطہ اسی لیے نہیں کیا تھا کہ پولیس کے طریقۂ کار کی وجہ سے اس کی بیٹی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی لہٰذا اس نے ابتدائی طور پر خود ہی اس معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کیا۔ وہ اسی سلسلے میں اپنی زمینوں پر گئی تھی۔

مینائی بابا نے یہ بھی بتا دیا کہ زیبا کے ساتھ اس کا بچپن کا دوست شکیل بھی گیا ہے۔ زین نے اس سے شکیل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ مینائی بابا جو کچھ جانتا تھا، وہ اس نے بتا دیا۔

زین نے..... وہ ویڈیو بھی دیکھنا چاہیں جو اسے راجا بھینو بھیجا کرتا تھا لیکن مینائی بابا نے بتایا کہ زیبا نے وہ ویڈیو احتیاط سے رکھی ہیں جن کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم۔

اس سے پوچھ گچھ کے بعد زین واپس اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ وہاں سے اس نے لاہور کی پولیس سے رابطہ کیا اور اس سے راجا بھینو نامی ڈاکو کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ اسے بھی راجا بھینو کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا جو ٹیپو سے زیبا کو معلوم ہوا تھا۔

زین کو یہ الجھن بھی تھی کہ زیبا نے اپنا موبائل بند کیوں کر رکھا تھا لیکن اسے دوسری الجھن یہ بھی لاحق ہو گئی کہ زیبا کی زمینوں پر کام کرنے والے لڑکے شاموکوس خانے میں فٹ کرے۔ کیا وہ قتل اسی سلسلے کی کڑی ہو سکتا تھا جس کی چھان بین کے لیے زیبا وہاں گئی تھی؟

لاہور پولیس سے زین کو اس سلسلے میں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہو سکی لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی طور پر خود اس سارے معاملے کو دیکھے گا۔ وہ زیبا کو بھی سازش کے اس جال سے نکالنا چاہتا تھا اور مینائی بابا کی بیٹی کی زندگی بھی اس کے پیشِ نظر تھی۔

دوبارہ وہ زیبا کے گھر پہنچا تو اس کے ساتھ کچھ ایسا سامان بھی تھا جس کے ذریعے وہ مینائی بابا کے موبائل پر آنے والی کالز ریکارڈ کر سکتا تھا۔ وہ اس امکان کو پیشِ نظر رکھنا چاہتا تھا کہ شاید راجا بھینو مینائی بابا کو فون کرے۔

زین نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس سارے معاملے کو نمٹائے بغیر وہ اپنے گھر نہیں جائے گا۔ وہ اپنی بہنوں سے وعدہ کر چکا تھا کہ برطانیہ سے واپسی پر وہ صرف ایک دن کے لیے دفتر جائے گا اور پھر ایک ہفتے کی چھٹی وہ اپنی بہنوں اور والدین کے ساتھ گزارے گا۔

اب ضروری تھا کہ وہ زیبا ہی کے گھر میں قیام کرتا۔ اس نے ٹیکسی اس وقت تک اپنے ساتھ ہی رکھی تھی۔ اب اس نے اپنا سامان اتار کر ٹیکسی والے کو دگنے سے بھی زیادہ معاوضہ دے کر رخصت کر دیا۔ اس نے ڈرائیور کو تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ اس سارے معاملے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور اگر اس نے یہ غلطی کی تو اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

ڈرائیور کو اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ وہ ایک گمبھیر معاملے میں شریک رہا ہے اس لیے اسے محتاط رہنا پڑے گا۔

زین نے پولیس کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ لوگ اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کریں گے۔

زیبا کے گھر میں اس نے اپنا سامان ڈرائنگ روم ہی میں رکھا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر اب دو تین گھنٹے تک زیبا کا موبائل بند ہی ملا تو وہ لاہور پولیس سے رابطہ کر کے وہاں سے کسی آدمی کو گاؤں بھجوائے گا اور زیبا کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ وہ اس معاملے میں عجلت اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا





کہ لاہور پولیس اپنے طور پر زیبا پر توجہ نہ دینے لگے۔

نو بجے مینائی بابا نے اس کے لیے کھانے کا بندوبست بھی کر دیا۔ کھانے کے بعد زین کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ سگریٹ پیتا ہوا ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔ اس کی بے چینی حد سے زیادہ بڑھ چکی تھی جب مینائی بابا کے موبائل فون پر زیبا کی کال آ گئی۔ مینائی بابا نے اس کے سامنے ہی کال ریسیو کی۔ زین اسے پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ زیبا سے کیا باتیں کرنا ہوں گی۔

اس سارے معاملے میں رازداری برتنا زین ضروری سمجھ رہا تھا۔ اگر وہ خود زیبا سے بات کرتا تو یہ بات زیبا کے دوست شکیل پر بھی ظاہر ہو جاتی کہ وہ زندہ ہے۔ کیونکہ فوری طور پر زین کو شکیل کے بارے میں تفصیلات نہیں معلوم ہو سکی تھیں اس لیے وہ شکیل سے بھی رازداری برتنا چاہتا تھا۔

ریکارڈنگ کے آلے کا ایک تار مینائی بابا کے موبائل سے منسلک تھا اس لیے زین نے ساری باتیں بھی سنیں۔ فوری طور پر اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ زیبا خیریت سے ہے۔

اسے یقین تھا کہ زیبا اب فوراً پولیس اسٹیشن فون کرے گی لہٰذا اس نے بھی ایس ایچ او سے رابطہ کرنے میں لمحوں کی تاخیر نہیں کی اور اسے سمجھا دیا کہ اسے زیبا سے کیا بات کرنا ہے۔ زین نے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے کسی معتمد ماتحت کو زیبا کے گھر بھیج دے۔

اس آدمی کے آنے تک زین وہ پرچہ لکھ چکا تھا جو بعد میں زیبا کو ایس ایچ او سے ملا۔

زین کو یقین تھا کہ زیبا اب جلد از جلد کراچی پہنچنے کی کوشش کرے گی اور سب سے پہلے پولیس اسٹیشن کا رخ کرے گی اور قوی امکان تھا کہ شکیل بھی اس کے ساتھ ہو گا۔

زین کا خیال درست ثابت ہوا لیکن اس کے لکھے ہوئے پرچے کی وجہ سے یہ بات شکیل کو بھی معلوم نہیں ہو سکی کہ وہ زندہ تھا۔

یہ ساری کہانی زیبا کے لیے خاصی سنسنی خیز تھی۔ یہ سب کچھ سنتے ہوئے وہ بیچ بیچ میں زین سے کوئی سوال بھی کر بیٹھتی تھی۔ آخر زین کی ساری کہانی سن لینے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں قیاس بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہاں یہ سب کچھ ہوا ہو گا۔“

”اب تم مجھے وہ ویڈیو کیسٹز دکھاؤ جو مینائی بابا کو کسی لے بھیجی تھیں۔“

”وہ بھی دکھا دیتی ہوں لیکن اب کچھ ناشتا وغیرہ تو کر لیا جائے۔“

”ناشتے کے لیے کہہ دو۔ اسی دوران میں ویڈیو بھی دیکھ لی جائے گی۔“

زیبا نے آواز دے کر مینائی بابا کو بلایا اور ہدایت کی۔

”ان کا سامان کسی کمرے میں پہنچوا دیجیے۔“ اس نے زین کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ملازم سے ناشتا تیار کرنے کے لیے بھی کہیے۔“ پھر وہ کھڑی ہو گئی اور زین کی طرف دیکھ کر بولی۔

”آؤ۔ ویڈیو میرے کمرے میں ہیں۔ چھپا کر رکھی ہیں میں نے۔“

ویڈیو کے ذکر پر مینائی بابا کو چوکنے دیکھ کر زیبا کو کہنا پڑا۔ ”آپ گھبرائیں نہیں مینائی بابا! سب کچھ تو آپ خود ہی انہیں بتا چکے ہیں۔ اب ویڈیوز دکھانے سے کیا فرق پڑے گا۔“

”گھبرائیے نہیں۔“ زین نے بھی مینائی بابا کی ڈھارس بندھائی۔ ”آپ کی بیٹی پر کوئی آنچ نہیں آنے پائے گی۔“

”مجھے یقین ہے۔“ مینائی بابا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جب آپ بی بی صاحبہ کے اتنے اچھے دوست ہیں تو آپ کو بھی میرا اتنا ہی خیال ہو گا جتنا بی بی صاحبہ کو ہے۔“ آخر میں مینائی بابا کی آواز بھرا گئی تھی لیکن پھر وہ تیزی سے مڑ کر ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔

زیبا زین کو اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ دنوں ویڈیوز دیکھنے میں کچھ ہی وقت لگا تھا لیکن زین نے دوبارہ بھی ویڈیوز دیکھیں، پھر زیبا سے بولا۔ ”راجا بھینو یا وہ جو کوئی بھی ہے، اس کی وجہ سے تمہیں کتنا نقصان ہوا ہے؟“

”ڈھائی کروڑ روپے سالانہ کا۔“

”مینائی بابا کو اتنی ہمت ہوئی کیسے؟ تمہیں اتنا نقصان ہوتا رہا اور وہ...“

”بیٹی کے لیے باپ کی محبت کم نہیں ہوتی زین! مینائی بابا مجھے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے رو پڑے تھے۔ انہوں نے گڑگڑا کر کہا تھا کہ میں ان کی بیٹی کو بچالوں یا اس نقصان کی وجہ سے انہیں جیل بھجوا دوں۔“

”تم بہت ہمدرد ہو مینائی بابا کی؟“

”بے شک۔“ زیبا نے کہا۔ ”اگر یہ فراڈ کرنے والے مجرم کا پتا نہ لگ سکا تو میں ان کی بیٹی کی خاطر آئندہ بھی یہ نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

زین سر جھکا کے کچھ سوچنے لگا۔ زیبا خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ زین کچھ رک کر بولا۔ ”شاموکے سلسلے میں تمہیں شبہ ہے کہ وہ تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا؟“

”بس یونہی ایک خیال آ گیا تھا ذہن میں۔“



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جب منشی نے تمہیں شامو کے بارے میں بتایا تھا تو تمہارے قریب اور کون تھا۔ میرا مطلب، منشی کی یہ بات کسی اور نے بھی سنی تھی؟"

"ہاں۔" زیبا نے جواب دیا اور سوچتی ہوئی بولی۔ "شکیل تو میرے ساتھ تھا ہی، منشی کا بیٹا ٹیپو بھی تھا۔ کیا تم یہ شبہ کر رہے ہو کہ ان دونوں میں سے کوئی شامو کا قاتل ہو سکتا ہے؟"

"شبہ تو ہر ایک پر کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاملہ نہیں سلجھایا جا سکتا۔"

"شکیل تو حویلی ہی میں رہا تھا۔" زیبا نے کہا۔

"یہ تم یقین سے کہہ سکتی ہو... شکیل تمہارے سامنے ہی رہا تھا؟"

"نہیں۔" زیبا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں دو گھنٹے آرام کرنا چاہتی تھی۔ شکیل کے لیے حویلی میں دوسرے کمرے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا تھا۔"

اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دستک دینے والا ملازم تھا جو ان کے لیے ناشتا لے کر آیا تھا۔

ناشتے کے دوران میں زیبا بولی۔ "تمہاری آنکھوں میں سرخی ہے۔"

"ظاہر ہے۔ ایک تو سفر کی تھکان... پھر یہاں آتے ہی یہ معاملہ ہو گیا۔ رات بھی جاگتے ہوئے گزری ہے مگر نیند تو تمہاری آنکھوں میں بھی ہے۔"

"میں بھی رات بھر کی جاگی ہوئی ہوں۔"

"بس تو پھر اب تم ناشتا کر کے سونے کے لیے لیٹو۔" زین نے کہا پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ "ابھی خاصا وقت ہے۔ مجھے سیٹ مل جائے گی۔"

"کیسی سیٹ؟"

"اگر ائرلائنز کے شیڈول میں ان دو سالوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تو مجھے دس گیارہ بجے کے درمیان کی کسی فلائٹ میں سیٹ مل جائے گی۔"

"کہاں جاؤ گے؟" زیبا نے چونک کر پوچھا۔

"لاہور۔" زین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اور وہاں سے تمہاری زمینوں پر! میرا خیال ہے کہ شامو کے قتل کی تحقیقات مجھے خود کرنا چاہئیں۔"

"لیکن تمہیں آرام کی ضرورت ہے زین! آٹھ نو گھنٹے کے سفر کے علاوہ رات بھر کے جاگے ہوئے بھی ہو۔ تمہاری گردن پر زخم بھی ہے۔"

"اس زخم کی تکلیف ایسی نہیں ہے کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔"

"مگر اتنی جلدی کیا ہے؟"

"اس قسم کے معاملات میں جلدی تو کرنا پڑتی ہے۔" زین نے کہا۔ "دیر ہو جانے کی صورت میں کوئی سراغ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔"

"لیکن..."

"کوئی بحث نہیں زیبا۔" زین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم سے یہ فراڈ کرنے والے کو میں جلد از جلد بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔"

"میری زمینوں تک کیسے پہنچو گے؟"

"لاہور پولیس کے ذریعے۔" زین نے کہا۔ "اور ہاں... کسی کو بھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کہاں گیا ہوں۔ ویسے مینائی بابا کو تو تم سے سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوگی۔ شکیل پر بھی ظاہر نہ کرنا کہ مجھ سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے۔"

زین نے زیبا کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اپنے موبائل پر ائرلائنز کی انکوائری سے معلوم کرنے لگا کہ لاہور کے لیے فلائٹ کب مل سکتی ہے۔

فلائٹ گیارہ بجے جانی۔

زیبا چاہتی تھی کہ وہ زین کو چھوڑنے ائرپورٹ جائے لیکن زین اس موقع پر بھی راز داری چاہتا تھا۔ اس نے زیبا کی معیت مناسب نہیں سمجھی اور ایک ٹیکسی منگوا کر اس میں اس طرح دبک کر بیٹھ گیا کہ اسے باہر سے دیکھا نہ جا سکے۔

اس کو روانہ کرنے کے بعد ہی زیبا نے اپنی خواب گاہ کا رخ کیا۔ اپنا موبائل اس نے آف کر دیا اور ٹیلی فون کو آنسرنگ مشین سے کنکٹ کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ شکیل اسے فون کرے گا اور فی الحال وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شکیل کو پہلے ہی اس کے اندازِ گفتار سے شبہ ہو چکا تھا کہ وہ اس سے کوئی بات چھپا رہی تھی۔

زیبا نے یہ سب انتظامات تو کیے مگر اسے یقین نہیں تھا کہ خیالات کے ہجوم میں اسے نیند آ سکے گی۔ یہ اور بات ہے کہ بستر پر لیٹنے کے بعد چند منٹ میں ہی نیند نے اسے اپنے اندھیرے میں گھسیٹ لیا۔

جب وہ جاگی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ شدید بھوک محسوس کر رہی تھی لیکن پہلے اس نے غسل کرنا ضروری سمجھا۔ پھر اس نے ٹیلی فون سے منسلک آنسرنگ مشین چیک



کی۔ اس کی توقع کے مطابق شکیل کی دو کالز آ چکی تھیں۔

بعد میں مینائی بابا سے معلوم ہوا کہ شکیل خود بھی آیا تھا لیکن مینائی بابا نے زیبا سے اس کی ہدایت کے مطابق کہہ دیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

سات بجے تک زین کی کال نہیں آئی تو اس نے خود ہی اس سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے زین نے ہنس کر کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ اب تک تم بہت بے چین ہو چکی ہو گی اور مجھے ضرور فون کرو گی۔"

"کیا رہا؟"

"ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ میں نے کھیت میں بہت دور دور تک آلۂ قتل تلاش کروانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں ملا۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ شاید پٹواری اس کھیل میں شامل ہو اس لیے میں اس سے بھی ملا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے میرے شبہے کو تقویت ملتی۔ میں منشی اور اس کے بیٹے ٹیپو سے بھی مل چکا ہوں۔ وہ البتہ کچھ پریشان نظر آیا کہ کسی اہم افسر نے شامو کے قتل کی چھان بین شروع کی ہے۔"

"کیا اس کی پریشانی اس لیے ہو سکتی ہے کہ اسی نے شامو کو قتل کیا ہے؟"

"ابھی میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی میں کچھ سوچ نہیں سکا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ناکام نہیں رہوں گا۔ اور ہاں۔" زین ہنسا۔ "درشن ان کے بھی ہو گئے جو ٹیپو سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔"

"ٹرو دت!" زیبا مسکرائی۔ "بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ تم اس پر لٹو تو نہیں ہو گئے؟"

"تمہارے بعد کسی چراغ میں روشنی باقی نہیں رہی زیبا۔" زین نے محبت بھرے لہجے میں کہا پھر بولا۔ "اچھا اب تم مجھے کل ہی فون کرنا۔ ہاں اگر ضروری ہوا تو میں خود تم کو فون کر لوں گا۔"

"اچھا۔"

"راجا بھینو کا فون تو نہیں آیا؟"

"نہیں۔ میں نے مینائی بابا سے پوچھا تھا۔ اگر اس کی کال آئی تو ریکارڈ ہو جائے گی۔"

"اچھا تو پھر اب کل تک کے لیے خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

☆☆☆

اس سے اگلے دن بھی زیبا نے اس لیے اپنا موبائل بند رکھا کہ شکیل کی کال نہ آ جائے۔ ٹیلی فون بھی آنسرنگ مشین سے کنکٹ رکھا۔ صبح آٹھ سے دس بجے کے دوران میں شکیل کی دو کالیں آئیں۔ اس نے آنسرنگ مشین کی ریکارڈڈ آواز ضرور سنی ہو گی لیکن اس نے اپنا کوئی پیغام ریکارڈ کروائے بغیر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

زیبا الجھن کا شکار رہی کہ شکیل اس کے "غائب" ہو جانے کے باعث خاصا پریشان ہو گا لیکن وہ زین کی ہدایت بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ شکیل سے بات کرنا اور اس سے سب کچھ چھپانا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

بارہ بجے تھے جب زیبا نے موبائل پر زین سے رابطہ کیا۔

"بہت موقع سے فون کیا تم نے۔" دوسری طرف سے زین ہنس کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"کوئی خاص مطلب نہیں، یونہی کہہ دیا میں نے۔ دراصل میں اس وقت ائرپورٹ پر ہوں بلکہ طیارے میں سوار ہونے والا ہوں۔ ایک بج کر چالیس منٹ پر میں کراچی پہنچ جاؤں گا۔"

زیبا جلدی سے بولی۔ "راجا بھینو..."

"کراچی آ کے بتاؤں گا سب کچھ... اب تمہیں کسی سے بھی میرے بارے میں کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اوہ! تمہاری اس بات نے تو میرا ذہن بہت ہلکا کر دیا۔ میں نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا اور ٹیلی فون آنسرنگ مشین سے کنکٹ کر دیا تھا۔ میں شکیل سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اور وہ مجھے مسلسل فون کر رہا ہے۔ وہ میرا بچپن کا دوست ہے زین۔"

"اب تم اس سے بات کر لو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"فوراً دوڑا چلا آئے گا وہ۔"

"ٹھیک ہے۔ اچھا اب میں ڈس کنکٹ کر رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ زیبا کچھ کہتی، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ اب زیبا نے اپنا موبائل بند نہیں کیا اور ٹیلی فون سے بھی آنسرنگ مشین کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب وہ شکیل سے بات کر سکتی تھی۔ زین نے کہہ ہی دیا تھا کہ اب کسی سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں، لیکن زیبا نے شکیل سے خود



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رابطہ نہیں کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ زین پہلے آجائے اور وہ جان لے کہ زین نے کس حد تک کامیابی حاصل کی تھی اور کس طرح کی تھی۔

وہ بار بار گھڑی دیکھنے اور بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ زین نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہو گا۔ زیبا کو سب سے زیادہ فکر مینائی بابا کی بیٹی کی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھی۔ وہ ٹہلتی ہی رہی اور وقت خاصا گزر گیا۔

مینائی بابا کا موبائل وہیں ایک تپائی پر رکھا ہوا تھا جس سے ریکارڈنگ مشین منسلک تھی۔ مینائی بابا کو اگر موبائل کی گھنٹی سنائی دیتی تو وہ وہیں آ کے کال ریسیو کرتا۔

اور اتفاق سے اسی وقت ایسا ہوا جب زیبا وہاں ٹہل رہی تھی۔

"مینائی بابا!" زیبا نے جلدی سے پکارا۔

لیکن مینائی بابا جہاں بھی تھا، گھنٹی کی آواز سن چکا تھا۔ وہ لپکتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔

"دیکھیں کس کی کال ہے۔" زیبا نے کہا اور ٹہلتی رہی۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اسے ان خیالات سے مینائی بابا نے چونکایا۔

"بی بی صاحبہ!" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ تو راجا بھینو کی کال ہے۔"

"کیا؟" زیبا تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔

"یہ نمبر۔" مینائی بابا نے موبائل کی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نمبر وہی ہے۔ راجا بھینو مجھے اسی نمبر سے کال کرتا رہا ہے۔"

"ریسیو کریں۔" زیبا نے جلدی سے کہا۔

مینائی بابا نے جیسے ہی موبائل آن کیا، ریکارڈنگ مشین آٹومیٹک طور پر چل پڑی۔

"ہیلو!" مینائی بابا نے کہا۔

"کیا حال ہے مینائی بابا؟" دوسری طرف سے کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "پہچان تو گئے ہو گے؟" ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔

"راجا بھینو!" مینائی بابا کی آواز میں لرزش تھی۔ "میری بیٹی مجھے آخر کب ملے گی راجا بھینو؟"

"مجھے جتنا روپیا حاصل کرنا تھا، کر چکا۔ اب میں تمہاری بیٹی اور داماد کو رہا کر رہا ہوں۔"

"داماد کو۔" مینائی بابا نے چونک کر کہا۔

ان کی باتیں زیبا بھی سن رہی تھی۔ اس نے ریکارڈنگ مشین سے منسلک ہیڈ فون اپنے کانوں پر چڑھا لیا تھا۔

دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔ "ہاں! تمہارے داماد کو، زاہد عرف راجا بھینو کو۔"

"کیا... کیا مطلب؟" مینائی بابا تھوڑا سا ہکلا گیا۔

"ہاں مینائی بابا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم نے ویڈیو میں اپنی بیٹی سے جو کچھ سنا، وہ جھوٹ تھا۔ میں ہی اسے یہ جھوٹ بولنے کے لیے مجبور کرتا تھا۔ تمہاری بیٹی کے ساتھ تمہارا داماد بھی میری قید میں تھا۔ میں نے ان دونوں کو الگ الگ رکھا تھا۔ خیر! میں نے تمہیں بس یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ اپنے گھر سے باہر نکلو۔ پھاٹک سے کچھ ہی فاصلے پر تمہیں ایک ویگن فٹ پاتھ سے لگی کھڑی نظر آئے گی۔ تمہاری بیٹی اور داماد اسی میں ہیں۔"

فوراً ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

زیبا نے جلدی سے ہیڈ فون اپنے کانوں سے اتارا۔

"میری بچی، بی بی صاحبہ!" مینائی بابا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"چلیں!" زیبا بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تین ملازموں کو بھی پکارا۔

دروازے سے باہر نکلتے وقت زیبا کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ موبائل اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے اسکرین پر شکیل کا نمبر دیکھا اور کال ریسیو کی۔

"ہاں شکیل۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

"کہاں غائب ہو؟"

"اب تو گھر پر ہی ہوں۔"

زیبا، مینائی بابا اور تین ملازم تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بڑھ کیا رہے تھے، تقریباً دوڑ رہے تھے۔

"ہانپ کیوں رہی ہو؟" شکیل نے پوچھا۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ جب ملو گے تو بتاؤں گی۔ اب میں فون بند کر رہی ہوں۔" پھاٹک سے باہر نکلتے وقت زیبا نے موبائل آف کر دیا۔

کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ہوئی ویگن فوراً دکھائی دے گئی تھی۔

ویگن میں ریشم بھی تھی اور ایک نوجوان جسے زیبا نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ زاہد ہی ہو سکتا تھا۔ دونوں بے ہوش تھے۔

☆☆☆

ملازمین کی مدد سے ریشم اور زاہد کو بنگلے میں لایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کو دیکھنے



لگے اور پھر ریشم چیخ کر مینائی بابا سے لپٹ کر رونے لگی۔ مینائی بابا بھی رو رہا تھا اور ریشم کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

"تم کچھ بتاؤ زاہد۔" زیبا بولی۔ "ریشم تو کچھ بتانے کی حالت میں نہیں ہے۔"

"آپ!" زاہد حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ "آپ بی بی... صاحبہ..."

"ہاں۔" زیبا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"میں کیا بتاؤں؟ میں گھر میں سو رہا تھا جب کسی نے مجھے دبوچ لیا۔" زاہد نے پریشانی کی حالت میں کہا۔ "نہ جانے کیا سنگھا کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو میں کسی کمرے میں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کتنے آدمیوں نے اغوا کیا تھا لیکن میرے سامنے ایک ہی آتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول ہوتا تھا۔ مجھے دھمکی دی تھی اس نے کہ اگر میں نے شور مچانے یا کوئی اور حرکت کرنے کی کوشش کی تو مجھے ذبح کر دیا جائے گا ورنہ مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ ریشم بھی تمہارے ساتھ اغوا کی گئی تھی؟"

"نہیں۔" زاہد نے جواب دیا۔ "وہ آدمی میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ میں نے ریشم کے بارے میں بہت پوچھا لیکن مجھے جواب نہیں ملا۔"

زیبا کا دماغ بری طرح الجھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر اسے مزید کیا کہنا یا کیا کرنا چاہیے۔

ریشم کا رونا دھونا کم ہوا اور وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس کے کمرے میں دو آدمی آیا کرتے تھے۔ ایک تو خاموش رہتا تھا لیکن دوسرا اس سے باتیں کرتا تھا۔ اس نے ریشم کو بہت ڈرایا دھمکایا لیکن عملی طور پر اسے کوئی تکلیف نہیں دی۔ بس ویڈیو بناتے وقت وہ ریوالور نکال لیا کرتا تھا۔ اس نے ریشم کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے وہی سب کچھ نہ کہا جو اسے بتایا گیا ہے، تو وہ اسے گولی مار دے گا۔ اس قسم کی دھمکیوں کے علاوہ ریشم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی گئی تھی۔

"لیکن بیٹی!" مینائی بابا بولا۔ "دوسری ویڈیو میں تو تم لہولہان تھیں؟"

"ویڈیو بنانے سے پہلے اس نے مجھ پر خون کے رنگ کا پانی ڈالا تھا اور مجھے مجبور کیا گیا تھا کہ میں وہی کچھ کہوں جو اس نے مجھے باقاعدہ یاد کروایا تھا۔"

"تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں دی گئی؟" مینائی بابا نے کہا۔

"نہیں بابا... میرے کھانے پینے کا... ہر بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔"

ریشم کی یہی بات زاہد نے بھی دہرائی۔

اسی وقت شکیل آ گیا اور وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی سوالیہ نظریں زیبا پر جم گئیں۔

"مینائی بابا!" زیبا بولی۔ "آپ ان دونوں کو کسی کمرے میں لے کر جائیے۔ انہیں آرام کرائیں۔"

اس وقت یہی ضروری تھا۔ مینائی بابا ریشم اور زاہد کو وہاں سے لے گئے۔ ان کے ساتھ ملازمین بھی چلے گئے۔

"بیٹھو۔" زیبا نے شکیل سے کہا۔

"کیا معاملہ ہے یہ؟ اور تم کہاں غائب تھیں؟ موبائل بھی بند کر رکھا تھا۔ بہت پریشان کر دیا تم نے مجھے۔"

"میں اسی لڑکی اور اس کے شوہر کی تلاش میں تھی۔"

"کون ہیں یہ؟"

"مینائی بابا کی بیٹی اور داماد۔" زیبا نے جواب دیا اور پھر اسے شروع سے ساری باتیں بتانے لگی۔ یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی زمینوں پر کیوں گئی تھی۔ پھر بات وہاں تک پہنچی جب کراچی آنے کے بعد وہ شکیل کے ساتھ پولیس اسٹیشن گئی تھی۔

وہ سب کچھ سنتے ہوئے شکیل بہت حیران نظر آ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اس نے کئی سوال بھی کیے۔

"پولیس اسٹیشن۔" شکیل بولا۔ "وہیں سے تو تم میرے لیے معما بن گئیں۔"

"مجبوری تھی۔" زیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ایس ایچ او نے مجھے ایک پرچہ دیا تھا جو زین نے مجھے لکھا تھا۔"

"کیا مطلب؟" شکیل ہکا بکا نظر آیا۔

زیبا نے اس پرچے کی تحریر بتانے کے بعد اس کے بعد کی کہانی بھی شروع کر دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ زین کا تعلق ایک خفیہ ایجنسی سے ہے اور وہ کسی خاص قسم کی تربیت کا کورس کرنے برطانیہ گیا تھا۔

شکیل ادھ کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے وہ سب کچھ سنتا رہا اور پھر یکایک بول پڑا۔ "اب وہ کہاں ہے؟" اس نے زین کے بارے میں پوچھا۔

زیبا نے گھڑی دیکھی دی۔ دو بج چکے تھے۔

"وہ اب آنے ہی والا ہو گا۔" وہ بولی۔

"کہاں سے؟" شکیل نے پوچھا۔

"وہ اسی معاملے کی چھان بین کے لیے میری زمینوں پر گیا تھا۔ اب آ رہا ہے۔ ایک بج کر چالیس منٹ پر اس کی فلائٹ لینڈ کر چکی ہو گی۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہاں اس نے کیا معلوم کیا؟ مینائی بابا کی بیٹی اور داماد کا سراغ اسی نے لگایا تھا؟"

"نہیں، یہ دونوں تو ابھی ملے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی، ایک ویگن میں۔" زیبا نے وہ ساری روداد بھی سنا دی۔

"کمال ہے۔" شکیل حیرت سے بولا۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھے طلسم ہوش ربا جیسی کہانی سنا رہی ہو۔"

اسی وقت زین بیرونی دروازے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ زیبا جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ زین کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جو اس نے ابھی جلائی نہیں تھی۔

"میں بڑی بے چینی سے تمہاری منتظر تھی۔ مینائی بابا کی بیٹی اور داماد مل گئے ہیں۔"

زین ذرا بھی نہیں چونکا اور سرسری لہجے میں بولا۔

"کیسے؟"

"راجا بھینو ریشم کا شوہر زاہد نہیں ہے۔" زیبا نے جواب دیا۔ "جس نے بھی ان دونوں کو اغوا کیا تھا، اسی نے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ..."

زیبا نے وہ سب کچھ پھر دہرایا جو ذرا دیر پہلے شکیل کو بتا چکی تھی۔

"خوب!" اس مرتبہ بھی زین نے سرسری لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "زاہد پر تشدد کیا گیا ہے؟"

"نہیں، وہ دونوں ہی بالکل ٹھیک حالت میں ہیں۔"

زین نے اپنی انگلیوں میں دبی سگریٹ ہونٹوں کے ایک گوشے میں رکھتے ہوئے سلگائی اور اب بڑی توجہ سے شکیل کی طرف دیکھا جو اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔

"میں تعارف کرانا بھول ہی گئی۔" زیبا ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "یہ میرے دوست شکیل ہیں۔ اور شکیل... یہ زین ہیں۔ میں تم دونوں سے ہی ایک دوسرے کا تذکرہ کر چکی ہوں۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" شکیل نے زین سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا لیکن اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے بالکل خوشی نہیں ہوئی تھی۔

زین نے سر کی ہلکی سی جنبش اور مسکراہٹ پر اکتفا کی۔

زیبا نے ایک ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا پھر زین سے بولی۔ "تم نے کھانا تو جہاز میں کھا لیا ہوگا؟"

"ہاں۔"

"اور مجھے بھوک اس وقت لگے گی جب تم مجھے بتاؤ گے کہ وہاں سے کیا کر کے لوٹے ہو۔"

"کل رات ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔" زین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آدھی رات کے بعد کوئی چور ٹیپو کے گھر میں گھس گیا تھا۔ اتفاق سے تمہارے منشی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے شور مچا دیا۔ بستی کے اور لوگ بھی شور سن کر دوڑ پڑے لیکن چور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسے میں نے ایک دلچسپ واقعہ اس لیے کہا کہ وہ چور میں تھا۔"

"کیا؟" زیبا کے منہ سے نکلا۔

شکیل کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے تھے۔

"ہاں۔" زین بولا۔ "آلۂ قتل نہ ملنے کی وجہ سے مجھے کچھ مایوسی ہو رہی تھی اور میں اپنا شبہ دور کرنا چاہتا تھا یا اس شبے کو تقویت دینا چاہتا تھا کہ شامو کا قتل ٹیپو نے کیا ہے۔ ایسی واردات میں آلۂ قتل کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اپنے اسی شبے کی تصدیق یا تردید کے لیے میں آدھی رات کے بعد ٹیپو کے گھر میں جا گھسا تھا کہ اگر ٹیپو نے قتل کیا ہے تو شاید چھری وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا ہو۔ میں نے خاص طور سے کچن کی تلاشی لی۔ سارا کام مجھے ٹارچ کی روشنی میں کرنا پڑا۔ وہاں مجھے ایک چاقو اور دو چھریاں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک چھری کے دستے پر مجھے ہلکا سا سرخ نشان ملا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ خون کا دھبا ہو۔ ٹیپو نے وہ چھری دھوئی تو ہوگی لیکن وہ دھبا اس کی نظر سے چوک گیا۔ مجرموں سے اس قسم کی غلطیاں نہ ہوں تو قانون انہیں کبھی پکڑ ہی نہیں سکتا۔"

"تو کیا خون کا وہ دھبا..."

زیبا کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ زین بول پڑا۔

"ہاں! ٹیپو نے شامو کو قتل کیا تھا۔ آج صبح لیبارٹری سے اس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ دھبا شامو ہی کے خون کا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شامو کو جس چھری سے ذبح کیا گیا تھا، اس کی دھار میں کوئی چھوٹی سی جگہ ٹوٹی ہوئی یا گھسی ہوئی تھی۔ اس طرح پوری طرح ثابت ہوگیا کہ قتل اسی چھری سے کیا گیا تھا۔"

"لیکن ٹیپو نے ایسا کیوں کیا؟" زیبا حیرت سے بولی۔

"دراصل اس سارے معاملے میں اس لڑکی ثروت کا بھی کچھ کردار ہے جو اس ٹھیکے دار کی بیٹی ہے۔ ٹیپو سے دو روز پہلے بھی ثروت ملنے آئی تھی اور وہ دونوں کسی جگہ کھڑے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے تو انہیں اچانک کچھ فاصلے پر شامو کھیت میں کام کرتا نظر آیا تھا۔ ٹیپو کو دھڑکا لگا کہ شامو نے ان کی باتیں نہ سن لی ہوں۔ بعد کے دو دنوں میں ٹیپو نے محسوس کیا کہ شامو اس کا سامنا کرنے سے گریز کرنے





لگا تھا۔ اس سے ٹیپو کے شبے کو تقویت ملی۔ پھر جب منشی نے انہیں بتایا کہ شامو تم سے ملنا چاہتا ہے تو ٹیپو کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہ ٹیپو کو کسی بہانے اس جھونپڑی میں لے گیا اور اسے ذبح کر کے مار ڈالا۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟" زیبا نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹیپو نے سب اعتراف کر لیا ہے۔ دراصل آج صبح گیارہ بجے اسے گرفتار کیا جا چکا ہے۔ وہی تمہاری زمینوں کے ٹیوبوں میں گھپلے کا ذمے دار ہے۔"

"اسے اتنی ہمت کیسے ہوگئی؟" زیبا کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

"اس کے بیان کے مطابق ایک رات کھیتوں میں اسے ڈاکو راجا بھینو ملا تھا۔ اس نے ٹیپو کو بتایا تھا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا نہیں گیا۔ اسی نے ٹیپو کو تمہاری زمینوں کے معاملے میں گھپلے پر آمادہ کیا۔ اس نے ٹیپو کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے یہ کام نہ کیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔" زین نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ "اس ملاقات کے بعد ٹیپو بہت خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے ساری بات ثروت کو بتائی تو ثروت نے اسے اکسایا کہ وہ یہ کام ضرور کرے تاکہ وہ دونوں شادی کے بعد ایک پُرتعیش زندگی گزار سکیں۔ ثروت کے اکسانے پر ٹیپو اس جرم پر آمادہ ہو ہی گیا۔ وہ بے چارہ یہ گمان بھی نہیں کر سکا کہ راجا بھینو نے پہلے ہی سے ثروت کو اس کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔"

"یعنی ثروت راجا بھینو کی آلۂ کار تھی۔" زیبا بولی۔

"ظاہر ہے۔" زین نے کہا۔ "ہاں تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ٹیپو اور ثروت کی نگرانی میں نے کل ہی شروع کروا دی تھی۔ صبح ساڑھے دس بجے مجھے اطلاع ملی کہ ثروت ایک فلائٹ سے کراچی کے لیے روانہ ہوگئی ہے۔"

"کیوں؟"

"میں نے ٹیپو کے علاوہ اس سے بھی پوچھ گچھ کی تھی۔ یعنی کل۔ وہ مجھ سے خوف زدہ ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن کراچی کیوں؟"

"کیوں؟" زین نے شکیل کی طرف دیکھا۔ "اس سوال کا جواب آپ زیادہ بہتر دے سکتے ہیں۔"

"میں۔" شکیل چونکا۔

"ہاں، یہ سارا کھیل آپ ہی نے تو رچایا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" شکیل غصے کا اظہار کرتا ہوا تیزی سے اٹھا۔

"بیٹھ جاؤ شکیل!" زین نے بہت سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ بھاگنے کی کوشش تم کرو گے تو نہیں مگر احتیاطاً میں بندوبست کر کے آیا ہوں۔ وہ دیکھو۔"

یکا یک ہکا بکا رہ جانے والی زیبا نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ دو کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر نہ جانے کب وہاں آ کھڑے ہوئے تھے۔

شکیل صوفے پر گر پڑا۔ اس کا چہرہ جیسے دھواں دھواں ہونے لگا۔

"بہت خوب کام کیا ہے تم نے۔" زین نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اپنی دوست کو ہی حلال کرنے کی منصوبہ بندی کر ڈالی۔"

"زین!" زیبا کی آواز لرز اٹھی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ تمہارے دوست کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے۔"

شکیل اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"ایک بات کہی تھی میں نے کل تم سے۔" زین نے زیبا کی طرف دیکھا۔ "ہر ایک پر شبہ کرنا ہمارے پیشے کا لازمی جز ہے۔ کل میں جب یہاں سے گیا ہوں تو میں نے دو آدمیوں کو ان حضرت کی نگرانی کا کام سونپ دیا تھا۔ برطانیہ میں تم مجھے بتا چکی تھیں کہ ان حضرت کے والد شامی صاحب ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ شامی انڈسٹریز انہی کی ہے۔ میرے آدمیوں نے آسانی سے شامی کا گھر تلاش کر لیا اور پھر انہیں بھی دیکھ لیا۔ مجھے لاہور میں ان لوگوں نے فون پر رپورٹ دی کہ سال بھر پہلے یا اس سے کچھ پہلے شامی صاحب کو ایک ڈیل میں اتنا زبردست نقصان ہوا تھا کہ وہ دوالیا ہو گئے۔ گھر، ایک کار اور بینک میں دو ڈھائی لاکھ روپے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ اس صدمے سے ان کے جسم پر فالج گرا۔ تب سے اب تک ان کی زندگی بستر یا وہیل چیئر پر گزر رہی ہے۔ وہ مُردے کے مانند ہو گئے ہیں کیونکہ ان کی قوتِ گویائی بھی سلب ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہوا کہ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان حضرت نے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم کھول لی ہے۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ یہ بزنس انہوں نے شاید تمہارے ہی غصب شدہ پیسوں سے اسٹارٹ کیا ہو۔ پھر یہ شبہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب یہاں سے مجھے رپورٹ ملی کہ ان حضرت نے دو کروڑ کا ایک



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا ہے اور وہ چیک فردوس باجوہ کا ہے... اس کا علم ہونے سے مجھے خیال آیا کہ ان حضرت نے گوجرانوالہ میں فردوس باجوہ کے نام سے بھی اکاؤنٹ کھولا ہوگا۔ اس کی چیک بک ظاہر ہے کہ انہی کے پاس ہوگی چنانچہ انہوں نے فردوس باجوہ کے نام سے چیک کاٹ کر اپنے اصل نام کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا ہے۔ یہ سب کچھ میرے شبے کو توی کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ انہیں چائے پلانے کے لیے بینک منیجر نے روک لیا تھا۔ ان کو مزید تاخیر سے دوچار کرنے کے لیے میرے آدمیوں میں سے ایک نے ان کی کار کے ایک ٹائر کی ساری ہوا خارج کر دی تھی۔ وہیل تبدیل کرنے میں بھی انہیں کچھ وقت لگا۔ اسی دورانیے میں میرے دوسرے آدمی نے ان کے دفتر میں جا کر مہمانوں کی ایک کرسی کے نیچے ایک ڈیوائس لگا دی۔ اس ڈیوائس کا تعلق نیچے کھڑی ہوئی ایک کار سے تھا جس میں رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر وہ ساری باتیں ٹیپ ہو جاتیں جو ان کے کمرے میں ہوتیں۔ اس کام کے بعد مجھے لاہور میں ہی ایک ایسی رپورٹ ملی کہ میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ لاہور سے روانہ ہونے والی ثروت انہی کے دفتر میں پہنچی تھی۔ ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی، اس کا ٹیپ میں اپنے موبائل فون پر سن چکا ہوں۔ ان دونوں کی باتوں سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہت عرصے سے پسند کرتے تھے۔ ثروت ان سے اتنی محبت کرتی تھی کہ ان کی زندگی سنوارنے کے لیے ان کی شریکِ جرم بھی بن گئی۔ وہ میری وجہ سے بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے ان حضرت کو سمجھایا کہ اب یہ سلسلہ اس طرح ختم کر دیا جائے کہ مزید تفتیش کی ضرورت نہ رہ جائے۔ اس کی باتوں سے یہ حضرت بھی گھبرا گئے۔ انہوں نے ثروت سے کہا کہ وہ کسی ہوٹل میں قیام کرے۔ یہ خود اس بنگلے میں پہنچے جہاں انہوں نے ریشم اور زاہد کو قید کر رکھا تھا۔ اس کام کے سلسلے میں انہوں نے دو جرائم پیشہ افراد کو بھی خرید لیا تھا۔ انہی میں سے ایک نے تمہاری کار پر فائرنگ کر کے تمہیں ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ حضرت چاہتے تھے کہ تم خوف زدہ ہو کر اپنی زمینوں پر نہ جاؤ۔ بعد میں مجھ پر جو گولی چلائی گئی، اس کی ہدایت ان حضرت نے اپنے آدمی کو موبائل پر دی ہوگی۔ اس حرکت کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ مجھ پر گولی چلنے کی اطلاع سن کر تم وہاں رکنے کے بجائے کراچی کا رخ کرو۔ تمہارے وہاں رکے رہنے سے ان حضرت کو ڈر ہوگا کہ تم معاملے کی تہ تک نہ پہنچ جاؤ۔" زین کے بغیر بولتا رہا اور زیبا دم بہ خود بیٹھی سنتی رہی۔

یکا یک شکیل صوفے پر ایک طرف لڑھک گیا۔

"اداکاری مت کرو۔" زین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں اپنے کیے کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ میں ابھی ایک فون کروں گا اور ثروت بھی گرفتار کر لی جائے گی۔ ہاں تو زیبا! میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ حضرت اس بنگلے پر پہنچے جہاں ریشم اور زاہد کو قید کیا گیا تھا۔ وہاں سے ان دونوں کو بے ہوش کر کے اور ایک ویگن میں ڈال کر یہاں پہنچایا گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ویگن چوری کی ہوگی۔ میرے ایک آدمی نے ویگن کا تعاقب کیا تھا۔ جب وہ آدمی یہاں ویگن کھڑی کر کے چلا گیا، میرے آدمی نے جھانک کر ویگن میں دیکھا۔ اس کے بعد مجھے رپورٹ ملی کہ اس ویگن میں ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا گیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ریشم اور زاہد ہوں گے۔ اس کے بعد ہی ان حضرت نے مینائی بابا کو موبائل پر اس کی اطلاع دی ہو گی۔ مقصد یہی ہوگا کہ ان دونوں کے مل جانے کے بعد اس معاملے کی مزید تحقیق نہ کی جائے یا اس پر بہت زیادہ زور نہ دیا جائے۔ اب رہی یہ بات کہ ثروت سے ان کے تعلقات کب سے ہیں، اس کا جواب تو یہی حضرت دے سکیں گے لیکن میرا قیاس ہے کہ ثروت نے شاید اسی کالج میں تعلیم حاصل کی ہوگی جہاں ان حضرت نے پڑھا ہے۔" پھر زین نے شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے مشتعل لہجے میں کہا۔ "اب اٹھ جاؤ مسٹر شکیل عرف راجا بھیّو۔"

لیکن شکیل اسی طرح پڑا رہا۔

"کاش تم مجھے اپنے حالات بتا دیتے شکیل۔" زیبا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ایک دوست کو میں اتنا روپیا تو دے ہی سکتی تھی۔"

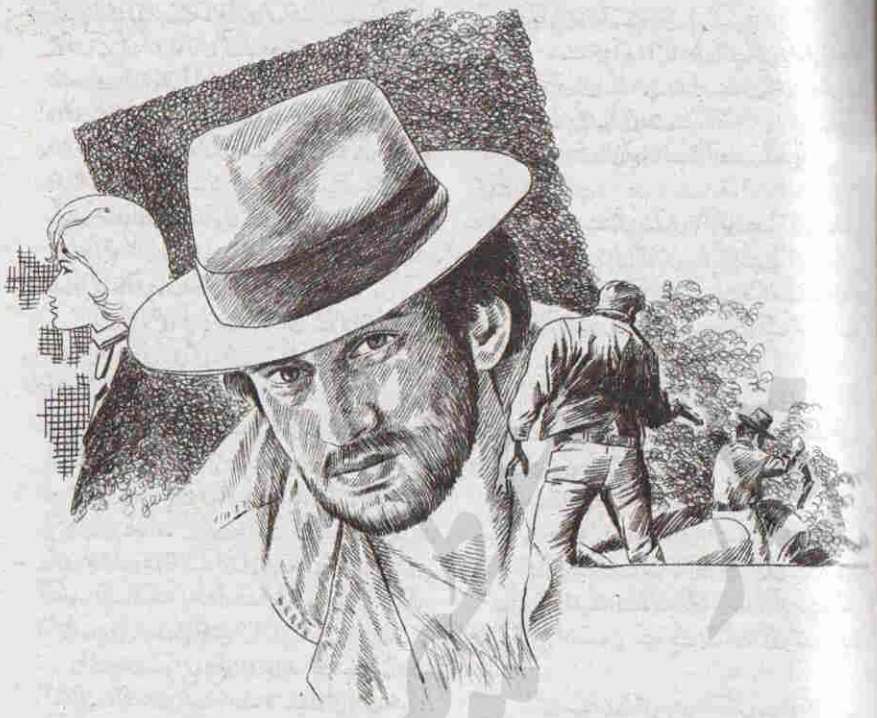
زین نے بیرونی دروازے پر کھڑے پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہتھکڑیاں لگاؤ اسے۔"

لیکن ہتھکڑیاں لگانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ شکیل اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ اس کی روح نے قفسِ عنصری کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ صدمے یا مستقبل کے خوف سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔

زیبا کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ شکیل بہرحال اس کا بچپن کا دوست تھا۔

زیبا کئی دن تک اداس رہی۔ یہ اس کی جذباتیت تھی کہ وہ اس شخص کے لیے اداس رہی جس نے اس کے ساتھ فراڈ کیا تھا۔





# حق دار

آصف ملک

سنتا ہوں بڑے شوق سے افسانۂ ہستی
کچھ اصل ہے، کچھ خواب ہے، کچھ حسن بیاں ہے

حقیقتیں ... وقت کی تہوں میں دب ضرور جاتی ہیں ... مگر ... ختم نہیں ہوتیں ... برسوں پرانے ایک قصے کی بازگشت ... جس کی تکرار اور گونج نے گویا انتقام کی چنگاری کو بھڑکا دیا تھا ...

**ان خوابوں کی بنت ..... جس کی تعبیریں اصل حق دار کی منتظر تھیں**

وہ گھوڑے کو ہلکی چال کے ساتھ چلاتا اس قصبے کی طرف بڑھ رہا تھا جس کا خستہ حال دروازہ شمال کی طرف تھا اور لکڑی کے ایک روایتی قصبے کی طرح اس کے دروازے پر فصیل کی سی لگی تھی۔ آنے والا نوجوان اور خوش رو مرد تھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے سردی کی مناسبت سے مخصوص طرز کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اس کا لباس اچھا تھا اور سر پر قیمتی ہیٹ تھا۔ اس کے گھوڑے کی خرجین میں بہترین رائفل تھی۔ اسی طرح اس کی کمر سے بندھے ہولسٹر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں چاندی کی طرح چمکتا ہوا ریوالور تھا۔ مگر اس کے لباس اور جوتوں پر جمی گرد بتا رہی تھی کہ وہ بہت دور سے یہاں آیا ہے۔ قصبہ ذرا بہتر آبادی پر مشتمل تھا۔ مرکزی سڑک کے دونوں طرف قطاروں میں مکانات تھے۔ سڑک کی طرف والا مکان کمرشل تھا اور لوگوں نے اس میں دکانیں، ہوٹلز اور اسی طرح کے دوسرے کاروبار کر رکھے تھے۔ سڑکیں اور گلیاں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ صبح کے وقت یہ ظاہر قصبہ سویا ہوا تھا لیکن جب وہ اپنا گھوڑا باندھ کر ایک ریستوران میں داخل ہوا تو وہاں خاصی گہما گہمی تھی۔

اس گہما گہمی کی وجہ ریستوران کے کاؤنٹر پر ایک نوجوان اور دلکش لڑکی تھی۔ اس نے نیلی جینز پر چست شرٹ پہن رکھی تھی اور اس لباس میں اس کے پُرکشش خدوخال پوری طرح نمایاں تھے۔ کاؤبوائے ہیٹ سے اس کے سرخی مائل بال نکل کر شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، عمر شاید بائیس اور چوبیس کے درمیان تھی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے پلٹ کر نوجوان کو دیکھا اور مسکرا دی، اس کی آنکھوں میں پسندیدگی تھی۔ نوجوان کاؤنٹر کے آخری سرے پر موجود اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ایک گاہک کو سرو کر کے لڑکی اس کے پاس آئی۔

''ہیلو... ہینڈسم... کیا چاہیے؟''

نوجوان نے اس کا جائزہ لیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

''ناشتا لے آؤ۔ اس میں دو ابلے انڈے شامل ہوں اور کافی خوب گرم اور سیاہ ہو۔''

''بس دس منٹ میں۔'' لڑکی نے کہا اور اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ناشتے کا وقت ختم ہو رہا تھا اس لیے اب لوگ آنے کے بجائے رخصت ہو رہے تھے۔ جب تک نوجوان کے سامنے ناشتا آیا، ریستوران میں بس چند لوگ رہ گئے تھے اس لیے لڑکی اب فارغ تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنے لیے بھی کافی لے آئی۔ ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام جینٹ ہے... جینٹ گریگ۔ تم چاہو تو جین بھی کہہ سکتے ہو۔''

''شکریہ جین۔'' اس نے ٹرے اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اولیور ریڈ کہتے ہیں۔''

''تم سیکسن ہو؟'' جین نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا اور ناشتا کرنے لگا۔ جین کافی کے گھونٹ لیتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ ''تم یہاں سے گزر رہے تھے یا کسی کام سے یہاں آئے ہو؟''

''میں یہاں آیا ہوں۔'' اس نے مختصراً جواب دیا اور کھانے میں مگن ہو گیا۔ ناشتے کے بعد اس نے پوچھا۔

''یہاں کوئی اچھا ہوٹل ہے؟''

''سامنے ہی ایک اچھا ہوٹل ہے لیکن اگر تم چاہو تو میرے ریستوران کے اوپر چند کمرے ہیں لیکن وہ میں ہر ایک کو کرائے پر نہیں دیتی ہوں۔''

''یہ ریستوران تمہارا ہے؟'' اولیور کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔

''ہاں، اسے میں نے ہی قائم کیا ہے۔'' جین نے فخر سے کہا۔ ''اس کا ڈیزائن بھی میں نے بنایا ہے۔''

''تب ہی تمہاری طرح دلکش ہے۔'' اولیور نے کہا تو لڑکی کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے ایک کمرا کرائے پر چاہیے۔''

''تمہیں دو ڈالرز روز کے دینے ہوں گے، اس میں ناشتا بھی شامل ہو گا اور بارہ بجے تک کمرا خالی کرنا ہو گا ورنہ ایک دن کا کرایہ مزید چارج ہو جائے گا۔''

اولیور نے چار ڈالرز نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ ''یہ ہو گیا دو دن کا کرایہ... اور اس وقت ناشتے کا بل؟''

''وہ آج کے کرائے میں شامل ہو گیا۔'' جین نے رقم اپنے کیش بکس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا سامان کہاں ہے؟''

''باہر گھوڑے پر ہے، مجھے اپنا گھوڑا بھی کہیں رکھوانا ہے۔''

''قصبے کے شروع میں جان کا اصطبل ہے، وہ مناسب چارج کرتا ہے اور تمہارے گھوڑے کی اچھی طرح دیکھ بھال بھی کرے گا۔''

اولیور جان کے اصطبل تک آیا۔ وہ ادھیڑ عمر لیکن خوش مزاج آدمی تھا۔ اس نے اولیور سے کہا۔ ''تمہیں ہمارا قصبہ پسند آئے گا۔ مغرب میں اتنی پُرسکون اور پُرامن جگہ کم ہی ملے گی۔ یہاں گولی چلنے کی آواز بھی کم آتی ہے۔''

''لیکن میں نے سنا ہے راجر پان اسی علاقے میں سرگرمِ عمل ہے۔''

''وہ ان پہاڑوں کے دوسری طرف ہوتا ہے۔'' جان نے دور شمال کی سمت نظر آنے والے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے معلوم ہے یہاں شیرف جارج گریگ ہے۔ اس لیے وہ اس طرف آنے سے گریز کرتا ہے۔''

''جارج گریگ۔'' اولیور چونکا، اسے جین کا خیال آیا۔ ''کیا اس کا جینٹ گریگ سے کوئی رشتہ ہے؟''

جان نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم شاید اسی کے ریستوران سے آ رہے ہو؟''

اولیور نے سر ہلایا۔ ''میرا قیام بھی وہیں ہے۔''



''اچھی لڑکی ہے۔ ہاں وہ شیرف جارج گریگ کی بیٹی ہے لیکن دونوں باپ بیٹی میں بنتی نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد اولیور اپنا بیگ لے کر جین کے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ اسی کی منتظر تھی، اسے اوپر لائی۔ یہاں چار کمرے تھے اور دو واش رومز تھے۔ گرم پانی کا بندوبست بھی تھا۔ اولیور کو حیرت ہوئی کہ اتنے شاندار کمروں اور سہولتوں کے ساتھ وہ صرف دو ڈالرز کرایہ لے رہی تھی۔ وہ چاہتی تو اس سے دوگنا زیادہ کرایہ بھی لے سکتی تھی۔ اولیور نے اپنا بیگ الماری میں رکھا۔ جین اس کے ساتھ ہی تھی۔ ''کیسا لگا کمرا؟''

''بہترین۔'' وہ بولا۔ ''لیکن تم نے کہا تھا کہ تم ہر کسی کو کمرا نہیں دیتی ہو؟''

''ہاں، میں صرف اسے کمرا دیتی ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ سمجھ لو یہ سائیڈ بزنس ہے اور اس کا ریستوران سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جین اس کے قریب آ گئی، اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اولیور کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

''تم شیرف کی لڑکی ہو؟''

یہ سنتے ہی جین کی آنکھوں کی چمک بجھ سی گئی۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، جارج گریگ میرا باپ ہے لیکن میں اس سے الگ رہتی ہوں۔''

''اس کی وجہ؟''

''میں اس کے سخت مزاج سے نالاں ہوں۔''

''راجر پان جیسے آدمیوں سے نمٹنے کے لیے سخت گیر ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

''میں راجر پان نہیں ہوں۔'' جین نے تیز لہجے میں کہا اور اچانک ہی کمرے سے نکل گئی۔ اولیور کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے شانے اچکائے اور تولیا لے کر کمرے سے نکل آیا۔ نہا کر وہ سو گیا پھر اس کی آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ اس نے صرف شیکر پہن رکھی تھی اس لیے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ سامنے جین کھڑی تھی۔ اس نے معذرت کی۔

''سوری... تم سو رہے تھے اور دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا لیکن اس وقت جگانا ضروری ہے۔''

''کوئی خاص بات؟'' اولیور نے پوچھا۔ ''سوری... میں نے لباس نہیں پہنا ہے اس لیے تمہیں اندر نہیں بلا سکتا۔''

''کوئی بات نہیں، میں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ شیرف کے دفتر سے تمہارا بلاوا آیا ہے۔''

یعنی تمہارے باپ کی طرف سے؟''

''وہ شیرف ہے اور اس نے تمہیں میرے باپ کی حیثیت سے نہیں، شیرف کی حیثیت سے بلایا ہے۔'' جین سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ایک منٹ۔'' اولیور نے اسے روک کر جلدی سے اپنا لباس پہنا اور دروازہ کھول کر جین کو اندر بلا لیا۔ جین سنجیدہ ہو رہی تھی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، شیرف نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں لیکن اس کا ایک آدمی آیا تھا اور پیغام دے گیا ہے۔ لیکن مجھے کوئی عام سی بات لگ رہی ہے ورنہ تمہارے لیے صرف پیغام نہیں آتا۔''

''تمہارا مطلب ہے، شیرف کا آدمی مجھے اسی وقت ساتھ لے جاتا؟''

''بالکل یہی ہوتا۔''

''شیرف کا آفس کہاں ہے؟''

''اسی سڑک پر آگے ہے۔'' جین نے بتایا۔

اولیور نے کمر سے ہولسٹر باندھا اور اوپر سے جیکٹ پہن لی۔ ہلکی سنہری داڑھی کے ساتھ وہ اس لباس میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جین کی آنکھوں میں ستائش آ گئی۔ وہ اس کے ساتھ نیچے آئی اور اس کے جانے سے پہلے آہستہ سے بولی۔ ''شیرف سے جو بات ہو، مجھے بھی بتانا۔''

اولیور سر ہلا کر باہر نکل آیا۔ شیرف کا دفتر ذرا ہی دور تھا اور وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے سرد مہری سے اولیور سے ہاتھ ملایا اور اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میرا نام اولیور ریڈ ہے اور میں جنوب سے آیا ہوں۔''

''کیوں؟'' شیرف کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔ ''تم نے جان سے راجر پان کی بات کیوں کی تھی؟''

''مجھے راجر پان کی تلاش ہے۔'' اس نے بلا جھجک جواب دیا۔

''کیوں؟''

''وہ میرے خاندان کی تباہی کا ذمے دار ہے۔''

''وہ بہت سارے خاندانوں کی تباہی کا ذمے دار ہے۔''

''میں صرف اپنے خاندان کو جانتا ہوں۔ میرا باپ، ماں، بڑا بھائی اور ایک شیر خوار بہن سب مارے گئے۔''

شیرف کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر کسی قدر نرم لہجے میں بولا۔ ''مسٹر ریڈ! مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن راجر پان کی تلاش آسان نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔''

''جان کا کہنا ہے کہ وہ شمال کی طرف پہاڑوں میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہیں موجود ہے۔''

''یہ پہاڑ سیکڑوں مربع میل رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں اور بالکل ویران ہیں اسی وجہ سے جرائم پیشہ لوگوں کی پسندیدہ پناہ گاہ ہیں۔ ان پہاڑوں میں راجر پان کو تلاش کرنا بھوسے میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔''

''میں کئی سال سے اس کے پیچھے ہوں اور میرا خیال ہے میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں۔''

''یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟'' شیرف طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اپنی چالیس سال کی ملازمت کے دوران میرا بہت وقت راجر پان کے پیچھے ضائع ہوا ہے اور میں بھی اس کے قریب نہیں پہنچ سکا۔ ہاں، اس کے بہت سارے گرگے میرے ہاتھ ضرور مارے گئے ہیں۔''

''جان کا کہنا ہے کہ راجر پان اس وجہ سے اس علاقے کا رخ کرنے سے گریز کرتا ہے کہ یہاں تم شیرف ہو۔''

''درست ہے۔ راجر جانتا ہے کہ اس سرزمین پر مجھ سے زیادہ اس کا دشمن کوئی نہیں ہوگا۔''

''تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو تم سے کہیں زیادہ راجر پان کے دشمن ہیں۔'' اولیور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا مجھے اجازت ہے؟''

''ضرور... لیکن خیال رہے کہ میں اس قصبے میں کوئی ہنگامہ پسند نہیں کروں گا۔''

''میرا خیال ہے شمالی پہاڑ اس قصبے سے بہت دور ہیں شیرف اور شاید تمہاری عمل داری سے باہر بھی ہیں۔'' اولیور نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

''میرا ایک مشورہ ہے برخوردار۔'' عقب سے شیرف کی آواز آئی تو وہ رک گیا۔ ''یہاں راجر پان کا ذکر اتنی بے پروائی سے مت کرو۔''

اولیور نے سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شیرف کا دفتر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مشکل سے سات آٹھ افراد تھے۔ اتنے بڑے قصبے میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے یہ تعداد کافی تھی لیکن راجر پان جیسے مجرم سے نمٹنے کے لیے یہ نفری بالکل ناکافی تھی۔ راجر پان کو چالیس سال سے ٹیکساس کا ہوا کہا جاتا رہا ہے۔ اس نے بارہ سال کی عمر میں پہلا قتل اپنے سگے چچا کا کیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں گروہ بند بدمعاشوں میں شامل ہوگیا اور بیس سال کی عمر میں اس نے اپنا گروہ بنا لیا تھا۔ وہ بینکوں اور شراب خانوں کو لوٹتا تھا۔ شاہراہوں سے گزرتے قافلوں پر شب خون مارتا تھا اور کئی بار سرکاری خزانہ لے جانے والی ریل گاڑیوں پر کامیاب حملے کر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پر ایک دو یا چند درجن نہیں، ہزاروں افراد کا خون تھا۔ گولی چلاتے وقت وہ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ اس کے سامنے بوڑھا ہے، عورت ہے یا بچہ۔ رحم کا لفظ اس کی لغت میں شامل ہی نہیں تھا۔

اولیور ریڈ واپس آیا۔ اس نے اپنے میلے کپڑے جین کے سپرد کیے، وہ اپنے ہوٹل میں رکنے والوں کے لیے لانڈری کی سروس بھی خود کرتی تھی۔ پھر رات کے کھانے سے پہلے وہ نزدیکی بار میں چلا آیا۔ اس نے دیکھا کہ قصبے کے صاف ستھرے ماحول کی طرح یہاں رہنے والوں کا انداز بھی صاف ستھرا ہے۔ بار میں بھی کوئی ہنگامہ یا شور شرابا نہیں تھا اور لوگ سکون سے گپ شپ کر رہے تھے۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اولیور ایک الگ میز پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد جان بھی بار میں داخل ہوا اور سیدھا اس کی طرف آیا۔ وہ اولیور کی طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں دوست لیکن شیرف کی طرف سے ہدایت ہے کہ کوئی اجنبی قصبے میں آئے تو اس کے بارے میں شیرف کے دفتر میں اطلاع دی جائے۔ اور تم نے تو راجر پان کا نام لیا تھا۔''

''میں ابھی شیرف کے دفتر سے ہی آ رہا ہوں۔'' اولیور نے کہا اور اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ویٹر سے دوسرا گلاس منگوایا۔ ''تم فکر مت کرو، میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔''

''تم اچھے آدمی ہو لیکن میرے بعض گاہک تو اس بات پر ناراض ہو جاتے ہیں کہ میں نے ان کے بارے میں شیرف کے دفتر اطلاع کی ہے۔''

ایک جام پی کر جان کسی قدر بے تکلف ہو گیا۔ اولیور نے اس سے کہا۔ ''مجھے لگا جیسے شیرف جارج، راجر پان کے بارے میں حساس ہے۔''

''بہت زیادہ... وہ یہاں اس کا وجود برداشت کرنا تو ایک طرف رہا، اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا ہے۔''

''کیا راجر پان نے کبھی اس قصبے میں کوئی کارروائی کی ہے؟''

''حیرت انگیز طور پر کبھی بھی نہیں۔ حد یہ کہ یہاں کبھی اس کا کوئی آدمی بھی نہیں آیا حالانکہ یہ جگہ شمالی پہاڑوں سے کتنی دور ہے، تم دیکھ سکتے ہو۔''

''شاید بیس پچیس کلومیٹرز سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' اولیور نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تو شیرف کے پاس زیادہ آدمی بھی نہیں ہیں۔ کم سے کم راجر پان جیسے آدمی کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے اتنے پولیس مین قطعی ناکافی ہیں۔"

"میرا اور قصبے کے دوسرے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے۔ ہم یہاں بہت سکون سے ہیں اور ہمیں کبھی راجر پان یا اس کے ساتھیوں کی طرف سے پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔"

"کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے؟"

جان نے شانے اچکائے۔ "ممکن ہے لیکن میرا خیال ہے یہ شیرف کے نام کا اثر ہے۔ ایک زمانے میں وہ مستقل راجر پان کے پیچھے رہا تھا۔ سنا ہے راجر کے بہت سارے ساتھی بھی شیرف کے ہاتھوں مارے گئے یا گرفتار ہوئے۔ پھر وہ یہاں چلا آیا۔ پہلے ڈپٹی شیرف بنا اور بیس سال پہلے وہ یہاں شیرف بن گیا۔ آج تک وہی شیرف چلا آرہا ہے۔"

اولیور نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ "تقریباً اتنے ہی عرصے سے راجر پان یہاں ہے۔"

جان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا... کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں، تم پیو۔" اولیور نے اس کے گلاس میں مزید وہسکی انڈیلی اور وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اولیور سوچتا رہا پھر اس نے باقی بچ جانے والی بوتل اٹھائی اور وہاں سے نکل آیا۔ جان اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ ہوٹل واپس آکر اس نے جین سے کھانے کا پوچھا۔

"کیا پسند کرو گے؟"

"کوئی بھی اچھی چیز لیکن اپنے کمرے میں۔"

"میں لاتی ہوں۔" جین کی آنکھوں میں پھر مخصوص چمک آگئی۔

"میں وہسکی لایا ہوں۔" اولیور نے اسے بوتل دکھائی۔ "دو گلاس بھی لیتی آنا۔"

اولیور نے پہلے ہی محسوس کرلیا تھا کہ لڑکی اس کی طرف جھک رہی ہے لیکن یہ جھکاؤ کس نوعیت کا تھا، وہ اس سے واقف نہیں تھا۔ خیر نتیجہ جلد سب سامنے آجاتا۔ وہ اوپر آیا اور جوتوں سمیت بستر پر دراز ہوگیا۔ ایک گھنٹے بعد جین کھانے سمیت آگئی۔ وہ صرف اولیور کا ہی نہیں، اپنا کھانا بھی لائی تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ "میں نے سوچا ڈنر تمہارے ساتھ ہی کروں۔"

"تم نے اچھا سوچا۔" اولیور نے کہا۔ دونوں نے ڈنر کیا۔ جین بھیڑ کے گوشت کے بھنے پارچے لائی تھی۔ اس کے ساتھ سرکے میں ڈوبے زیتون تھے۔ اولیور نے بوتل بھی نکال لی۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں، ابھی تو آوارہ گردی کر رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

"میرا باپ میرے لیے کچھ سونا چھوڑ گیا تھا، اسی سے گزارا ہوتا ہے۔"

"یعنی تم کوئی کام نہیں کرتے ہو؟"

"اگر تم یقین کرو تو میں بتا دوں، میں کھانا بہت اچھا بناتا ہوں۔"

جین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "واقعی؟"

"ہاں کل میں تمہیں عملی مظاہرہ کرکے بھی دکھا سکتا ہوں۔"

کھانا ختم ہونے کے بعد جین ٹرے لے گئی اور جاتے ہوئے کہا۔ "سونا مت، میں آؤں گی۔"

اولیور سویا نہیں۔ وہ جین کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک گھنٹے بعد آئی اور آتے ہی اس پر چھا گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب دونوں تھک کر چور ہوچکے تھے، اولیور نے سگریٹ سلگائی اور جین کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی لیکن جاگ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ اولیور کے بازو پر رکھا۔ "تم راجر پان کی تلاش میں ہو؟"

وہ کش لیتے ہوئے رک گیا۔ "تمہاری اپنے باپ سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"میں اس سے نہیں ملتی لیکن میں جاننا چاہتی تھی کہ اس نے تمہیں کیوں بلایا تھا؟" جین کے لہجے میں شکوہ آگیا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے بتانا تمہاری شیرف سے کیا بات ہوئی ہے۔"

"موقع ہی نہیں ملا لیکن لگتا ہے تم نے خود معلوم کرلیا۔ ویسے یہ بھی جان لیا ہوگا کہ میں کیوں راجر پان کی تلاش میں ہوں۔"

"ہوں۔" وہ آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ "لیکن کیا یہ بہت بڑا دعویٰ نہیں ہے؟ اس علاقے میں شیرف بھی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اسے راجر پان کی تلاش ہے۔"

"شیرف اور مجھ میں فرق ہے۔" اولیور کا لہجہ سرد ہوگیا۔ "وہ اپنا فرض نبھاتا ہے اور مجھے راجر پان سے اپنے خاندان کا انتقام لینا ہے۔"

جین اٹھ بیٹھی۔ اس نے نرمی سے اولیور کا بازو سہلایا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"میں ٹھیک سے نہیں جانتا لیکن بہت بُرا ہوا تھا۔ میرے گھر کو آگ لگا دی گئی تھی اور پھر چاروں طرف سے



گولیوں کی بوچھاڑ کردی گئی تھی۔ اندر موجود کسی فرد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگلے روز جب مکان کا ملبا ٹھنڈا ہوا تو لوگوں نے چار ایسی جلی ہوئی لاشیں دیکھیں جو گولیوں سے چھلنی تھیں۔"

"تم بچ گئے؟"

"ہاں کیونکہ میں شدید بیمار تھا اور ایک ڈاکٹر کے پاس زیرِ علاج تھا۔ مجھے تو ٹھیک ہونے کے بعد پتا چلا جب میرے گھر والوں کی تدفین ہوئے بھی چار دن گزر چکے تھے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ راجر پان کا کام ہے؟"

اولیور نے اسے غور سے دیکھا۔ "ایسے کام چھپانے کے لیے نہیں، سب کو بتانے کے لیے اور دشمنوں کو عبرت دلانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ حملہ کرنے والوں نے راجر پان کے نام کے نعرے بلند کیے تھے۔ مجھے اس وقت معلوم ہوگیا تھا جب میں دس سال کا تھا اور میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ جب تک اپنے ماں باپ کا بدلہ نہیں لے لوں گا، سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"تو اسی وجہ سے تم آوارہ گردی کر رہے ہو؟"

"کہہ سکتی ہو۔"

"تم نے یہ بھی کہا ہے کہ تم کسی حد تک جانتے ہو کہ راجر پان شمالی پہاڑوں میں کہاں چھپا ہوا ہے؟"

اولیور نے سر ہلایا۔ "میں نے بڑی محنت سے اس کا سراغ لگایا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ اگر تم نے اس کا سراغ لگا بھی لیا تو تم اکیلے اس کے خلاف کیا کرسکو گے؟"

اولیور سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے جین کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں کہنا چاہ رہی ہوں کہ اگر تمہارے ذہن میں کوئی خیال ہے تو شیرف سے بات کرو۔ یقین کرو، وہ بھی راجر پان کا اتنا ہی دشمن ہے۔ بس اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ شمالی پہاڑوں میں کہاں پایا جاتا ہے۔"

"میں اس سے کیا بات کروں؟"

"یہ کہ تم راجر پان تک اس کی راہنمائی کرو گے۔"

"کیا وہ میری بات مان جائے گا؟"

"کیوں نہیں مانے گا؟" جین نے یقین سے کہا۔ "اب اس کی اکلوتی بیٹی کہے گی تو وہ ضرور مانے گا۔"

"تم اس سے الگ رہتی ہو، اس کو باپ کہنا گوارا نہیں ہے تو وہ تمہاری بات کیسے مانے گا؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" جین کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "جب میں اس سے بات کروں گی تو وہ ضرور مانے گا۔ مجھے اس کی سخت گیری پر اعتراض ہے اور اسی وجہ سے میں اس سے الگ ہوئی ہوں... اسے میری کسی بات پر اعتراض نہیں ہے۔"

"اس بات پر بھی نہیں۔" اولیور نے اپنے کمرے میں اس کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا۔

جین نے منہ بنایا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں تو وہ کسی صورت دخل نہیں دے سکتا ہے۔"

اولیور نے اسے کھینچ کر خود سے قریب کرلیا۔ "جین! تم نے مجھے کس حد تک پسند کیا ہے؟ صرف وقت گزاری کے لیے یا..."

"میں نہیں کہہ سکتی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "ابھی تو ہمیں ملے ایک دن بھی نہیں ہوا ہے۔"

"اس کے باوجود تم یہاں موجود ہو۔"

"یہ الگ بات ہے۔" جین نے جواب دیا اور اٹھ کر اپنا حلیہ درست کرنے لگی پھر اس نے جانے سے پہلے کہا۔ "کل دوپہر تین بجے تیار رہنا، میں تمہیں شیرف کے گھر لے چلوں گی۔"

اولیور نے شیرف کا گھر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ نہایت عالی شان قسم کا محل تھا جو پورے کا پورا سفید پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف وسیع و عریض سبزہ زار تھا۔ اولیور نے اس سے پہلے کبھی اتنی خوب صورت عمارت نہیں دیکھی تھی۔ اس نے جین سے کہا۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شیرف اتنا دولت مند ہوگا۔"

"یہ اس کی خاندانی دولت ہے ورنہ شیرف کو کتنی تنخواہ ملتی ہے، یہ سب جانتے ہیں۔" جین نے کہا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر عمارت کے اوپری حصے تک پہنچے۔ ایک بٹلر نے دروازہ کھولا اور انہیں اندر ایک نشست گاہ میں لے آیا، بٹلر کے جانے کے بعد اولیور نے کہا۔

"میرا خیال ہے شیرف کے دفتر میں اتنے لوگ کام نہیں کرتے ہوں گے، جتنے اس کے محل میں... کرتے ہیں۔"

جین نے سر ہلایا۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اس محل میں دس افراد ملازم ہیں۔"

کچھ دیر میں شیرف جارج گریگ ان کے سامنے تھا اور جین کہہ رہی تھی۔ "مسٹر جارج! قدرت نے تمہیں ایک موقع دیا ہے کہ تم راجر پان کا خاتمہ کرسکو۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مسٹر ریڈ کی مدد سے؟'' شیرف کے لہجے میں طنز تھا۔

''جسے صرف یہ معلوم ہے کہ راجر پان شمالی پہاڑوں میں کہیں موجود ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ اس کے ٹھکانے تک تمہاری راہنمائی کر سکے گا۔'' جین کے لہجے میں اصرار تھا۔

شیرف نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں کہ مسٹر ریڈ میری کس قدر راہنمائی کر سکتا ہے، میرے ساتھ آؤ۔''

وہ انہیں اپنی اسٹڈی میں لے آیا۔ وہاں دیوار پر اس پورے علاقے کا بہت بڑا نقشہ لگا تھا۔ شیرف نے چھڑی سے شمالی پہاڑوں کو واضح کیا۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ راجر پان کہاں ہے؟''

اولیور نے غور سے نقشے کو دیکھا اور پھر شیرف سے چھڑی لے کر ایک مقام پر رکھی۔ ''اس مقام پر جہاں دو سرخ رنگ کے پہاڑ ہیں۔ ان کی شکل تکونی اور کسی نیزے کی انی جیسی ہے۔ ان پہاڑوں کے درمیان کی وادی راجر پان کا اصل ٹھکانا ہے لیکن یہاں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں یہاں تک جا چکا ہوں۔'' جارج گریگ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''تم بھول رہے ہو، میں راجر پان کو تلاش کرتا رہا ہوں۔'' اولیور نے جواب دیا۔ اس نے جین کی طرف دیکھا۔ ''معاف کرنا... مجھے شیرف، راجر پان کو تلاش کرنے میں سنجیدہ نظر نہیں آتا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' شیرف جارج غرایا۔ ''مجھ سے زیادہ کون ہے... جسے راجر پان کی تلاش ہو۔''

''تبھی وہ بیس سال سے تمہارے پڑوس میں بیٹھا ہے اور تم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکے۔'' اولیور کا انداز سادہ لیکن طنز سے بھرپور تھا۔ شیرف تلملا گیا۔

''میرے پاس جو وسائل ہیں، اس میں اس قسم کی مہم جوئی خودکشی ہوگی۔ راجر پان ان پہاڑوں میں بہت طاقتور ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے تو پورا فوجی بریگیڈ درکار ہے۔ اور تم کیا سمجھتے ہو، اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے؟ دو بار فوجی دستوں نے ان پہاڑوں کو کھنگالا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔''

''اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ وہ انہی پہاڑوں میں ٹھکانا بنائے ہوئے ہے اور یہیں سے نکل کر اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔''

جین نے ان کی بحث میں مداخلت کی۔ ''میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ فوج کا کام نہیں ہے کیونکہ ان کی آمد سے راجر اور اس کے ساتھی چوکنا ہو جاتے ہوں گے اور یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے ہوں گے۔ جب فوجی کارروائی ختم ہو جاتی ہو گی تو وہ واپس آ جاتے ہوں گے۔''

اس بار شیرف نے طنزیہ نظروں سے اپنی اکلوتی بیٹی کو دیکھا۔ ''تو تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟''

''میرا تو خیال ہے، پولیس کا ایک مختصر دستہ جو اس علاقے سے واقف ہو، خاموشی سے وہاں داخل ہو اور راجر کو تلاش کرے۔ وہ یقیناً وہاں کوئی بڑا گروہ بنا کر نہیں رہتا ہو گا۔ اس کے پاس محدود آدمی ہوں گے اور اس کے دوسرے آدمی آس پاس کی آبادیوں میں رہتے ہوں گے۔ جب وہ کسی کارروائی کے لیے نکلتا ہو گا تو اس کے ساتھی اس سے آ ملتے ہوں گے۔''

''شیرف، تمہاری بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس ویرانے میں زیادہ آدمیوں کے ساتھ قیام ممکن بھی نہیں ہے۔'' اولیور نے تائید کی۔

''یہ مفروضہ ہے کیونکہ اگر راجر پان کو پتا چل گیا تو وہ نہایت آرام سے پورے دستے کا صفایا کر دے گا۔'' شیرف نے کہا۔

''یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔'' اولیور نے کہا۔ ''بہرحال، اگر تم اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔''

''مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔'' جین نے مایوسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ ''میں تو بہت امید کے ساتھ اولیور کو لائی تھی۔''

شیرف نے گویا صفائی پیش کی۔ ''میں انکار نہیں کر رہا ہوں لیکن اس معاملے میں کوئی اندھا قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔ میں ایک ذمے دار آدمی ہوں۔ میرے ساتھ انتقام کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔''

جین نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ کرو گے؟''

''ہاں لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

واپسی پر جین نے پورے یقین سے اولیور سے کہا۔ ''شیرف اب اس معاملے میں عملی قدم اٹھائے گا۔''

''شاید۔'' اولیور کے لہجے میں شک تھا۔

☆☆☆

اولیور اور شیرف گھوڑوں پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اولیور نے پیچھے آنے والے شیرف کے چار ساتھیوں کے بارے میں کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ بہترین لڑاکا ہیں؟''

''وقت آنے پر تم دیکھ لو گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن مجھے شبہ ہے ایسا وقت آئے گا۔''

''شبہ کیوں ہے؟''

''مجھے یقین نہیں کہ راجر پان اس جگہ ملے گا جس کی نشان دہی تم نے کی ہے۔'' شیرف صاف گوئی سے بولا۔

''تمہیں کیوں شبہ ہے؟''

''کیونکہ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی ایک جگہ اپنا ٹھکانا بنا کر نہیں رکھتا بلکہ کچھ عرصے بعد ٹھکانا بدل دیتا ہے۔ اس لیے وہ ابھی تک قانون کی گرفت میں آنے سے بچا ہوا ہے۔''

''کوئی بھی ہمیشہ نہیں بچتا، کبھی نہ کبھی گرفت میں ضرور آتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم کل تک ان دو سرخ پہاڑوں کے پاس پہنچ جائیں گے۔'' شیرف جارج نے کہا۔

''امکان تو ہے۔ ویسے ابھی تک کسی سے مدبھیڑ نہیں ہوئی ہے۔''

''یہ پہاڑ ویران ہیں۔ جب سے یہاں راجر پان کا بسیرا ہوا ہے لوگوں نے یہاں سے گزرنا چھوڑ دیا ہے اس لیے بالکل خالی پڑے ہیں۔ ورنہ ایک زمانے میں یہاں لوگوں کی آمد و رفت ہوتی تھی کیونکہ ان پہاڑوں کے چاروں طرف بستیاں ہیں۔''

دوسرے دن وہ سرخ پہاڑوں کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے ان کے درمیان پڑنے والی وادی میں پڑاؤ ڈالا۔ وہ دوپہر کے وقت یہاں پہنچے تھے اور سارا دن گھومتے پھرتے رہے تھے لیکن نہ تو انہیں کسی اور آدمی کی صورت دکھائی دی تھی اور نہ ہی راجر پان یا اس کے آدمیوں نے ان کی آمد کا نوٹس لیا تھا۔ انہوں نے ایک محفوظ جگہ کیمپ بنایا لیکن شیرف نے اسے کافی نہیں سمجھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ کیمپ کے چاروں طرف دور اونچی جگہوں پر پوزیشن سنبھال لیں تاکہ اگر کوئی کیمپ پر حملہ کرے تو وہ عقب سے اس پر حملہ کر سکیں۔ اولیور کو بھی شیرف کی یہ ترکیب پسند آئی۔ شیرف کے آدمی وادی میں مختلف اطراف میں اپنے ہتھیاروں سمیت مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ شیرف اور اولیور نیچے کیمپ میں الاؤ جلائے بیٹھے تھے۔ اولیور نے کہا۔ ''کیا اس طرح الاؤ جلا کر دوسروں کو متوجہ کرنا مناسب ہوگا؟''

''یہ تو تم بتاؤ۔'' شیرف کا لہجہ سرد ہو گیا۔ وہ کھانا کھا چکے تھے اور کافی کے بعد برانڈی سے شغل کر رہے تھے۔ سردی شدید تھی۔ اگر پاس الاؤ نہ جل رہا ہوتا تو وہ اتنے سکون سے نہ بیٹھے ہوتے۔ ''تم نے کہا تھا کہ راجر پان اس وادی میں ہے۔ وہ یا اس کے آدمی اس الاؤ کی طرف ضرور متوجہ ہوں گے۔''

''کیا میں نے غلط کہا تھا؟'' اولیور نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا لہجہ چیلنج کرنے والا تھا۔ شیرف کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اولیور نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے، میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ یہ ایک مجرم کی کہانی ہے۔''

''میں ضرور سنوں گا۔'' شیرف نے سر ہلایا۔

اولیور نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ کم عمری سے جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ اس نے قتل کیے اور لوگوں کو لوٹا۔ وہ جہاں سے گزر جاتا، تباہی و بربادی چھوڑ جاتا۔ لوگ اس کا نام سن کر تھرا جاتے تھے اور پولیس اس کی آمد کا سن کر اپنے تھانے تک محدود ہو جاتی لیکن پھر اس کی زندگی میں تبدیلی آئی۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ لڑکی بھی اسے پسند کرنے لگی۔ اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی اور اسے لے کر ایک ایسی جگہ جا بسا جہاں کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ ویسے بھی چہرے سے بہت کم لوگ اسے جانتے تھے۔ وہ نام اور حلیہ بدل کر وہاں رہنے لگا اور گزر اوقات کے لیے اس نے کاشت کاری شروع کر دی۔''

''اچھی کہانی ہے۔'' شیرف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اولیور نے شیرف کا تبصرہ نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔ ''لیکن یہ بات اس پولیس افسر کو پسند نہیں آئی جو اس مجرم کے جرائم میں برابر کا شریک تھا۔ درحقیقت دونوں کاروباری شریک تھے۔ مجرم لوٹ مار کرتا تھا اور پولیس افسر اسے تحفظ دیتا تھا اور اس کے بدلے لوٹ کے مال میں سے نصف لیتا تھا۔ اسے بالکل پسند نہیں آیا کہ اس کی آمدنی رک جائے۔ مگر مجرم غائب ہو گیا تھا اور پولیس افسر کو اس کے بارے میں قطعی علم نہیں تھا۔ پھر اتفاق سے کئی برسوں بعد اس پولیس افسر نے مجرم کو تلاش کر لیا۔ وہ اب بالکل ایک عام شہری کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا اور اپنے مجرمانہ ماضی کو قطعی فراموش کر چکا تھا۔ اس لیے جب پولیس افسر اس کے سامنے آیا تو اس نے اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ پولیس افسر نے اسے دھمکی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی کہ وہ اس کے مجرمانہ ماضی کو سامنے لے آئے گا۔ جواب میں مجرم نے اسے بتایا کہ اس طرح وہ بھی پھنسے گا۔ پولیس افسر نے جب دیکھا کہ وہ کسی صورت اس کی بات ماننے اور ماضی کی طرح جرائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس نے اسے سزا دینے کی ٹھانی اور ایک رات اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مجرم کے گھر کو آگ لگا دی اور پھر گھر والوں پر گولیوں کی بارش کر دی۔ اس پولیس افسر کو معلوم نہیں تھا کہ مجرم کا ایک بیٹا گھر میں نہیں ہے ورنہ وہ شاید اسے بھی نہ چھوڑتا۔"

شیرف کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ جب اولیور خاموش ہوا تو اس نے غرا کر کہا۔ "میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم نے راجر پان کا نام لے کر بتایا تھا کہ اس نے تمہارا سارا خاندان کس طرح ختم کیا تھا۔"

"تم اسی وجہ سے اتنے آرام سے صرف چار ساتھیوں کو لے کر یہاں آ گئے کہ تم جانتے تھے، تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے، جس راجر پان کا نام لے کر تم آج تک جرائم کر رہے ہو، وہ کب کا مر چکا ہے۔" اولیور نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ راجر پان دنیا میں نہیں ہے اس لیے اس کے نام پر کھل کر جرائم کیے جا سکتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ راجر پان کے پیچھے میں ہوں؟" شیرف بولا۔ اس کا ہاتھ رفتہ رفتہ اپنے ہولسٹر کی طرف جا رہا تھا۔ "تم نے مجھے تلاش کیسے کیا؟"

"میں نے تمہیں بہت آسانی سے تلاش کر لیا لیکن یہ تلاش پہلے راجر پان کی تھی کیونکہ تم نے میرے خاندان پر اسی نام سے حملہ کیا تھا۔ اس وقت مقامی لوگوں کو علم نہیں تھا کہ جس کے گھر پر راجر پان کا نام لے کر حملہ کیا جا رہا ہے، وہ اصل میں خود راجر پان ہے۔ مجھے بھی اس وقت علم ہوا جب میں جوان ہو گیا اور یہ بات میرے قصبے کا صرف ایک شخص جانتا تھا کیونکہ اس نے اتفاق سے میرے باپ کو پہچان لیا تھا مگر اس کی درخواست پر یہ بات راز میں رکھی۔ اس لیے وہ جانتا تھا کہ میرے گھر پر حملہ کرنے والے راجر پان اور اس کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ راجر پان میرا باپ تھا تو میں نے اس کے ماضی کی کھوج کی اور جان لیا کہ اس کا شریک جرم کون تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ راجر پان کے نام پر اب بھی جرائم ہو رہے ہیں۔ لوگوں کو لوٹا اور قتل کیا جا رہا ہے۔ راجر پان کہاں ہے، یہ جاننا بھی مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے اطراف کی بستیوں میں تمہاری تلاش شروع کی اور تمہیں تلاش کر لیا۔"

"نوجوان! تم نے یہاں آ کر غلطی کی۔ کہیں اور چلے جاتے تو اپنی طبعی عمر تک زندہ رہتے... لیکن اب میں تمہیں بھی تمہارے خاندان والوں کے پاس بھیجنے پر مجبور ہوں۔"

شیرف جارج کا ہاتھ اس کے ہولسٹر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی، اولیور بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس سے پہلے ہی پستول نکال کر اس پر تان لیا اور آہستگی سے بولا۔ "بس... اب حرکت مت کرنا۔ میں جرائم پیشہ نہیں ہوں لیکن ہوں راجر پان کا بیٹا۔ اس لیے تم پر ذرا بھی ترس نہیں کھاؤں گا۔"

شیرف کا ہاتھ رک گیا، وہ غرایا۔ "اگر تم سوچ رہے ہو کہ یہاں سے بچ کر چلے جاؤ گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔"

"میں بچ کر نہیں جاؤں گا بلکہ تمہاری لاش لے کر جاؤں گا۔ آخر تمہاری بیٹی کو بھی تسلی دینی ہو گی۔ ویسے تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اولیور نے پستول کا رخ شیرف کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

اولیور کے بازو پر پٹی بندھی تھی اور جین اسے سوپ پلا رہی تھی۔ وہ غم زدہ تھی اور اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پیالہ ختم کر کے اس نے ایک طرف رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پاپا کو آخری بار دیکھ رہی ہوں۔"

"میں نے شیرف سے کہا تھا کہ ہمیں زیادہ آدمیوں کے ساتھ جانا چاہیے، صرف چار ناکافی ہوں گے۔ اسی وجہ سے ہم پر حملہ ہوا اور حملہ آور رات کی تاریکی میں فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے اچانک ہی حملہ کیا تھا۔ اگر میرے بازو پر گولی نہ لگتی تو میں مزاحمت کرتا۔"

"مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔ میرا باپ ہمیشہ سے ضدی اور من مانی کرنے والا تھا۔ اس نے راجر پان جیسے شخص کو دشمن بنایا اور پھر بھی چند آدمیوں کے ساتھ اس کے علاقے میں چلا گیا۔ شکر ہے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔" جین نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ نہیں دیکھ سکی تھی کہ اولیور کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ آج صبح ہی شیرف کے آدمیوں کے ہمراہ اس کی لاش لے کر واپس پہنچا تھا۔ اس کی کہانی پر سب نے یقین کر لیا تھا۔ اب جارج گریگ کی بیٹی اور اس کی تمام دولت و جائداد اس کی تھی۔ وہ اس کا حق دار بھی تھا کیونکہ جارج نے یہ ساری دولت اس کے باپ کے نام پر تو حاصل کی تھی۔





# رشتوں کا خون

محمد عفان آزاد

خوبیوں اور خامیوں کا تناسب ہی انسانی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے... کسی بھی جذبے ... یا عادت کی زیادتی اور شدت سے پیدا ہو جانے والی کوئی کمی ... اس کی ذات کو غیر متوازن بنا دیتی ہے... ایک خواہش مند کی کتھا جس کی خواہشات کے حصول نے انسانی رشتوں کو ارزاں اور معمولی بنا دیا تھا...

**زندگی میں خونی رشتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتی ایک پرتاثر کہانی**

جینٹ اور ویلا ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ اُن کے گھروں کے دروازے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ویلا تو یہاں مدتوں سے رہ رہی تھی مگر جینٹ گزشتہ ایک برس پہلے ہی جنوبی ڈکوٹا کے علاقے لیکسن میں منتقل ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک برس سے پڑوسنیں تھیں مگر اس کے باوجود اُنہیں کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی۔

جینٹ کو طلاق ہو چکی تھی اور ویلا کسی بھی ایسی طلاق یافتہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی جو سگریٹ اور شراب پیتی ہو اور رات کو دیر تک گھر سے باہر رہتی ہو۔ اگرچہ جینٹ اُس کی ہم عمر تھی مگر ویلا کو اس کی جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی تھی وہ اس کا رویہ تھا۔ اُس کے خیال میں جینٹ اس طرح ظاہر کرتی تھی، جیسے ابھی وہ صرف بیس سال کی ہو۔ یہ حرکت بھی اسے سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اُن دونوں ہمسائیوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لیے وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر ہی رہنا پسند کرتی تھیں۔

ویلا سنجیدہ، بہترین اخلاق اور گھر کی دیکھ بھال میں وقت گزارنے والی مہذب عورت تھی۔ اُس کی زندگی اپنے گھر کے گرد ہی گھومتی تھی۔ اُن کا بیٹا کوڈی، شوہر جیک، ساس بریجٹ... یہ ویلا کا مختصر گھرانا تھا جو اُس کے لیے پوری دنیا تھی۔

جینٹ کے والدین مر چکے تھے۔ کسی اور رشتے دار کو وہ جانتی نہ تھی۔ طلاق سے پہلے بھی وہ سب سے دُور، شوہر کے ساتھ علیحدہ رہ رہی تھی۔ شادی شدہ زندگی میں اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ شوہر کے والدین، بہن بھائی یا اور کوئی رشتے دار اُن کے پاس پھٹکنے بھی نہ پائیں۔ اپنی اس کوشش میں وہ خاصی کامیاب رہی تھی۔ طلاق لینے کے بعد اب وہ تمام رشتوں کی قید سے آزاد تھی اور اپنی پسند کی زندگی میں مگن تھی۔ بقول ویلا کے وہ اکثر راتوں کو دیر گئے نشے کی حالت میں اونچی آواز میں گانے گاتے ہوئے گھر لوٹتی تو اس کی نظر اُس پر پڑ جاتی تھی۔ کئی بار اُس کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا کوئی مرد بھی ہوتا تھا۔ ویلا کے بیڈروم کی کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اکثر راتوں میں ایسا ہوتا تھا کہ جب اس کے کانوں میں جینٹ کے گانے کی چنگھاڑتی آواز پڑتی تو وہ پردہ ہٹا کر باہر جھانک لیتی تھی۔ دونوں گھروں کے درمیان کوئی دیوار نہیں تھی۔ سڑک پر لگے بلب کی روشنی میں جب بھی وہ جینٹ کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو دیکھتی، اس کا بلڈ پریشر بڑھنے لگتا..... کئی بار جینٹ نے بھی یہ محسوس کیا تھا کہ گھر واپسی پر اس کی پڑوسن اپنی کھڑکی سے جھانکتی ہے۔ اسے یہ حرکت بہت بُری لگتی تھی۔ غصے سے اس کا بلڈ پریشر بھی ہائی ہو جاتا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف اپنے اپنے دلوں میں شدید بغض رکھتی تھیں۔

ویلا اور جینٹ، دونوں نے کوڈی پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ جینٹ کو جب بھی وہ بچہ نظر آتا، وہ اسے پیار سے قریب بلاتی اور اس سے باتیں کرتی۔ جوں جوں کوڈی بڑا ہو رہا تھا، ویسے ویسے ویلا ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ بُری عورت اس کے بیٹے کو اپنی محبت کے جال میں نہ پھانس لے۔ کوڈی صحت مند تھا اور اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔ وہ جس اسکول میں پڑھتا تھا وہاں جینٹ لائبریرین تھی۔ اسی بنا پر ویلا خدشات کا شکار تھی۔ ویلا کا شوہر جیک شرابی، دل پھینک اور ناکارہ شخص تھا۔ اکثر اُن کے درمیان کشیدگی رہتی تھی۔ ویلا نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ عرصے سے جینٹ میں دلچسپی لے رہا ہے اور وہ بھی اسے مسکرا کر مزید آگے بڑھنے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ اسی لیے ایک دن جب جیک گھر سے باہر تھا اور اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہوگا، تب اس نے کوڈی کو جینٹ کے گھر بھیجا تاکہ وہ پتا چلائے کہ کہیں اس کا باپ وہاں تو نہیں۔

☆☆☆

یہ سنیچر کی صبح تھی۔ جب کوڈی عقبی حصے سے اس کے گھر کے قریب پہنچا تو وہ باہر کھڑی ہوئی نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ کوئی اور عورت بھی تھی۔ وہ دونوں آپس میں کچھ ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے اُس کی ماں پر طنز کر رہی ہوں۔ یہ دیکھ کر کوڈی گھر چلا آیا اور جو کچھ دیکھا سنا تھا، وہ سب کچھ ماں کو بتا دیا۔ اسے یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ کم از کم اس کا شوہر اُس کے پاس نہیں تھا، البتہ یہ سوچ سوچ کر اُس کا خون کھول رہا تھا کہ وہ دونوں اس کی ذات سے متعلق طنزیہ گفتگو کر رہی تھیں۔

لگ بھگ آدھ گھنٹے تک اس نے جیک کی واپسی کا انتظار کیا مگر وہ نہ آیا۔ مایوس ہو کر وہ اکیلے ہی کافی شاپ چل دی۔ یہ اس کے ہر سنیچر کا معمول تھا۔ وہ مقامی کافی شاپ میں بیٹھ کر سکون سے کافی پیتی اور ذہن کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اکثر جیک ان کے ساتھ آتا تھا۔ آج بھی اسے آنا تھا مگر ویک اینڈ کے باوجود نہ جانے وہ صبح سویرے، بنا کچھ بتائے کہاں چلا گیا تھا۔

ابھی وہ کافی پی رہی تھی کہ جینٹ بھی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی اور سیدھی اس کے برابر والی میز کی طرف بڑھی۔ ویسے بھی اس وقت وہاں کوئی اور میز خالی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اجنبی عورت بھی تھی۔ ویلا کو گمان ہوا کہ شاید یہی وہ عورت ہو گی جس سے وہ اس کے بارے میں طنزیہ گفتگو کر رہی تھی۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مزید بھڑک اٹھی۔

''ہائے ویلا...'' جینٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیسی ہو؟'' صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اخلاقی طور پر اس کا حال چال پوچھ رہی ہے۔

''بالکل ٹھیک۔'' اُس نے بھی رسمی لہجے میں مختصر جواب دیا۔

''جیک کا کیا حال ہے؟ کب طلاق دے رہی ہو اپنے اس شرابی شوہر کو؟'' جینٹ نے بے تکلفی سے کہا۔ یہ سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے بُرا سا منہ بنایا، نظریں جھکا کر کافی کی طرف دیکھنے لگی۔ ویلا کی حالت دیکھ کر جینٹ مسکرانے لگی۔

''کافی کا سارا مزہ غارت کر دیا کمینی عورت نے۔'' ویلا کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑائی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا اپنے شوہر پر۔ اگر وہ جھگڑالو اور شرابی ہوتا تو شاید اسے پرائی عورت کے سامنے جینٹ کی اس تنقید کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس نے جلدی جلدی کافی ختم کی اور باہر نکل آئی۔

کئی برس کی شدید شراب نوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن جیک چل بسا۔ اُس وقت کوڈی کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ باپ کی موت کے بعد ویلا بالکل تنہا رہ گئی۔ یہ اُن کی زندگی کے انتہائی دکھ بھرے شب و روز تھے۔ اس دوران میں جینٹ کا ایک اور رُخ سامنے آیا۔ اچھے ہمسائے کی طرح وہ ویلا کے گھر آنے جانے لگی تھی۔ ایسے وقت میں جب وہ تنہائی اور دکھ سے گزر رہی تھی، جینٹ نے اُن کی غمگساری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس کے رویے سے ویلا کا دل بھی اُس کی طرف سے قدرے صاف ہو چکا تھا۔

جیک کی زندگی میں اکثر ان کے ہاں لڑائی جھگڑے اور ہاتھا پائی کے واقعات ہوتے رہتے تھے مگر اب وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ شوہر کی موت کے بعد گھر کا ماحول خاصا پُرسکون ہو گیا ہے۔ کوڈی بھی باپ کے رویے سے خاصا نالاں تھا۔ وہ بھی خوش تھا کہ اب اسے ہر وقت ڈانٹنے والا کوئی نہیں۔ ویلا کی زندگی ایک نئے ڈھب پر چل پڑی تھی جہاں صرف سکون تھا۔ وہ خود کو اب زیادہ آزاد محسوس کرنے لگی۔

جیک کی موت کے بعد سوشل سیکورٹی اور انشورنس کی مد میں انہیں اچھی خاصی رقم مل گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب تک کوڈی اٹھارہ سال کا نہیں ہو جاتا، تب تک سوشل سیکورٹی کی مد میں اس کی پرورش کے لیے معقول رقم بھی ملتی رہتی۔ شوہر تو مر گیا تھا لیکن آمدنی کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یہ بات اس کے لیے نہایت اطمینان بخش تھی۔ جینٹ نے ویلا کو مشورہ دیا کہ گھر بیچ کر وہ کہیں اور اچھی جگہ چلی جائے اور بیٹے کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارے۔ اسے یہ مشورہ اچھا لگا مگر اس نے سوچا کہ وہ بوڑھی ساس کو اس عمر میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس لیے فی الحال اس نے لیکن سے کہیں اور جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ شوہر کی موت کے بعد اس کے پاس خاصا فارغ وقت تھا۔ ویلا نے ایک گفٹ شاپ پر ملازمت کر لی۔ یہ کام اس کے لیے آمدنی کا ذریعہ ہونے کے علاوہ من پسند بھی تھا۔

جیک کی موت کے سوا سال بعد اس کی ماں بھی چل بسی۔ اب ویلا اور کوڈی اکیلے رہ گئے تھے لیکن نہ جانے کس طرح یہ بھنک ویلا کے ایک رشتے دار کو مل گئی۔ یہ ویلا کے انکل آرنٹ تھے۔ وہ مرچنٹ نیوی کے ایک ریٹائرڈ آفیسر تھے اور دوسرے شہر میں اکیلے رہتے تھے۔ ان کی عمر خاصی تھی۔ اِدھر بوڑھی ساس دنیا سے گزری، اُدھر بوڑھے انکل اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اُن کے ہاں آدھمکے۔ ویسے بھی عمر کے اس حصے میں کسی اپنے کے پاس نہ ہونے کا احساس شدت اختیار کر گیا تھا۔ انکل آرنٹ کی زندگی کا یہ خلا ویلا نے پُر کر دیا۔

ویلا شائستہ عورت تھی۔ اس نے خوشی خوشی انہیں اپنے گھر پر قبول کر لیا لیکن انکل آرنٹ بہت ہی بدمزاج ہے۔ ان کا لہجہ ہمیشہ تحکمانہ ہوتا۔ وہ پورے گھر کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتے تھے۔ ویلا کی طبیعت میں تابع داری اور بڑوں کے احترام کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ شاید اسی لیے وہ یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی مگر کوڈی سخت پریشان تھا۔ اگرچہ کوڈی نے اب تک کی ساری زندگی جھکی جھکی دادی کے ساتھ بسر کی تھی مگر وہ اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ یہ بھی ان کے بہت قریب تھا مگر انکل آرنٹ... ایک تو اجنبی اوپر سے بدمزاج۔ کوڈی کسی بھی طرح ان کا رویہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے، تب سے اس کا اونچی آواز میں میوزک سننا بند ہو چکا تھا۔ سورج ڈھلنے کے بعد وہ گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ اگر کبھی گھر لوٹنے میں دیر ہو جاتی تو بدمزاج انکل کی تقریر اس کا دماغ خراب کر دیتی۔ ویلا بھی بیٹے کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو دیکھ کر دل میں کُڑھتی ضرور تھی مگر انکل سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کوڈی کو اچھی طرح احساس ہو چکا تھا جب تک انکل یہاں ہیں، تب تک اس کی زندگی عذاب ہی بنے رہے گی۔ آخر اس نے اپنی آزادی کا ایک راستہ نکال لیا۔

رفتہ رفتہ کوڈی جینٹ کے قریب ہونے لگا۔ بہت جلد عملی طور پر اس نے جینٹ کے گھر کو ہی اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ وہ بھی اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ دونوں مل کر ہلا گلا کرتے، ریستوران میں دعوتیں اڑاتے، فلمیں دیکھتے، ساتھ گھومتے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھرتے تھے۔ جینٹ اس کو پڑھاتی۔ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی۔ کوڈی نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ بات ویلا اچھی طرح جان چکی تھی مگر وہ ناخوش نہیں تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ جینٹ اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جینٹ کو ہمیشہ سے بُری عورت سمجھتی تھی لیکن جب سے کوڈی اُس کے ساتھ رہ رہا تھا، اس کی رائے بدل گئی تھی۔

انکل آرنٹ کو جگر کا عارضہ لاحق تھا۔ اس کے باوجود وہ خوب شراب پیتے تھے جس کی وجہ سے وہ اکثر بیمار رہتے اور مہینے میں کئی بار ایسا ہوتا تھا جب ویلا کو کام سے چھٹی کر کے اُن کی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ ایک دن ویلا کو باہر جانا تھا مگر انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آخر اس نے انہیں بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اُسے قریب واقع چرچ کے ایک دعائیہ اجتماع میں شرکت کرنا تھی۔ وہ شاید نہیں جاتی مگر یہ دعوت نیلسن نے دی تھی۔ وہ نیلسن کو کافی عرصے سے جانتی تھی۔ نیلسن چرچ انتظامیہ کا ایک اہلکار تھا۔ وہ یہ کام پیسے کے لیے نہیں بلکہ مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتا تھا۔ جانا ضروری تھا اس لیے وہ اپنے ساتھ انکل آرنٹ کو بھی لے گئی۔ اس کی گاڑی میں جینٹ کے ساتھ کوڈی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے نیلسن سے ملوائے تاکہ وہ اسے نصیحت کر سکے۔ اکیلا وہ جاتا نہیں اس لیے اس نے جینٹ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ وہ اب اکثر یہ سوچتی تھی کہ کوڈی لڑکپن میں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جینٹ اسے اپنے کسی خاص مقصد کے لیے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔

اجتماع کا پہلا سیشن ختم ہونے کے بعد چائے کا وقفہ ہوا۔ موقع غنیمت تھا۔ ویلا نے کوڈی اور جینٹ کے حوالے سے سارا معاملہ نیلسن کے سامنے بیان کر دیا۔ نیلسن شائستہ مزاج اور ہمدرد طبیعت کا مالک تھا۔ وہ توجہ سے اس کا مسئلہ سنتا رہا۔ ویسے بھی وہ دلی طور پر اسے پسند کرتا تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ انکل کی وجہ سے میرا جواں سال بیٹا کسی پرائی عورت کے گھر رہے۔ وہ اس سے پیار کرتی ہے لیکن ہے تو طلاق یافتہ۔'' ویلا نے اپنے دل کا اصل راز نیلسن کے سامنے کھولا۔ ''وہ اب عمر کے سترھویں سال میں داخل ہونے والا ہے۔ یہ بات میرے لیے پریشان کن ہے۔ وہ عورت اچھے کردار کی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوڈی...'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''میں تمہاری بات سمجھ گیا۔'' نیلسن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس عمر میں اسے اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر پر ہونا چاہیے۔''

''یہی تو میں چاہتی ہوں۔'' ویلا نے فوراً کہا۔ ''عورت اس کی ماں تو نہیں ہے۔ اوپر سے کوڈی بھی جوان ہو رہا ہے۔ کہیں خدانخواستہ اُن کے بیچ کچھ...'' وہ ایک بار پھر کہتے کہتے رک گئی۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے جواں سال بیٹے کو نادان اور جینٹ کو دل کی گہرائیوں سے ناپسند کرتی ہے۔

''اصل مسئلہ انکل آرنٹ کا ہے۔'' نیلسن نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ میرا خیال ہے کہ جب تک وہ گھر پر ہیں، کوڈی نہیں پلٹے گا۔ جہاں تک ان کی بات ہے تو وہ عمر کے جس حصے میں ہیں، ان کا رویہ بدلنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں مگر انکل آرنٹ کا کیا کروں؟'' ویلا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ جب سے کوڈی، جینٹ کے ساتھ رہ رہا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں کسی سے اتنے پُرتشویش لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا دل جینٹ کی طرف سے کبھی بھی صاف نہیں رہا تھا، وہ مصلحتاً سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔

''جہاں تک انکل کی بات ہے تو انہیں اولڈ ایج ہوم بھیج دینا چاہیے۔'' نیلسن نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''ویسے میرا اگلا خطاب بگڑے ہوئے نوجوانوں کو راہِ راست پر لانے کے بارے میں ہے۔ کوشش کروں گا کہ اسے بھی سمجھا سکوں۔''

''یہ بہت اچھا ہوگا۔'' ویلا نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ملتے ہیں، اب سیشن شروع ہونے والا ہے۔'' نیلسن نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ویلا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ جب وہ نیلسن سے گفتگو کر رہی تھی، جینٹ کوڈی کے ساتھ راہداری میں ہی کھڑی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اتفاقی طور پر وہاں موجود تھی یا شاید گن لینے کے لیے کھڑی تھی کہ ویلا، نیلسن سے کیا باتیں کر رہی تھی۔

دعائیہ تقریب دراصل ایک اجتماع تھا جس میں مبلغین اصلاحی تقاریر کرتے تھے۔ نوجوانوں کے لیے مخصوص سیشن شروع ہونے والا تھا۔ جینٹ اور ویلا کے درمیان کوڈی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے لیے سلکی بال کوٹ کے کالر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے تقریب میں شرکت کے لیے زندگی میں پہلی بار سوٹ پہنا تھا۔ سیشن شروع.... ہونے والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی ہال میں داخل



ہوئی۔ وہ کوڈی کی ہم عمر ہی لگ رہی تھی لیکن اس کا حلیہ اس طرح کے مذہبی اجتماعات میں شرکت کے لحاظ سے بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ اس نے بھڑکیلا سرخ شارٹ اسکرٹ، بنا بازو کا ٹنگ بلاؤز اور اونچی ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ چہرے پر بھی کافی میک اپ تھوپ رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے چال چلن کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ وہ لڑکی اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اچانک اس کی نظر کوڈی پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ کوڈی کی نظریں بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے ہی دیا۔ وہ ان سے اگلی قطار میں بیٹھے ایک مرد اور عورت کے درمیان بیٹھ گئی۔ وہ اس کے والدین تھے۔

ویلا اور جینٹ نے بھی اس لڑکی اور کوڈی کے درمیان مسکراہٹ کے اس تبادلے کو محسوس کر لیا تھا۔ جینٹ، کوڈی اور اس لڑکی کی دوستی سے آگاہ تھی۔ مگر ویلا کے لیے یہ اہم بات تھی۔ اس نے بیٹے پر نظر ڈالی۔ ویلا کے خیال میں تو وہ لڑکی بہت سر چڑھی تھی مگر کوڈی اس لڑکی کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی پاکیزہ پری آسمان سے زمین پر اتر آئی ہے۔ ویلا نے کن انکھیوں سے یہ منظر دیکھا تھا۔

تقریب کے خاتمے پر کھانے کا اہتمام تھا۔ اسی دوران میں ویلا جان بوجھ کر اس لڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ اتفاق سے نیلسن بھی لڑکی کے ساتھ موجود ادھیڑ عمر کے سنجیدہ شکل و صورت والے مرد سے بات کر رہا تھا۔ ویلا سمجھ گئی کہ وہ یقیناً اس کا باپ ہی ہوگا۔

''ہائے...'' ویلا نے قریب پہنچ کر کہا تو نیلسن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کوڈی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''ہائے مسز ویلا جیک۔'' نیلسن نے مہذبانہ انداز میں کہا اور پھر اس فیملی سے تعارف کرانے لگا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' نیلسن نے جب بتایا کہ کیمی کے دادا بھی پادری تھے تو ویلا نے خوشی سے کہا۔ کیمی وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں وہ سوچ رہی تھی۔

کیمی ایک خودسر لڑکی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی بھی نہیں سنتی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں اس نے ایک دو ایسے جرم کر ڈالے تھے جو قابلِ سزا تھے لیکن کم عمری کی بنا پر اسے صرف نگرانی کی سزا دی گئی تھی۔ اب اسے اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے کے دوران میں مکمل طور پر والدین اور اساتذہ کی نگرانی میں گزارنا تھے۔ اس سزا کے بعد بھی اس کے رویے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کی خودسری اب بھی تقریباً پہلے جیسی ہی تھی۔ اس کے خراب رویے کی بنا پر اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا اور اب وہ اسی اسکول میں پڑھتی تھی جہاں کوڈی پڑھتا تھا۔ کوڈی سے اس کی ویسے بھی اچھی خاصی دوستی تھی۔ یہ بات ویلا بھی سمجھ گئی جب وہ، نیلسن اور کیمی کے والدین چائے کی میز پر باتیں کر رہے تھے مگر اُس وقت وہ دونوں ان سے الگ تھلگ باتوں میں مشغول تھے۔

اسے کیمی پہلی ہی نظر میں پسند نہیں آئی تھی مگر ایک پہلو ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ اسے اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھ کر بھی برداشت کیے جا رہی تھی۔ وہ کیمی کی خودسری برداشت کرنے کو تیار تھی کیونکہ اپنے بیٹے کو ہر قیمت پر جینٹ کے چنگل سے نکالنا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ہم عمر نوجوان لڑکی کسی بھی لڑکے کو ایسی عورت سے ہر حال میں دور کر سکتی ہے جو عمر میں اُس کی ماں کے برابر ہو اور چاہے اُسے کتنا ہی ٹوٹ کر پیار کرتی ہو اس لیے اس نے جاننے کے باوجود کوڈی سے یہ کہنے سے گریز کیا کہ کیمی اچھی لڑکی نہیں ہے۔

ویلا اپنے دل میں جینٹ کے متعلق جو کچھ بھی سوچتی ہو مگر چرچ سے واپسی پر سارے راستے وہ صرف اس لیے پریشان تھی کہ پچھلے مہینے کی اسکول رپورٹ سے اسے پتا چلا تھا کہ کوڈی کی توجہ پڑھائی پر سے کچھ کم ہو گئی ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اسے پہلے کی طرح پڑھائی کی طرف راغب کیا جائے۔ انکل آرنٹ کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ اس لیے خلافِ توقع سارا دن چپ بیٹھے رہے تھے۔ جینٹ اور کوڈی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ویلا ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ سب خاموش تھے۔

واپسی میں ویلا پورے راستے.... نیلسن کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ اسے کافی عرصے سے جانتی تھی مگر شوہر کی موت کے بعد اب نیلسن کے بارے میں وہ کسی اور زاویے سے سوچ رہی تھی۔ نیلسن بھی اس کی عزت کرتا تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ جب سے جیک کا انتقال ہوا تھا، تب سے اُس کی دلچسپی بھی اس کی ذات میں خاصی بڑھ گئی تھی۔ عمر میں وہ اس سے کچھ بڑا تھا لیکن اس کے نزدیک اُس کی ایک خوبی تھی۔ وہ معقول آمدنی کے ساتھ خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا۔ ویلا کے لیے یہی اہم بات تھی۔ اُس کے لیے جیک کی موت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ پیسوں کا تھا۔ انکل آرنٹ اسے ہر ماہ معقول کرایہ ادا کرتے تھے اور جب تک کوڈی اٹھارہ سال کا نہیں ہو جاتا، تب تک اُسے سوشل سیکیورٹی کی طرف سے گزر بسر کا وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ وہ خود بھی تھوڑا بہت کما لیتی تھی مگر اس کے باوجود اس کا ہاتھ تنگ تھا۔ وہ پریشان تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب کوڈی اٹھارہ سال کا ہو جائے گا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو سوشل سیکیورٹی کا وظیفہ بھی بند ہو جائے گا اور انکل آرنٹ کی زندگی کا تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ وہ مرتے تو آمدنی کا ایک اور ذریعہ ختم ہو جاتا۔ یوں اگلے سال سوا سال بعد اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا تھا کہ یا تو وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کرے یا ہائی اسکول کی تعلیم مکمل ہوتے ہی کوڈی کہیں پر ملازمت شروع کر دے۔ تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ نیلسن سے شادی کر کے ان مشکلات سے خود کو نکالے۔ نیلسن نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ عورت تھی۔ اس کی نظروں سے بھانپ چکی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی وہ ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ واپس گھر پہنچ گئے۔

ایک طرف تو ویلا تھی جو صرف اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی، دوسری جینٹ تھی جو صرف اور صرف کوڈی کے بہتر مستقبل کے بارے میں فکر مند تھی۔ ایک روز کوڈی کے ریاضی کے ٹیچر مسٹر میلرڈ نے اُس سے کہا۔ ”کوڈی کا دماغ فزکس اور ریاضی میں غیر معمولی طور پر چلتا ہے۔ اگر وہ اس پر توجہ دے تو مستقبل میں اچھا انجینئر بن سکتا ہے۔“ یہ بات تب سے اس کے ذہن پر سوار تھی۔ ویسے بھی وہ کوڈی کے گزشتہ ماہ دیے گئے ٹیسٹ کے رزلٹ سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ واپس اس کو پڑھائی کی طرف لانا چاہتی تھی۔ سارے راستے وہ اسی سوچ میں ڈوبی رہی تھی۔

دوسرے دن جینٹ نے اس کی ایڈوانس میں کئی ماہ کی فیس جمع کروائی۔ اس کے لیے پرائیویٹ طور پر ایک ٹیوٹر کا انتظام کیا اور پھر ذاتی طور پر بھی اسے پیار سے سمجھاتی رہی۔ آخر کچھ عرصے بعد جب سہ ماہی نتیجہ آیا تو اس کی محنت کا پھل آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس نے امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ پوری کلاس میں وہ پہلے نمبر پر آیا تھا۔ اب ہائی اسکول پاس کرنے کے لیے اس کا آخری سیمسٹر باقی تھا۔

جس دن کوڈی نے رپورٹ کارڈ لا کر جینٹ کو دکھایا تو وہ فوراً ویلا کے گھر پہنچ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے کارڈ لہراتے ہوئے کہنے لگی۔ ”یہ دیکھو اپنے بیٹے کا مستقبل۔“

”دکھاؤ۔“ ویلا نے لپک کر اس کے ہاتھ سے کارڈ چھین لیا اور پڑھنے لگی۔ ”یہ بہت اچھا ہے۔ بس! جیسے ہی یہ ہائی اسکول سے فارغ ہوگا، نوکری پر لگ جائے گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جینٹ نے چونک کر کہا۔ ”اسے آگے پڑھنا ہے، کالج بھیجو، گریجویشن کرواؤ۔ یہ کیا تم اس سے نوکری کروانے کا سوچ رہی ہو۔ کیا ہائی اسکول کی تعلیم بہت ہے؟“ جینٹ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

اسے ویلا کے خیالات سن کر جھٹکا لگا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اگلے سال کوڈی کی سوشل سیکیورٹی بند ہو جائے گی اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کالج کی فیس...“

”ذرا یہ سوچو کہ کوڈی تمہاری انویسٹمنٹ ہے۔“ جینٹ نے قطع کلامی کی۔ ”اگر وہ ہائی اسکول چھوڑ کر نوکری کرتا ہے تو پھر ساری زندگی کولہو کا بیل بنا رہے گا۔ اگر وہ انجینئر بن جاتا ہے تو پھر پچاس ہزار سے ایک لاکھ ڈالرز سالانہ کمائے گا، وہ بھی پہلے ہی سال۔ پھر تو اس کی کمائی بدستور بڑھتی جائے گی۔“ جینٹ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مالی طور پر کتنا خوشحال ہو سکتا ہے۔

”کیا واقعی...“ بظاہر سیدھی سادی نظر آنے والی ویلا نے نہایت سادگی سے کہا۔ پیسے کا سن کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

”یقیناً۔“

”مگر میرے پاس اتنے...“ ویلا نے ایک بار پھر پیسوں کے نہ ہونے کا رونا شروع کیا ہی تھا کہ جینٹ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ ذہین طالب علم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آگے پڑھنے کے لیے اسے اسکالرشپ مل سکتی ہے۔“

”یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔“ ویلا نے کہا۔ ”میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔“ پہلی بار ویلا واقعی اسے دل سے کافی پلانا چاہ رہی تھی۔

”ضرور بناؤ۔“ جینٹ نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد کوڈی بھی آ گیا۔ خوش قسمتی سے انکل آرنٹ ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے تھے اس لیے لعن طعن کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کوڈی نے اونچی آواز میں میوزک لگا دیا۔ کافی پیتے ہوئے گانے کی دھن پر ویلا کے پاؤں بھی ہل رہے تھے۔ وہ بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب جینٹ نے گھر کا بیرونی دروازہ بند کیا۔ وہ کچھ سامان خریدنے جا رہی تھی۔ دروازہ بند کر کے جیسے ہی وہ پلٹی، سامنے سے نیلسن آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیمی بھی تھی۔ ویسے بھی وہ کیمی سے کئی بار پہلے بھی کوڈی کے ذریعے مل چکی تھی۔

”ہائے... کہیں جا رہی ہو؟“ نیلسن نے قریب پہنچ کر کہا۔

”ہاں... بس ذرا مارکیٹ تک جا رہی تھی۔“



”آج اتفاق سے یہاں آنا ہوا، سوچا کہ ذرا ویلا سے بھی ملتا چلوں۔“ نیلسن نے مہذب انداز میں بات شروع کی۔ ”اس نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم کوڈی کو کالج بھجوانا چاہتی ہو۔ یہ تم نے بہت اچھا سوچا ہے۔“

”بہت شکریہ نیلسن ورنہ تو ویلا اس سے...“

”وہ نوکری کروانا چاہتی ہے۔“ نیلسن نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سب کچھ اچھی طرح جانتا ہوں مگر مجھے تمہارا فیصلہ زیادہ بہتر لگا۔ میں اس معاملے میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔ اس بچے کی زندگی سدھر جائے گی، یہ تمہارا احسان ہوگا۔“

”میرا کوئی احسان نہیں ہوگا۔“

”یہ سب تمہارا خلوص ہے جینٹ۔“ نیلسن کا لہجہ تشکرانہ تھا۔

کیمی چپ چاپ نیلسن کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولی البتہ اُس کے چہرے کے تیور بتا رہے تھے کہ جینٹ کا یہ انداز اُسے پسند نہیں آیا تھا۔

دوسرے دن جینٹ اسکول لائبریری میں کام کر رہی تھی کہ کیمی آ گئی۔ ”ہیلو میڈم۔“ اس نے قریب پہنچ کر طنزیہ انداز میں اسے پکارا۔

”ہائے کیمی...“ جینٹ نے کمپیوٹر مانیٹر پر سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور گرم جوشی سے کہا۔ ”خیریت تو ہے، تم اور یہاں لائبریری میں؟“

”تم سے ملنے آئی ہوں اور کچھ کہنے بھی۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”تو کہو۔“ جینٹ نے بھی اس کے لہجے میں چھپی تلخی کو محسوس کر لیا تھا اسی لیے اس کا لہجہ بھی فوراً ہی بدل گیا۔ اس نے بھی نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

”تم کوڈی کو کالج بھجوانے کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو؟“

”اس لیے کہ وہ ذہین ہے اور اسے اپنا مستقبل بنانا ہے، سمجھ میں آ گئی یہ بات۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہنے بولی۔ ”میرے خیال میں تمہیں بھی کالج میں داخلہ لینا چاہیے۔ وہاں تمہاری دلچسپی کی بھی بہت سی چیزیں ہوں گی۔“

”بہت شکریہ تمہارے اس قیمتی مشورے کا۔“ اس نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”ویسے مجھے کالج جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے لائبریری میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر جینٹ کی طرف رخ کر کے کہنے لگی۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہیں کوڈی کے مستقبل کی فکر کیوں ہے؟ تم اس کی ماں تو ہو نہیں اور رہی ماں تو وہ خود چاہتی ہے کہ اب اسے نوکری کر لینی چاہیے۔ لیکن تم ہو کہ اس کی ماں سے بھی زیادہ اس کے مستقبل کی فکر میں مری جا رہی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم اس کی...“

”بکواس بند کرو اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔“ جینٹ نے قطع کلامی کی اور آہستہ آواز مگر سخت لہجے میں کہا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی کیا کہنے والی تھی۔

”اوکے... جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی پلٹی اور پھر کمر لچکاتے ہوئے لائبریری سے باہر نکل گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسے چڑانے کے لیے ہی یہاں آئی تھی۔

کیمی کے جانے کے کافی دیر بعد تک جینٹ سر پکڑے بیٹھی رہی۔ وہ اس لڑکی کو اچھی طرح جانتی تھی مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی سوچ بھی اسی کی طرح گھٹیا ہے۔ جینٹ نے کوڈی کو کبھی تنبیہہ نہیں کی تھی کہ وہ کیمی سے زیادہ میل ملاپ نہ کرے لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں کیمی اس کا مستقبل تاریک کرنے کی وجہ نہ بن جائے۔ ویسے وہ یہ بات تو پہلے ہی جان چکی تھی کہ دونوں کے تعلقات دوستی سے بہت زیادہ آگے بڑھ چکے ہیں۔ یہ بات پہلے تو نہیں مگر کیمی کے اس رویے کے بعد اس کے لیے ضرور پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ پچھلے تین چار برسوں کے دوران جینٹ، کوڈی کو ویلا سے بھی بڑھ کر چاہنے لگی تھی۔ وہ زندگی میں اسے کسی بلند مقام پر باعزت زندگی بسر کرتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی مگر اب کیمی...

☆☆☆

وہ دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا جب نیلسن نے آخر کار ویلا کو شادی کی پیشکش کر دی۔ وہ تو خود بھی دل سے یہی چاہتی تھی۔ اُس نے بھی فوراً ہاں کر دی۔ کیونکہ اس عرصے میں انکل آرنٹ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ تنہا ہو گئی تھی لہٰذا طے پایا کہ دونوں نئے سال کے موقع پر شادی کر لیں گے۔ ویلا بہت خوش تھی مگر ایک دن اچانک اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ فینسی گفٹ شاپ کی مالکن لوری والکر ایک صبح جاگنگ کر رہی تھی کہ تیز رفتار کار نے اسے ٹکر ماردی۔ وہ شدید زخمی ہوئی۔ اسپتال میں کئی روز گزارنے کے بعد وہ گھر تو منتقل ہو گئی تھی لیکن ابھی کئی روز تک اسے تھراپی کروانا تھی۔ حادثے کے نتیجے میں وہ چلنے پھرنے اور بولنے سے لگ بھگ معذور ہی ہو چکی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں اب ویلا کو تن تنہا دُکان



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلانا تھی۔ اس کی مدد کے لیے صرف ایک کم عمر سیلز مین ہی تھا۔ ویسے بھی بالمین اتنا تجربہ کار نہیں تھا کہ اکیلا دُکان سنبھال سکتا۔ اس ناگہانی مصروفیت کے باعث ویلا اپنے گھر اور کوڈی کو ہی نہیں بلکہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ بہت جلد وہ اور نیلسن شادی کرنے والے ہیں۔ اس نے کوڈی کو بھی ایک دو روز اپنی مدد کے لیے دکان پر بلایا تھا لیکن اس نے جلد بازی میں دو تین قیمتی گفٹ توڑ ڈالے تھے۔ جس پر اس نے اسے واپس بھیج دیا۔ ویلا اب صبح دس بجے سے شام سات بجے تک دکان پر رہتی تھی اور جب گھر لوٹتی تو اتنی تھک چکی ہوتی کہ کھانا کھاتے ہی لمبی تان کر سو جاتی۔

''کیمی میری مدد کر سکتی تھی لیکن بہت دن ہو گئے وہ دکھائی ہی نہیں دی۔ لگتا ہے کہیں غائب ہو گئی ہے۔'' اُس روز جینٹ، ویلا سے ملنے کے لیے پہنچی تو کہنے لگی۔ ''کہیں اُن دونوں میں جھگڑا تو نہیں ہو گیا ہے۔'' ویلا نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''خیر چھوڑو، مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ کوڈی جانے اور وہ۔'' جینٹ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کیمی لوری کی رشتے دار بھی ہے۔ اس نے اسے بچپن میں گود لے لیا تھا مگر چھ سال کی تھی کہ اسے ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔''

''کیوں بھیج دیا تھا؟'' جینٹ نے حیرت سے پوچھا۔

''ویسے یہ میرے لیے انکشاف ہے۔''

''اب وہ دُکان چلاتی یا اس کی دیکھ بھال کرتی۔'' ویلا نے جواب دیا۔ ''ویسے وہ رشتے میں اس کی فرسٹ، سیکنڈ یا تھرڈ کزن بھی ہوتی ہے۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟''

''لوری نے بتایا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''جب سے اُس کی تھراپی ہو رہی ہے، لوری بتا رہی تھی کہ کیمی باقاعدگی سے آتی ہے اور اس کی خاصی مدد کر رہی ہے۔''

''کیا...'' جینٹ نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیمی اور کسی کی مدد۔ تم تو انکشاف پر انکشاف کیے جا رہی ہو۔'' جینٹ کے لبوں پر ہلکی سے مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ ''کوئی مطلب ہی ہو گا اُس کا ورنہ کیمی اور کسی کی مدد... یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو بڑی خود غرض لڑکی ہے۔ وہ صرف دولت اور اپنی ذات سے ہی مخلص ہے۔'' لگ رہا تھا کہ جینٹ بھی آج کھل کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہ رہی تھی۔ ''خیر یہ باتیں چھوڑو۔ یہاں دستخط کر دو۔ کل درخواست جمع کروانی ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر ویلا کے سامنے درخواست فارم اور قلم بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ کوڈی کے کالج میں داخلے کی درخواست پر بطور سرپرست اس سے دستخط کروانے کے لیے آئی تھی۔

نئے سال کے آغاز پر نیلسن اور ویلا نے شادی کر لی۔ دوسرے ہی دن وہ تین روز کے لیے ایک تفریحی مقام پر ہنی مون منانے کے لیے چل دیے۔ اُن کی غیر موجودگی میں کوڈی، جینٹ کے ہاں سے اپنے گھر چلا گیا تھا۔ جینٹ کو کوڈی نے بتایا تھا کہ کیمی کہیں باہر گئی ہوئی ہے اور ہفتے کی شام لوٹنے والی ہے۔ جس دن نیلسن اور ویلا ہنی مون پر گئے، اس کے دوسرے دن اُسے لوٹنا تھا۔ جینٹ کو یقین تھا کہ کوڈی گھر پر تنہا ہے اور کیمی یقیناً سیدھا اُس کے پاس ہی پہنچے گی۔ وہ دونوں خالی گھر سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیں گے۔

''تمہاری غیر موجودگی میں مجھے تو یہاں ایک بار بھی کیمی نظر نہیں آئی۔'' جب وہ ہنی مون سے لوٹے تو ویلا، جینٹ سے ملنے اس کے گھر گئی اور باتوں باتوں میں یہ جاننا چاہا کہ اُن کی غیر موجودگی میں کہیں وہ تو یہاں نہیں آئی تھی۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ شاید اُن دونوں میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہے ورنہ یہ تو ممکن نہیں، گھر خالی اور کوڈی تنہا ہو لیکن وہ نہ آئے۔'' جینٹ نے کہا تاہم وہ یہ بات گول کر گئی کہ ہفتے کی رات کو اُس کے گھر کے پچھواڑے سے اُٹھا پٹخ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ جینٹ نے یہ آوازیں سن کر کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی تھی مگر اندھیرے کی وجہ سے اُسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ وہ صبح سویرے اسے گھر کے باہر نظر آیا تھا لیکن نہ تو جینٹ نے اس سے کچھ پوچھا اور نہ ہی اُس نے کچھ بتایا۔ البتہ وہ چہرے سے پریشان لگ رہا تھا۔ دوسری طرف ویلا یہ سن کر خوش تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کیمی اُس کے بیٹے سے دور رہی تھی۔

''ویسے وہ ہے کہاں؟'' ویلا نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، کوڈی نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔'' جینٹ نے جواب دیا۔ ''ویسے اسے یہ ضرور علم تھا کہ وہ ہفتے کی شام لوٹ رہی ہے۔''

''کیا کوڈی نے تمہیں بتایا تھا؟'' ویلا نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔

''خیر چھوڑو اس قصے کو، میں تو ویسے ہی اندازے سے کہہ رہی تھی۔'' جینٹ نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ اب اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ نیلسن کو فوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے۔ اب مجھے اس کے لیے پرہیزی کھانا بنانا ہے۔'' ویلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔



''اوکے۔'' جینٹ بھی کھڑی ہو گئی۔ ''کل تمہاری طرف چکر لگاؤں گی۔''

''ضرور۔'' ویلا نے کہا۔ ''نیلسن بھی تمہاری بہت تعریف کر رہا تھا۔''

ویلا کو ہنی مون سے لوٹے ہوئے تیسرا دن تھا کہ صبح سویرے جینٹ اس کے گھر پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ جب سے اگلل آرنٹ کا انتقال ہوا تھا، تب سے کوڈی اپنے گھر پر ہی رہ رہا تھا۔ اس وقت وہ سویا ہوا تھا۔ نیلسن کی طبیعت اب بھی خراب تھی لیکن وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے چرچ جا چکا تھا۔ ویلا کچن میں تھی۔

''تمہیں کچھ پتا بھی ہے کیمی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' جینٹ سیدھی کچن میں پہنچی اور جلدی سے کہا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' جینٹ کو پریشان دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی۔

''کیمی مر گئی، اس کا قتل ہو گیا ہے۔''

''کیا؟'' یہ سن کر ویلا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''کل شام اُس کی لاش ہاورڈ جھیل میں تیرتی ہوئی ملی ہے۔ کسی نے لاش دیکھ کر پولیس کو اطلاع کر دی۔'' جینٹ نے اخبار اُس کے سامنے لہرایا۔ خبر کے ساتھ اُس کی بڑی سی تصویر بھی چھپی تھی۔

ویلا بہت پریشان تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسکول میں سب کو پتا ہے کہ کیمی اور کوڈی میں بہت قریبی تعلقات تھے۔ اُسے ڈر تھا کہ اب کوڈی پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچ نہیں سکے گا۔ ''اب کیا ہو گا؟'' اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''وہی جو پولیس کرتی ہے۔'' جینٹ نے کہا۔ ''ایسی لڑکی کا تو یہی انجام ہونا تھا۔ اب پولیس آئے گی اور کوڈی سے بھی گتھیش ہو گی۔''

کافی دیر تک وہ دونوں سر جوڑے اس بات پر سوچتی رہیں کہ اب کیا ہو گا؟ مگر وہ اس کے سوا کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں کہ کسی بھی وقت پولیس اس گھر کے دروازے پر پہنچنے والی ہے۔

''میں گھر جا رہی ہوں اور آج لائبریری سے چھٹی کر رہی ہوں۔'' کافی دیر بعد جینٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس آئے گی تو پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔''

جینٹ تو چلی گئی مگر ویلا سخت پریشان تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ اُسے گئے ہوئے بمشکل آدھ گھنٹا ہی گزرا ہو گا کہ شیرف کی کار ویلا کے ڈرائیوے میں پہنچی۔ جینٹ بھی اپنے گھر کی کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کار سے اترتا، جینٹ تیزی سے اٹھی اور پچھلے دروازے سے ویلا کے ہاں پہنچ گئی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، اُسے کوڈی سیڑھیوں سے اترتا ہوا نظر آ گیا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس اس کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی خاموش تھا اور خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو خاموش مگر سوالیہ نگاہوں سے گھورتے رہے اور پھر لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ وہ سب شیرف سمیت لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سب خاموش تھے صرف شیرف ہمینسن بول رہا تھا۔

''آپ یقین کریں وہ صرف ایک حادثہ تھا۔'' اچانک کوڈی نے شیرف کی قطع کلامی کی اور بولنا شروع کر دیا۔ ''کیمی نے کچھ ایسا کہا تھا کہ میں طیش میں آ گیا اور خود پر قابو کھو بیٹھا۔ ہم نے لڑنا شروع کر دیا۔ یقین کرو، میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے اور طیش دلا رہی تھی۔ بس اسی عالم میں، میں نے اسے ایک تھپڑ مار دیا۔ بس پھر کیا تھا، وہ گالیاں بکتی ہوئی گھر کے پچھواڑے کی طرف چلی گئی۔ وہ بھی غصے میں بے قابو ہو گئی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ شیرف معنی خیز نگاہوں سے اُسے گھور رہا تھا۔

''اُس کے بعد کیا ہوا تھا؟'' شیرف ہمینسن نے سوال کیا۔ ویلا اور جینٹ دم بخود بیٹھی، کوڈی کا اعترافی بیان سن رہی تھیں۔

''پھر اُس نے غصے میں چلاتے ہوئے شاید دیوار پر اپنا سر دے مارا۔'' کوڈی نے ایک بار پھر اپنا بیان شروع کیا۔ ''اسی دوران میں بھی وہاں پہنچ گیا اور اسے اندر لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس نے مجھے دھکا دیا اور میں گر گیا۔ اس نے پھر زور سے اپنا سر دیوار پر مارا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ میں اٹھا اور تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، وہ بہت ہلکی چل رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، اس نے دو تین ہچکیاں لیں اور دم توڑ دیا۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش رہا اور پھر بولنا شروع کیا۔ ''اُسے مرتا دیکھ کر میں سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں اس کی لاش چھوڑ کر اندر چلا آیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر اندھیرا تھا۔ میں اس کی لاش ڈگی میں ڈال کر جھیل پر لے گیا اور پانی میں بہا دیا۔'' یہ کہہ کر وہ شیرف کی طرف دیکھنے لگا۔ ''سر' میرا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقین کیجیے، وہ ایک حادثہ ہی تھا اور کچھ نہیں۔"

"اب یہ ایک حادثہ تھا یا پھر قتل... یہ فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ فی الحال تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے شیرف اپنی جگہ سے اٹھا اور کوڈی کے ہاتھ پشت پر موڑتے ہوئے ہتھکڑی لگادی۔

جب شیرف کوڈی کے ہاتھ موڑ رہا تھا تو اچانک داخلی دروازے سے نیلسن اندر آ گیا۔ کچھ دیر تک تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا پھر وہ زور سے چلایا۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے دل پر ہاتھ رکھا اور نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ وہ دو دن تک بخار میں مبتلا رہا تھا۔ شاید اُس وقت اسے دل کا دورہ پڑا تھا یا کمزوری کی وجہ سے اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اچانک رونما ہونے والی صورتِ حال سب کے لیے پریشان کن تھی۔ ویلا شوہر کو زمین پر گرتا دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف دوڑی۔

"فوراً ایمبولینس منگواؤ۔" شیرف نے کوڈی کو ساتھ لے جاتے ہوئے ایک پولیس والے سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد نیلسن کو ایمبولینس سے اسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ ویلا بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔ شیرف کب کا جا چکا تھا۔ لاؤنج میں صرف جینٹ تھی۔ آخر وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ گھر کو تالا لگایا اور اپنے گھر چلی آئی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اپنے ایک جاننے والے وکیل کو فون کر کے پوری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کوڈی کے لیے اس سے قانونی مدد کی درخواست کی۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔" جم بارنیس نے پوری رُوداد سننے کے بعد کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔"

"بہت شکریہ جم۔" یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

جینٹ کی آنکھوں میں رہ رہ کر کیمی کا چہرہ اُبھر رہا تھا۔ صرف چند روز پہلے ہی وہ لائبریری میں اُس کے پاس آئی تھی اور نہایت بدتمیزی سے کہہ رہی تھی۔ "جینٹ... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس کی نظروں کے سامنے بار بار وہ منظر ابھر رہا تھا جب شیرف کوڈی کو گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے لاچارگی عیاں تھی۔ اس وقت وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ وہ ایک کے بعد ایک کر کے کئی گلاس چڑھا چکی تھی۔ مسلسل سگریٹ پھونکے جا رہی تھی۔ اس نے چلّا چلّا کر رونا چاہا مگر شدتِ غم سے اس کی آواز سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اُسے اپنا سینہ درد کی شدت سے پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سمجھی کہ اُسے دل کا دورہ پڑ گیا ہے اور وہ مر رہی ہے۔ وہ نیم غنودگی کی حالت میں آڑی ترچھی صوفے پر گری ہوئی تھی۔

اگلی صبح کوڈی کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ کوڈی کے وکیل جم بارنیس نے عدالت سے استدعا کہ ملزم نابالغ ہے اور اس پر فردِ جرم بھی عائد نہیں ہوئی ہے اس لیے اسے ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ اس وقت عدالت میں صرف جینٹ موجود تھی۔ ویلا نیلسن کے پاس اسپتال میں تھی۔ عدالت نے دلیل تسلیم کر لی اور اسے ایک لاکھ ڈالرز نقد کی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا۔ یہ سنتے ہی جینٹ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اب کوڈی کو مقدمے کا فیصلہ ہونے تک جیل میں ہی رہنا پڑے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ، ویلا اور نیلسن مل کر بھی عدالت میں ضمانت کے ایک لاکھ ڈالرز جمع نہیں کروا سکیں گے۔ کمرائے عدالت میں کیمی کے ماں باپ بھی موجود تھے۔ البتہ اُن کا رویہ سرد تھا۔ دونوں خاموشی سے بیٹھے عدالتی کارروائی دیکھتے رہے۔ کوڈی فرش پر نظریں گاڑے، ہر شے سے لاتعلق بنا بیٹھا تھا۔ پولیس نے اگلے تین روز تک کوڈی سے وکیل کے سوا کسی بھی شخص کی ملاقات پر پابندی لگا دی تھی۔ اس لیے جب مقدمے کی ابتدائی کارروائی ختم ہوئی تو جینٹ گھر جانے کے بجائے سینٹرل اسپتال کی طرف چل دی۔ وہ ویلا اور نیلسن سے ملنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"اب خاصا بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" نیلسن ٹیک لگا کر بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا، جب جینٹ اُس کی مزاج پرسی کے لیے وارڈ میں داخل ہوئی۔

"انہیں معمولی نوعیت کا دل کا دورہ پڑا تھا۔" ویلا نے مداخلت کی۔ "ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"مسٹر نیلسن! کیا دل کا روگ پال لیا ہے؟" جینٹ نے اس کی دل جوئی کی خاطر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہ بتاؤ، عدالت میں کیا ہوا؟" اس سے پہلے کہ نیلسن کچھ کہتا، ویلا نے اضطراب سے پوچھا۔ یہ سُن کر وہ اسے عدالتی کارروائی کا سارا احوال سنانے لگی۔ نیلسن خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ کیمی کو قتل کر سکتا ہے۔" ویلا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ ایسا نہیں ہے۔ میں نہیں مان سکتی کہ اس نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیمی تو ہمیشہ ہی ایسی۔ اس کا انجام تو یہی ہونا تھا۔"

"مگر وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟" نیلسن نے ویلا کی



طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب وہ اتنا کچھ بتا رہا ہے تو ممکن ہے مزید کچھ ایسا ہو، جسے وہ چھپا رہا ہے۔" نیلسن نے منطقی انداز میں کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ قتل اُس نے نہیں، کسی اور نے کیا ہو۔" ویلا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے کیمی کے اس حادثے کے قتل کے پیچھے ایسا کوئی اور شخص ہو جسے کوڈی جانتا ہے اور وہ کیمی سے زیادہ اسے پیار کرتا تھا۔ اب اُسے بچانے کے لیے الزام اپنے سر لے رہا ہے۔" ویلا نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

یہ سنتے ہی جینٹ کو لگا جیسے اُس کے سینے میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ہو۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ ویلا کی باتوں سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہرگز یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ کوڈی ایسا کچھ کر سکتا ہے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی اور پھر منہ بناتے ہوئے کہنے لگی۔ "وہ کمبخت تھی ہی ایسی، نہ جانے اس کے چکر میں کوڈی کے ساتھ اور کیا کچھ ہوتا رہا ہوگا اور اب معلوم نہیں اسے کیا کچھ بھگتنا پڑے گا۔ ویسے بھی اس کے ایک دو بوائے فرینڈ تو ہوں گے نہیں۔ کوڈی تو بس بہانہ بن گیا۔ ہو سکتا ہے کیمی سے کوڈی کی دوستی کسی اور کو پسند نہ آئی ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ترچھی نظروں سے جینٹ کی طرف دیکھا۔

"تم بہت غلط سمجھ رہی ہو۔" نیلسن نے بیوی کو سرزنش کی۔ "سمجھنے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے وہ مکمل طور پر سچ بول رہا ہو۔ ہو سکتا ہے پولیس تفتیش میں وہ بے قصور ثابت ہو۔" نیلسن سمجھ گیا کہ ویلا کس کو کوچلی کئی سنا رہی ہے۔ وہ جینٹ کے چہرے پر ویلا کی باتوں کا ناگوار تاثر صاف دیکھ رہا تھا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" کچھ دیر تک تینوں خاموش رہے اور پھر جینٹ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "ویلا... تمہارا یہ کہنا بھی درست ہے ہو سکتا ہے قتل کسی اور نے کیا ہو۔ یہ وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جسے کوڈی بہت زیادہ چاہتا ہے اور اسے بچانے کے لیے خود کو داؤ پر لگا چکا ہے۔"

"میرے کہنے کا مطلب بھی یہی تھا۔" ویلا نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"ویسے وہ تم سے بھی بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔" جینٹ نے مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ منہ سے تو کچھ نہ بولی البتہ اندر سے جل بھن گئی۔ یوسف نے اُس کا وار اُس پر ہی پلٹ دیا تھا۔

کوڈی کو پولیس تحویل میں چوتھا دن تھا۔ جب سے وہ گرفتار ہوا تھا، جینٹ نے صرف ایک بار اسے عدالت میں ہی دیکھا تھا۔ اس دوران میں نیلسن کی حالت بہتر ہو چکی تھی اور وہ گھر منتقل ہو گیا تھا مگر اُس دن جس انداز میں ویلا اس پر اپنے شک کا اظہار کر رہی تھی، اس کے بعد ایک بار بھی نہ تو یہ اُن کے گھر گئی اور نہ ہی وہ ملنے کے لیے آئی۔

وہ جمعرات کا دن تھا۔ کوڈی سے ملاقات پر تین دن کی عائد پابندی ختم ہو گئی تھی۔ وہ کوڈی سے ملنے کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچی مگر اُسے ملنے نہیں دیا گیا۔ اُس وقت پولیس کوڈی سے تفتیش کر رہی تھی۔

دوسرے دن صبح وہ پھر پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، اچانک برابر کے کمرے سے شیرف نکل کر آ گیا۔ "کیا آپ مس جینٹ ہیں؟" اس نے شائستگی سے پوچھا۔

"جی ہاں، کہیے کیا بات ہے؟"

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" شیرف نے کہا۔ "بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے دفتر میں چلیں۔"

"اوکے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

جینٹ، کوڈی اور کیمی کے بارے میں لیکسن میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کچھ کہہ رہے تھے کہ جینٹ اور کوڈی کے بہت خاص تعلقات تھے اور کیمی ان کے بیچ کباب میں ہڈی بنی ہوئی تھی۔ کچھ کا کہنا تھا آخر وہ کیا بات تھی کہ جو کیمی کے منہ سے نکلی تو کوڈی سخت مشتعل ہو گیا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ کیمی، جینٹ کی طرف سے بدگمان تھی اور موت سے صرف چند روز پہلے ہی وہ لائبریری میں جا کر اس سے تلخ لہجے میں گفتگو کر چکی تھی۔ وہاں موجود کئی لوگوں نے اُس کی اونچی آواز میں یہ بات سنی تھی... "مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" جینٹ کے کانوں تک بھی یہ افواہیں پہنچ رہی تھیں مگر اُس نے انہیں کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ شیرف کے پیچھے چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اب یہ اس سے کیا جاننا چاہتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں دفتر میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا تم یہ بات جانتی تھیں کہ کیمی ماں بننے والی ہے؟" شیرف ہینسن نے بات شروع کی۔

"نہیں۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی یہ نہایت نجی نوعیت کا معاملہ ہے میں بھلا کیسے جان سکتی ہوں؟"

"کوڈی نے اس بارے میں تم سے کوئی ذکر کیا تھا؟"

"قطعاً نہیں۔"

"حیرت ہے۔" شیرف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ویسے وہ تو تم سے بہت قریب ہے، شاید وہ اپنی ماں کے بھی اتنا قریب نہ ہو۔"

"ماں کے قریب تو ہے اور آپ کے بقول شاید مجھ سے کچھ کم تو یہ بات اُس کی ماں سے ہی پوچھ لو کہ اس کے بیٹے کی وجہ سے کیا یہی ماں بننے والی تھی۔" شیرف کی بات سن کر اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"اوکے..." شیرف نے فوراً کہا اور بات کا رُخ پلٹ دیا۔ وہ جینٹ کی ناراضی سمجھ گیا۔ "تم اُن کی پڑوسی ہو، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کتنے عرصے سے وہاں رہ رہی ہو؟"

"لگ بھگ پچھلے دس سالوں سے۔" جینٹ نے جواب دیا۔

"ماں اور بیٹے ایک دوسرے کے کتنا قریب تھے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ ماں بیٹے ہیں۔" جینٹ نے کہنا شروع کیا مگر کچھ سوچ کر رک گئی اور سوال کا شیرف ہینسن کی نگاہوں سے جائزہ لے کر جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ "مگر اس کے باوجود بظاہر وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب نہیں تھے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جنہیں وہ دونوں ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ البتہ گزشتہ چار پانچ برسوں سے وہ زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتا تھا۔"

"ہُونہہ... تو یہ بات ہے۔" جینٹ خاموش ہوئی تو شیرف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں معذرت خواہ ہوں کہ تمہارا وقت لیا۔" اس نے مہذب لہجے میں کہا۔ "تمہارا شکریہ، ہمیں تم سے اس کیس کے بارے میں مفید معلومات ملی ہیں۔ اگر تفتیش کے دوران ضرورت پڑی تو امید ہے تم ضرور وقت دوگی۔"

"شکریہ۔" جینٹ نے لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ اسے یقین ہوگیا کہ فی الحال یہ ملاقات اپنے اختتام پر ہے۔ "مجھے آپ کی مدد کرکے خوشی ہوگی۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم اس وقت تک لاعلم ہوگی..."

"کس بارے میں۔" جینٹ نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی سے اٹھنے والی تھی مگر یہ سن کر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات تھے۔

"ویلا نیلسن کو صبح سویرے گرفتار کرلیا گیا ہے۔" شیرف نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"کیا..." وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "کیوں؟ اُس نے کیا جرم کیا ہے؟ اُسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟" ویلا کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی اس کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔

"قتل اور اقدامِ قتل کے جرم میں۔"

"کیا مطلب؟ کھل کر بتاؤ کیا جرم کیا ہے اُس نے۔"

"اچھا تو پھر تفصیل سے سنو۔" شیرف نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ لوری والکر کی گفٹ شاپ پر کام کرتی تھی۔ لوری نے پچھلے ہفتے مجھے فون کرکے بتایا کہ اُسے جس تیز رفتار گاڑی نے ٹکر مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، وہ گاڑی ویلا چلا رہی تھی۔"

"مگر اُس نے یہ بات پولیس کو پہلے کیوں نہیں بتائی؟" جینٹ نے قطع کلامی کی۔

"میں نے بھی اُس سے یہی کہا تھا مگر اُس کے پاس ٹھوس جواز ہے یہ بات چھپانے کا۔" شیرف نے کہنا شروع کیا۔ "اُس کا کہنا ہے کہ حادثے کے بعد وہ کافی زخمی تھی اور جب وہ گھر لوٹی تو اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مکمل صحت یابی تک وہ یہ بات چھپائے گی۔ لوری کو ڈر تھا کہ کہیں وہ اسے دوبارہ مارنے کی کوشش نہ کرے۔"

"مگر ویلا ایسا کیوں کرے گی؟" جینٹ نے شیرف کو ٹوک دیا۔

"لوری کا کہنا ہے کہ وہ پچھلے کافی عرصے سے انٹرنیٹ پر مختلف قسم کے زہر تلاش کررہی تھی۔ اس نے کئی قسم کے زہر آن لائن خریدے تھے اور اس نے یہ پارسل دکان کے پتے پر منگوائے تھے۔ ایسا صرف ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ہوا تھا۔ یہی نہیں، وہ مختلف زہر کے استعمال کے طریقے معلوم کرنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ یہ ساری معلومات لوری نے دکان کے کمپیوٹر ریکارڈ سے حاصل کی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے ایک دن سرسری طور پر اس سے یہ پوچھ لیا تھا کہ وہ زہریلے کیمیکل کے بارے میں کیوں معلومات حاصل کررہی ہے۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا البتہ گھبرا گئی۔ بس اُس کے چند روز بعد ہی ویلا نے اسے کار سے کچل کر مارنے کی کوشش کی۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ جینٹ دم سادھے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ویسے کیمی، ویلا کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔" یہ کہہ کر اُس نے جینٹ کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے کہ کیمی اُسے بلیک میل کرسکتی تھی؟"

"ممکن تو ہے۔" جینٹ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ شیرف کے انکشافات اس کے سر پر حیرت کے پہاڑ بن کر ٹوٹتے جارہے تھے۔

"مرنے سے دو دن پہلے کیمی نے اپنا بینک اکاؤنٹ



کھولا تھا، وہ بھی پانچ ہزار ڈالرز سے۔"

"کیا؟"

"اور یہ رقم نہ تو اس کے گھر والوں کی طرف سے دی گئی تھی اور نہ ہی تم نے دی تھی۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور جینٹ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہم نے تصدیق کے لیے تمہارے بینک اکاؤنٹ کی تمام تر تفصیلات حاصل کرلی تھیں۔"

"اوہ..." جینٹ کے لیے یہ بھی ایک اہم انکشاف تھا۔ "مگر وہ رقم..."

"وہ رقم ویلا نے دی تھی۔" شیرف نے کہا۔ "اب خود ہی سمجھ لو کہ اتنی بڑی رقم کوئی کسی کو کیوں دے گا اور وہ بھی کیمی جیسی بدکردار لڑکی کو۔"

"اوہ میرے خدا۔" جینٹ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"ویلا نے نیلسن کو بھی زہر دے دیا تھا۔ یہ بات اس کے طبی معائنے سے ثابت ہوگئی ہے۔" شیرف نے حیرت کا ایک اور بم گرایا۔ "وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں اُس کی موت یقینی تھی۔"

"اُس پر کیا کیا الزامات لگائے گئے ہیں؟"

"اپنے سابق شوہر جیک، ساس بریجٹ اور انکل آرنٹ کو زہر دے کر قتل کرنے اور لوری، نیلسن کو قتل کرنے کی کوشش کا سنگین الزام اس پر عائد کیا گیا ہے۔" شیرف چند لمحے کے لیے سانس لینے کو رُکا۔ "ویسے جیک، بریجٹ اور آرنٹ کی قبر کشائی کرکے ان کی باقیات کے لیبارٹری تجزیے سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اُن تینوں کی موت زہر سے ہی ہوئی تھی۔ خیر، تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو ویلا سے قریب ہو اور گزشتہ چند برسوں میں اس کی موت ہوئی ہو؟" شیرف نے اپنی بات مکمل کرکے اس کی طرف دیکھا۔

"ان تینوں کے سوا، میں اُس کے جاننے والے کسی اور شخص کی موت سے قطعی لاعلم ہوں۔" جینٹ نے آہستہ سے کہا۔

"اگر تمہارے علم میں ایسی کوئی بات آئے تو مجھے ضرور بتانا۔"

"ویسے کیمی کے قتل..."

"اس جرم کا الزام ویلا پر عائد نہیں کیا جاسکا۔ اس کا ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔" شیرف نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ کوڈی سچ بول رہا ہے۔"

"اس پر جو الزام عائد کیے گئے ہیں، وہ ثابت ہوگئے ہیں؟" جینٹ نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں اب تک ایک بھی الزام ثابت نہیں ہو پارہا ہے۔" شیرف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ وہ حادثہ ہی ہو مگر ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ "اب آپ جاسکتی ہیں۔" اس نے جینٹ سے کہا۔ "اگر ضرورت پڑی تو ضرور ملاقات ہوگی۔" شیرف نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ویلا نے تو ابتدا میں اپنے اوپر لگائے ہوئے ہر الزام سے انکار کیا لیکن آخر میں اس نے اعتراف کرہی لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو نہایت عسرت میں مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ذہنی طور پر شروع سے ہی معاشی تحفظ چاہتی تھی۔ جیک سے شادی کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ایسا شوہر ثابت نہیں ہوا جس کی اسے امید تھی۔ وہ عادی شرابی تھا۔ وہ اس کے بے تحاشا شراب پینے سے سخت نالاں تھی۔ اس لیے اُسے مار کر انشورنس کی رقم ہتھیانے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں ساس اس کے لیے بوجھ بن گئی۔ اس نے شوہر کی طرح اُس کی ماں سے بھی پیچھا چھڑا لیا۔ انکل آرنٹ کی انشورنس کی رقم اور بینک میں موجود ایک لاکھ ڈالرز ہتھیانے کے لیے انہیں بھی زہر دے دیا۔ اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ وہ نیلسن کی دولت ہتھیانے کے لیے اسے بھی مار ڈالنا چاہتی تھی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ پھنس گئی، البتہ اس نے کیمی کے قتل سے انکار کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کیمی کو لوری نے یہ بات بتادی تھی کہ میں نے اسے مارنے کی کوشش کی ہے اور انٹرنیٹ پر زہر کی خریداری کی تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر ساڑھے پانچ ہزار ڈالرز نہ دیے تو وہ پولیس کے پاس جاکر سارا ماجرا بیان کردے گی۔ یوں اس نے بلیک میل کرکے مجھ سے ساڑھے پانچ ہزار ڈالرز ہتھیا لیے تھے۔ ویلا کا کہنا تھا یہ ایسا موقع تھا جب اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ انہیں ہنی مون پر جانا تھا ورنہ وہ اس کا پتا صاف کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ کیمی کو قتل کرنے پر سنجیدگی سے غور کررہی تھی۔

کوڈی کے خلاف پولیس کیمی کا قتل ثابت نہیں کرسکی۔ اس نے عدالت میں وہی کچھ بیان کیا جو وہ شیرف کو پہلے ہی بتاچکا تھا۔ البتہ اس نے اعتراف کیا کہ جس رات اُس کی موت ہوئی، اُس رات کیمی نشے کی حالت میں اُس کے گھر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئی تھی۔ دونوں کے درمیان پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ہفتے کی رات اُس کے پاس ہی رہے گی۔ جب وہ گھر آئی تو سخت نشے کی حالت میں تھی۔

کچھ دیر تک تو کوڈی کے ساتھ لگاوٹ سے پیار بھری باتیں کرتی رہی مگر اچانک اسے جینٹ یاد آ گئی۔ پہلے تو وہ جینٹ کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتی رہی پھر اسے گالیاں دینے لگی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر وہ اس پر لاس ویگاس جانے کے لیے زور دینے لگی۔ ''میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ ہم پانچ ہزار ڈالرز کو کیسینو میں جا کر پانچ کروڑ ڈالرز میں بدل سکتے ہیں۔'' کوڈی کے بقول وہ کافی عرصے سے اس پر زور ڈال رہی تھی کہ انہیں لاس ویگاس بھاگ جانا چاہیے۔ اُس رات بھی وہ یہی بات کر رہی تھی۔ کوڈی کا کہنا تھا کہ میں اس کی ہر بات اس لیے نظر انداز کر رہا تھا کہ وہ نشے میں تھی لیکن پھر اچانک اس نے میری ماں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جب اُس نے یہ کہا کہ میری ماں قاتل اور دولت کی لالچی ہے تو بس مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے اسے چپ ہونے کو کہا مگر وہ بولتی رہی۔ جب اس نے میری ماں کو گالیاں دینا شروع کیں تو پھر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے ایک تھپڑ مار دیا۔ اس کے بعد اس نے چلانا شروع کر دیا اور پھر وہ کچھ ہو گیا جو سب کے سامنے ہے۔

یہ وہ بات تھی جو اس نے نہ تو شیرف کو گرفتاری کے وقت بتائی تھی نہ پولیس کو تفتیش کے دوران، البتہ اب بات دوسری تھی۔ اس کی ماں قتل کے الزام میں گرفتار ہو چکی تھی اور اس نے سیریل کلر ہونے کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ اس لیے کوئی قباحت نہ تھی کہ وہ سب کچھ عدالت کو سچ سچ بتا دے۔

پولیس تفتیش اور میڈیکل رپورٹس کی روشنی میں عدالت نے بھی اسے اتفاقی حادثہ قرار دیا۔ پولیس اور میڈیکل رپورٹس کا کہنا تھا کہ کیمی کو پہلی چوٹ ماتھے پر لگی۔ دوسری چوٹ سر کے پچھلے حصے پر لگی جو موت کا سبب بنی۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ملزم کے بیان کے مطابق اس نے اپنا سر خود دیوار پر کئی بار مارا اور پھر اچانک چکرا کر پیچھے گری۔ گرنے کی وجہ سے اس کے سر کے عقبی حصے پر چوٹ لگی۔ یوں وہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ اگر اس کو قتل کیا گیا ہوتا تو پہلی چوٹ سر کے پچھلے حصے پر لگتی۔

ان شواہدات کی بنا پر عدالت نے کوڈی کو بے گناہ قرار دے کر بری کر دیا۔ البتہ لاش کو جھیل میں پھینکنے اور پولیس کو اطلاع نہ دینے پر اسے سرزنش ضرور کی گئی۔ اٹھارہ سال سے کم عمر ہونے کے باعث اسے عدالت نے چھ ماہ تک پولیس کی نگرانی میں رہ کر بہتر چال چلن کا پابند کر دیا تھا۔

کوڈی کی رہائی کو چھ ماہ گزر گئے تھے۔ اس دوران میں اُس نے اچھے نمبروں سے ہائی اسکول پاس کر لیا۔ پولیس نے بھی اسے نگرانی سے آزاد کر دیا تھا۔ جینٹ کی کوششوں سے کوڈی کا واشنگٹن کے ایک اچھے انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہو گیا تھا، البتہ ویلا کا مقدمہ بدستور زیرِ سماعت تھا۔ کوڈی نے گھر فروخت کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ اب ویلا اس گھر میں شاید ہی کبھی واپس آ سکے۔ ماں کے بینک کھاتوں میں موجود رقم بھی عدالت کے حکم پر اسے مل گئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے کوڈی کے پاس اتنی رقم آ گئی تھی کہ وہ اسکالرشپ کے بغیر ہی اپنی تعلیم مکمل کر سکے اور نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔ کوڈی کے پاس خاصی رقم تھی مگر جینٹ نے کبھی اس کی دولت پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☆☆☆

سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے جب جینٹ کوڈی کو واشنگٹن روانہ کرنے کے لیے ائرپورٹ پہنچی۔

''تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔'' وہ جینٹ سے لپٹ گیا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔

''ہم ضرور ملیں گے، بس تم انجینئر بن جاؤ۔'' کافی دیر بعد جینٹ نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے جیسے آج جمی کو الوداع کہہ رہی ہوں۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''جمی...'' کوڈی نے بھی سن لیا۔ تبھی اس نے استفساریہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں میرا بیٹا جمی... جو اگر زندہ ہوتا تو تمہارے جتنا ہی ہوتا۔ مگر وہ تین سال کا تھا جب ایک کار حادثے کے باعث مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' جینٹ نے ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اوہ آئی ایم سوری... مگر میں ضرور آؤں گا تمہارے پاس مما۔'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر جینٹ سے لپٹ گیا۔ اُس کے منہ سے مما سُن کر اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ کوڈی نے پہلی بار اسے اتنے پیار سے مما کہا تھا۔ ''ضرور میرے بچے۔'' اس نے کوڈی کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

جینٹ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج کوڈی کو نہیں بلکہ جمی کو الوداع کہہ رہی ہو مگر اچھے مستقبل کے لیے... جینٹ نے ہمیشہ آزاد زندگی اور تنہائی کو ترجیح دی تھی لیکن کوڈی کو خدا حافظ کہتے ہوئے جینٹ کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ اس بھری دنیا میں تنہا نہیں ہے۔

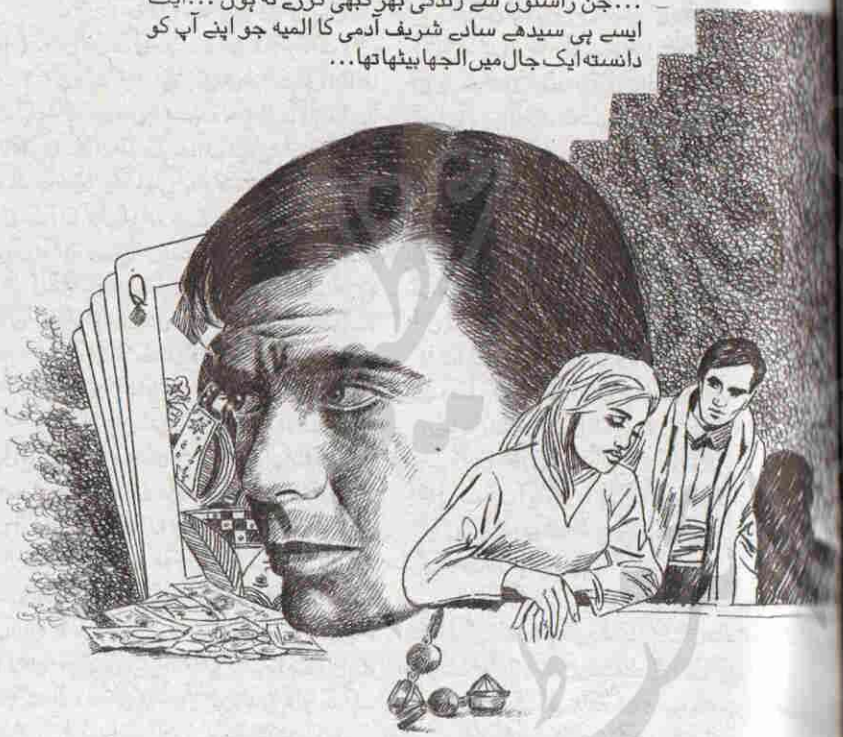


ایک ہی گر کو کامیابی کی کنجی سمجھنے والے افلاطونوں کا نرالہ کھیل

# ہارجیت

تنویر ریاض

راستہ بھٹک جانے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں... لیکن کچھ لوگ جان بوجھ کر ان راستوں کا انتخاب کر بیٹھتے ہیں ... جن راستوں سے زندگی پھر کبھی گزرے نہ ہوں ... ایک ایسے ہی سیدھے سادے شریف آدمی کا المیہ جو اپنے آپ کو دانستہ ایک جال میں الجھا بیٹھا تھا...



دسمبر کی یخ بستہ رات کو کوستا ہوا جیفرسن کولارڈ اس تیزی سے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ وہ گردوپیش سے بے نیاز کامیابی کے نشے میں چور آگے بڑھ رہا تھا... جیسے اسے یقین ہو کہ اب اس کے دن پھرنے والے ہیں۔ اس وقت وہاں صرف ایک ٹیکسی موجود تھی اور اس کا ڈرائیور سردی سے بچنے کے لیے اپنی ٹوپی ماتھے سے نیچے کیے بیٹھا تھا اور اس نے اپنے چہرے کے نچلے حصے کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ایک مسافر کو اپنی جانب آتے دیکھا تو سیدھا ہو کر اپنے ہاتھ رگڑنے لگا۔ اسی وقت ایک اور آدمی نمودار ہوا اور اس نے اپنا بازو بلند کر کے ایک مخصوص اشارہ دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ منزلِ مقصود خواہ کچھ بھی ہو لیکن مسافر کو وہاں تک نہیں پہنچنا تھا اور جیفرسن کولارڈ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک مختصر مگر ناخوشگوار سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔

☆☆☆

جیف لیمن کو عدالتوں سے نفرت تھی لیکن پرائیویٹ سراغ رساں ہونے کی وجہ سے اس کا بیشتر وقت وہیں گزرتا۔ اس وقت بھی وہ ایک ایسی ہی عدالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اکتا دینے والی سماعت کے بعد عدالت کا فیصلہ آنے والا تھا۔ جیف کو اس مقدمے سے اس لیے بھی دلچسپی تھی کہ ملزم کو پکڑنے میں اس کا نمایاں کردار تھا۔ ملزم مورٹن نے اپنی بیوی کے آشنا کو قتل کیا اور جائے واردات سے فرار ہو کر روپوش ہو گیا۔ جب پولیس اسے تلاش کرنے میں ناکام رہی تو اس کی گرفتاری میں مدد دینے والے شخص کے لیے انعام کا اعلان کر دیا گیا جو جیف لیمن نے وصول کیا۔ طویل تلاش کے بعد وہ مورٹن کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جو اپنے ایک دوست کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔

جیف کے خیال میں تو قاتل کو مجرم قرار دے کر سزا سنانی چاہیے تھی۔ اگر مورٹن کسی اور شخص کو قتل کرتا تو اس کی قسمت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہر لگ جاتی لیکن مقتول نے اس کی بیوی کو بہکایا تھا لہٰذا جیوری کے ارکان کی ہمدردیاں مورٹن کے ساتھ ہو گئیں۔ وہ سب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے شادی شدہ افراد تھے اور ہر جائی بیویوں کے بارے میں ان کا مؤقف بہت مضبوط تھا۔ ان میں سے ہر کوئی جانتا تھا کہ اس صورتِ حال میں وہ خود کیا کرتا۔ مروجہ قانون کے مطابق ملزم کو سزا ہو سکتی تھی لیکن غیر تحریر شدہ قانون نے ایک ایسے شوہر کی طرف داری کی جس کے ساتھ دھوکا ہو رہا تھا۔

جب جیوری کے سربراہ نے اپنا فیصلہ سنایا تو جیف کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ جیوری کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ مورٹن نے ایک جیتے جاگتے انسان کے سینے میں پانچ گولیاں اتار دیں۔ انہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ ملزم اپنی بیوی سے مسلسل گالم گلوچ کرتا تھا اور نہ ہی انہوں نے اس بات پر توجہ دی کہ وہ اپنی جس دوست کے پاس چھپا ہوا تھا، وہ اس کی سابقہ محبوبہ تھی۔ مرد جو چاہے کرتے پھریں لیکن عورتوں پر لازم ہے کہ وہ ہر حالت میں شوہروں کی وفادار رہیں۔ اسی غیر تحریر شدہ قانون کے نتیجے میں مورٹن بے گناہ قرار پایا اور وہ طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا جیف کے سامنے سے گزر گیا۔

جیف کو اس فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ جیوری پر سے اس کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور جج نے بھی ان کے اس فیصلے کی تعریف کی۔ عدالت سے باہر آتے ہوئے جیف نے خود کو تسلی دی کہ اسے مورٹن کو پکڑنے کے عوض ایک معقول انعام مل گیا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔ یہ سراسر ناانصافی تھی۔ ایک شخص جس نے قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہو، اسے محض اس لیے رہا کر دیا جائے کہ اس نے معاشرتی برائی کو روکنے اور شریفانہ قدروں کو پروان چڑھنے کے لیے یہ قتل کیا تھا۔ اب وہ اپنی بیوی کے ساتھ پہلے سے زیادہ ہتک آمیز رویہ اختیار کرنے کے لیے آزاد تھا۔

☆☆☆

ایڈتھ کولارڈ کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اس دفتر میں آنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ وہ بہت چھوٹا اور بے ڈھنگا کمرا تھا جس میں انتہائی معمولی فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ کوفت اسے یہ جان کر ہوئی کہ جس سراغ رساں سے ملنے کے لیے وہ آئی تھی، وہ خود دفتر میں موجود نہیں تھا اور اس کی جگہ سرخ بالوں اور گھنی داڑھی والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جیف لیمن کا معاون تھا۔ اسٹین اس کے ساتھ بے حد خوش اخلاقی سے پیش آیا لیکن وہ اس پر مشکل سے ہی بھروسا کر سکتی تھی۔ ایڈتھ اس سے معذرت کر کے واپس جانے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا اور جیف اندر آ گیا۔

ایڈتھ کو یقین نہیں آیا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے وہ ملنے آئی تھی۔ وہ موٹا اور پستہ قد تھا۔ گو کہ اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا مگر اس کے چہرے سے اعتماد نہیں جھلک رہا تھا۔ ان دونوں کا تعارف مکمل ہوا تو اسٹین کمرے سے باہر چلا گیا۔

"میں نہیں جانتا کہ تم کس مقصد سے یہاں آئی ہو لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم نے میرا انتخاب کیوں کیا؟" جیف نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا۔" ایڈتھ نے جواب میں کہا۔ "پولیس اس قاتل کو پکڑنے میں ناکام رہی لیکن تم نے اسے تلاش کر لیا۔ اس آرٹیکل میں یہ بھی لکھا تھا کہ تم اپنی صلاحیت کے حوالے سے پہچانے جاتے ہو۔"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اپنی ساکھ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"



ایڈتھ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ پچیس چھبیس سال کی ایک پُرکشش عورت تھی لیکن اس کے چہرے پر فکرمندی تھی۔ کافی دیر تک وہ سہمی سہمی اور گھبرائی ہوئی سی بیٹھی رہی پھر بڑی مشکل سے بولی۔ "میں اپنے شوہر کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔"

"کہتی رہو۔ میں سُن رہا ہوں۔"

وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ان دنوں وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں ہے۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے یا اس بارے میں کچھ جانتی بھی ہو؟"

"میں یقین کی حد تک یہ بات کہہ سکتی ہوں۔"

"تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

ایڈتھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ بلاوجہ ہی یہاں چلی آئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اپنی ازدواجی زندگی سے متعلق سراغ رساں کے تیکھے سوالوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جیف کو اس سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی عورتیں اس کے پاس آ چکی تھیں اور انہیں اس کیفیت سے گزرنا پڑا تھا۔

"تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے؟"

"وہ میکی نامی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں منیجر ہے۔"

"لگتا ہے کہ اس کا کام کافی اہم نوعیت کا ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے لیکن اب وہ اکثر دیر سے گھر آنے لگا ہے۔" ایڈتھ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"کیا اس نے اس کی کوئی وجہ بیان کی؟"

"وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے دیر ہو جاتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔" جیف نے خیال ظاہر کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس پر بہت زیادہ ذمے داریاں ہوں گی۔ اور میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کرسمس کی شام تک وہ اسی طرح دیر سے آتا رہے گا۔ پہلے ہی اعلان ہو چکا ہے کہ تمام اسٹور نصف شب تک کھلے رہیں گے۔"

جیف نے دیکھا کہ اس عورت کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ اس نے اپنا رومال اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"پانچ سال۔"

"اس سے پہلے کبھی تمہیں اس پر اس طرح کا شک ہوا؟"

"نہیں۔" ایڈتھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمیشہ سے ہی بہت اچھا شوہر رہا ہے۔ بہت مہربان اور توجہ دینے والا۔ وہ اپنے دونوں بچوں پر جان چھڑکتا ہے اور سب لوگ اسے اچھا باپ سمجھتے ہیں۔"

"پھر اس میں کیا تبدیلی آئی، سوائے اس کے کہ وہ دیر سے گھر آتا ہے... تم نے کوئی اور خاص بات نوٹ کی؟"

"وہ بے پروا ہو گیا ہے۔ بعض اوقات جب میں اس سے بات کرتی ہوں تو وہ یہ بھی نہیں سنتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا دماغ کہیں اور ہے لیکن اس سے بھی بڑے دو واقعات ہوئے ہیں۔"

جیف اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی اہم انکشاف کرنے والی ہے۔

"پہلی بات تو یہ کہ اس نے میرے جیولری باکس سے ڈائمنڈ کا بروچ نکال لیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے۔ "لگتا ہے کہ وہ اس نے کسی دوسری عورت کو دے دیا ہے۔"

"تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟"

"نہیں لیکن میں ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔"

"کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اسی نے بروچ نکالا ہو گا؟ یہ کارستانی کسی نوکر کی بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف میں اور میرا شوہر ہی جانتے ہیں کہ اس باکس کی چابی کہاں رکھی ہوئی ہے۔ یہ بروچ اسی نے نکالا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس سے کتنا جذباتی لگاؤ ہے۔ مجھے اس سے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔"

"کیا تم نے اس سے کبھی اس بات پر جھگڑا کیا؟"

"نہیں، میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ میرے پاس کوئی واضح ثبوت نہ ہو۔ میں سچائی جاننا چاہتی ہوں مسٹر جیف۔"

"تم نے دوسرا واقعہ نہیں بتایا؟" جیف نے کہا۔

"ہاں، دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہے۔ ایک ہفتے پہلے جیفرسن رات کے دو بجے تک واپس نہیں آیا۔ مجھے اس کا اندازہ ہال میں لگے ہوئے دیوار گیر کلاک سے ہوا۔ وہ خاموشی سے گھر میں داخل ہوا اور علیحدہ بیڈ روم میں سو گیا۔ جب میں نے اسے دوسری صبح دیکھا تو وہ بری طرح زخمی تھا۔ گو کہ اس نے مجھے ڈاکٹر کو فون نہیں کرنے دیا لیکن میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ رات کو اتنی دیر تک کہاں رہا اور یہ چوٹ اسے کیسے لگی؟ لیکن وہ تو عجیب ہی موڈ میں تھا۔"

"عجیب؟" جیف نے پوچھا، شاید وہ اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں، میں اس کے لیے یہی لفظ استعمال کرسکتی ہوں۔"

ایڈتھ نے اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹی موٹی باتیں بتائیں جو اس کے شوہر کی بے رخی کو ظاہر کرتی تھیں۔ بظاہر وہ بہت معمولی نوعیت کی تھیں لیکن ان سب کو ملا کر دیکھا جائے تو ایڈتھ کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آسکتی تھی اور اسے ذہنی سکون کی شدید ضرورت تھی۔

"کیا تم میرا کیس لے سکتے ہو؟" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"ایک شرط پر۔" جیف نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ہر قسم کی بری خبر سننے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے۔ کم از کم یہ اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں اندھیرے میں رہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ دوسری عورت کون ہے؟"

"پھر تو شاید تمہیں مایوسی ہوگی مسز کولارڈ۔"

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

"مجھے یقین نہیں کہ وہ تم سے بے وفائی کرسکتا ہے۔" جیف نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تم نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے تو لگتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور محنتی شوہر ہے اور تم جیسی بیوی مل جانے پر اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ کوئی بھی شوہر راتوں سے جان بوجھ کر نہیں بھٹکتا۔ ضرور کوئی دوسری بات ہے اور اس میں یقیناً کسی عورت کی کوئی غلطی نہیں ہے۔"

☆☆☆

میتھیو اسٹین اس سے پہلے کبھی میکی اسٹور نہیں آیا تھا۔ اسے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ وہ یہاں وافر مقدار میں موجود اشیا اور معیار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسٹور گاہکوں سے بھرا ہوا تھا اور وہاں چلنے کی جگہ بھی کم تھی۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ وہ یہاں خریداری کرنے نہیں بلکہ جینفر ن کولارڈ پر نظر رکھنے کے لیے آیا ہے جو بڑے باوقار انداز میں اسٹور کا گشت لگا رہا تھا تاکہ اپنے عملے کی کارکردگی دیکھتا رہے لیکن گاہکوں سے بات کرتے ہوئے وہ بہت نرمی اور دوستانہ انداز میں پیش آتا۔

اسٹین کے لیے باقاعدہ نوکریوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ ہمیشہ ایسے کام کو ترجیح دیتا جس میں کچھ کر دکھانے کا موقع ملے لہٰذا جہاں کہیں لڑائی جھگڑے کا اندیشہ ہوتا، وہاں جیف اسے بھیج دیا کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسٹین لڑنے بھڑنے کا ماہر ہے۔ لیکن یہاں ایسا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ کولارڈ جیسے پُرامن اور مہذب شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اسٹین کو مکا بازی دکھانے کا موقع فراہم کرے گا۔

جب اسٹور شام کو بند ہوا تو اسٹین اپنے شکار کے انتظار میں باہر گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کچھ فاصلے سے کولارڈ کا تعاقب شروع کردیا۔ یہاں تک کہ وہ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ایک جیولری کی دکان پر پہنچ گئے۔ دکان کا مالک جانے کی تیاری کررہا تھا لیکن کولارڈ کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ غالباً کولارڈ کو پہچانتا تھا۔ اس لیے اس نے اسے اندر آنے کی دعوت دی اور دونوں باتوں میں مشغول ہوگئے۔ اسٹین نے کھڑکی سے جو کچھ دیکھا، اس سے اندازہ لگا لیا کہ ان دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہورہی ہوگی۔

☆☆☆

"وہ اپنی محبوبہ کے لیے تحفہ خرید رہا تھا۔" اسٹین نے اعلان کیا۔ "مسٹر جیف! تم غلط سمجھ رہے تھے، اس کیس میں دوسری عورت موجود ہے۔"

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"اس لیے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"کیا تم نے ان کی گفتگو سنی تھی؟" جیف نے پوچھا۔

"نہیں کیونکہ دو منٹ بعد ہی مجھے ایک پولیس والے کی وجہ سے وہاں سے ہٹنا پڑا جو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی بُری نیت سے وہاں گھوم رہا ہوں۔ لیکن مسٹر کولارڈ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ چوری چھپے کوئی کام کررہے ہیں۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ اپنی بیوی کے لیے تحفہ خرید رہے ہوتے تو اتنے بے چین نہ ہوتے۔ مجھے تو ان کی نیت میں فتور نظر آرہا تھا۔"

"جبکہ تم یہ بھی کہہ رہے ہو کہ وہاں سے وہ سیدھے اپنے گھر گئے تھے؟"

"ہاں، میں نے ان کا گھر کے دروازے تک تعاقب کیا تھا۔"

"اور وہ جیولری شاپ سے کچھ لے کر بھی نہیں آئے؟"

اسٹین کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ "ہاں، سوائے اپنے مجرمانہ راز کے۔"

"تم ان کے بارے میں غلط رائے قائم کررہے ہو۔" جیف نے کہا۔

"میں نے ان کی گھنٹوں نگرانی کی۔" اسٹین بولا۔ "اسٹور میں وہ ایک منیجر کی طرح نظر آرہے تھے لیکن اسٹور سے باہر آتے ہی ان کا انداز مشتبہ ہوگیا اور اس سے



صرف ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم فیصلہ کرنے میں جلدی کررہے ہو۔"

"مجھے اس پر شک ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں کل بھی اس کی نگرانی کروں؟"

"نہیں۔" جیف نے کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا... اگر وہ مستقل پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہے تو اس کا مطلب ہے اسے اپنے تعاقب کا شبہ ہوگیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم شریف آدمی ہو لیکن دیکھنے میں خطرناک لگتے ہو۔ جہاں تک اس دکان کا تعلق ہے تو ممکن ہے کہ وہاں وہ اپنی گھڑی مرمت کروانے گیا ہو۔ وہاں جانے کی اور بھی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔"

اسٹین بولا۔ "مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آرہی ہے۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے اور میں اس کا پتا لگا لوں گا۔"

☆☆☆

نگرانی کا دوسرا دن بے نتیجہ ثابت ہوا۔ کولارڈ معمول کے مطابق صبح کام پر آیا۔ اس نے تمام دن اسٹور میں گزارا اور چھٹی ہونے پر سیدھا گھر چلا گیا۔ جیف اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا جس انداز میں وہ گاہکوں اور اپنے عملے سے نمٹ رہا تھا، وہ قابلِ تعریف تھا۔ البتہ اسٹین ایک بات بتانا بھول گیا اور وہ یہ کہ کولارڈ کے سیدھے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جیف کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ اپنے گھر کے صدر دروازے پر نہیں پہنچ گیا۔

جیف کو کولارڈ کی طرف سے اطمینان ہوگیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ کولارڈ کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ورنہ اس کی جاب ایسی تھی جس میں پُرکشش خواتین سے راہ و رسم بڑھانے کے ان گنت مواقع میسر آسکتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اس کی بیوی چوکنا ہوگئی؟ وہ کیوں دیر سے گھر آرہا تھا؟ اس کے ہاتھ پر چوٹ کیسے لگی؟ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لیے جیف کو اگلے روز بھی اس کا تعاقب کرنا پڑا۔

کولارڈ چھٹی ہونے کے بعد اسٹور سے باہر آیا لیکن گھر جانے کے بجائے مختلف سمت کی جانب ہولیا۔ جیف نے نوٹ کیا کہ اس کے انداز میں تبدیلی آگئی ہے۔ وہ ایک پُرسکون اور باصلاحیت منیجر کے بجائے چوکس اور بے چین نظر آرہا تھا، جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے۔ جیف جانتا تھا کہ کس طرح اپنے آپ کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھنا ہے۔ گہری اندھیری شام کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب رہا۔ اس نے کولارڈ سے اتنا فاصلہ رکھا تھا کہ نظروں میں آئے بغیر اس کا تعاقب جاری رکھ سکے۔

مختلف راستوں سے ہوتا ہوا کولارڈ ایک گھر کے پاس رک گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں گھما کر یہ یقین کرنا چاہا کہ کسی نے اسے یہاں آتے دیکھا تو نہیں۔ پھر اس نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ اس مکان سے متصل ایک بجلی کا کھمبا تھا جس پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں جیف دروازے کا بخوبی نظارہ کرسکتا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت عورت باہر آئی۔ جیف نے دیکھا کہ اس عورت نے بھرپور مسکراہٹ سے کولارڈ کا استقبال کیا اور اسے اندر لے گئی۔ یہ منظر دیکھ کر جیف پریشان ہوگیا اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی یہ شخص اپنی بیوی کو دھوکا دے رہا ہے۔ کیا یہ یہاں کسی خفیہ ملاقات کے لیے آیا تھا؟ اپنی پولیس کی ملازمت کے دوران جیف نے فحاشی کے کئی اڈوں پر چھاپا مارا تھا اور اس کی معلومات کے مطابق اس علاقے میں ایسا کوئی اڈا نہیں تھا۔ ویسے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ دھندا شہر کی پسماندہ بستیوں سے لے کر عالی شان ہوٹلوں میں زور و شور سے جاری تھا۔ "نہیں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "کولارڈ کبھی ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کرسکتا۔ اس کی بیوی بے حد پیاری اور خوب صورت عورت تھی اور وہ اس سے بھی دور ہوسکتا تھا جب کوئی دوسری عورت اس سے سچی محبت کرنے لگتی۔ کولارڈ ضرور کسی ایسے شخص سے ملنے آیا ہوگا جس نے اسے گھر میں آنے کی اجازت دی۔"

اسی لمحے اسے مورٹن کا خیال آیا کیونکہ اس نے اپنی بیوی کے عاشق کو قتل کردیا تھا اور ایک غیر تحریر شدہ قانون کی وجہ سے سزا سے بچ گیا۔ لیکن ایڈتھ کولارڈ کے پاس ایسا کوئی موقع نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت کے ساتھ دیکھ کر اس عورت کو قتل کردیتی تو وہ تحریر شدہ قانون کے رحم و کرم پر ہوتی اور مردوں پر مشتمل جیوری اسے کوئی رعایت نہ دیتی۔ ایڈتھ کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ انتقام لینا تو دور کی بات، اس میں تو اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے شوہر سے دیر سے آنے کا سبب پوچھ سکے۔

سردی شدید ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کا کالر اوپر کیا اور ایک ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں سے مکان پر نظر رکھ سکے۔ اسے اب کولارڈ کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اس جگہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرسکتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس واقعے کا ذکر اس کی بیوی سے نہیں کرے گا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ بے حد تکلیف دہ ہوگا گو کہ اس نے اسے حقیقت بتانے کا وعدہ کیا تھا لیکن پوری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچائی جانے بغیر وہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صدر دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور ایک لحیم شحیم شخص نے کولارڈ کو سڑک کی طرف دھکا دے کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کولارڈ زمین پر گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جیف فوراً ہی اس کی مدد کے لیے لپکا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''ہاں۔'' کولارڈ اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

جیف اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ تمہیں زیادہ چوٹ لگی ہے۔'' وہ کولارڈ کا ہیٹ اٹھانے کے لیے جھکا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری چوٹ سنجیدہ نوعیت کی ہو سکتی ہے۔''

''نہیں، میں نے کہا نا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔''

جب اس نے چلنے کی کوشش کی تو تھوڑا سا لڑکھڑایا تو... جیف نے اسے پکڑ کر سیدھا کیا۔ کولارڈ شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا احسان مند بھی تھا کہ اجنبی ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی مدد کے لیے آیا۔ جیف اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ کچھ پینے سے تمہاری حالت سنبھل جائے گی۔''

☆☆☆

جب وہ ایک بار میں داخل ہوئے تو جیف صحیح طور پر اس کا جائزہ لینے کے قابل ہو سکا۔ کولارڈ کی حالت خاصی ابتر تھی۔ جب اسے زمین پر پھینکا گیا تو ہیٹ کہیں دور جا گرا اور اس کا سر پختہ سڑک سے ٹکرایا تھا۔ اس کی کنپٹی پر چوٹ آئی تھی اور کان کے نیچے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے کوٹ کی آستین بھی پھٹ گئی تھی۔ میز کی طرف جاتے ہوئے جیف نے ڈرنکس کا آرڈر دیا پھر اس کی توجہ بہتے ہوئے خون کی طرف دلائی۔ کولارڈ نے جیب سے رومال نکالا اور اپنے کان کی لو صاف کرنے لگا۔

''تمہاری بہت بہت مہربانی۔'' کولارڈ بولا۔ ''کیا میں اپنے محسن کا نام جان سکتا ہوں؟''

''میرا نام جیف لیمن ہے اور میں اپنے دوستوں سے ملنے جا رہا تھا کہ میں نے تمہیں باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ کیا ہوا تھا؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کے لیے میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔''

''تم پر حملہ ہوا ہے اور یہ ایک جرم ہے۔''

''نہیں۔'' کولارڈ جلدی سے بولا۔ ''یہ ایسا نہیں جیسا کہ دکھائی دیا۔ میں کسی پر کوئی الزام لگانا نہیں چاہتا۔''

''میں گواہی دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''یقین جانو، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

ویٹر وہسکی کے دو گلاس لے کر آ گیا۔ کولارڈ نے اپنا گلاس اٹھایا اور ایک لمبا گھونٹ لینے کے بعد وہ بہتر نظر آنے لگا۔ اب وہ اپنے محسن کا جائزہ لینے کے قابل ہو چکا تھا۔ شکل وصورت کے اعتبار سے شاید وہ دیکھنے والوں پر خوش گوار تاثر قائم نہ کرتا ہو لیکن اس کی ہمدردی پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس اجنبی پر بھروسا کر سکتا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ جیف کے سامنے تھوڑی بہت وضاحت پیش کر دے۔

''یہ میری اپنی غلطی تھی۔'' کولارڈ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھنے میں تو تم اس طرح کے نہیں لگتے کہ کسی سے لڑائی جھگڑا کرو۔''

''میں واقعی ایسا نہیں ہوں مسٹر جیف... اور میں وہاں جھگڑا کرنے نہیں گیا تھا۔ میں صرف اپنی چیز واپس لینے گیا تھا۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ میں تمہیں پوری کہانی سنا دوں۔ میرا نام جیفرسن کولارڈ ہے اور میں نے ایسی حرکت پہلے کبھی نہیں کی۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھ میں تھوڑا سا لالچ آ گیا تھا۔ اس کہانی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب میرے ایک ساتھی نے مجھے اس مکان کے بارے میں بتایا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں جواری اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے جاتے ہیں۔ میرے ساتھی نے ایک کارڈ گیم کے ذریعے ستر ڈالرز سے زیادہ جیتے اور آگے بڑھنے کے بجائے کھیل چھوڑ دیا۔ مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔'' کولارڈ افسردگی سے بولا۔ ''میں لالچ میں آ گیا... مجھے مزید رقم چاہیے تھی۔''

جیف کے لیے یہ کہانی نئی نہ تھی۔ کولارڈ وہاں جوا کھیلنے گیا تھا تاکہ بہ آسانی کچھ رقم حاصل کر سکے۔ پہلی بازی وہ ہار گیا لیکن اس کے بعد جیت کا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ کھیلتا رہا اور جیتتا رہا۔ اس نے بیس ڈالرز سے کھیلنا شروع کیا تھا اور وہ چار سو ڈالرز جیت چکا تھا۔ اس رقم سے کولارڈ نے کوئی خاص چیز خریدنے کا پروگرام بنایا۔

''میں نے اپنی بیوی ایڈتھ کو شادی کی پہلی سالگرہ پر ڈائمنڈ بروچ تحفے میں دیا تھا۔ میں اپنے آپ سے ہمیشہ یہ



وعدہ کرتا کہ اس سے میچ کرتے ہوئے بُندوں کی جوڑی بھی اسے تحفے میں دوں گا۔ گو کہ یہ بہت قیمتی تھا لیکن ایڈتھ اس کی مستحق تھی۔''

گویا اس نے وہ بروچ کسی دوسری عورت کو دینے کے بجائے جیولری شاپ پر رکھوا دیا تھا۔ وہ اتنا سادہ لوح تھا کہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکا۔ بھلا وہ لوگ اسے اتنی آسانی سے جیتی ہوئی رقم کیوں لے جانے دیں گے؟ وہ اپنی جیب میں رقم ڈال کر مکان سے باہر آیا اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ڈرائیور نے ٹیکسی روکی اور اسے تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد رقم لے کر چلتا بنا۔

''میں نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے انڈے سے میرے ہاتھ پر وار کیا اور میں تقریباً بے ہوش ہو گیا۔''

''کیا تم اس آدمی کو دوبارہ پہچان لو گے؟''

''شاید نہیں۔ اس نے ہیٹ پہن رکھا تھا اور مفلر سے اپنے چہرے کا نچلا حصہ لپیٹ رکھا تھا۔ رات کے وقت شاید وہی ایک ٹیکسی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ شاید میں پہلے بھی اس میں سوار ہوا ہوں لیکن میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی میرے پاس کم پیسے ہوتے تھے اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھا۔''

''تم نے پولیس میں رپورٹ کیوں درج نہیں کروائی؟'' جیف نے پوچھا۔

''میرا خیال تھا کہ یہ مسئلہ خود ہی حل کر لوں گا۔ جب مجھ میں اتنی ہمت آ گئی تو میں آج شام ان کے پاس گیا اور ان سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ تم نے دیکھ ہی لیا۔''

''تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوف بھی ہو۔''

''یہ مجھے اب معلوم ہوا ہے۔'' کولارڈ نے تمکین لہجے میں کہا۔ ''یہ میری حماقت تھی جو فرض کر لیا کہ مجھے وہاں جا کر صرف رقم کا مطالبہ کرنا ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ اس ٹیکسی ڈرائیور سے ملے ہوئے ہیں لیکن میں اسے کسی طرح ثابت نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ میرے ساتھ کھیلنے والوں میں ایک پولیس والا بھی تھا اور سب سے زیادہ وہی پیسے ہار کر گیا تھا۔''

جیف کو محسوس ہوا کہ پولیس والا بھی سادہ لوح جواریوں کو لوٹنے کی سازش میں شریک ہے۔ وہ جان بوجھ کر اپنے کا ڈرامار چاتا تاکہ دوسرے کھلاڑیوں کو اپنے نقصان کا احساس نہ ہو۔ جیتنے والا جب مکان سے باہر نکلتا تو اسے باہر وہی مخصوص ٹیکسی ملتی جس کا ڈرائیور اس گروہ سے ملا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دور آگے جانے کے بعد جیتنے والے کھلاڑی کو مار پیٹ کر جیتی ہوئی رقم چھین لیتا اور وہ ان تینوں میں تقسیم ہو جاتی۔ ان کا تازہ ترین شکار کولارڈ تھا۔

''میں اپنے آپ کو بالکل احمق سمجھ رہا ہوں۔'' کولارڈ نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ کیا کیا جائے۔''

جیف نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ''اپنے گھر جاؤ اور بیوی کو کچھ نہیں بتانا کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔''

☆☆☆

جیف نے دوبارہ اس مکان کا رخ کرنے سے پہلے دو راتوں تک انتظار کیا۔ وہ اس مکان میں داخل ہونے اور جواریوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے کوئی معقول جواز تلاش کر رہا تھا۔ مکان میں روشنی کم تھی اور جوئے خانے کے مالک نے آنکھوں پر آئی شیڈ چڑھا رکھے تھے جن کی وجہ سے اس کا چہرہ کسی حد تک چھپ گیا تھا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی بازیاں لگ رہی تھیں اور جیف جان بوجھ کر ابتدائی چند بازیاں ہارتا رہا۔ اس نے بازار سے دگنی قیمت پر اپنے لیے وہسکی کا ایک گلاس بھی خریدا۔ گلاس لانے والا وہی شخص تھا جس نے کولارڈ کو مکان سے باہر پھینکا تھا۔

پہلے سیشن کے اختتام پر ایک باوردی پولیس والا بھی اس کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص اچھی خاصی رقم ہار چکا تھا اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ سب پولیس والے شراب پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو ہوش میں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ پولیس والا خاص طور پر اس کی چھان بین کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

جب وہ وہاں سے چلنے لگا تو پولیس والے نے بڑی تکلفی سے اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھ دیا اور یوں باتیں کرنے لگا جیسے وہ آپس میں بڑے گہرے دوست ہوں۔ گفتگو کے دوران اس نے جیف سے متعدد سوالات کیے جن کا جیف نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا کیونکہ وہ نشے میں نہیں تھا۔ اس لیے اسے جواب دینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے اسی مرحلے کے لیے اپنے آپ کو مدہوش ہونے سے بچایا تھا۔

اگلی رات وہ پھر اس مکان میں گیا۔ جوئے خانے کا منتظم بہت ہوشیار شخص تھا۔ اس نے ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ اچھے پتے باری باری مختلف کھلاڑیوں کے پاس جائیں۔ یہاں تک کہ جیف کو بھی ایک بازی جیتنے کا موقع دیا گیا۔ اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ بہت خوش ہے، ایک اور ڈرنک کا آرڈر دے دیا لیکن اس نے جو کچھ جیتا تھا، وہ دوسری بازی میں ہار گیا اور اپنی شکست پر الٹی سیدھی بکواس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگا۔ جوئے خانے کے منتظم اور پولیس والے کی نظریں چار ہوئیں اور وہ نیا شکار ڈھونڈنے لگے۔

اب سب سے بڑی بازی شروع ہونے والی تھی اور پولیس والے کے اصرار پر لوگ بڑی بڑی رقوم لگا رہے تھے۔ میز کے وسط میں نوٹوں اور سکوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ منتظم نے بڑی مہارت سے پتے بانٹے اور جیف نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اس کے پاس جیتنے والے پتے ہیں لیکن وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سر کھجانے لگا۔ بازی شروع ہوئی اور وہ سب بڑے انہماک سے کھیلنے لگے۔ جیف کے سامنے وھسکی کا بھرا ہوا گلاس رکھا تھا جس کا اس نے آرڈر نہیں دیا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں آدھا گلاس خالی کر دیا اور قہقہے لگانے لگا۔ پھر وہ اپنے پتوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ کون سی چال چلنا چاہیے۔ سب کی جیبیں خالی ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ پولیس والے نے بھی نقد رقم کی جگہ اپنی گھڑی بازی میں لگا دی۔ وہ جانتا تھا کہ کبھی بازی نہیں جیت سکے گا۔ اس بار بھی میدان جیف کے ہاتھ رہا۔ اس نے اپنے پتے نیچے کیے اور بولا۔

''کوئی انہیں دیکھنا چاہتا ہے؟ آخر میں جیت ہی گیا۔''

اس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر میز پر سے رقم سمیٹی اور ترنگ میں آ کر گنگنانے لگا۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ مزید کھیلے لیکن جیف نے گھر جانے کا ارادہ کر لیا کیونکہ وہ کافی رقم جیت چکا تھا۔ میز پر سے اٹھ کر ان سب لوگوں سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز پھر آئے گا۔ جب بارٹینڈر اس کے ساتھ دروازے تک آیا تو جیف سمجھ گیا کہ یہ شخص ایک فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ باہر صرف ایک ہی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈرائیور ٹیکسی کے ساتھ ہی موجود تھا اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے مسلسل چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس نے جیف کو اپنی طرف آتا دیکھا اور ساتھ ہی اس کا اشارہ سمجھ گیا جو جیف کے پیچھے آنے والے شخص نے اسے کیا تھا۔

وہ واحد شخص نہیں تھا جس نے بازو ملنے کا وہ مخصوص اشارہ دیکھا ہو بلکہ راہداری میں چھپے ہوئے میتھیو اسٹین نے بھی وہ اشارہ دیکھ لیا تھا اور اس نے جیف کو اپنا مخصوص اشارہ دے کر اسے محتاط رہنے کے لیے کہا۔ اسٹین کو امید تھی کہ آج رات اسے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی اور اسے کچھ ایکشن دیکھنے کا موقع مل سکے گا۔

ٹیکسی ڈرائیور کو اپنا پتا سمجھانے کے بعد جیف اس میں سوار ہو گیا۔ ٹیکسی زیادہ سے زیادہ پچاس گز دور گئی ہو گی کہ وہ ایک تنگ گلی میں مڑ کر رک گئی۔ ڈنڈے سے لیس ڈرائیور اپنے مسافر سے بدکلامی کرنے لگا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس بار اس کا مقابلہ جیفرسن کولارڈ سے نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب جیف نے اپنے پستول کی نال کا رخ اس کی جانب کر دیا اور بولا۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو یہ ڈنڈا مجھے دے دو۔''

جیف نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور بولا۔

''میں سچ سچ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اور تمہارے ساتھی کب سے یہ گیم کھیل رہے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟'' ڈرائیور ہکلاتے ہوئے بولا۔

''میں اس حملے اور ڈاکے کی بات کر رہا ہوں جب تم نے کچھ عرصے پہلے ایک آدمی کو یہاں اتارا اور اس سے ڈھیر ساری رقم لے کر فرار ہو گئے۔ تم توقع کر رہے تھے کہ میں بھی اسی طرح اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دوں گا، یہ تمہاری بھول تھی۔ اب میں تمہیں طویل عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دوں گا۔''

ڈرائیور نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں پھر اس نے اچانک ہی ٹیکسی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ جیسے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی، وہاں چھپے ہوئے اسٹین نے اسے پکڑ لیا اور اس کے منہ پر ایک زوردار مُکا رسید کیا۔ ڈرائیور اس ضرب سے چکرا کر رہ گیا لیکن فوراً ہی سنبھلتے ہوئے اس نے بھی اپنی مٹھی بھینچ لی۔ جیف نے اپنا سر ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر نکالا اور ان دونوں کی لڑائی دیکھنے لگا۔ اس نے فوری طور پر ٹیکسی سے باہر آنے کی زحمت گوارا نہیں کی کیونکہ جانتا تھا کہ اکیلا اسٹین ہی ڈرائیور کے لیے کافی ہے۔

گو کہ ڈرائیور جسمانی طور پر کافی مضبوط تھا لیکن اس کے مقابلے میں اسٹین زیادہ فٹ، پھرتیلا اور جوان تھا۔ اس لیے ڈرائیور جب بھی حملہ کرتا تو وہ تیزی سے ایک طرف جھک جاتا اور اس طرح ڈرائیور کا ہر وار ناکام جا رہا تھا۔ پورے ایک منٹ تک وہ ڈرائیور کو اسی طرح تھکاتا رہا پھر اس نے پلٹ کر جوابی حملہ کیا جو اتنا زوردار تھا کہ ڈرائیور کا دماغ گھومنا اٹھا۔ دوسرا گھونسا ڈرائیور کی ناک پر پڑا اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ ڈرائیور طیش میں آ کر چلاتے ہوئے اندھا دھند مکے برسانے لگا لیکن اس کا بازو فضا میں ہی لہراتا رہا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے آپ کو ان حملوں سے بچائے رکھا اور جب اس نے دیکھا کہ ڈرائیور بری طرح تھک چکا ہے تو اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ ڈرائیور ان حملوں کی



تاب نہ لا سکا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

''بہت خوب۔'' جیف نے ٹیکسی سے باہر آتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں فاتح قرار دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''مجھے کافی دیر سے اپنے جسم کو حرارت پہنچانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔'' اسٹین نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''گلی میں کھڑے کھڑے میں برف کا تودہ بن گیا تھا۔''

☆☆☆

کرسمس کی شام اسٹور کھولنے کا تجربہ بے حد کامیاب رہا۔ میکی اسٹور گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ کولارڈ کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ اسے گاہکوں کی سہولت کے ساتھ ساتھ اپنے عملے پر بھی نظر رکھنا تھی کہ کہیں وہ رش کی وجہ سے بوکھلاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسٹور لیمن بھی گاہکوں کے ہجوم میں شامل تھا۔ وہ اس رش میں راستہ بناتا ہوا کولارڈ تک پہنچا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے اٹھائے ہوئے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تم نے کرسمس کے تحفے خریدے ہیں۔'' کولارڈ نے کہا۔ ''کیا کچھ لے لیا؟''

جیف نے کہا۔ ''سب سے بہترین تحفہ تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے اور وہ یہ کہ جوا خانہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور اس کا مالک پولیس کی تحویل میں ہے۔ اس کے علاوہ اس بار ٹینڈر کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے جس نے تمہیں دھکے دے کر مکان سے باہر نکالا تھا۔ ان کا ساتھ دینے کے جرم میں ٹیکسی ڈرائیور بھی پولیس کی حراست میں ہے۔ اس پولیس والے کی بھی کم بختی آ گئی۔ اب وہ کبھی کسی جوئے خانے سے اپنا حصہ وصول نہیں کر سکے گا۔ فی الحال تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ حوالات میں بند ہے۔ اسے سزا تو ہو گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

''واقعی، یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ آئندہ وہ سادہ لوح لوگوں کو نہیں لوٹ سکیں گے۔'' کولارڈ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''یقیناً ایسا ہی ہو گا۔'' جیف نے کہا۔ ''البتہ میں تم سے وعدہ نہیں کر سکتا کہ جیتی ہوئی رقم تمہیں واپس مل سکے گی یا نہیں... لیکن تمہیں اس کے لیے فکرمند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ جوئے میں بھی بے ایمانی کرتے تھے اور اس طرح بازی ہارتے تھے کہ تم جیسے لوگوں کو جیتنے کا موقع مل جائے اور پھر تم محفل میں آ کر ایک کے بعد ایک بازی لگاتے رہو اور جیتی ہوئی رقم ہار جاؤ۔ اگر تم مزید کھیلنے سے انکار کرتے تو باہر ان کا ساتھی ٹیکسی ڈرائیور تم سے وہ رقم چھین لیتا۔''

''مجھے اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' کولارڈ نے کہا۔ ''مجھے اچھا سبق مل گیا ہے اور میں آئندہ کبھی جوا کھیلنے نہیں جاؤں گا۔ میں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اب مجھے عقل آ گئی ہے۔ اس کے باوجود میں جاننا چاہوں گا کہ یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں نے وہ سب کچھ تمہیں بتا دیا ہے جس کا جاننا تمہارے لیے ضروری تھا۔''

جیف کو یاد آیا کہ ایڈتھ بھی تفصیلات معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ یہ جان کر خوش تو ہوئی کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت کے چکر میں نہیں ہے۔ جیف نے اسے گول مول انداز میں کولارڈ کی مصروفیت کے بارے میں بتایا اور یقین دلایا کہ اس کی مسلسل نگرانی کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ کسی دوسری عورت کے پاس نہیں جاتا۔ البتہ وہ کولارڈ کے جوا کھیلنے کی بات گول کر گیا اور نہ ہی اس نے یہ بتایا کہ کولارڈ نے بروچ کیوں نکالا تھا۔

☆☆☆

جیف کو احساس تھا کہ کولارڈ بہت مصروف ہے اس لیے اس نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں چلوں گا۔ تم تو شاید نصف شب تک مصروف رہو گے۔''

''نہیں، میرا عملہ یہاں موجود رہے گا۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے تاکہ جیولری شاپ سے وہ بُندے لے سکوں جو میں نے اپنی بیوی کے لیے بنوائے ہیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر جیف۔'' وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ اس کے باوجود میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

''اس بات کو اب بھول جاؤ۔ وہ لوگ سادہ لوح لوگوں کو لوٹ کر پیسے بنا رہے تھے لیکن آخر میں ایک غیر تحریر شدہ قانون کو توڑ کر خود ہی پھنس گئے۔''

''وہ قانون کیا ہے؟''

''یہی کہ ہر بار ایک ہی چال کامیاب نہیں ہوتی۔ اس مرتبہ انہوں نے غلط آدمی کا انتخاب کیا اور اب وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے کرسمس منا رہے ہیں جبکہ میں یہاں مزے سے شاپنگ کر رہا ہوں۔ خدا حافظ مسٹر کولارڈ۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بیوی نئے بُندے دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ عورت کے لیے وہی چیز خریدنی چاہیے جو اس کو پسند ہو تاکہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔ یہ بھی ایک غیر تحریر شدہ قانون ہے۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



# للکار

طاہر جاوید مغل

## پچیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار
خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔
خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار
کے طواف میں محو رہتا ہے ... مگر آج عشق کی اقدار
میں تبدیلی ... وقت کی ضرورت اور حالات کا
تقاضا ہے ... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...
کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ... سر پھرے عاشق نے اب
ایسے شخص کا روپ دھار لیا ہے جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر
محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ
نظر رکھتا ہے ... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت
جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ... عشق میں اس کی زندگی کی
سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ... جبکہ دوسرے عاشق کا
مطمحِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس
کے قلب و نظر ... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں
کشادگی کو بھر دیا ہے ... کائنات کا ہر مسئلہ
اس کے پیشِ نظر ... ایک للکار ہے۔

**ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے**

### گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے داجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا.... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور مل پانی۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا اور اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہمیں ایک عجیب و الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں ساتھیوں سے الگ ہوگیا اور ہارون عجیبکی تک جا پہنچا۔ مجھے اور جیکی کو نل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے۔ میرا آپریشن ہوگیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہوگیا۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کرڈالا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کردیا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں بونگوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رستاویوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام میں ایک جرمن چپ دی۔ پھر سامبر مقابلے والا دن آگیا۔ میں اور جارج مدمقابل تھے۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کردیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ عمران نے راجزئی کی واردات کا ڈراما کر کے انعام میں ملنے والی جیپ غائب کردی پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر یہ سب دھوکا تھا، ایک محدود فاصلے پر پہنچنے کے بعد حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوگئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ وہاں سب نے ہمارا استقبال کیا۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں نے لیک کر کسی کو گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی اور کچھ لوگ گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکے۔ ہم بھی اس پر سوار ہوگئے۔ اچانک ایک بستی آنے پر ٹریکٹر ٹرالی ایک احاطے میں رک گئی۔ یہ گاؤں کا شفاخانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کردیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر لی وان بھی یرغمالیوں میں شامل تھا اور آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ماریا کی وجہ سے وہاں کافی ہلچل مچ گئی تھی۔ رنجیت پانڈے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسپتال میں گھسنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہمیں کمیت میں بھرت نامی نوجوان ملا جو ہمیں اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ پھر عمران نے بھرت کے ہاتھ انگریز افسر کو ملاقات کا پیغام بھیجا اور ہماری اس سے ملاقات ہوئی۔ عمران نے اسے اپنی باتوں سے قائل کرلیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ انگریز افسر راضی ہوگیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ درجنوں مسلح کمانڈوز نے بھی گولیوں کی برسات کردی۔ آفتاب بھی مارا گیا۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے مگر انگریز افسر نے دھوکے سے سلطانہ کو باہر بلا کر اسے بھی مار ڈالا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ زرگاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ یہاں بغاوت ہوگئی تھی اور زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ پھر انور خاں بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ بھرت بھی جھوٹے الزام میں قید تھا۔ ہمیں جیل سے قاسمیہ چوک لے جایا گیا۔ ہمیں سولی چڑھایا جانا تھا مگر عمران نے بتایا کہ یہاں کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ اچانک طلال فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم بھی حرکت میں آگئے۔ ٹیارڈ اور اسٹیل مارے گئے۔ ہم وہاں سے نکل کر پرانے قلعے میں آگئے۔ یہاں کے لوگوں نے مورچے بنالیے تھے مگر حکم کی فوج کو زیادہ دیر نہیں روکا جاسکتا تھا۔ ستیش اور مالا بھی قلعے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں گیتا بھی آگئی۔ وہ عمران کو کوئی خاص جانکاری دینا چاہتی تھی۔ وہ اپنی انفارمیشن کے بدلے عمران کی قربت چاہتی تھی۔ تاہم عمران نے اسے سمجھا بجھا کے اہم معلومات لے لیں۔ معلومات کے مطابق قلعے کی فصیل ایک جگہ سے کمزور تھی۔ اس اہم معلومات کے بعد وہاں ایک خندق کھودی گئی۔ ہم پر حکم کے فوجیوں کی طرف سے حملہ ہوگیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑائی قلعے کے قریب پہنچ گئی۔ اسی دوران میں قلعے کے برآمدے سے گیتا بھی کی تشدد زدہ لاش ملی۔ یہ کوئی اندرونی سازش تھی۔ ہم لوگ شفاخانے گئے تو وہاں زخمیوں کے بیچ رنجیت پانڈے موجود تھا۔ اس نے ہمیں گن پوائنٹ پر لے لیا۔ اس نے مزاحمت کرنے والے زخمیوں اور چوہان کو بھی گولی ماردی اور ہمیں انور خاں کے کمرے میں لے آیا۔ اس سازش میں عبدالرحیم اس کا دست راست تھا۔ اس نے انور خاں کے گلے میں کڑا ڈال دیا جو کہ بم ڈیوائس تھی۔ وہ ہم سے قلعے کا دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ تاہم ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کردیا۔ پھر وہاں موجود قیدی انگریزوں سے ڈیوائس کا کوڈ نکلوا کر اسے بند کیا گیا۔ لڑائی میں شدت آگئی تھی اور حکم کے فوجی قریب آتے جارہے تھے۔ پھر چھولے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ حکم کو گرفتار کرلیا گیا اور اینڈرسن مارا گیا۔ بھرت اس لڑائی میں زخمی ہوکر اسپتال میں داخل تھا۔ میں اور عمران اسپتال سے نکل کر باہر آئے تو دو گھڑسوار ہماری طرف آئے۔ ان کے عقب میں مالا بھی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے





دونوں گھڑسوار اور مالا ہمارے قریب آکر رک گئے۔ اتنے میں پانڈے کا اچھوت ماتحت امرناتھ بھی بھاگا ہوا آیا اور ہمارے پاس آکر رک گیا۔

مالا نے ہانپتی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے، ماتاجی کہاں ہوں گی؟“

میں نے کہا۔ ”میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج صبح کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ نہیں بچیں۔“

”یہ غلط ہے۔“ مالا نے کہا۔ ”میں پورے وشواس سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ زندہ ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں ابھی ابھی اسپتال سے ملا ہے۔“

”کیسا ثبوت؟“ عمران نے پوچھا۔

”پتا چلا ہے کہ رات کو کچھ لوگن اسپتال میں آئے تھے۔ انہیں جانکاری ملی تھی کہ یہاں اسپتال میں کوئی ایسی ناری موجود ہے جو دوھوا ہے اور اس کی عمر میں بتیس ورش کے لگ بھگ ہے۔ ان لوگن کو اسپتال میں تو ایسی عورت نا ہیں ملی مگر پھر پتا چلا کہ اسپتال کے تحن میں جو چھوٹا سا مندر ہے، وہاں ایک ایسی دوھوا عورت سیوا کا کام کرت ہے۔ یہ لوگن اس عورت کے پاس پہنچے اور اسے ایک گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ دیکھنے والے نے بتایا ہے کہ گھوڑا گاڑی میں ایک بوڑھی عورت بھی موجود تھی جس نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دیکھنے والے کا وچار ہے کہ وہ کالے کپڑوں والی عورت ماتاجی ہی تھی۔“

”تم اپنی اس ساری بات سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو مالا؟“ عمران نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”میں یہ بتانا چاہت ہوں کہ ماتاجی نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی عادت کے مطابق کوئی خطرناک شوشہ چھوڑنے والی ہیں۔ وہ اسپتال کے اندر سے ایک تیس ورش کی بیوہ ناری کو ڈھونڈ کر لے گئی ہیں۔ مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ میں نے تیس ورش کی بیوہ کا ذکر ماتاجی کی زبانی کسی پرانی رسم کے سلسلے میں سنا تھا۔ کوئی ایسی رسم جو بہت بری تھی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نا ہیں آرہا ہے۔ پر میرا من کہہ رہا ہے کہ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ ماتاجی کا کٹر پن اور ان کا ”میں نہ مانوں“ والا روپ کوئی مصیبت کھڑی کرنے والا ہے۔“

امرناتھ نے لجاجت سے کہا۔ ”میں اس قابل تو نا ہوں جی لیکن اگر آپ کی اجاجت ہو تو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ ہم کو اس بارے میں پنڈت مہاراج سے پوچھنا چاہیے۔ ان کو بہت سی پوتھیاں اور شاستریں منہ جبانی یاد ہیں۔ پنڈت مہاراج ہمیں فوراً بتا سکت ہیں کہ اگر بھگوان نہ کرے ماتاجی کوئی بُری رسم ادا کرنے والی ہیں تو وہ کیا ہووے گی۔“

مالا نے فوراً تائید کی۔ ”میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں فوراً ماتاجی کے ارادے کے بارے میں جاننا چاہیے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کچھ لوگن اسپتال سے تیس ورش کی ودھوا ناری کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ اور اگر اسے لے جانے والوں میں ماتاجی بھی ہیں تو پھر ہمیں جانکاری ہونی چاہیے کہ وہ کیا کرنا چاہ رہی ہیں۔“

تھوڑے سے مزید مشورے کے بعد ہم سیدھے راج بھون میں پنڈت مہاراج کے پاس پہنچے۔ پنڈت مہاراج کو عارضی طور پر راج بھون کے ایک رہائشی پورشن میں نظر بند کیا گیا تھا۔ پنڈت مہاراج اپنے لمبے بالوں اور اپنے گلے میں جھولنے والی درجنوں مالاؤں کے ساتھ لکڑی کی چوکی پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ جارج گورا کے ساتھ میرے سامبر مقابلے سے پہلے اور مقابلے کے بعد بھی پنڈت مہاراج نے کچھ اچھے فیصلے دیے تھے اور ہمارے دل میں جگہ بنائی تھی لیکن آخر میں وہ بھی موقع پرستی اور مصلحتوں کا شکار ہوا تھا۔ دھرم کا منہ بند کرنے کے لیے پہلے مجھے، عمران اور حمیدہ کو آزاد کیا گیا تھا اور جب ہم ایک خاص حد سے آگے نکلے تھے تو ہمیں پھر سے پکڑنے کے لیے گھوڑے دوڑا دیے گئے تھے۔

آج اگر پنڈت مہاراج شرمسار اور سرنگوں نظر آرہا تھا تو اس کی وجہ وہی واقعات تھے۔ بہرحال، اس موقع پر ہم نے پنڈت مہاراج کو مزید شرمسار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے اسے تسلی تشفی دی اور اسے باور کرایا کہ دیگر دھرمی لوگوں اور پنڈتوں پجاریوں کی طرح اس سے بھی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ مالا نے پنڈت مہاراج سے وہ سوال پوچھے جو بڑی شدت سے اس کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ اس نے تیس سالہ بیوہ کا ذکر کیا اور اس خونی رسم کا ذکر کیا جس کے بارے میں اس نے کوئی ادھوری سی بات کہیں سنی تھی۔

پنڈت مہاراج کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس حوالے سے کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں سے ایک موٹی تگڑی قدیم شاستر کھولی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک تحریر کی نشاندہی کی۔ یہ سنسکرت میں تھی۔ مالا کی درخواست پر پنڈت مہاراج نے تحریر کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کچھ اس طرح تھا۔

”بھانڈیل کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں جب بھی بھگوان کے سینکوں (سپاہیوں) کو دشمن کے خلاف یدھ (جنگ) میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ہورا کی رسم کا سہارا لیا۔ ہورا کی رسم بلیدان کی وہ رسم ہے جس سے ہمیشہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاری ہوئی جنگ جیتی گئی ہے۔ یہ بلیدان ایشور کو اتنا پسند آتا ہے کہ وہ کایا پلٹ دیتا ہے۔ انہونی، ہونی ہو جاتی ہے۔ اتہاس (تاریخ) میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔''

... نیچے کچھ مثالیں لکھی ہوئی تھیں۔

آخر میں درج تھا۔ ''ہورا کی رسم کے مطابق کالے رنگ کی تینتیس بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے مُردہ جسم مٹی میں دبا دیے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آسکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ ہتھنیوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کرنے کے باوجود بھی ورودھیوں (دشمنوں) کی شکست اور اپنی فتح کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ ہورا کی اس دوسری رسم میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ ان تینوں ناریوں کو ودھوا ہونا چاہیے اور ان کی عمریں تیس سال سے کم نہ ہوں۔ یہ ناریاں دھرم کے پالن کے لیے اپنی خوشی اور اکھشا سے اپنا جیون قربان کریں... تو یہ بھی ہو سکتا ہیں کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔''

اس کے علاوہ بھی اس رسم کے حوالے سے دو چار شرائط لکھی ہوئی تھیں۔

مالا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پورے یقین سے بولی۔ ''اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ بے شک... بے شک یہی باتیں تھیں جو میں نے اپنے گھر میں اپنی دادی ساس سے سنی تھیں اور مجھے پورا وشواس ہے کہ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا کام ہونے جا رہا ہے۔''

''لیکن آپ تو ایک عورت کی بات کر رہی ہیں۔ یہاں تین عورتوں کا ذکر ہے۔'' میں نے مالا سے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ ہو سکتا ہے کہ میری دادی ساس نے دو عورتوں کا انتظام پہلے سے کر رکھا ہو۔ وہ جو کام کرنے کی ٹھان لیوت ہیں پھر وہ کر گزرتی ہیں۔''

''اب سوچنے کی بات ہے کہ یہ کام کب اور کہاں ہو گا؟'' عمران نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی ہجوم والی جگہ پر ہووے گا۔ جہاں بہت سارے لوگن اس کو دیکھ سکیں اور ان کے اندر جوش اور شکتی پیدا ہو سکے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ شہر کے ''زیادہ ہندو آبادی'' والے علاقے میں ماتا جی کو تلاش کرایا جائے۔ بہت سے بندوں کو فوری طور پر اس کام پر لگا دیا جاوے۔ یہ بھی ہو سکت ہے کہ ماتا جی اور ان کے قریبی ساتھیوں نے کسی مندر یا دھرم شالے میں پناہ لے رکھی ہو۔''

مالا کی رائے میں وزن تھا۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے مشورہ کیا۔ فوری طور پر مبارک علی کو بلایا گیا اور اسے ساری صورتِ حال بتا کر تلاش کی ذمے داری سونپ دی گئی۔

ہم دوبارہ راج بھون کے دربار میں پہنچے تو وہاں فتح کا جشن جاری تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اپنے ایک پرانے ساتھی اجے سے بھی ہوئی۔ اجے تل پانی کی فوج میں کپتان تھا۔ وہ انور خاں کے ساتھ ہی یہاں زرگاں میں پہنچا تھا۔ اب یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکی تھی کہ زرگاں کے حکمراں دشوانا تھ عرف حکم جی نے جان بچانے کے لیے ایک کوڑھ زدہ بھنگی کے گھر میں پناہ لی تھی اور اسے وہیں سے پکڑا گیا ہے۔ رتنا دیوی کی اتفاقیہ موت کی خبر بھی ہر جگہ پھیل چکی تھی۔ انگریز کمان دار اینڈرسن کی لاش راج بھون میں لائی جا چکی تھی۔ اس کی لاش کو کڑی حفاظت میں رکھا گیا تھا ورنہ منیارڈ اور پانڈے کی لاش کی طرح وہ بھی لوگوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتی۔

چھوٹے سرکار نے اپنے بڑے بھائی حکم جی کے لیے فی الحال نظر بندی کے احکام جاری کیے تھے۔ اس سے ضروری کاغذات پر دستخط وغیرہ کرانے کے بعد اسے اپنے اہلِ خانہ کی آخری رسومات میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا راج بھون کا تہ خانہ تھا۔ کچھ دیر بعد حسنات احمد بھی دربار میں پہنچ گیا۔ وہ اسپتال میں انور خاں کے غدار ساتھی عبدالرحیم سے تفتیش کر کے یہاں پہنچا تھا۔ درد کا انجکشن جو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کرتا تھا، عبدالرحیم کی زبان کھلوانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

حسنات احمد نے بتایا۔ ''عبدالرحیم نے انگریز افسر منیارڈ کے ساتھ معاملہ طے کیا تھا۔ راج بھون کی ایک ''پری'' عبدالرحیم کے پیچھے لگائی گئی۔ اس نے ایک ہی رات میں نہ صرف عبدالرحیم کو شیشے میں اتار لیا بلکہ عبدالرحیم کے ذریعے انور خاں کے دو تین اور ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ منیارڈ کی طرف سے ان افراد کو فی کس پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ ہوا اور ایک ایک لاکھ روپیا نقد فراہم کیا گیا۔ عبدالرحیم کو خصوصی رشوت کے طور پر زرگاں کی ایک قیمتی زمین دینے کا وچن بھی دیا گیا۔''

''باقی لوگ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ انور خاں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ ان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں اور شہر کے ناکوں پر ان کے لیے خاص ہدایتیں جاری کر دی گئی ہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک پیغام رساں بڑی





تیزی سے وہاں پہنچا۔ اس نے حسنات کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کچھ گفتگو کی۔ حسنات نے مجھے اور عمران کو بھی بلا لیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''بڑھیا کی کارستانی سامنے آ گئی ہے جی۔'' حسنات نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''وہ قاسمیہ کے قریب دھرم شالے میں موجود ہے۔ وہی دھرم شالہ جس کے مینار پر چڑھ کر اس نے تین دن پہلے پوجا پاٹ کی تھی۔''

''کیا کسی نے اسے دیکھا ہے وہاں؟'' کپتان اجے نے پوچھا۔

''ابھی دیکھا تو نا ہیں لیکن امید ہے کہ وہ خانہ خراب بھی وہیں پر ملے گی۔ جس ودھوا عورت کو وہ اسپتال کے مندر سے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، وہ دھرم شالے کے مینارے پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی ہے۔ دونوں عورتیں آتما ہتھیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہاں بہت سے ہندو جمع ہو گئے ہیں اور نعرے وغیرہ لگا رہے ہیں... مجھے لگت ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تیسری عورت بھی مینارے پر چڑھ جاوے گی اور پھر رسم کے مطابق یہ تینوں ودھوائیں آتما ہتھیا کریں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہورا کی رسم کے مطابق، ہاری ہوئی جنگ کو جیتنے کے لیے قربانی دیں گی۔'' میں نے کہا۔

حسنات نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بالکل ایسا ہی ہے جی۔ لگت تو یہی ہے کہ وہ سیکڑوں لوگن کے سامنے مینارے سے چھلانگ لگا دیویں گی... اور شہر میں ایک نئے فساد کی شروعات ہو جاوے گی۔''

''نہیں، اب کوئی فساد نہیں ہو گا۔'' عمران نے یقین سے کہا۔ ''فساد کرنے والوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ پھر بھی ہمیں اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لینا چاہیے اور فوری طور پر اس کا سدباب کرنا چاہیے۔''

حسنات نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے جی کہ فساد کی اصل جڑ بڑھیا بھی دھرم شالے کے اندر ہی ہے۔ وہی ان تین عورتوں کو اس خونی کھیل کے لیے تیار کر رہی ہے۔''

میں، عمران، اجے اور حسنات فوراً وہاں سے روانہ ہوئے۔ ایک بند فوجی گاڑی میں ہم بیس منٹ کے اندر ایک بار پھر قاسمیہ کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے۔ تل پانی کے سپاہیوں کو دیکھ کر لوگوں نے نعرے لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر طرف طربیہ ماحول کی جھلکیاں تھیں مگر جب ہم دھرم شالے کے نواح میں پہنچے تو وہاں کا منظر اور طرح کی فضا دکھائی دی۔ وسیع دھرم شالے کے بیچوں بیچ ایک تالاب میں کھڑا چوکور مینار لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا... اردگرد کی چھتوں اور گلیوں میں چار پانچ سو افراد جمع ہو چکے تھے اور ابھی مزید آ رہے تھے۔ بلند و بالا مینار پر ہمیں دو عورتیں نظر آئیں۔ دونوں نے گہرے زرد رنگ کے چولے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے بال کھولے ہوئے تھے اور اپنے سروں کو ہیجانی انداز میں ہلا کر کچھ اشلوک وغیرہ پڑھ رہی تھیں۔

''تیسری عورت نظر نہیں آ رہی۔'' میں نے حسنات احمد سے پوچھا۔

''شاید اسی کا انتظار ہو رہا ہے۔'' حسنات احمد نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' عمران نے کہا۔

ہم بند فوجی گاڑی کے اندر ہی بیٹھے تھے۔ اردگرد کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ اس گاڑی میں اہم لوگ موجود ہیں لیکن پھر بھی دھرم شالا کے ایک پجاری کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ یہ ادھیڑ عمر شخص تیزی سے گاڑی کی طرف آیا اور کھڑکی کے شیشے سے چمٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ فریادی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مینار کی بلندی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''اسے اندر آنے دو۔'' عمران نے حسنات احمد سے کہا۔

حسنات نے دروازہ کھول لیا اور اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور فریادکناں لہجے میں بولا۔ ''ان دونوں ناریوں کا جیون بچاؤ جی۔ یہ آتما ہتھیا کر لیویں گی۔ بڑی ماتا ان کو آتما ہتھیا پر مجبور کر دیوے گی۔ یہاں جو کچھ ہونے جا رہا ہے... وہ بڑی ماتا ہی کروا رہی ہے۔ پرنتو! وہ وہی کچھ کرت ہے جو اس کے اپنے من میں آوت ہے۔''

عمران نے پوچھا۔ ''وہ ان کو آتما ہتھیا پر کیوں مجبور کر رہی ہے؟''

جواب میں ادھیڑ عمر پجاری نے قریباً وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے مالا نے بتایا تھا۔ ادھیڑ عمر پجاری نے ''ہورا'' کی رسم کا ذکر کیا اور بتایا کہ کچھ لوگوں کے عقیدے کے مطابق اگر تین ودھوا ناریاں جن کی عمریں تیس سال سے زیادہ اور پینتیس سال سے کم ہوں، اپنی مرضی سے اپنے جیون کی بلی دیں تو ہاری ہوئی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ ادھیڑ عمر پجاری نے یہ بھی بتایا کہ دو ودھوا عورتیں مینار پر چڑھ گئی ہیں۔ دھرم شالا کے اندر سے ہی ایک تیسری عورت کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ بس چند منٹ میں وہ بھی مینار کے اوپر نظر آئے گی اور پھر تینوں عورتیں مینار سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیں گی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمران نے کہا۔ ''ہمیں ہورا کی اس رسم کے بارے میں پنڈت مہاراج نے ایک شاستر میں سے پڑھ کر بتایا تھا۔ کیا تمہارے پاس بھی کوئی ایسی شاستر یا پوتھی ہے؟''

''کیوں نا ہیں جی... دھرم شالا میں ایسی کئی پوتھیاں ہیں جن میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔''

''کیا تم کوئی ایسی پوتھی ہمیں دکھا سکتے ہو؟''

''بالکل دکھا سکتا ہوں جی... مگر ابھی سے بہت کم ہے۔ آپ پہلے ان ناریوں کا جیون بچانے کے لیے کچھ کریں۔''

''جیون ضرور بچے گا، تم گھبراؤ مت۔ تم فٹافٹ اندر سے کوئی پوتھی لے کر آؤ۔ جلدی کرو۔'' عمران نے پجاری کو تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ چارونا چار گاڑی سے اترا اور اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دھرم شالے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ دھرم شالے کے اردگرد ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ مینار پر چڑھی ہوئی عورتوں کا انداز مزید ہیجانی ہو گیا تھا۔

ادھیڑ عمر پنڈت فقط دو تین منٹ میں واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور کتاب کی ورق گردانی کرتا چلا آ رہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے گرم صافوں میں چھپائے اور کپتان اجے کے ساتھ گاڑی سے نکل آئے۔ ہم نے ادھیڑ عمر پجاری کو بھی ساتھ لے لیا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم مینار کے داخلی دروازے تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی ہندو اور مسلمان سپاہی موجود تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے۔

ہم نے طویل سیڑھیاں طے کیں اور مینار کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں سے زرگاں کی آبادی دور تک دکھائی دیتی تھی۔ قاسمیہ کا پرانا قلعہ، راج بھون کے چمکتے ہوئے گلس، لال بھون کی اونچی چھتیں، شہر کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی نہر اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

گہرے زرد لباس والی دونوں عورتیں ہمیں دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ ان دونوں کے سانولے چہروں پر عجیب سی جنونی کیفیت تھی۔ ''کک... کون ہو تم؟'' ایک عورت نے پوچھا۔

''میں اجے کمار ہوں، آپ دونوں کی مدد کے لیے مجھے بڑی ماتا نے کہا ہے۔'' اجے کمار آگے بڑھ کر بولا۔

''ہماری تیسری بہن کہاں ہے؟'' عورت نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔ تیسری بہن سے اس کی مراد اپنی تیسری ساتھی تھی۔

''وہ بس آ رہی ہے۔'' اجے نے مبہم جواب دیا۔

جب اجے کمار دونوں عورتوں سے مکالمہ کر رہا تھا، میں اور عمران پندرہ بیس سیڑھیاں نیچے اترے اور بڑی ماتا کو تلاش کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی حجرہ نما جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ مینار کے اندر ہی واقع تھی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں ستیش کی کھوسٹ دادی یعنی بڑی ماتا تین عورتوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تینوں عورتیں یہاں کی پجارنیں تھیں۔ ایک چوتھی عورت فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کے سانولے سلونے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے جا رہے تھے۔ اس فرش بوس عورت نے بھی اوپر والی عورتوں کی طرح گہرے زرد رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

ہمیں دیکھ کر بڑی ماتا اور اس کی ساتھی عورتیں بُری طرح ٹھٹکیں۔ ''کون ہو تم؟'' بڑی بی یعنی بڑی ماتا نے کڑک کر پوچھا۔

''ہمیں اوپر والے نے بھیجا ہے۔'' عمران بڑے اطمینان سے بولا۔ ''دراصل آپ دھرم کے لیے اتنا کچھ کر رہی ہیں کہ اوپر والے کو آپ پر پیار آ گیا ہے۔ وہ اب آپ کی ساری پرکھشائیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ سورگ کی ٹھنڈی ہوائیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''کیا بکتے ہو... کون ہو تم؟'' بڑھیا پھر کڑکی۔

''میں موت کے دیوتا کا اردلی ہوں۔ آپ کو سنسار کے دکھوں سے نجات دلانے آیا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں... مکتی دلانے آیا ہوں۔''

غیر معمولی پیرانہ سالی کے باوجود بڑھیا کی یادداشت غضب کی تھی۔ اس نے عمران کی آواز پہچان لی۔ ''کون ہو تم؟ میں کہتی ہوں یہ کپڑا ہٹاؤ اپنے منہ سے۔''

عمران نے کپڑا ہٹا دیا۔ میں نے بھی ہٹا دیا۔ بڑھیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تو تم یہاں بھی آ گئے ہو منحوس... موئے... مردود۔''

''بس آپ کا پیار کھینچ لایا ہے ہمیں۔ ہم آپ کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتے۔'' عمران نے اپنے لباس میں سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ تینوں عورتیں چلّا کر ایک کونے میں سمٹ گئیں۔

بڑھیا عمران کو مارنے دوڑی۔ عمران نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ وہ کسی بدروح کی طرح چلّانے لگی۔

اس کی ایک ساتھی عورت لرز کر بولی۔ ''بھگوان کی مار سے ڈرو۔ چھوڑ دو ان کو۔ تم کو کچھ پتا نا ہیں تم کیا کر رہے ہو۔''

''ہمیں پتا ہے، ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی پتا ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تم نے دو عورتوں کو





قربانی کی بکریاں بنا لیا ہے اور انہیں اوپر چڑھا دیا ہے۔ اب اس تیسری کو تیار کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ یہ بے چاری موت کے خوف سے بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ تم اسے ہوش میں لانا چاہ رہی ہو تا کہ اسے دھرم کا واسطہ دے کر آخری سفر پر روانہ فرما سکو۔''

بڑھیا خود کو چھڑانے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ مدد کے لیے پکار بھی رہی تھی۔ ہم اسے حجرے سے باہر لے آئے۔ باقی عورتوں کو اندر ہی رہنے دیا۔ حجرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ ہم شور مچاتی بڑھیا کو لے کر اوپر اس جگہ آ گئے جہاں بلی دینے والی دونوں بیوہ عورتیں موجود تھیں۔ ادھیڑ عمر پجاری اور اجے ان کو باتوں میں مصروف رکھے ہوئے تھے۔ بڑی ماتا کو ہمارے ساتھ دیکھ کر یہ دونوں عورتیں بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ بڑی ماتا عمران کو بددعائیں دے رہی تھی اور بدترین گالیوں سے نواز رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اس کا منہ نوچنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ عمران کی گردن سے خون رسنے لگا تھا۔ تاہم وہ یہ سب کچھ تحمل سے برداشت کر رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر عمران نے بڑھیا کی دونوں کلائیاں اجے کمار کے حوالے کر دیں تا کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے پھر اس نے پجاری سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''پجاری جی! تم ''ہورا'' کے بارے میں پوتھی کی تحریر پڑھ کر سناؤ۔''

پریشان حال پجاری نے تحریر پڑھی۔ یہ پوری تحریر کچھ اس طرح تھی۔ ''رسم کے مطابق تینتیس کالی بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے جسم منی میں دبا دیے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آ سکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ ہتھنیوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی اگر اجے (فتح) کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ اس میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ ان ناریوں کو دوشوا ہونا چاہیے اور ان کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں۔ یہ ناریاں اپنی مرضی سے اپنا جیون قربان کریں... تو یہ بھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔ اگر کسی کارن تیس سال کی تین دوشوا ناریاں نہ مل سکیں تو پھر مجبوری کی صورت میں تیس سال سے تین گنا عمر والی دوشوا ناری بھی یہ بلیدان دے سکتی ہے۔''

عمران نے اجے کمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجے! مجھے لگتا ہے کہ اس دھرمی تحریر میں یہ آخری فقرہ سب سے اہم ہے...''

میری طرح بات اجے کی سمجھ میں بھی آ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو عمران بھائی۔ اس طرف تو پہلے ہم میں سے کسی کا دھیان ہی نا ہیں گیا۔''

پھر اجے ادھیڑ عمر پجاری سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ کا کیا وچار ہے پجاری جی۔ اگر شرط کے مطابق تین ناریاں نہ مل سکیں تو پھر ایک ہی بڑی عمر کی ناری کی قربانی ہو سکت ہے؟''

گمبھیر صورتِ حال کی وجہ سے... پجاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تحریر کو پھر پڑھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنا مٹکا سا سر اثبات میں ہلایا... ''جی ہاں... ایسا ہو سکت ہے۔ شبدوں میں یہی کچھ لکھا ہے۔ میں نے پنڈت مہاراج سے بھی اس بارے میں سنا تھا۔''

پجاری کی بات سن کر زرد لباس والی دونوں عورتوں کے دھواں دھواں چہروں پر ہلکی سی چمک نظر آئی۔ بڑی ماتا کی صورت مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن جیسی ہو گئی۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ''اپنی بک بک بند کرو۔ منحوسو! چھوڑ دو مجھے...'' پھر وہ نیچے کھڑے سیکڑوں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے واویلا کرنے لگی لیکن اس کی آواز وضاحت سے نیچے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اگلے دو تین منٹ میں کپتان اجے، ادھیڑ عمر پجاری اور بڑی ماتا کے درمیان زوردار مکالمہ ہوا۔ پہلے اجے اور پھر پجاری نے بھی بڑی ماتا کو قائل کرنا چاہا کہ اگر وہ ہورا کی رسم ادا کرنا ہی چاہتی ہے اور اس کے لیے شبھ گھڑی بھی نکال چکی ہے تو پھر خود یہ قربانی دے، ے... کیونکہ شرائط کے مطابق تین عورتیں میسر نہیں ہیں۔ نہایت سنگین اور عبرت ناک ہونے کے باوجود یہ صورتِ حال کسی حد تک دلچسپ بھی تھی۔ بڑی ماتا اپنے جیون کی نوّے سے زیادہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ اس کی انتہا پسندی اور کٹر پن کی وجہ سے اب تک نہ جانے کتنے نوجوانوں کی جانیں گئی تھیں لیکن وہ اب بھی جینا چاہتی تھی۔ وہ ''ہورا'' کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور ہمارے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اجے نے ابھی تک اسے دونوں کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اب اجے کا چہرہ غصے سے سرخ دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑی ماتا کی ایک گندی گالی کے جواب میں وہ چیخ کر بولا۔ ''دھرم تمہاری مرضی کا نام نا ہیں ہے بڑھیا۔ دھرم کے پالن کے لیے اور ہندو جاتی کا نام اونچا کرنے کے لیے اگر یہ عورتیں قربانی دے سکت ہیں تو تم بھی دے سکت ہو۔ تم دوشوا ہو۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری عمر بھی تیس سے تین گنا یعنی نوے ورش سے اوپر ہے۔ پھر تم کیوں آگے نا ہیں آتی ہو؟ تم دوسروں کو سورگ کی خوش خبریاں سنادت ہو، اب جب سورگ کے لیے تمہاری اپنی ٹکٹ پکی ہورہی ہے تو تم بھاگ رہی ہو۔"

وہ بوپلے منہ سے اجے کو کوس رہی تھی۔ اسے گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے اجے کے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ ایک جگہ اچانک اجے کا پاؤں پھسلا۔ بڑی بی کی کلائیوں پر اس کی گرفت کمزور ہوئی۔ وہ ایک دم اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترنا چاہیں مگر اس کی اپنی ہی سفید ساڑی اس کے پاؤں میں الجھی۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اسے تھامتا، وہ دس پندرہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے گری۔ اس کا سر شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ میں سیڑھیوں کے پاس تھا۔ میں لپک کر اس تک پہنچا، اسے اٹھایا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ وہ شدید زخمی ہوچکی تھی۔

اسی دوران میں امرناتھ اور مالا بھی کچھ دیگر افراد کے ساتھ مینار پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بڑھیا کو حجرہ نما کمرے میں لٹا دیا۔ امرناتھ تو نیچے دوڑا تاکہ اس کے لیے طبی امداد لاسکے۔ اندازہ ہوا کہ بڑھیا آخری سانسیں لے رہی ہے۔ مالا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ پکارتی چلی گئی۔ "دادی جی... دادی جی۔" اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

دادی نے اپنی سفید سفید آنکھوں سے مالا کو دیکھا۔ ان لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں میں اپنی پوتی بہو کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دھرم شالا کا ایک سیوک گنگا جل لے آیا۔ مالا نے گنگا جل بڑی ماتا کے منہ میں ٹپکانا چاہا مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ وہ اپنا سر مالا کی گود سے نکالنا چاہ رہی تھی۔ یہی وہ کہنہ ہٹ دھرمی ہے جو ہزار ہا سال سے انسان کے اندر سفر کررہی ہے۔ یہ جب ایک بار دل میں جگہ بناتی ہے تو آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس ہٹ دھرمی کا سرچشمہ اکثر فرسودہ عقیدے ہی ہوتے ہیں۔

مالا سمجھ گئی کہ وہ اپنی دادی ساس کے آخری لمحات کو مزید اذیت ناک بنا رہی ہے۔ اس نے دادی ساس کا لہولہو سر چوما اور پھر یہ سر ایک خدمت گار عورت کی گود میں دے دیا۔ بڑی بی نے خدمت گار عورت کے ہاتھ سے گنگا جل پیا۔ کچھ دیر کھینچ کھینچ کر سانس لیتی رہی پھر بے ہوش ہوگئی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں چند منٹ بعد اس کی نبض رک گئی۔ وہ جا چکی تھی... جذبات میں آکر رسم کے لیے تیار ہو جانے والی دونوں بیوہ عورتیں اب اجے کمار کے سپاہیوں کی تحویل میں تھیں۔ انہیں حفاظت سے نیچے اتار لیا گیا۔

☆☆☆

دو تین روز کے اندر زرگاں میں حالات معمول پر آنے لگے۔ ہمارا یار غار اسد اب فتح پور سے زرگاں پہنچ چکا تھا۔ نوری بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسد نے بتایا تھا کہ تاؤ افضل اپنی بیٹیوں سمیت بالکل خیریت سے ہے۔ فتح پور کے نئے کھیا نے تاؤ افضل اور اس کی بیٹیوں کی حفاظت کی پوری ذمے داری لی تھی۔ اسد اور نوری کو سلطانہ کی موت کی اطلاع مندر میں ہی مل گئی تھی مگر انہیں ابھی تک اس کا یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ دیر تک روتے رہے۔ وہ اس بات پر بھی ششدر تھے کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا چوکیدار آفتاب ایک انتہا پسند گروہ کا حصہ تھا... اور وہ اپنی موت کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی بے وقت موت کا سبب بھی بنا تھا۔

اقبال نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ مجھے ایک پوٹلی تھمائی اور بولا۔ "اس میں سلطانہ بھابی کی چیزیں ہیں اور وہ زیور بھی جو وہ مندر کے تہ خانے میں چھوڑ آئی تھیں۔"

میں نے لرزتے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی۔ ایک تھیلی میں رکھے ہوئے وہ گہنے میری نگاہوں میں جگمگانے لگے جو اس کے جسم اور چہرے پر دمکا کرتے تھے۔ میں نے تھیلی بند کردی۔ کنگھی کی دیگر اشیا میں اس کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ تھوڑی سی نقدی جو ایک رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی شیشی جو میں نے اسے نل پانی میں دی تھی۔ کچھ تصویریں جن میں ایک بڑی تصویر ہمارے بالو کی تھی۔ بالو سے دور ہو کر اس نے نہ جانے کتنی بار اس تصویر کو چوما ہوگا، اس کے لیے روئی ہوگی۔ اس تصویر کی دید نے میری آنکھیں بھی نم کردیں۔

میں اسد کو لے کر ایک بار پھر سلطانہ کی قبر پر گیا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ اسے آنسوؤں کا خراج پیش کرتے رہے۔ وہ جو کچھ بھی تھی، جارج گورا اور حکم جیسے لوگوں کے جبر کا ردِعمل تھی۔ پھر وہ آفتاب اور ہاشم جیسے شدت پسندوں کے ہتھے چڑھ گئی اور نادانستہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

میں اور اسد قبرستان سے واپس آئے تو حسنات میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ پی کیپ والے اس لڑکے کو میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر لی وان کا بھتیجا تھا۔ عمران نے اس کی جان بڑے ڈرامائی انداز میں بچائی تھی۔ ہاشم اس لڑکے کو شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر بالکل آخری لمحات میں عمران نے ایک سچا نشانہ لگا کر





ہاشم کو شوٹ کردیا تھا۔

میں نے لی وان کے بھتیجے کو گلے سے لگایا۔ حسنات نے کہا۔ "جناب! یہ آج صبح مجھ سے ملا تھا۔ اس کے پاس آپ کے لیے ایک چیز تھی۔ اس نے مجھے دی اور کہا کہ آپ تک پہنچا دوں لیکن میں نے کہا کہ تم خود ہی پہنچاؤ تو بہتر ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔

اس نے واسکٹ کی جیب میں سے ایک تہ شدہ لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔ کسی آپ کی وائف نے دیا تھا۔"

"سلطانہ نے؟"

"جی ہاں۔"

"کب دیا تھا؟"

"جب ہم اسپتال میں بند تھے۔"

میں نے اس بارے میں لی وان کے بھتیجے سے تھوڑی سی تفصیل پوچھی۔ پتا چلا کہ اشرافیا گاؤں میں جب آفتاب اور ہاشم نے ہندو اور مسلمان مریضوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور حالات خراب سے خراب ہورہے تھے تو سلطانہ نے یہ رقعہ اس کو دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔

لی وان کے بھتیجے اور حسنات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کمرے میں آیا اور بلب کی روشنی میں یہ تحریر پڑھی۔ میری نم آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ آئے۔ سارے واقعات میری آنکھوں میں پھر تازہ ہوگئے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کے نسخہ جات والے پیڈ کا کاغذ تھا۔ اس کاغذ پر سلطانہ نے نیلی روشنائی سے لکھا تھا۔ "مہروج! امید بندھ کر پھر ٹوٹ گئی ہے۔ حالات خراب ہوگئے ہیں۔ ہاشم رازی اس بات پر بالکل تلا ہوا ہے کہ ہم ماریا کو یہاں آزاد نہیں کریں گے۔ وہ اسے نل پانی کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ ماریا کے وارثوں کو یہ بات قبول نہیں۔ اللہ جانے اب کیا ہوگا۔ ایک ایک کر کے لوگن مرنا شروع ہوجائیں گے اور پھر... شاید... میری باری بھی آجائے۔ مہروج! اگر ایسا ہوگیا تو تم میرے بالو کا بہت خیال رکھنا۔ اسے زندگی میں کوئی دکھ نہ ہونے دینا۔ اسے یہ بھی کبھی نہ بتانا کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا اور کیوں ہوا تھا۔

"اور ہاں مہروج! ایک بہت اہم ضروری بات بھی تم سے کرنی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت بہت اچھے ہو۔ تم نے ہمارا بہت بہت خیال رکھا ہے۔ لیکن تم محبت صرف اور صرف اس لڑکی سے کرتے ہو جو پاکستان میں تم سے بچھڑ گئی تھی۔ تم بھول گئے ہو لیکن میں ناہیں بھولی۔ جب تم اپنے ہوش میں ناہیں تھے، میں نے راتوں کے اندھیروں میں تمہیں اس لڑکی کے لیے سسکتے اور روتے دیکھا ہے۔ اس کے لیے تڑپتے دیکھا ہے۔ جیسے کوئی بے کل پرندہ اپنا پنجرہ توڑ کر نکلنا چاہتا ہو۔ تم بھی اس راجواڑے کا پنجرہ توڑ کر ثروت تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اور مجھے وشواس ہے، تم اب بھی چاہتے ہو گے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو مہروج۔ اور اگر تم کرتے ہو تو وہ کیوں نہ کرتی ہوئے گی۔ وہ جہاں بھی ہوئے گی، تمہاری راہ دیکھ رہی ہوئے گی۔ ضرور دیکھ رہی ہوئے گی۔ تم اسے ڈھونڈو مہروج۔ وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی، میں جہاں بھی ہوں گی ضرور خوش ہوں گی۔ اگر دنیا میں نہ ہوئی تو میری روح خوش ہوئے گی۔ پھر اگر ہوسکے تو میرے بالو کو اس کی گود میں دینا اور اسے میرے بارے میں بتانا... اور اس سے کہنا کہ دور اتر پردیش کے ایک راجواڑے میں اس کی ایک بہن تھی۔ وہ بن دیکھے اس سے بہت پیار کرتی تھی... تمہاری سلطانہ۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ نظر دھندلا گئی۔ میں دیر تک اس خط کے تاثر میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شام ہوگئی۔ عمران کی آواز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اٹھ جاؤ، کب تک ایسے بیٹھے رہو گے؟ دیکھو، تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ نل پانی میں دیوان کی ملازمہ صفیہ کھڑی تھی۔ اس کی گود میں ننھا بالو تھا۔ عمران نے بالو کو اپنی بانہوں میں لیا، اس کا منہ چوما اور پھر میرے حوالے کردیا۔ میں نے اس ننھی جان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے اندر جذب ہوگیا، میرے جسم کا حصہ بن گیا۔ مجھے اس کے بدن سے اس کی ماں کی مہک آئی۔ وہ اپنی گول مٹول مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

وہ معصوم اس جانکاہ حادثے سے بے خبر تھا جو اس پر گزر چکا تھا۔ اس کی قریب ترین ہستی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسے اب کبھی معلوم نہیں ہونا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور اس کا پیار کیا ہوتا ہے۔ وہ ہستی کیا ہوتی ہے جو کوکھ سے جنم دیتی ہے اور پھر زندگی کی ہر مشکل کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی بے خبری پر میرا دل خون ہوگیا۔

میں نے اسے بہت پیار کیا۔ پھر اسے صفیہ کے حوالے کر کے ضروری ہدایات دیں۔ صفیہ کے چہرے پر تھکن کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آثار تھے۔ وہ بالو کے ساتھ طویل سفر کر کے ابھی کچھ ہی دیر پہلے نل پانی سے یہاں پہنچی تھی۔

عمران نے مجھے بتایا۔ ''مراد شاہ صاحب کل زرگاں سے واپس نل پانی جا رہے ہیں مگر چھوٹے سرکار پانچ چھ مہینے یہیں گزاریں گے۔ وہ یہاں مختلف انتظامات کریں گے۔ اپنا نائب مقرر کریں گے اور بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کا عمل شروع ہوگا۔ انہوں نے برٹش باشندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں... ٹھیک تیس روز بعد جو غیر ملکی یہاں ہوگا، وہ گرفتار ہو جائے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ نکل جائیں گے؟''

''نکل جائیں گے نہیں... وہ لوگ نکل رہے ہیں۔ ان کا بس چلے تو اڑ کر یہاں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ اب یہاں ان کے اور ان کے بچوں کے سروں پر موت کی تلوار لٹک رہی ہے۔''

میڈم صفورا بہت پریشان تھی۔ وہ ابرار صدیقی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میڈم صفورا نے ہمیں صدیقی کے بارے میں جو آخری اطلاع دی تھی، وہ یہی تھی کہ صدیقی ایک قریبی پگوڈا میں خدمت گار کی حیثیت سے اپنی اسیری کے دن کاٹ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ صدیقی کی سزا کو معطل کرانے کی کوششیں بھی کرتی رہی تھی... اور اب جبکہ ہم سب کی سزائیں ختم ہو چکی تھیں اور سزائیں دینے والے خود سزاؤں کی زد میں تھے، مولانا صدیقی ناپید ہو چکے تھے۔ یہ بڑے افسوس کی بات تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید پانچ چھ روز تک جاری رہنے والے خونی فسادات کے دوران میں صدیقی کے ساتھ کچھ ہو گیا ہو یا پھر وہ خود ہی کہیں روپوش ہو۔ صدیقی اپنی طرز کا ایک عجیب کردار تھا۔ دین دار اور پارسا بھی۔ لالچی اور موقع پرست بھی۔ وہ نوادرات میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اسی دلچسپی کے سبب وہ بدھا کے مجسمے کی چوری میں ملوث ہوا اور میڈم صفورا کے ساتھ پاکستان سے یہاں لا پہنچا گیا۔

اگلے روز میڈم صفورا نے ایک اہم اطلاع دی۔ اس نے بتایا۔ ''پگوڈا کے ایک عمر رسیدہ بھکشو کا کہنا ہے کہ صدیقی چار پانچ روز پہلے زرگاں سے نکل چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک اسٹیٹ سے ہی نکل چکا ہو۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''پہلے تو نہیں تھا لیکن آج کل ہے۔ خاص طور سے جن دنوں زوردار لڑائی ہو رہی تھی، سرحدی پوسٹوں پر سارا سسٹم درہم برہم تھا۔ بہت سے لوگ جن پر مقدمے چل سکتے ہیں، ان چار پانچ دنوں میں اسٹیٹ سے نکلے ہیں۔ ان میں بر... افراد بھی ہیں۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔

''بہرحال، آپ اس بارے میں پوری تسلی کر لیں۔ ا... ہماری یہاں سے روانگی میں پانچ چھ روز باقی ہیں۔''

''پانچ چھ نہیں... آٹھ دس روز۔'' عمران نے فو... کہا۔ ''ابھی ہمیں یہاں ایک شادی میں شرکت کرنی ہے ا... کچھ دیگر ضروری کام نمٹانے ہیں۔''

''کس کی شادی؟''

''بھرت کمار اور چمپی کی۔ اس کے لیے مہورت نک... جا چکا ہے۔ اونچی ذات کے لڑکے اور اچھوت لڑکی کی شادی اس اسٹیٹ میں نئے رجحانوں کی بنیاد رکھے گی۔ ا... جاہلیت پر ایک بڑی کاری ضرب لگائے گی جس کے علمبر... خم اور بڑی ماتا جیسے لوگ ہیں۔''

''لیکن بھرت تو زخمی ہے شاید؟'' میڈم صفورا... کہا۔

''اس کی حالت اب بہتر ہے۔ وہ بستر پر اٹھ کر بی... سکتا ہے۔ سینئر ڈاکٹر نے کہا ہے، وہ تین چار روز تک ڈسچا... ہونے کے قابل ہوگا۔''

اجیت رائے عرف چھوٹے سرکار کے بارے میں ا... لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے ہیں، یا ہو... والے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں کوئی مصدقہ بات تو معلو... نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم اس بات میں تو شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ایک انصاف پسند اور روشن خیال شخص ہیں۔ جن دنوں میں سلطانہ کے ساتھ پہلی بار نل پانی گیا تھا، میں نے چھوٹے سرکار کے انصاف کا ایک یادگار منظر دیکھا تھا۔ ایک شاہی ہاتھی نے ایک غریب مزدور کو کچل دیا تھا۔ یہ ہاتھی چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کا تھا۔ چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کنور کو وہی سزا دی تھی جو کسی عام شخص کو دی جاتی۔ اسے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا اور جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی۔

یہاں زرگاں میں چھوٹے سرکار نے بھرت کمار اور چمپی کی شادی کو آفیشل شادی قرار دیا اور اس کی سادہ اور باوقار تقریب راج بھون میں ہوئی۔ گندی رنگت والی اچھوت لیکن دلکش چمپی دلہن بن کر کھشتری بھرت کمار کی حویلی میں پہنچ گئی۔ چھوٹے سرکار نے چمپی کے واج یعنی ... کا انتظام اپنی طرف سے کیا۔ اور یہ انتظام اتنا بیش قیمت ... کہ بھرت کمار کے پتا کے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ ... ساری عمر کے لیے اس کا اور اس کے پورے خاندان کا ...





... ہو چکا تھا... اور پھر چمپی کی ڈولی راج بھون سے اٹھی تھی۔ ... کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے معمولی بات سمجھنے والا آنے ... والے دنوں میں زبردست مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔

ابرار صدیقی کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا اور اب میڈم صفورا کے نزدیک ستراسّی فیصد امکان اس بات کا تھا کہ صدیقی خونی ہنگاموں اور لڑائی کے دوران میں یہاں سے نکل چکا ہے۔ اب ہم اپنا رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں بڑی خاموشی کے ساتھ زرگاں سے رخصت ہونا تھا۔ چھوٹے سرکار کے خصوصی حفاظتی دستے نے ہمیں اپنی نگرانی میں لینا تھا اور ایک طویل سفر کے بعد ہمیں اسٹیٹ کی حدود سے باہر نکالنا تھا۔ اسٹیٹ کی حدود سے آگے کا چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں کپتان اجے کے ساتھ کرنا تھا۔ کپتان اجے کی ذمے داری تھی کہ ہمیں الٰہ آباد میں ایک مقیم نامی شخص تک پہنچائے۔ یہ چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں اپنے رسک اور اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔ بے شک اس سفر میں ان راستوں کا شناور کپتان اجے ہمارے ساتھ تھا پھر بھی اس سفر کا بہ خیریت طے ہونے میں ہماری قسمت کو بھی دخل تھا۔ ہمیں مقامی طرز کے دیہاتی لباس فراہم کر دیے گئے تھے۔ یہ چرواہوں کے لباس تھے اور زنانہ مردانہ دونوں طرح کے تھے۔

وہ ایک سرد شب کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ زرگاں سو رہا تھا۔ اپنے سارے گلی کوچوں، ... ٹانوں اور جلوہ گاہوں سمیت۔ اس کے بارونق بازار خالی ... تھے۔ اس کے گھر غنودگی کے جھونکوں میں تھے... اور ... زرگاں کو اس حالت میں چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ یہاں ... روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ہمارا اپنا فیصلہ تھا کہ ہماری رخصتی ... ہی سے ہوگی۔ اگر یہ علی الاعلان ہوتی تو شاید ہزاروں ... ہمارے راستوں پر جمع ہو جاتے۔ ان میں سے بہت ... ایسے بھی ہوتے جن کے لیے ہماری واپسی حوصلہ شکن ... بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگ ہم دونوں اور خاص طور ... مجھے بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر ... عام کی یہ خواہش تھی کہ ہم یہاں سے روانہ نہ ہوں۔ کم ... چند ماہ تک تو کہیں نہ جائیں۔

لیکن ہمیں جانا تھا۔ یہاں ہمارا دانہ پانی پورا ہو چکا ... لیے راستے ہمیں پکار رہے تھے... اور ہم اس آخر ... دھند آلود سناٹے میں زرگاں کو الوداع کہہ رہے ... ... خاں، طلال... بھرت کمار... تیش... ... ... عنات اور مبارک وغیرہ نے ہمیں بڑی محبت اور بڑے دکھ بھرے انداز میں الوداع کہا۔ چھوٹے سرکار اور ان کے قریبی مصاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس موقع پر مجھے چھوٹے سرکار کی طرف سے ایک گراں قدر تحفہ بھی دیا گیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے میں نے جارج گورا کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ جب اٹھارا گاؤں سے ہمیں پانڈے وغیرہ نے گرفتار کیا تھا تو یہ چاقو میرے لباس سے نکال لیا گیا تھا۔

سب سے رخصت ہو کر ہم بند جیپ میں آ بیٹھے۔ ایک نم ناک سی فضا میں ہمارا قافلہ چل پڑا۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں تو ایک طرف سے طلال دوڑتا ہوا آیا اور گاڑی کی کھڑکی سے لپٹ گیا۔ میں نے دروازہ کھلوایا۔ وہ زار زار رو رہا تھا۔ ''مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ چلی گئیں، آپ بھی جا رہے ہیں۔ میرے لیے اب یہاں کچھ بھی نہیں۔''

میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اسے پیار سے سمجھایا۔ ''تم یہاں سے نہیں جا سکتے طلال۔ تم تو آنے والے کل کی امید ہو۔ تم نے یہاں ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ آنے والے وقت میں یہاں کچھ اور رنجیت پانڈے، جارج گورے اور حکم جی پروان چڑھ سکتے ہیں۔ تمہیں انہیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم کرنا ہے۔ تم یہیں رہو گے طلال۔''

پتا نہیں وہ میری باتیں سمجھا یا نہیں لیکن میرے تسلی بخش انداز نے اسے حوصلہ دیا...

عمران نے کہا۔ ''طلال! ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تم سے رابطہ رکھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ہم یہاں کے حالات سے باخبر رہیں گے... تم سے وعدہ ہے۔''

ہم طلال کو بمشکل سنبھالنے اور الوداع کہنے میں کامیاب ہوئے۔

... ہم کافی دور نکل گئے تو میں نے مڑ کر زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا۔ انہی روشنیوں میں کہیں وہ قبرستان تھا جہاں ایک بے مثال لڑکی اپنی تمام تر دلیری، شجاعت اور وفاداری کے ساتھ ابدی نیند سو رہی تھی۔

''خدا حافظ سلطانہ۔'' میں نے زیرِ لب کہا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اگلا دن ابر آلود تھا۔ ٹھٹھرا ہوا سورج چند منٹ کے لیے اپنی بیمار صورت دکھاتا اور پھر بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا۔ ہمارا سفر درمیانی رفتار سے جاری رہا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ حکم کے بچے کھچے سپاہی کہیں کہیں جو مزاحمت کر رہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے، وہ بھی کچلی جا چکی تھی۔ پھر بھی گھڑسوار سپاہیوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔

شام کو ہم نے گھنے سنسان جنگل میں پڑاؤ کیا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بلند و بالا درخت بھیگے ہوئے خاموش کھڑے تھے جیسے کسی بات پر شرمسار ہوں۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اچانک میں چونکا۔ یہ جگہ جانی پہچانی لگی۔ تھوڑا سا غور کیا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میں نے جارج گورا کی حراست سے فرار ہونے کے بعد دو نہایت مشکل راتیں گزاری تھیں۔ ہاں، یہ وہی جگہ تھی۔ یہ چھوٹی سی آبی گزرگاہ جو جنگل کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی جاتی تھی اور جس کے کنارے جنگلی جانوروں کے قدموں کے بہت سے نشان تھے۔

دفعتاً مجھے ایک اور بات یاد آئی اور میں پھر چونک گیا۔ عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ بولا۔ ''تم تو اس جگہ کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پچھلے جنم میں یہاں کسی ہندو ناری کے ساتھ لَو سین کرتے رہے ہو۔''

''ہندو ناری کے ساتھ تو نہیں مگر اپنی تنہائی کے ساتھ لَو سین کرتا رہا ہوں۔''

''یہ کیا بے ہودہ بات ہے۔'' ''تنہائی'' نے کوئی ساڑی تھوڑی پہن رکھی ہوتی ہے۔ نہ ہی تنہائی کے سر پر لمبے ریشمی بال ہوتے ہیں۔ نہ ہی پتلی کمر ہوتی ہے۔ لَو سین کے لیے ایسی دو چار چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے، جب میں جارج گورا کی رہائش گاہ سے فرار ہوا تھا تو انہی جھگیوں پر بھٹکتا رہا تھا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر کیا کیا تھا؟''

''وہی کیا ہوگا جو تمہارے آباؤ اجداد گاؤں کے کھیتوں میں کرتے رہے ہیں۔''

''یار! تم مذاق سمجھ رہے ہو... لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ اس وقت بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کبھی اس اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں سکوں گا۔ دوڑ دوڑ کر اور پھڑ پھڑا کر مر جاؤں گا لیکن مجھے آزادی نہیں ملے گی۔ اس وقت یہاں پانی کے کنارے بیٹھ کر میں نے ایک عجیب کام کیا۔ میں نے ایک خط لکھا اور اسے بوتل میں بند کر کے اس ندی میں بہا دیا۔ وہ بوتل میرے سامنے بہتے بہتے دور چلی گئی۔ دریا کی طرف۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکلتی چلی گئی ہو۔ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہو... اور دریاؤں کا آخری ٹھکانا تو سمندر ہی ہوتا ہے۔ کیا پتا کہ وہ سمندر تک پہنچی ہو۔ کسی کشتی راں یا کسی جہاز کے سواروں نے اسے دیکھا ہو۔ پانی سے نکالا ہو۔ میرا خط پڑھا ہو۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امریکا نے اپنا ساتواں بحری بیڑا تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا ہو۔ وہ اپنے پانیوں میں چلتا چلتا دریائے آمو میں پہنچا ہو اور پھر اگلے منگل تک یہاں اس جنگل میں پہنچ جائے۔ زبردست... کتنا مزہ آئے کہ یہ بیڑا یہاں آ کر ریت میں پھنس جائے۔ بیڑے کے سارے مرد فوجیوں کو تیندوے کھا جائیں یا ہاتھی کچل دیں۔ بس لڑکیاں بچ جائیں۔ ہو ہو ہو... ہر بندے کے حصے میں پانچ پانچ لڑکیاں اور وہ بھی امریکن۔ نیو ورلڈ آرڈر...''

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتا، ہمیں اجے کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ بوندا باندی سے بچنے کے لیے اس نے چھتری لے رکھی تھی۔ ایک اضافی چھتری وہ ہمارے لیے لا رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے یہ چھتری مجھے تھما دی۔

''کیا کہیں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جانا تو نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو جا بھی سکتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور ایک جنگل باسی کی جھونپڑی ہے۔ ایک عمر رسیدہ مسلمان بزرگ ہے، اپنے دو مریدوں کے ساتھ عرصے سے یہیں رہوت ہے۔ مسافر محفوظ سفر کے لیے اس سے دعائیں کرواتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی کروا سکتے ہیں۔''

''اگر زیادہ دور نہیں تو چلتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے شام کا اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ ہم رم جھم میں ندی کے ساتھ چلتے رہے۔ اجے کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس جھٹپٹے میں اس طرح چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد ہم گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر ایک نسبتاً اونچی جگہ پر واقع ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جھونپڑی تین درختوں کے تنوں کے اوپر زمین سے قریباً دس فٹ کی بلندی پر تیار کی گئی تھی۔ اوپر چڑھنے کے لیے بانس کی سیڑھی موجود تھی۔ اندر مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ سیڑھی کے قریب ایک نوجوان باریش شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے دستے والی کلہاڑی تھی... ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس نے ہم سے دو چار سوال کیے۔ وہ اس بات پر کچھ حیران بھی تھا کہ اس ابر آلود شام میں ہم لیچپز زدہ راستے پر چلتے ہوئے اس جگہ آ پہنچے ہیں۔ وہ سیڑھی چڑھ کر اوپر گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے ہمیں بھی اوپر بلا لیا۔

بزرگ کی عمر اسّی پچاسی برس رہی ہوگی۔ لمبی سفید داڑھی، بھاری پلکیں... وہ ایک بوسیدہ کمبل لیے بیٹھے تھے۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نیکوکار اور ہر وقت عبادت و ریاضت میں گم رہنے والے شخص ہیں۔ اجے کے بقول یہ بات مشہور تھی کہ ان کی دعا سے سفر کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور بھٹکے ہوئے راہیوں کو راستے ملتے ہیں۔

ہم نے بھی ان سے اپنے لیے دعا کرائی... انہوں نے گڑ اور سوکھی کھجوروں سے ہماری تواضع کی۔ جب ہم اٹھنے والے تھے، اچانک میری نظر ایک چیز پر پڑی اور میں حیران رہ گیا... میں نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ کچھ دیگر اشیا کے ساتھ وہ شیشے کی بوتل بھی ایک کونے میں پڑی تھی جسے کچھ عرصہ پہلے میں نے چلتے پانی میں بہایا تھا... ہاں، یہ وہی بوتل تھی... سو فیصد وہی تھی۔ میں نے اسے کسی دور دراز کے سفر کے لیے ندی میں بہایا تھا مگر... وہ دور دراز کے سفر پر نہیں گئی تھی۔ یہ تو بس ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا سفر طے کر کے اس جھونپڑی کے گوشے میں پڑی تھی۔

میں حیران رہ گیا۔ بوتل کے اندر وہ مڑا تڑا کرنسی نوٹ بھی اسی طرح موجود تھا جو میں نے اس میں ڈالا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بیٹا جی!'' عمر رسیدہ شخص نے میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ... یہ بوتل... آپ کو کہاں سے ملی؟''

عمر رسیدہ شخص نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولے سے بولے۔ ''سامنے والی ندی سے... گھاس میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں وضو کر رہا تھا۔ میری نظر پڑ گئی۔ میں نے نکال لی۔''

میں نے بزرگ کی اجازت سے بوتل اٹھائی۔ اس میں دو انگلیاں ڈال کر اپنا لکھا ہوا خط نکالا۔ بزرگ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''مجھ کو لگتا ہے کہ تم یہ بوتل پہچانتے ہو... کہیں... تم نے ہی تو اسے پانی میں تا ہیں بہایا تھا...''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ یہ چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ ندی کنارے اداس بیٹھا تھا۔ کنارے پر اٹکی ہوئی اس بوتل پر نظر پڑ گئی۔ یونہی وقت گزاری کے لیے میں نے نوٹ پر یہ رقعہ لکھ کر اس میں ڈال دیا اور پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں کی یہیں رہے گی...''

بزرگ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''دیکھو، کتنا عجیب اتفاق ہے۔ تم نے اس بوتل کو جہاں پھینکا تھا، یہ وہی سے تم کو مل گئی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ کہیں نہیں گئی لیکن اس نے کہیں نہ جا کر بھی بہت لمبا سفر کیا ہے اور اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ کیا یہ بڑی بات نا ہیں ہے؟''

''میں سمجھا نہیں بزرگوار۔''

وہ بولے۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ ہزاروں میل کا سفر کر کے بھی کسی کی نظر میں نہ آ سکتی... کسی کی توجہ کا مرکز نہ بنتی۔ لیکن یہ ایک بالکل چھوٹا سا سفر کر کے مجھ تک آ گئی۔ میں نے تمہاری تحریر پڑھی... تمہارے درد کو محسوس کیا۔ میرے ناچیز ذہن میں تمہارے لیے فکر جاگی۔ میں نے تمہارے لیے اپنے رب کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ وہ غفور الرحیم ہے... سنتا ہے۔ مجھ جیسا حقیر بندہ بھی جب ''دل'' سے کچھ مانگتا ہے تو وہ عطا کرتا ہے۔''

میں گم صم کھڑا تھا، عمران اور اجے بھی خاموش تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں بزرگ کا سرخ و سپید چہرہ کسی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں بزرگوار... وہ عطا کرتا ہے۔ ہم نے پچھلے چند ہفتوں میں اس کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ ہم سخت مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہمیں آگے بھی کچھ سخت مرحلے درپیش ہیں۔ ہمیں آپ کی مزید دعاؤں کی ضرورت ہے جناب۔ آپ ہمارے لیے خصوصی دعا فرمایئے...''

بزرگ کے پاس گزرے ایک دو گھنٹوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس درویش صفت شخص سے رخصت ہو کر واپس اپنے پڑاؤ میں پہنچ چکے تھے۔ وہ بوتل اب میرے پاس تھی۔ اس کے اندر رکھا جانے والا رقعہ میری جیب میں تھا۔ عمران نے کہا۔ ''بھئی واہ... آج تک تو ہم نے ایسی بوتلوں کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ لمبے سفر کر کے دور دیس کے نامعلوم لوگوں تک پہنچتی ہیں اور پھر ان میں موجود خطوں سے کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ پہلی بوتل ہے جو کہیں گئی بھی نہیں اور پھر بھی اپنا کام دکھا گئی ہے... پڑھ کر تو سناؤ اس میں لکھا کیا تھا تم نے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ بس دو تین فقرے تھے۔'' میں نے کہا اور مڑا تڑا کاغذ نکال کر عمران کے سامنے پڑھا۔ اس کاغذ یعنی کرنسی نوٹ کے کنارے پر میں نے شاخ کے قلم اور اپنے زخم کے خون سے لکھا تھا۔ ''میرے پیارو! میں زندہ ہوں۔ میرا انتظار کرنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا... تابش۔''

نوٹ پر تین نام یعنی فرح، عاطف اور ثروت بھی لکھے تھے۔ ہم دیر تک اس نوٹ اور اس کی تحریر پر تبصرہ کرتے رہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنوں سے ملنے کا سپنا آنکھوں میں اجاگر ہو گیا۔

... بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنا ایک سپنے جیسا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کسی بہت بڑی جیل سے اچانک آزاد فضاؤں میں پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تقریباً پچاس کلومیٹر کا سفر چرواہوں کے بھیس میں طے کرنا تھا۔ ہم ایسے چرواہے تھے جنہیں بھیڑ بکریاں چرانے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ فی الوقت بھی ہمارے پاس بھیڑ بکری نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہم نے چرواہوں کے لباس پہن لیے۔ سروں پر پگڑ بھی رکھ لیے۔ مسلسل سفر نے حلیے پہلے ہی خراب کر رکھے تھے۔ مزید خرابی کے لیے بالوں میں دھول ڈالی گئی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا گیا۔ مردوں نے کانوں میں بالیاں ڈالیں۔ میڈم صفورا، نوری اور صفیہ نے کنگن پہنے۔ میڈم صفورا کا حلیہ دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ پینٹ شرٹ اور بوائے کٹ بالوں والی ایک اسٹائلش عورت تھی۔ چرواہی کے بھیس میں اسے چولی اور گھاگرا پہننا پڑا۔ اپنا منہ سر، بھاری اوڑھنی میں چھپانا پڑا۔ اسے دیکھ کر عمران کی ہنسی چھوٹی تو اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ وہ منہ پھیر کر ہنستا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میڈم جانتی تھی مگر خاموش رہی۔ اسے اب عمران کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ عمران اپنی طرز کا انوکھا بندہ ہے۔ وہ عمران کا احسان بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ عمران نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک نہایت زہریلے سانپ کا زہر میڈم کے بدن سے چوسا تھا۔ وہ سنگین واقعہ ہم سب کی یادداشت میں درج تھا۔

ہمارے لیے بھیڑ بکریوں کا انتظام اسٹیٹ کی حدود ختم ہونے سے دو تین میٹر پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ریوڑ تھا۔ اس میں ایک اصلی چرواہا اور چرواہی بھی موجود تھے۔ ہمارے لباسوں کے اندر اسلحہ چھپا ہوا تھا۔ کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میرے اور عمران کے علاوہ اسد نے بھی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ ریوڑ میں ایک خچر بھی موجود تھا۔ اس پر کاٹھ کباڑ لدا ہوا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ میں وہ شاندار دوربار الفل بھی موجود تھی جس سے عمران نے پچھلے دنوں میں چند یادگار نشانے لیے تھے۔

بہرحال، ہمارا یہ سفر خیریت سے گزرا۔ راستے میں دو تین جگہ ہمارا گزر چیک پوسٹوں کے قریب سے ہوا۔ ایک جگہ ہمیں روکا بھی گیا۔ صفورا، نوری اور صفیہ لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھیں۔ ہماری صورتوں پر شک کیا جا سکتا تھا مگر ہماری جگہ اصلی چرواہے نے ہی بی ایس ایف کے اہلکاروں سے بات کی اور ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے لیے ہمیں بی ایس ایف کے اہلکاروں کو معمولی رشوت بھی دینا پڑی۔ یعنی بکریوں کا چار پانچ کلو دودھ اور ایک چھوٹا سا مینا۔

کپتان اجے کمار ہمارا بہترین راہنما اور مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بھی مقامی چرواہے کے بھیس میں تھا، تاہم ہمارے خیریت کے اس سفر میں اس کی راہنمائی کے علاوہ چھوٹے سرکار کے انتظامات کو بھی عمل دخل تھا۔ ہم جہاں پہنچتے تھے، ہمارے پروگرام کے مطابق ہمارے لیے اسباب پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ الٰہ آباد سے تقریباً تیس کلومیٹر دور ماچھی گڑھ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک مسلمان زمیندار کے گھر میں ہماری شب بسری کا انتظام کیا گیا تھا۔ ماچھی گڑھ میں ہم چرواہوں کے بھیس سے دوبارہ عام لوگوں کے بھیس میں آ گئے۔ اصلی چرواہا اور چرواہی اپنی بھیڑ بکریوں سمیت ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ دونوں بڑے سادہ اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا سفر بڑا اچھا گزرا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ دونوں سگے بہن بھائی تھے۔ بہن ایک سال بڑی تھی۔ بھائی چھوٹا تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ بہن کی نسبت ہمیں بھائی کسی حد تک افسردہ نظر آیا تھا۔ بہن اسے ہنسانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس نوجوان چرواہے کی بیوی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد اپنے نومولود بچے سمیت پانی کے ایک گڑھے میں گرنے سے مر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بچے سے بہت پیار کرتا تھا۔ ان کی موت نے اسے نیم دیوانہ کر دیا تھا مگر اب وہ بتدریج سنبھل رہا تھا۔

میرے سینے میں بھی تو ایک ایسا ہی غم انگاروں کی طرح دہکتا رہتا تھا۔ میری سلطانہ بھی تو مجھے چھوڑ گئی تھی لیکن مجھے اس چرواہے کا غم اپنے غم سے بڑا لگا... شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ تا نک دکھیا سب سنسار۔

ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہمیں الٰہ آباد کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ عجیب اور ناقابلِ یقین۔ مجھے ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ عمران میں کچھ خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ رات کوئی ایک ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا۔ میں اور عمران حویلی کے ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ مجھے گاؤں کی کسی قریبی گلی میں کتے کی آواز سنائی دی۔ یہ بھاری آواز مسلسل تاریکی کی لہروں پر ڈوب ابھر رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ عمران اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔ میں نے لالٹین کی لَو اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اسی دوران میں گلی میں سے ایک بار پھر کتے کی گونجتی ہوئی آواز ابھری۔ مجھے اپنے جسم میں پھریری سی


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس ہوئی... مجھے لگا میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہوئی ہے۔ یہ وہی آواز تھی۔ یہ وہی جسیم کتا تھا جسے ہم نے اٹھرا گاؤں کے کھنڈرے ہوئے کھیت میں دیکھا تھا۔ میں چپل پہن کر تیزی سے برآمدے میں آیا۔ وسیع صحن کے آخری سرے پر حویلی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر ارد گرد کوئی موجود نہیں تھا۔ میں دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔ یخ بستہ ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے عمران نظر آگیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ ایک سایہ سا اس کے پاؤں میں حرکت کر رہا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وہی کتا تھا۔ وہ عمران کے پاؤں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ الٹا سیدھا ہو رہا تھا۔ اس کی دم بے ساختہ تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ عمران اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اور گردن کے بال سہلا رہا تھا۔

میں چند قدم آگے آیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کتا اٹھرا گاؤں سے قریباً ایک سو بیس کلو میٹر دور یہاں تک ہمارے پیچھے آیا ہے... اچانک عمران کو احساس ہو گیا کہ میں اس سے کچھ فاصلے پر یہاں گلی میں موجود ہوں۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔

''عمران! یہ وہی کتا ہے؟'' میری آواز حیرت سے لرز رہی تھی۔

''ہاں، یہ وہی ہے۔ مجھے کل رات بھی شک ہوا تھا کہ یہ ہمارے خیمے کے آس پاس موجود ہے۔ شاید یہ مسلسل ہمارا پیچھا کرتا رہا ہے۔''

''یار! یہ بڑی حیران کن بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اور پھر اپنے ہاتھوں میں ''اینیمل ماسٹری'' بھی تو ہے۔ یہ تو تم ہی ناقدرے ہو جو گھاس نہیں ڈالتے ہو۔ جگر! اتنا پیار کسی پتھر سے بھی کرو ناتو وہ سچ مچ میرے پیچھے آنا شروع ہو جائے۔'' وہ اداسے مسکرایا۔

میں الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ..... ان لمحوں میں اس کی آنکھوں کے شیشے میں واقعی ایسا کچھ نظر آیا جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔ کچھ دیر تک اس جسیم کتے کو بہلانے اور پچکارنے کے بعد اس نے اسے واپس بھیج دیا۔ اور وہ واقعی یوں واپس چل پڑا جیسے اس سے وداع ہو کر جا رہا ہو۔ کچھ دیر تک اس کا متحرک ہیولا ماچھی گڑھ کی تاریکی میں نظر آتا رہا پھر اوجھل ہو گیا۔ ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہم شہر رنگ و بیوالہ آباد میں داخل ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں ایک طویل عرصہ کسی الگ تھلگ جزیرے پر گزارنے کے بعد ایک جیتی جاگتی، ہنستی بستی دنیا میں واپس آگیا ہوں۔

بڑے شہروں کے جانے پہچانے مناظر نگاہوں کے سامنے آئے۔ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک، انسانوں کا ہجوم، بارونق بازار، ٹی وی، سینما ہاؤس، چائے خانے، ریسٹورنٹ، پارک، تفریح گاہیں۔ میں ہر منظر کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے لیے ایک عجوبہ تھا۔ ہمیں ایک فور اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارا اندراج فرضی ناموں سے تھا۔ شام کے وقت ہم بالائی منزل کی لابی میں بیٹھے نیچے سڑک پر رواں دواں زندگی کا نظارہ کرنے لگے۔ میڈم صفورا، اسد اور اجے بھی وہیں تھے۔

عمران نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی الو کو اندھیری جگہ سے نکال کر اچانک روشنی میں بٹھا دیا گیا ہو۔ نالائق شخص، ایسے ہر چیز کو ندیدوں کی طرح دیکھو گے تو مشکوک قرار پاؤ گے۔ خاص طور سے لڑکیوں کو دیکھنا تو بالکل ترک کر دو۔ تمہاری جگہ یہ کام میں کیے دیتا ہوں۔ میں یہ کام نسبتاً اچھے طریقے سے کرلوں گا۔''

اس نے جیب سے ہلکے رنگ والے سن گلاسز نکالے اور لگا لیے۔ سن گلاسز اسے ہمیشہ اچھے لگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''جیمز بانڈ لگ رہا ہوں یا نہیں؟''

''جیمز بانڈ تو نہیں، انعامی بانڈ لگ رہے ہو۔ اور وہ بھی ایسا جو پانچ سو قرعہ اندازیوں میں شامل ہونے کے بعد بھی نہ نکلا ہو۔''

''تم میری توہین کر رہے ہو اور یہ بھول رہے ہو کہ جس طرح ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے... بلکہ میں پورے کا پورا تمہارے پیچھے ہوں۔''

اسد بولا۔ ''یعنی... تمہارا مطلب ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک عورت کا ہاتھ ہی ہو۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر اس بندے میں تھوڑی سی بھی احسان شناسی ہوتی تو اپنے گلے میں ڈھول ڈالتا اور میرے آگے آگے ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے چلتا۔ اے الہ آباد کے رہنے والو! استقبال کرو میرے محسن کا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے تابی کو تابی بنایا۔ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور اتنا سکھایا اتنا سکھایا کہ ایک دن وہ جارج گورا جیسے شخص سے متھا لگانے اور اسے مار گرانے کے قابل ہوا۔ اور ایک جارج گورا ہی نہیں، اس نے تابی کو ہر ہر موڑ پر جارج گوروں اور سیٹھ سراجوں اور میڈم صفوروں سے لڑنا سکھایا ہے۔''

''میڈم صفوروں'' کا لفظ اس نے ہولے سے بولا تھا





ہے۔''

''کیا دیکھا ہے؟''

''وہی جو تم چھپا رہے ہو۔ کالی جیکٹ والا وہ بندہ جو تمہیں دیکھ کر اچانک سیڑھیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد سے تمہارا چہکنا بالکل بند ہے۔''

''بولوں تب مصیبت، نہ بولوں تب مصیبت۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اب خاموش رہنا چاہیے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں لینا چاہیے۔''

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''وہ بہت خطرناک بندہ ہے یار۔''

''تم سے بھی خطرناک؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے تیرے جیسے اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ وہ بہت ہی زیادہ گڑبڑ بندہ ہے... اور میرا خیال ہے کہ وہ اب کسی بھی وقت یہاں ہمارے کمرے میں پہنچنے والا ہے۔''

''یہاں پہنچنے والا ہے؟ کیا کرے گا وہ یہاں آکر؟''

''یہ تو پتا نہیں لیکن... جو ہوگا بہت بُرا ہوگا۔''

''مگر یہ ہے کون؟'' میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

''سفید کپڑوں میں ایک پولیس والا۔ سجاد موہل نام ہے اس کا۔ بظاہر یہ تمہیں عام سا شخص لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں۔''

''یہ تمہیں پہلے سے کیسے جانتا ہے... تم تو شاید پہلی بار انڈیا آئے ہو؟''

''تمہارے ساتھ پہلی بار آیا ہوں۔ اس سے پہلے اپنے سرکس کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ روسی فن کار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے بمبئی کے علاوہ اور کئی شہروں میں بھی جھنڈے گاڑے تھے۔''

''سرکس میں کام کرنا کوئی جرم ہے جو تم اس الہ آبادی پولیس والے سے ڈر رہے ہو؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی سہی۔ ابھی ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ اٹھا اور تکیے کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر چیک کرنے لگا۔ چیک کرنے کے بعد اس نے پستول دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یار! ہمارے لیے خطرناک قسم کے پولیس والے ہی رہ گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے پانڈے سے پھر بھی میڈم کو بھنک پڑ گئی۔ وہ کافی پیتے پیتے چونک کر بولی۔

''تم نے میرے بارے میں کیا کہا؟''

''کچھ بھی نہیں میڈم۔'' وہ صاف مکر گیا۔

''میں نے خود سنا ہے۔ تم نے میڈم کہا ہے۔''

''نن... نہیں... میں تو میڈم نور جہاں کی بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ تابی اور میڈم نور جہاں کی لڑائی ہو گئی تھی نا... تو میں نے صلح کرائی تھی۔ یہ بھی بڑا عجیب واقعہ ہوا تھا۔'' وہ تالی بجا کر بولا۔ ''میڈم نور جہاں... فلسٹار ریما کو بیٹیوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی شریف، خوش شکل اور ملنسار بندے سے شادی کر کے اپنا گھر بسائے۔ فلم لائن میں تو انہیں ایک بھی ایسا بندہ نظر نہیں آتا تھا۔ آجا کے ان کی نظرِ کرم مجھ پر ہی جاتی تھی۔ وہ ہم دونوں کو قریب لانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یا تو میں سرکس چھوڑ کر فلموں میں اداکاری شروع کر دوں یا پھر ریما جی فلمیں چھوڑ کر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلایا کریں۔ ایک روز اس سلسلے میں انہوں نے بات کرنے کے لیے مجھے بلایا۔ تابی بھی ساتھ تھا... تابی نے غلطی سے میڈم کے سامنے ڈکار ماردی۔ بس انہیں غصہ آگیا۔ انہوں نے گرج کر کہا، وے توں ڈکار مار کے مینوں دس رہیا ایں کہ توں گھروں رج کے آیا ایں۔ یعنی تم ڈکار مار کر مجھے بتا رہے ہو کہ گھر سے کھا پی کر آئے ہو۔ تابی نے بہتیرا کہا کہ غلطی سے ڈکار نکل گئی ہے مگر وہ واقعی غصے میں تھیں۔ وہ تو ہمارے لیے لمبے چوڑے لنچ کا انتظام کر رہی تھیں... وہ بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں... لیکن جب...''

اچانک عمران چپ ہو گیا۔ اس کی نظر سامنے ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ میں اب اس کا رمز شناس ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب میں نے ایک شخص کو تیزی سے ایک دروازے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ عمران کے اندر جیسے اچانک ہی کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ اس کے بعد وہ چائے تو پیتا رہا اور باتوں میں بھی حصہ لیتا رہا مگر اس کی چہکار ختم ہو چکی تھی۔ محفل برخاست ہوئی تو ہم اپنے اپنے کمرے میں آگئے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں تھے۔ میں نے عمران کو پہلے اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے... کچھ بتاؤ گے نہیں؟'' میں نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تمہارے ساتھ رہنے کے بعد اب میری نظر بھی کافی تیز ہو گئی ہے۔ میں نے لابی میں چائے پیتے ہوئے کچھ دیکھا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان چھوٹی ہے تو اب تم اس نئی آفت کا ذکر فرما رہے ہو۔''

''اسی کو کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ابھی اسٹیٹ سے باہر تشریف لائے دو ہی دن ہوئے ہیں اور اس ناہنجار سے ملاقات ہوگئی ہے...''

اچانک ہمارے بائیں جانب والی کھڑکی ایک دھماکے سے کھلی۔ کسی نے اسے باہر سے ٹانگ رسید کی تھی۔ ایک نوجوان کود کر اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں وہی سیاہ جیکٹ والا شخص تھا۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس سال رہی ہوگی۔ کھچڑی بال مہدی میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ صورت سے ہی کرخت مزاج اور غصیلا نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ تاہم یہ پستول اس کی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب کے اندر ہی تھا۔ وہ بے پناہ اعتماد سے کھڑکی سے باہر ہی کھڑا رہا۔ اس کے ساتھی نوجوان نے مقامی لب و لہجے میں دھمکایا۔ ''خبردار! ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ یو آر انڈر ارریسٹ۔''

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں جھپٹ کر اس نوجوان پر حملہ کر سکتا ہوں۔ دوسری طرف عمران کھڑکی کے پاس تھا۔ وہ جست لگا کر کالی جیکٹ والے کو دبوچ سکتا تھا لیکن جب میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں لکھا ہوا پیغام صاف نظر آیا۔ وہ مجھے حملہ کرنے سے روک رہا تھا اور خود بھی ہرگز حملے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجے... ''بظاہر یہ تمہیں عام سا بندہ لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں...''

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ درحقیقت میرے اور عمران کے درمیان ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اس بارے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بہت رمز شناس ہو گئے تھے۔ میں واضح طور پر محسوس کر چکا تھا کہ عمران مجھے ری ایکٹ کرنے سے روک رہا ہے اور خود بھی ری ایکٹ کرنے کا رسک نہیں لے رہا۔

پستول بردار نوجوان جو بعد ازاں خود بھی پولیس والا نکلا، دروازے کی طرف گیا اور اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ جیکٹ والا اندر آ گیا۔ ہمارا کمرا طویل کوریڈور کے آخری سرے پر تھا۔ اتفاقاً اردگرد کے چند کمرے خالی تھے۔ باقی کمروں کے دروازے بند تھے۔ یہاں ہونے والی کارروائی کا پتا کسی کو نہیں چلا۔ جیکٹ والے نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''مجھے وشواس نہیں تھا کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ پاؤں گا... اور وہ بھی پھر اسی شہر میں۔''

عمران بولا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں قانونی طور پر انڈیا آیا ہوں۔ میرے پاس کاغذات ہیں۔''

''تم قانونی طور پر انڈیا آئے ہو گے لیکن یہاں سے بھاگے تو قانونی طور پر نہیں تھے۔ تمہاری پوری فائل ہے میرے پاس۔ اور اب اسی فائل کے آخری صفحے پورے کرنے کا سمے آ گیا ہے۔''

''لیکن میری بات سنو...''

''باقی ساری باتیں تھانے میں چل کر ہوں گی۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ وہ وردی میں نہیں تھا، اس لیے مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس رینک کا افسر ہے۔

''مگر آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ...''

''تم ہمیں بھاشن مت دو اور نہ ہی قانون سکھاؤ۔ بس چپ چاپ چلو ہمارے ساتھ۔ اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔''

عمران مجھے دبا دبا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی گیفیت مجھے بھی کمزور کر رہی تھی۔ ورنہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں ان دونوں سادہ پوش پولیس والوں پر قابو پانا اتنا دشوار نہیں ہوگا۔

میں نے ایک بار پھر عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا کہ ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو یہ سجاد نامی شخص کہہ رہا ہے۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ تقریباً پانچ فٹ دس انچ قد والا ایک عام سے جسم والا، عام سا شخص ہمیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جا رہا تھا اور عمران اس کی بات ماننے میں ہی عافیت سمجھ رہا تھا۔

ہم آگے پیچھے کمرے سے نکلے اور قالین پوش کوریڈور میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ کچھ آگے جا کر عمران نے سجاد سے کہا۔ ''اگر یہ معاملہ ہمارے درمیان طے ہو سکتا ہے تو...''

''ہمارے درمیان کچھ طے نہیں ہو سکتا... تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور اگر تم نے یہ بات دوبارہ کی تو میں لوگوں کی پروا کیے بغیر تمہارے منہ پر تھپڑ جڑ دوں گا۔ بس چپ چاپ چلتے رہو۔'' سجاد نے کہا۔

اس کا رویہ میرے ذہن میں چنگاریاں سی چکا رہا تھا۔ ہم مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ایک انتہائی سنگین دور سے گزر کر آئے تھے۔ زرگاں کی وہ خون آشام رات ابھی کل کی بات تھی جب پرانے قلعے کے سامنے نل پانی اور حکم کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا تھا... بارود کی بارش ہوئی تھی۔ لاشوں کا فرش بچھا تھا۔ ہم بھی اس میدانِ جنگ کا حصہ تھے اور سرخرو ہو کر نکلے تھے... اور آج الٰہ آباد کا یہ میرے جسم والا پولیس اہلکار صرف اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ہمیں ہانک کر لے جا رہا تھا۔ عمران ساتھ نہ ہوتا تو میں ہرگز اس صورتِ حال کو قبول نہ کرتا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ تک ہم اس طرح آئے کہ سجاد اپنا ہاتھ کالی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب میں ڈالے ہمارے عین پیچھے چل رہا تھا جبکہ اس کے نوجوان ساتھی نے ارد گرد کی پروا کیے بغیر پستول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اکّا دکّا راہ گیروں نے اس کے پستول کو دیکھا اور ان کے چہروں پر خوف و ہراس بھی نمودار ہوا تاہم کسی نے بھی اس صورتِ حال میں کسی طرح کی مداخلت کی ہمت نہیں کی۔

پارکنگ میں سفید رنگ کی ایک پرائیویٹ کار موجود تھی۔ کار میں ایک ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔ ''تم آگے بیٹھو۔'' سجاد نے تحکم سے عمران کو مخاطب کیا۔

عمران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ مجھے پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ سجاد اور اس کا نوجوان ساتھی میری دونوں جانب بیٹھ گئے۔ نوجوان نے اپنا سرکاری پستول باقاعدہ میرے پہلو سے لگایا ہوا تھا۔ یہ لوگ ذرا سی رعایت دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اچانک ایک اور کارروائی ہوئی۔ میری بائیں طرف بیٹھے سخت گیر نوجوان نے ایک آہنی کڑا میری پنڈلی کے نچلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ایک زنجیر بھی تھی۔ ایسے کڑے عام طور پر تھانوں میں پولیس والوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

گاڑی میں پہنچنے کے بعد ان پولیس اہلکاروں نے آپس میں جو بات چیت کی، اس سے پتا چلا کہ کالی جیکٹ والا سجاد ڈی ایس پی ہے۔ نوجوان جس نے پستول میرے پہلو سے لگا رکھا تھا، سب انسپکٹر تھا اور یہ ڈی ایس پی سجاد کا قریبی عزیز بھی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دراز قد ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔

گاڑی روانہ ہوئی اور الٰہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزرنے لگی۔ رات ہو چکی تھی۔ بازار جگمگا رہے تھے۔ ٹریفک رواں دواں تھا۔ راستے میں عمران نے ایک بار پھر ڈی ایس پی سجاد سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے سخت لہجے میں اسے خاموش کر دیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم جس جگہ پہنچے، وہ پولیس اسٹیشن نہیں تھی بلکہ رہائشی علاقے میں درختوں سے گھری ہوئی ایک کوٹھی تھی۔





مجھے معلوم تھا کہ انڈیا اور پاکستان میں پولیس والوں کے نجی ٹارچر سیل اور تفتیشی مراکز بھی ہوتے ہیں۔ کہیں یہ کوئی ایسی جگہ ہی تو نہیں؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ گاڑی ایک نیم تاریک پورچ میں رکی۔ ایک چوکیدار نے پولیس والوں کے انداز میں سجاد کو سیلیوٹ کیا۔ ہمیں ایک اندرونی کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں دو بوسیدہ چارپائیاں اور لحاف پڑے تھے۔ ایک طرف پرانا سا جستی ٹرنک رکھا تھا۔ چھت سے لوہے کی دو زنگ آلود زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار میں دو آہنی کڑے نصب تھے۔ کمرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں لوگوں سے تفتیش ہوتی ہے اور انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں کو اندر دھکیل کر کمرے کا وزنی آہنی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

میں اور عمران چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں آہنی دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں اندر کی طرف مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کھڑکی کے تین چوبی پٹ گرل سے باہر لگے تھے اور باہر کی طرف ہی کھلتے تھے۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک بڑا سا ایگزاسٹ فین بھی دکھائی دیا۔ کمرے میں بند کرنے سے پہلے ہماری اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ بہرحال، سگریٹ کا پیکٹ اور ایک لائٹر عمران کی جیکٹ کی جیب میں ہی تھے۔ عمران نے سگریٹ سلگایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔''

''خود کچھ پھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہ لوگ کر دیں گے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میری جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ ''یار! یہ کوئی بات ہے۔ الٰہ آباد کے دو پلیسے ہمیں بکریوں کی طرح ہانک کر یہاں اس ٹارچر سیل میں لے آئے ہیں۔ کیا ہم...''

''معمولی پولیس والے نہیں۔'' عمران نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ''اگر تم نے اس سجاد موہل کو معمولی سمجھا تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔ یہ شخص ہمیں اتنا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم غور کرو، اگر میں اس شخص کو اتنی اہمیت دے رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔''

''یار! اگر کوئی وجہ ہے تو مجھے بھی بتاؤ نا۔ میری برداشت جواب دے رہی ہے۔ یہ نہ ہو میں دھوکے میں مارا جاؤں۔ تم سن ہی رہے تھے، وہ خبیث راستے میں کیا باتیں کر رہا تھا ہمارے بارے میں اور پاکستان کے بارے میں۔ لگتا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ کُوٹ کُوٹ کر زہر بھرا ہوا ہے اس میں۔"

"آہستہ بولو یار! یہ جنونی شخص ہے۔ دو سال پہلے میرا اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ اور بہت بُرا پڑ چکا ہے۔ میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں الٰہ آباد میں اس سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، تین چار افراد دندناتے ہوئے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں سے صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل پولیس کی خاکی وردی میں تھا، باقی سادہ لباس میں تھے۔ دو افراد کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ انہوں نے اپنی انگلیاں لبلبی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے عقب میں دبلے پتلے جسم لیکن نہایت کرخت چہرے والا سجاد موبل چلا آ رہا تھا۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اور وہ اس پر کسی نامعلوم شخص کی ماں بہن ایک کرتا چلا آ رہا تھا۔

سجاد نے فون بند کیا۔ اس کے اشارے پر ہمارے کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ "منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" سجاد نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" عمران نے پوچھا۔

"تمہارے پیچھے گولی مارنا چاہتا ہوں تاکہ تم شہید نہ بن سکو۔ پتا چلے کہ تم بھگوڑے ہو اور تم نے بھاگتے ہوئے گولی کھائی ہے۔"

"لیکن..."

"لیکن کی ماں کی ایسی تیسی۔ جو میں بک رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ ورنہ سچ مچ تمہارے اندر دو تین روشن دان کھول دوں گا۔" سجاد کا لہجہ جنونی ہو گیا۔

عمران چند لمحے ہچکچایا پھر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ حالانکہ میں ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہنڈلی والی زنجیر ابھی تک میرے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔

اب ہم دونوں کے سامنے سپاٹ دیوار تھی۔ کہیں کہیں سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں ہمارے ہیولے بائیں جانب دکھائی دے رہے تھے۔ "اپنے ہاتھ پیچھے موڑو۔" سجاد موبل کی طرف سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہمیں الٹی ہتھکڑی لگائی جانے والی ہے۔ عمران نے جیسے آخری کوشش کے طور پر اپنا رخ ڈی ایس پی موبل کی طرف پھیرا اور کہا۔ "اگر تم میری پوری بات سن لو گے تو شاید اپنی رائے بدلنے پر تیار ہو جاؤ۔"

سجاد موبل کا جواب بڑا سخت تھا۔ ایک غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے عمران پر اپنے سرکاری پسٹل سے گولی چلائی۔ یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری اور میرے سامنے دیوار کا تھوڑا سا اور پلاستر اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ سجاد موبل گرجا۔ "کمینے! اگلی گولی تیرے کھوپڑے میں ماروں گا۔ منہ دوسری طرف کر... دوسری طرف کر۔"

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر رخ پھر دیوار کی طرف پھیر لیا... اور ہاتھ پیچھے کر دیے۔ میں نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے مجھے عندیہ دیا کہ میں سجاد کی ہدایت پر عمل کروں۔

میں نے بھی چار و ناچار ہاتھ پیچھے موڑ دیے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے خود پر بے پناہ جبر کرنا پڑا۔

دو افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑے کرخت انداز میں ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوسنے لگا جب ہم چائے پینے کے لیے ہوٹل کی بالکونی میں آئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اس موبل نامی بلا نے ہمیں نیچے سڑک پر سے ہی تاڑا ہو اور پھر اوپر آ گیا ہو۔

"چار پائی پر بیٹھ جاؤ۔" موبل نے نیا حکم صادر کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ ایک آٹومیٹک رائفل اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود چاروں افراد کے چہروں سے سفاکی برس رہی تھی اور خاص طور سے موبل کا چہرہ بے رحمی کی تصویر تھا۔ "اب اپنی کس ماں کا بدلہ لینے آئے ہو یہاں؟" موبل دانت پیس کر بولا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو موبل۔ میں کسی ایسی نیت سے یہاں نہیں ہوں۔ میں اور میرا یہ دوست..."

"یہاں دلیپ کمار سے ملاقات کے لیے آئے ہیں..." موبل نے عمران کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔ اس کا آہنگ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک جگر پاش نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کاغذات کہاں ہیں تمہارے؟"

"ہمارے ٹریول ایجنٹ کے پاس ہیں۔"

"اور ٹریول ایجنٹ کون ہے؟"

"اس کا ایڈریس ہوٹل میں ہے۔" عمران نے جھوٹ بولا۔

"تم بکتے ہو۔ تم غیر قانونی طور پر انڈیا آئے ہو اور تمہارا ٹارگٹ وہی منوج ہے۔ تمہارے اندر ضد ہے اور وہ ضد یہ ہے کہ تم منوج کی ہتھیا کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری یہی ضد تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے... اور میں تمہیں وشواس دلاتا





ہوں، اس مرتبہ تم پر دفعہ 326 نہیں دفعہ 302 لگنے والی ہے۔ تمہاری اس منحوس گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے والا ہے۔"

"کیوں، میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میں نے کسی کی جان نہیں لی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے جان نہیں لی تھی، تم نے منوج کو صرف گھائل کیا تھا۔ تم نے اس کی ٹانگیں ضائع کر دی تھیں۔ ٹانگیں ضائع ہونے کے بعد وہ مٹی کا ڈھیر ہو گیا۔ اس کا جیون اس کے لیے بہت بڑا بوجھ بن گیا۔ اس کے زخم بھی خراب ہوتے چلے گئے اور پھر ان زخموں کی وجہ سے اس کا دیہانت بھی ہو گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ منوج مر گیا؟" عمران نے قدرے حیرت سے کہا۔

"مر نہیں گیا حرامزادے... تُو نے اسے مار دیا۔ تیرے دیے ہوئے زخموں کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ اور یہ ہتھیا کا کیس بنتا ہے۔"

"اگر وہ واقعی مر گیا ہے تو... پھر اسے اس کے کرموں کی سزا ملی ہے۔ لیکن اگر تم یہ سمجھ رہے ہو موبل کہ میں اسے مارنے یا نقصان پہنچانے کے لیے یہاں آیا ہوں تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔"

"غلط فہمی ہے یا نہیں لیکن پھانسی کا پھندا تو اب تمہارے گلے میں پڑ گیا ہے... بچو جی... اگر کسی اندھے بہرے جج کے کان تم تک پہنچ بھی گئے تو عمر قید تو کہیں نہیں گئی... ساری عمر یہاں انڈیا کی کسی جیل میں سڑنا پڑے گا۔ اور اس دفعہ تمہیں یہاں سے بھاگنے بھی نہیں دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو پہلے ریمانڈ سے پہلے ہی تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ ندر ہے گی ٹانگ، نہ بھاگے گا کنگو تیلی۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ "میں تو کہتا ہوں جناب ابھی توڑیں۔ پُن (نیکی) کے کام میں دیری نہیں ہونی چاہیے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رائفل ڈی ایس پی سجاد موبل کی طرف بڑھائی۔ اس نے رائفل کو الٹی طرف سے پکڑا اور بڑے زور سے عمران کی پنڈلی پر رسید کیا۔ آہنی دستے نے یقیناً عمران کو زبردست چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ دہرا ہو گیا۔

پہلی چوٹ کے بعد سجاد موبل ایک دم عمران پر پل پڑا۔ اس نے عمران کو رائفل کے کندے سے پے در پے ضربیں لگائیں۔ ساتھ ساتھ وہ اسے ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اب میرے لیے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر ایک زوردار لات سب انسپکٹر کے سینے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر جستی ٹرنک پر گرا۔

حوالدار نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی ٹانگ رسید کر کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ میرے جسم میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ یہ وہی بجلی تھی جو جیکی کی خوفناک تربیت سے میرے رگ و پے میں سمائی تھی۔ یہ ایک ایسی توانائی تھی جس نے میری کایا پلٹ دی تھی اور مجھے میرے حریفوں کے لیے خطرناک بنا دیا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ اسی الٹی ہتھکڑی کا تھا جس نے میرے اور عمران کے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔ میری زوردار مزاحمت نے پولیس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔ انہیں سخت چوٹیں لگیں۔ خود ڈی ایس پی موبل بھی اچھل کر دیوار سے ٹکرایا لیکن پھر اس کے بعد کئی افراد بھڑ امار کر کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے ہمیں بے بس کر دیا۔ کوئی دس افراد ہوں گے جو ہم سے کالی بھڑوں کی طرح چمٹ گئے۔ انہوں نے ہمیں بُری طرح زدوکوب کیا۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر چلتا اور اس کا حتمی نتیجہ کیا نکلتا کہ ایک نسوانی آواز نے صورتِ حال تبدیل کر دی۔ یہ آواز کوٹھی کے برآمدے کی طرف سے بلند ہوئی تھی۔ اس آواز کے سنتے ہی ہمیں مارنے والے ٹھٹک گئے۔ ڈی ایس پی سجاد موبل نے بھی اپنا ہاتھ روک لیا۔

آواز ایک بار پھر ابھری۔ کسی نے چلّا کر کہا۔ "موبل! جلدی آؤ... پلیز۔"

موبل نے مڑ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ تب میری نگاہ بھی کھڑکی سے باہر باغیچے کی ایک روش پر پڑی۔ گارڈن لائٹ کی دودھیا روشنی میں ایک دراز قد عورت ذرا جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی نارنجی ساڑی کا پلو زمین پر لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا پہلو دبایا ہوا تھا۔ وہ کسی طرح کے درد کا شکار تھی۔

سجاد موبل تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہمیں زدوکوب کرنے والے اس کے ماتحت بھی تتر بتر ہو گئے۔ ہم دونوں ٹھنڈے فرش پر پڑے خون تھوک رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر دو تین گومڑ ابھر آئے تھے اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ میری ناک سے خون رس رہا تھا۔ پسلیوں سے بھی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کمرے کا دروازہ باہر سے پھر لاک کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی سجاد کے ایک ماتحت نے ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور بکتا جھکتا ہوا باہر چلا گیا۔ "ہائے... اوئی... اُف۔" عمران نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "رانی خاں کے سالوں نے بالکل بہنوئی سمجھ کر مارا ہے۔ مجھے تو لگتا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ میرا گُردہ زخمی ہو گیا ہے۔'' اس نے پیٹ کے درمیان ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''گردہ یہاں نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''یار! جتنی اٹھک بیٹھک ہوئی ہے ہمارے ساتھ، گُردہ کہیں بھی ہوسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ دماغ کے سوا تمہارے سارے اعضا اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم نے جان بوجھ کر یہ ''پھینٹی کھاؤ'' پروگرام کیوں بنایا ہے۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ یہ بندہ جنونی ہے اور میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ تو پھر کیوں پھنسے ہو اس کے شکنجے میں؟ کتنی فرماں برداری سے ہتھکڑی لگوائی ہے تم نے۔ اور ساتھ ساتھ مجھے بھی بندھوا دیا ہے۔''

''جب تمہیں اس بندے کی اصلیت کا پتا چلے گا نا تو تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔ میں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔''

''ٹھیک کیا ہے تو پھر ہائے ہائے کیوں کر رہے ہو؟''

''یار! تم تو بن چکے ہو آئرن مین۔ چھوٹی موٹی چوٹ تمہیں کچھ کہتی ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مار تم نے ایسے ہی کھائی ہے جیسے دودھ جلیبی کھاتے ہیں۔ سوچو اگر میں بھی ہائے ہائے نہ کروں تو ان لوگوں کا یارا تو پہنچ جائے گا ساتویں آسمان پر۔ جو مارتا ہے وہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ مار کھانے والا ہائے ہائے بھی کرے۔'' اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر ''اوئی اللہ'' کہہ کر لیٹ گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ کسی اندرونی چوٹ کی وجہ سے تمہاری جنس تبدیل ہوگئی ہے۔'' میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''اتنی جلدی جنس تبدیل نہیں ہوتی۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''اتنی جلدی جنس تبدیل ہونے لگے تو کوئی ماں اپنے بچے کو گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دے... ادھر جھگڑا ہوا ادھر جنس تبدیل۔ ایک دفعہ پتا ہے کیا ہوا...''

''ہاں، مجھے پتا ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن یہ پتا نہیں کہ آج کیا ہوا ہے۔ یہ انڈین پولیس والا کیوں تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے... اور یہ منوج کون ہے؟ کیا تم نے واقعی اس نام کے کسی بندے سے مار پیٹ کی تھی؟''

''یار یار! دو سال پہلے جب میں انڈیا آیا تھا تو یہاں بمبئی میں ایک ایسا جھگڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ ایسا سنگین نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس بندے کی جان چلی جاتی۔ اس میں کوئی گڑبڑ گوٹالا ہے۔ شاید یہ بندہ ہمیں بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ تم خود بھی بلیک میل ہونا چاہ رہے ہو۔ راستے میں کئی موقع ایسے آئے تھے جب ہم گاڑی کے اندر ہی اس ڈی ایس پی صاحب کی طبیعت صاف کر سکتے تھے۔ کم از کم میں تو ایسا کر سکتا تھا۔''

''اور یہی تمہاری بھول ہے۔'' عمران نے ترت کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی جیکٹ کی زپ ٹوٹ چکی تھی اور قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ آئندہ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

''یہ ہم ہیں کس جگہ پر اور یہ جوان عورت کون تھی؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہیں یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں اور ابھی تمہیں ''گڈ ڈکٹ'' بھی میں نے ہی لگائی ہے۔ بھئی تمہاری طرح میں بھی یہاں ایک ''معزز'' مہمان کی حیثیت سے موجود ہوں اور تمہارے ساتھ ہی مہمان نوازی اور عزت افزائی کے مرحلوں سے گزر رہا ہوں۔''

''یار! کچھ اندازہ تو ہوگا تمہارا؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اندازہ یہی ہے کہ یہ ڈی ایس پی موہل کی اپنی ہی رہائش گاہ ہے اور اس کے ایک حصے میں خاص ملزموں سے پوچھ گچھ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ میرے دوسرے اندازے کے مطابق یہ عورت جو ابھی موہل کو آوازیں دے رہی تھی، اس کی گھر والی ہے یا پھر آدھی گھر والی یعنی سالی ہوگی... یا پھر دو تہائی گھر والی یعنی منہ بولی بیوی ہوگی۔''

تھوڑی دیر پہلے ہونے والی مار پیٹ کا عمران پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا... ہاں، موہل کے حوالے سے وہ اب بھی پریشان تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ موہل کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا؟ ہمارے ہاتھ بدستور الٹی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ خاصی تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔ ہم اپنے چہرے سے رسنے والا خون بھی صاف نہیں کر سکتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار کمرے کی دیوار کا وہ حصہ آرہا تھا جہاں گولی کا تازہ نشان موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ یہ گولی اور گولی کا نشان اس امر کا ثبوت تھے کہ عمران ڈی ایس پی موہل کی جنونیت کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہمیں موہل پھر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے دبلے چہرے پر بھاری مونچھیں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے ساتھ صرف سب





انسپکٹر تھا۔ دروازے پر کھڑے رائفل بردار حوالدار نے کمرے کا قفل کھولا اور موہل کے لیے ایک کرسی کمرے کے اندر رکھ دی۔ موہل اس کرسی پر براجمان ہوگیا۔ رائفل بردار بالکل چوکس حالت میں اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ موہل کا پارا جو آدھ پون گھنٹا پہلے ضرورت سے زیادہ اوپر چلا گیا تھا، اب قدرے نیچے محسوس ہوتا تھا۔ اس نے دانتوں میں ماچس کی تیلی چباتے ہوئے آتشیں نظروں سے عمران کو گھورا اور کہا۔ ''کیا ارادے ہیں؟ مزید مرمت کرانی ہے یا سب کچھ صاف صاف بتانا ہے؟''

''آپ لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں؟'' عمران نے کہا۔

''ہمیں پتا چل چکا ہے۔ تم سات بندوں نے ہوٹل میں بکنگ کرائی تھی، چار مرد تین عورتیں۔ مجھے یقین ہے تمہاری طرح تمہارے ساتھیوں نے بھی فرضی نام لکھوائے ہوں گے۔ تم دونوں کے پکڑے جانے کے بعد تمہارے ساتھی موقع سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن بھاگ کر حرامزادے جائیں گے کہاں؟ موہل انہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی نکال لے گا۔''

موہل کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جب یہ پولیس والے ہمیں گن پوائنٹ پر ہوٹل سے باہر لا رہے تھے تو اسد یا اجے نے یہ منظر دیکھ لیا تھا اور فوری طور پر اپنا تحفظ کیا تھا۔ موہل نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کہیں یہ کوئی دہشت گردی کی پلاننگ تو نہیں ہے؟''

''دہشت تو تم پھیلا رہے ہو موہل صاحب! ہم پر بھیانک قسم کے الزام لگا رہے ہو۔ ورنہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم فن کار لوگ ہیں۔ لوگوں کو تفریح فراہم کر کے روزی کماتے ہیں۔''

''بے شک... بے شک... تم جیسے آٹھ دس اور فن کار انڈیا میں آجائیں تو پورے ملک میں تفریح کی لہر بپا ہو جائے۔ دو سال پہلے تو صرف ایک منوج کمار کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں... ایک بندہ زخمی ہوا تھا اور ایک گاڑی تباہ ہوئی تھی، اب تم لوگ اس سے کہیں بڑی تفریح فراہم کرنے کے قابل ہو۔ ویسے تم پاکستانیوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اپنے ملک کی مسجدوں میں تو خیر خیریت سے نماز بھی نہیں پڑھ سکتے ہو اور ہر موقع پر ہم ہندوستانیوں سے پوچھتے ہو کہ انڈیا میں تم پر ظلم تو نہیں ہوتا؟ واہ! کیا شان ہے تمہاری؟''

''لیکن یہ بات کیوں بھولتے ہو کہ یہاں احمد آباد میں سیکڑوں لوگوں کو مسلم کش فسادات میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے... بمبئی میں کیا ہو رہا ہے...''

''جو کچھ بھی ہو رہا ہے لیکن یہاں ہم مسلمان تم لوگوں سے زیادہ محفوظ اور خوش ہیں۔ تم لوگوں نے حکومتیں بنانے اور توڑنے کے سوا کیا ہی کیا ہے اپنے ملک میں۔ اپنی ضرورت کی چھوٹی سے چھوٹی شے کے لیے تم باہر کی دنیا کے محتاج ہو۔ تم نے اس خطے کو کلاشنکوف کلچر، ہیروئن اور دہشت گردی کے تحفے دیے ہیں۔''

''مگر معاف کرنا موہل صاحب! بڑے سے بڑا ڈان تو تمہارے ملک میں بھرا ہوا ہے۔ تمہاری پوری فلم انڈسٹری پر ڈانوں کا راج ہے۔ تمہارے بڑے بڑے شہران دادا گیروں نے یرغمال بنا رکھے ہیں۔''

''اور وہاں پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی جانکاری بھی ہم کو ہے۔ یہاں تو فلم انڈسٹری میں ڈان ہوں گے، وہاں تمہاری پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارے سرکاری محکموں میں بیٹھے ہوئے ہیں... اور تو اور تمہاری سرکس کمپنیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک منحوس سرکس کے ساتھ ایک حرامزادہ بازی گر یہاں آتا ہے اور سڑکوں پر دادا گیری کرتا ہے۔ لوگوں کی ٹانگیں توڑتا ہے، ان کے جیون برباد کرتا ہے۔ ان کو ان کے بال بچوں سمیت زندہ جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔'' ڈی ایس پی موہل نے آخری الفاظ دانت پیس کر کہے اور عمران کو قہر ناک نظروں سے دیکھا۔ چند لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ طیش میں آکر اس پر جھپٹ پڑے گا۔

اس نے حوالدار سے کہہ کر شراب کی چھوٹی بوتل منگوائی اور وہیں ہمارے سامنے بیٹھ کر اس کے تلخ گھونٹ بھرنے لگا۔ ذرا نشہ چڑھا تو اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے عمران کے پہلو میں لات رسید کی اور پھنکارا۔ ''اگر تیرے دل میں کوئی ارمان ہے تو نکال لے۔ میں تیری یہ ہتھکڑی کھلوا دیتا ہوں۔ تجھے بھاگنے کے لیے سے بھی دیتا ہوں۔ بیس تیس سیکنڈ سے پہلے تیرے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔ لیکن پھر اگر پکڑا گیا تو ننگا کر کے ماروں گا۔ ایک ایک انچ گوشت اڑا دوں گا تیرے پنڈے پر سے۔'' اس نے باقاعدہ انگوٹھے اور انگلی کو ملا کر ایک انچ کا اشارہ بتایا۔

ابھی کچھ دیر پہلے عمران نے مجھے ڈی ایس پی موہل کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ موہل ماضی میں کبڈی کا نامور کھلاڑی بھی رہا ہے اور اسی کھیل کی بنیاد پر پولیس میں بھرتی بھی ہوا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی انور موہل بھی پولیس میں تھا اور وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ بعد ازاں اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے پولیس چھوڑ دی تھی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔

موبل دس پندرہ منٹ مزید ہمارے پاس بیٹھا۔ اس دوران میں اس نے بس زہر ہی اگلا۔ اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ خصوصاً پاکستانی پولیس اور قانون نافذ کرنے والی دیگر ایجنسیوں سے وہ بہت متنفر تھا۔ اب پتا نہیں اس نفرت کی وجہ کیا تھی۔ عین ممکن تھا کہ عمران کو علم ہوتا مگر وہ کچھ بتاتا تو تب تھا۔ موبل کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ عمران کو ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ افسروں کے حوالے کرنا چاہتا ہے اور اپنی چھاتی پر کامیابی کا ایک یادگار تمغہ سجانے کا خواہش مند ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی شک تھا کہ عمران اب پھر کسی جرم کی نیت سے ہی یہاں الٰہ آباد میں موجود ہے۔ وہ اس نئے جرم کا کھوج بھی چاہتا تھا۔ ہم دونوں کے حوالے سے اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہی اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ یہ کال موبل کے کسی ماتحت کی تھی۔ اس ٹیلی فونک گفتگو سے ہمیں پتا چلا کہ الٰہ آباد میں اسد اور میڈم سمیت ہمارے ساتھیوں کی تلاش زور شور سے جاری ہے اور اس شخص کا بھی سراغ لگایا جا رہا ہے جس کی وساطت سے ہمارے لیے ہوٹل میں کمرے بک ہوئے تھے۔

سجاد موبل کے جانے کے بعد ہمارے کمرے کو باہر سے پھر وزنی تالا لگا دیا گیا۔ دو رائفل بردار اہلکار کمرے سے باہر چوکس حالت میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک حوالدار فیاض اور دوسرا ہندو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

حوالدار فیاض ہماری طرف مسلسل تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گرل دار کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگتا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ”میرے برادر! کہیں سے سبز چارا مل جائے گا تھوڑا سا؟“

”کیا کرو گے؟“

”کھائیں گے یار اور کیا کریں گے۔ تمہارے ڈی ایس پی نے ہمارے ہاتھ تو پیچھے باندھ دیے ہیں، اب روٹی اور برگر وغیرہ تو ہم کھا نہیں سکتے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چارا وغیرہ ہی کھانا پڑے گا۔“

وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ”گھبراؤ مت۔ چارا وغیرہ بھی دیں گے۔ پہلے تم سے تھوڑا سا اہل تو چلوا لیں۔“

”یار! اہل چلوایا تو ہے تم لوگوں نے۔ دیکھ لو ہم دونوں کے تھوبڑے نیلو نیل ہو رہے ہیں۔“

”ابھی تو صرف تھوبڑے نیلو نیل ہوئے ہیں، کل شام تک تمہیں ہر جگہ نیل نظر آئیں گے۔ اور جو جگہیں تم خود نہ دیکھ سکو گے، ان پر ہاتھ لگانے سے پتا چل جائے گا کہ نیل پڑے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے ہم شام تک یہیں رہیں گے؟“ عمران نے حیرت ناک صورت بنائی۔

”کل شام تک نہیں میرے ہیرے... اگلی پانچ چھ شاموں تک تم یہیں رہو گے... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ شامیں لگ جائیں۔ ویسے شام پر تمہارے کسی پاکستانی کوی نے بڑا اچھا گانا بنایا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے... میرا کوئی کام کرو اور... شام کرو۔“

عمران نے فوراً تصحیح کی۔ ”ہو سکے تو میرا ایک کام کرو، شام کا ایک پہر میرے نام کرو۔ ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھا ہے۔ میری بڑی پکی یاری ہے ان سے... لیکن یار! تمہاری ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارے ڈی ایس پی صاحب ہمیں اس کوٹھی میں کس طرح رکھ سکتے ہیں... یہ کوئی تھانہ تو نہیں؟“

”گھبراؤ مت۔ یہاں تم دونوں کو تھانے سے زیادہ ”سہولتیں“ ملیں گی۔“ وہ مونچھیں مروڑ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”باقی رہی یہاں رکھنے کی بات تو میرے ہیرے... تھانے تو تمہیں تب لے جایا جائے گا جب تمہاری گرفتاری ڈالی جائے گی۔ ابھی تو تمہارا کوئی اندراج ہی نہیں۔ کوئی کھوج کھرا، کوئی مائی باپ نہیں تمہارا۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں یہاں زندہ بھی گاڑ دیں گے تو کسی کو خبر نہیں ہوگی۔“

وہ دیر تک ہمیں ڈراتا دھمکاتا رہا اور بتاتا رہا کہ ڈی ایس پی صاحب اس چار دیواری میں مختار کل ہیں۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم پوچھ گچھ کے سلسلے میں ان سے پورا تعاون کریں ورنہ ہماری خیریت جو پہلے ہی مشکوک ہے، مزید خطروں میں گھر جائے گی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ ہمیں بیدردی سے مارا گیا تھا۔ میرا جسم پھوڑا بنا ہوا تھا لیکن ایسی تکلیفیں اب مجھے مزہ دیتی تھیں۔ میں ایسی تکلیفوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا تھا، ان سے دوستی کرتا تھا۔ اب مجھے ان کی ”شدت“ سے لذت کشید کرنا آ گئی تھی۔ بوسیدہ لحاف ہمیں سردی سے بچانے کے لیے ناکافی تھے۔ ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ جسمانی اذیت میں بھوک کی بے چینی بھی شامل ہو گئی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ مجھے دکھ پہنچانے میں ناکام تھا۔ رہی عمران کی بات تو وہ بھی بلا کا سخت جان تھا۔





## پچھتاوا

شادی کے چند روز بعد ہی میاں بیوی میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ ایک دن شوہر نے غصے سے کہا۔

”تم کہتی ہو کہ تم سے شادی کے لیے بہت سارے نوجوان تیار تھے؟“

”ہاں بہت سے بے وقوف تھے۔“ بیوی نے جواب دیا۔

”تو پھر انہی میں سے سب سے پہلے بے وقوف سے شادی کیوں نہیں کی؟“ شوہر بولا۔

”اسی سے کر کے تو پچھتا رہی ہوں۔“ بیوی نے تیزی سے کہا۔

جیکب آباد سے عادل شاد سومرو کی سوغات

اگلے روز صبح سویرے ڈی ایس پی موبل اپنی پرائیویٹ کار لے کر بڑی تیزی سے کہیں نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک حوالدار نے اندر آ کر میری ہتھکڑی کھولی۔ عمران کی ہتھکڑی میں نے کھولی۔ میرے پاؤں سے زنجیر بھی اتار لی گئی۔ تب تک حوالدار باہر نکل کر دروازہ لاک کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک عمران ایک خطرناک شخص تھا کیونکہ وہ ماضی قریب میں، منوج نامی کسی شخص کی ٹانگیں توڑ چکا تھا اور پولیس کی حراست سے فرار ہو چکا تھا۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہ شخص عمران کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔

ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈی ایس پی موبل کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ شام کے بعد بھی اپنی رہائش گاہ پر نظر نہیں آیا۔ اس کی کار بھی دکھائی نہیں دی۔ دو رائفل بردار اہلکار مسلسل کمرے کے دروازے کے سامنے پہرا دے رہے تھے۔ صبح ہمیں واجبی سا ناشتا دیا گیا تھا مگر رات کا کھانا اچھا تھا۔ رات نو دس بجے کے قریب ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ وہی عورت برآمدے کی سیڑھیوں پر دکھائی دی جسے ہم نے کل شب موبل کو پکارتے سنا تھا۔ تب وہ شدید درد میں محسوس ہوئی تھی۔ تاہم اب وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔ اس نے آج مختلف رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ قبول صورت اور متوازن جسم کی تھی۔ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی وہ ہمارے کمرے کی طرف آئی۔ کانسٹیبل اور حوالدار نے اسے ادب سے سلام کیا۔ وہ کھڑکی میں سے ہمیں گھورتے ہوئے بولی۔ ”کیا کیا ہے انہوں نے؟“

اس کا یہ سوال حوالدار فیاض سے تھا۔ فیاض نے کہا۔ ”ابھی انہوں نے کچھ بتایا نہیں بیگم جی... مگر کل تک سب کچھ بک دیں گے۔ ویسے شاید آپ نے غور سے دیکھا نہیں۔ ان میں سے ایک کو آپ پہلے سے بھی جانتی ہوں گی۔ یہ سرکس کا وہی بازی گر ہے جس نے منوج صاحب کی ٹانگوں میں گولیاں ماری تھیں۔“

بیگم صاحبہ نے غور سے عمران کو دیکھا اور ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکیڑا... ”اوہ مائی گاڈ... تو یہ پھر پکڑا گیا۔“

”صاحب جی نے آپ کو اس کے بارے میں بتایا نہیں؟“ حوالدار نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ کل شام کو مجھے کڈنی کا شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ آج صبح سویرے ان کو کسی چھاپے کے لیے جانا پڑ گیا۔ یہ تو بڑی اہم سا چارہ ہے۔ اگر انہیں موقع ملتا تو مجھے ضرور بتاتے۔“ اس نے ایک بار پھر غور سے عمران کو دیکھا پھر حوالدار سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”وشواس نہیں ہو رہا کہ یہ دوبارہ سلاخوں کے پیچھے ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟“

”یہ بھی ہونگا کوئی اٹھائی گیرا جی۔ یہ بھی پاکستان سے ہی تشریف لایا ہے۔“

بیگم صاحبہ نے تھانے داری لہجے میں کہا۔ ”اب کیا ارادے تھے تمہارے؟“

عمران نے مسمسی صورت بنائی۔ ”ارادے تو بڑے نیک تھے جی۔ کسی ہندوستانی لڑکی کو جیون ساتھی بنا کر پاکستان لے جانا چاہتا تھا مگر آپ کے شوہر صاحب بڑی دور کی سوچتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب میں ہندوستانی لڑکی کو پاکستان لے کر جاؤں گا تو اسے ضرور تنگ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ مار پیٹ بھی کروں۔ لہٰذا انہوں نے شادی سے پہلے ہی مجھے ایک ”سخت گیر داماد“ کا رتبہ بخش دیا بلکہ پھینٹی بھی لگا دی۔ دیکھیں کتنے ستم کی بات ہے، میں نے ابھی اس بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھی جس پر میں نے ظلم کرنا ہے اور مرمت میری پہلے ہی ہو گئی ہے۔“

حوالدار نے کہا۔ ”اسے بکنے کی عادت ہے بیگم صاحبہ! آپ کو یاد ہو گا پچھلی دفعہ جب اسے عدالت میں ریمانڈ کے لیے پیش کیا گیا تھا، اس نے مجسٹریٹ صاحب کو اس لیے مجسٹریٹ صاحبہ کہہ دیا تھا کیونکہ ان کی آواز بہت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باریک تھی۔ ایک نمبر کا چرب زبان ہے۔''

بیگم صاحبہ نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ عمران سے ایک دو باتیں کیں۔ پھر حوالدار کو ایک ڈاکٹری نسخہ دیا اور اپنے لیے میڈیکل اسٹور سے دوا لانے کو کہا۔ حوالدار چلا گیا تو بیگم صاحبہ نے ہیڈ کانسٹیبل کو برآمدے کی لائٹ روشن کرنے کو کہا۔ جب ہیڈ کانسٹیبل رخ دوسری طرف پھیر کر لائٹ روشن کر رہا تھا، بیگم صاحبہ نے اچانک اپنی گرم شال کے نیچے سے ایک موبائل فون نکالا اور گرل دار کھڑکی میں سے عمران کی طرف بڑھایا۔ عمران ایک لمحے کے لیے چونکا پھر اس نے موبائل لے کر چارپائی پر پڑے لحاف کے نیچے رکھ دیا۔

ہیڈ کانسٹیبل لائٹ روشن کر کے واپس ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ بیگم صاحبہ نے انکشاف انگیز لہجے میں عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہیں جانکاری نہیں کہ منوج کمار مر چکا ہے اور اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی موت تمہارے دیے ہوئے زخموں سے ہی ہوئی ہے... اب تم انڈیا آ گئے ہو۔ نہ صرف آ گئے ہو بلکہ پکڑے بھی گئے ہو۔ شاید اسی کو کہتے ہیں جو کرو گے سو بھرو گے۔''

عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی کی طرح دار بیوی واپس چلی گئی۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اس نے عمران کو موبائل دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتی ہے اور نہ صرف اسے جانتی ہے بلکہ رابطہ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اس نے حوالدار وغیرہ کے سامنے ضرور کچھ کھردری باتیں کی تھیں مگر اندر خانے وہ عمران کی ہمدرد محسوس ہوتی تھی۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی؟'' میں نے عمران سے سرگوشی میں پوچھا۔

''یہ شریفانہ چکر ہے۔ تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل ہی جانا تھا اور پھر یہی ہوا۔ موبائل فون نے ''وائبریٹ'' کیا۔ اس پر میسج آیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی کی وائف ہی کی طرف سے تھا۔ اس طویل میسج کا ٹیکسٹ انگریزی میں تھا۔ عمران نے یہ میسج مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''بھائی جان! آپ کو پھر سے پولیس کی کسٹڈی میں دیکھ کر مجھ پر جو گزری ہے، کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ آپ کو تقریباً دو سال بعد دیکھا اور وہ بھی اس حالت میں۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کل رات میں نے آپ کو اور آپ کے دوست کو گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا... پھر جب کمرے میں آپ دونوں سے مار پیٹ شروع ہوئی تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ میں نے درد کا بہانہ کیا اور سجاد کو آوازیں دیں۔ میں نے وقتی طور پر تو آپ کی مصیبت ٹال دی لیکن یہ زیادہ دیر نہیں ٹلے گی۔ سجاد کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کے لیے میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔''

جواب میں عمران نے لکھا۔ ''تم بھائی جان کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہو۔ تمہیں پتا ہے، میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اس جن زاد سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں جس نے پچھلے سات آٹھ سال سے تمہیں قید کر رکھا ہے۔ بہرحال، یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو میں اس کی قید میں ہوں۔ جہاں تک تمہاری مدد کی بات ہے تو تم بس دعا کرو۔ ذاتی طور پر اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے، میں سنبھال لوں گا۔''

میسج کا جواب آیا۔ ''یہ آپ کا نہیں سراسر میرا معاملہ ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا، میرے لیے کیا۔ میرے گھر کو بچانے کے لیے کیا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اگر آپ کی وجہ سے منوج کی ٹانگیں کٹیں تو وہ اسی لائق تھا۔ اس نے ایک گندا جرم کیا تھا... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سجاد بھی آپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے صرف اور صرف میری وجہ سے گرفتاری دی۔ میں آپ کی بہت احسان مند ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اس بوجھ تلے اور نہ دبائیں۔ مجھے بتائیں، آپ دوبارہ کیوں سجاد کی کسٹڈی میں نظر آ رہے ہیں؟ اور میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

عمران نے لکھا۔ ''اگر تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو تو خدا کے لیے اپنے اس ناہنجار... جن زاد شوہر سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ میری دلی خواہش پوری ہو جائے گی۔ اگر مجھ سے کہو گی تو میں سر کے بل حاضر ہوں، ورنہ کوئی مناسب شخص ڈھونڈنے میں، میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔''

جواب آیا۔ ''یہ مذاق کا موقع نہیں۔ میرا دل رو رہا ہے۔ آپ کو بُری طرح مارا ہے انہوں نے۔ اور ابھی وہ اور سختی کریں گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سجاد آپ کے ان ساتھیوں کی تلاش میں گئے ہیں جو آپ کے پکڑے جانے کے بعد ہوٹل پارک ویو سے فرار ہو گئے تھے۔ کم از کم آپ مجھے یہ تو





بتا دیں کہ اس بار آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ یہ منوج والا معاملہ ہی ہے یا کچھ اور ہے؟''

''نہیں عاصمہ! اس دفعہ ہم اہم فلمی شخصیات کے انٹرویوز لینے آئے ہیں۔'' عمران نے لکھا اور پھر مزید پیغامات سے بچنے کے لیے فون آف کر دیا۔

میں نے دیکھا کھڑکی سے باہر حوالدار فیاض رائفل گود میں رکھے کرسی پر بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نریندر کے قدموں کی چاپ برآمدے میں مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! مجھے سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ ورنہ...''

''ورنہ کیا؟''

''یہاں سینڈ بیگ نہیں ہے اور میں سینڈ بیگ کی کمی تمہارے تھوبڑے سے پوری کروں گا۔ مکے مار مار کر تمہاری بتیسی کا سوا ستیاناس کر دوں گا۔''

عمران کچھ دیر غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''یہ ڈی ایس پی کی بیوی عاصمہ کس گندے جرم کی بات کر رہی تھی؟ کیا کیا تھا منوج نے؟''

''اس نے ایک پاکستانی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اور لڑکی بھی وہ جو اس سے عمر میں بیس بائیس سال چھوٹی تھی۔ وہ ہمارے سرکس میں جگر تھی۔ ہمارے ساتھ ہی انڈیا کے شہروں میں شو کرنے کے لیے پاکستان سے آئی تھی۔ منوج نے اسے ورغلایا۔ اسے کوک میں نشہ آور دوا ملا کر پلائی اور اس سے دست درازی کی۔''

''یہ منوج کون تھا؟''

''بمبئی میں مرغِ حلیم بیچتا تھا۔ راج کپور کی بہن کی ساس کی خالہ کا چھوٹا بہنوئی تھا۔'' عمران پھر پٹری سے اترنے لگا۔

میں نے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ''یار! ایک بار مجھے شروع سے سب کچھ بتا دو پھر مجھے پریشانی ہو گی نہ تمہیں۔''

''کہاں سے بتاؤں؟''

''منوج سے بتا دو۔ یہ کون تھا؟''

''بمبئی کی فلمی دنیا کا بندہ تھا۔''

''ایک تو مشہور اداکار منوج کمار ہے؟''

''نہیں، یہ فلمسازی کرتا تھا۔ شاید ایک دو فلموں کی ڈائریکشن بھی دی تھی... کافی کھاتا پیتا شخص تھا۔ ایسے لوگوں کو لڑکیوں کی کیا کمی ہوتی ہے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ یہ بمبئی میں ہمارا شو دیکھنے آیا۔ وہاں اس کی ملاقات ہماری ٹیم سے ہوئی۔ ان میں زیب بھی شامل تھی۔ زیب لاہور کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکول کے زمانے میں اسے جمناسٹک کا شوق پیدا ہوا اور پھر شوق ہی شوق میں وہ ہمارے سرکس تک آ پہنچی۔ جان محمد صاحب نے اسے اچھے معاوضے کی پیشکش کی اور وہ باقاعدہ شوز میں حصہ لینے لگی۔ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اس نے منوج سے بھی ہنس کر باتیں کیں۔ بعد میں منوج نے اسے فون کیا اور بتایا کہ اگر وہ کوشش کرے تو فلموں میں آ سکتی ہے۔ ان فلمی لوگوں میں ایک جادو ہوتا ہے یار... ان کی آفرز کو ٹھکرانا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے، خاص طور سے لڑکیوں کے لیے۔ اچھے بھلے گھرانوں کی لڑکیاں ان چکروں میں پھنستے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔ بہرحال، یہاں جو کچھ ہوا، اس میں شاید تھوڑا بہت قصور زیب کا بھی تھا۔ ہم بمبئی میں قریباً پندرہ دن رہے تھے۔ وہ ہمیں بتائے بغیر منوج سے فون پر بات کرتی رہی اور اس سے ملتی بھی رہی۔ منوج نے اسے فلمی دنیا کی چکاچوند کی کچھ جھلکیاں دکھائیں۔ ایک روز اسے ساحل پر اپنے کاٹیج میں لے گیا۔ زیب کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ وہ چھبیس سال سے اوپر کا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اسے دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے اس بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا تو وہ اسے ذلیل و خوار کر دے گا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ زیب نے یہ سب کچھ مجھے بتا دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے لیے تھے۔ مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کسی کو کچھ بتاتی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اپنی نادانی کے سبب وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی اور اس کا دکھ جاننے میں کامیاب رہا۔ اب میرے لیے برداشت کرنا مشکل تھا۔ میں جانتا تھا کہ منوج سنہا واقعی ایک ''بڑا آدمی'' ہے۔ اپنے تعلقات کے سبب وہ اپنا کچھ بگڑنے نہیں دے گا اور میں اسے یونہی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے گھیر لیا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ رات کے وقت جب وہ اپنے ڈرائیور اور ایک فلمی دوست کے ساتھ نشے میں دھت اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا، میں نے اسے جالیا۔ اس کا دوست زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ ڈرائیور نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔ میں نے منوج کے گھٹنوں اور رانوں پر چھ گولیاں ماریں۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر جان بخشوائی۔ اس کے بعد کے واقعات کا تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تمہاری طرح جیمز بانڈ نہیں ہوں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ پوری بات بتاؤ۔ یہ ذلیل موبل تمہارے پیچھے کیسے پڑا؟"

"اوئے گھامڑ! میں مجرم تھا اور یہ پولیس والا۔ اس نے میرے پیچھے نہیں پڑنا تھا تو کیا جو ہی چاولہ یا شبانہ اعظمی نے پڑنا تھا۔ ان دنوں یہ شرابی پلسیا بمبئی میں ہی تعینات تھا۔ اس نے مجھے پکڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے تو اس خبیث کو خاص طور سے "محبت" ہے۔ منوج کو گولیاں مارنے اور اس کی مرسیڈیز کو آگ لگانے کے بعد میں اورنگ آباد کی طرف نکل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس کارروائی کی وجہ سے سرکس کے مالک جان محمد صاحب یا میرے دیگر دوستوں کو کوئی پریشانی ہو۔ منوج پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ یہ بس مجھ اکیلے کی کارروائی تھی۔ اس کا نتیجہ بھی میں اکیلے ہی بھگتنا چاہتا تھا..."

میں نے عمران کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلے ایک چیز کلیئر کرو۔ تم نے بتایا ہے کہ سجاد کو پاکستان اور پاکستانیوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"ہاں، خاص وجہ ہے۔" عمران نے اپنے زخمی ہونٹ سے رسنے والے خون کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ سجاد کا ایک بھائی انور بھی تھا۔ وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا، کچھ عرصے کے لیے پولیس میں بھی رہا۔ بعد میں اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا مگر اس کام کی آڑ میں وہ غلط دھندے بھی کرتا تھا۔ وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہیروئن اسمگل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ انڈیا سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہ لاہور میں پکڑا گیا اور فرار ہونے کی کوشش میں اپنے ایک پاکستانی دوست سمیت پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کوئی چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ سجاد جس طرح کا بھی ہے لیکن اس نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو باپ بن کر پالا تھا اور اس سے بہت پیار بھی کرتا تھا۔ اس کی موت نے سجاد کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ شراب تو وہ پہلے بھی بہت پیتا تھا لیکن اب پانی کی طرح پینے لگا۔ وہ کچھ جنونی سا ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی عاصمہ سے کہتا تھا کہ پاکستان جائے گا اور ان پولیس والوں کو قتل کرے گا جنہوں نے اس کے بھائی پر گولیاں چلائیں۔ وہ ان لوگوں کو قتل نہ کر سکا اور نہ ہی پاکستان جا سکا لیکن اس کے دل میں روز بروز نفرت پروان چڑھتی رہی۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے وہ دو تین بار نوکری سے معطل بھی ہوا۔ وہ چڑچڑا اور غصیلا بھی ہوتا جا رہا تھا... بات بات پر بیوی کو پیٹنے لگتا تھا۔ اس کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس کا ذمے دار بھی وہ اپنی بیوی عاصمہ کو ہی ٹھہراتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ایک چھوٹی سی بات سے ہو سکتا ہے۔ پاکستان اور انڈیا کا کرکٹ میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ پاکستانی ٹیم جیت گئی۔ عاصمہ نے اتنا کہہ دیا کہ پاکستانی ٹیم اچھا کھیل کر جیتی ہے۔ اس بات سے سجاد بھڑک اٹھا۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ سجاد نے بیوی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا۔ وہ تین مہینے کی حاملہ تھی۔ اس کی ابارشن ہو گئی۔ اسے کئی ہفتے اسپتال میں رہنا پڑا۔ انہی دنوں شدید ڈپریشن اور نوکری کی پریشانیوں کی وجہ سے سجاد نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔

"یہ وہ حالات تھے جن میں اسے میرا کیس ملا۔ میں ایک پاکستانی تھا اور میں نے یہاں بمبئی میں ایک بڑے پروڈیوسر کو جان کے لالے ڈالے تھے۔ سجاد موبل کی ساری خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میری گرفتاری کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ میری گرفتاری سے اسے دُہرا فائدہ ہوتا۔ ایک پاکستانی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر اس کی انا کو تسکین ملتی، دوسرے اس کی ڈانواں ڈول نوکری کو سہارا مل جاتا۔ اور عین ممکن تھا کہ سکہ بدوشی کے خطرات کے بجائے ترقی کا پروانہ اس کے ہاتھ میں آ جاتا۔ بس یہی حالات تھے جن میں، میں نے سوچا کہ موبل کو اپنی گرفتاری دے کر اس کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا چاہیے۔ سو میں نے یہ کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "یہاں تم شارٹ کٹ لگا رہے ہو۔ کوئی اہم واقعہ چھپا رہے ہو۔ سجاد کی بیوی عاصمہ کا اس معاملے میں کیا کردار ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے عنقریب... فساد پلس میں تمہیں نوکری دلانا پڑے گی۔ تمہاری ناک بہت لمبی ہوتی جا رہی ہے اور تم اسے ہر معاملے میں گھسیڑ رہے ہو۔ نیوز چینل میں نوکری کے لیے اصل کوالیفکیشن لمبی سے لمبی ناک ہی ہوتی ہے جو ہر جائز و ناجائز معاملے میں گھسیڑی جا سکے۔ اور اگر اسے گھسیڑنے میں تھوڑی بہت چوٹ بھی آ جائے تو اس کی پروا نہ کی جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ بہت جلد نیوز چینل میں نوکریوں کے لیے جو اشتہار دیے جائیں گے، وہ اس طرح کے ہوں گے۔ نامہ نگار کے لیے ناک کی کم از کم لمبائی چھ انچ درکار ہے۔ رپورٹر کے لیے آٹھ انچ... سینئر رپورٹر اور اینکر پرسن کے لیے دس انچ تاہم اگر اینکر پرسن کے نتھنے آدھ انچ سے زیادہ کشادہ ہوں اور اس کی آنکھوں





میں شرارے کی چمک ہو تو ناک کی لمبائی میں رعایت ہو سکتی ہے وغیرہ وغیرہ..."

"تم پٹڑی سے اتر رہے ہو۔ میں نے تم سے عاصمہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ اس سارے منظر میں کہاں سے آئی؟"

"بالکل، یہ صلاحیت بھی اینکر پرسن اور دانشور کے لیے ضروری ہے۔ ٹاک شو کے دوران میں بات کہیں بھی چلی جائے، وہ اسے پھر کان سے پکڑ کر وہیں لے آتے ہیں جہاں سے وہ بھاگی تھی۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ بات کو بھگاتے بھی وہ خود ہی ہیں۔ چلغوزوں کے بڑھتے ہوئے ریٹ کو وہ امریکا کی خارجہ پالیسی تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر اچانک خارجہ پالیسی میں سے چلغوزے اور خستہ مونگ پھلی کی بات نکال لیتے ہیں... اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوتا ہے کہ چلغوزوں کے مسلسل مہنگا ہونے میں ریوڑیوں کے کردار کا پتا چلانا ہے تاہم اس بارے میں بریک کے بعد بتایا جائے گا۔"

"یعنی تم عاصمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟" میں نے جھلا کر کہا۔

میری جھلاہٹ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "وہ بڑی تناؤ بھری رات تھی تابی۔ مجھے آج تک وہ سب کچھ یاد ہے۔ میں نے تمہیں اپنی کہانی میں بتایا تھا نا، اس سرکس کے مالک جان محمد صاحب سے بہت محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ ان کے بہت سے احسان ہیں مجھ پر۔ اس رات مجھے پتا چلا کہ بمبئی میں پولیس اہلکار جان محمد صاحب کو ہوٹل سے گرفتار کر کے لے گئے ہیں... اور سجاد موبل نے تھانے میں ان پر تشدد کیا ہے۔ وہ جان صاحب سے میرا اتا پتا جاننا چاہتا تھا۔ جان صاحب کو پہنچنے والی تکلیف اور ان کی بے عزتی نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دیں۔ میں اسی وقت بمبئی واپس آیا۔ میں نے پتا ہے کیا کیا؟"

"کیا کیا؟"

"میں نے سجاد موبل کو سزا دینے کے لیے اس کے بچوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ سجاد کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ مجھے بمبئی کے پوش ایریا میں سجاد کی کوٹھی کا پتا تھا۔ میں نے وہاں موجود چوکیدار سے اپنا تعارف سجاد کے دوست کے طور پر کرایا اور اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ سجاد گھر میں موجود نہیں تھا۔ گھر میں صرف عاصمہ اور اس کی ساس تھیں۔ عاصمہ کی ساس بیمار تھیں اور دوا لے کر سو رہی تھیں۔ رو رو کر عاصمہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ بھی چہرے سے بیمار ہی نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے سجاد کا دوست ہی سمجھا اور مجھے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میں کسی بھی طرح سجاد کی جان بچاؤں... میرے پوچھنے پر اس نے بتایا... ڈی آئی جی صاحب سجاد سے بہت ناراض ہیں۔ نوبت سجاد کی نوکری ختم ہونے تک پہنچ چکی ہے۔ سجاد کی آخری امید پاکستانی ملزم والا کیس تھا۔ لیکن وہ ملزم بھی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اعلیٰ افسروں نے سجاد کو دو ہفتے کی ڈیڈ لائن دی تھی۔ یہ ڈیڈ لائن پرسوں ختم ہو رہی ہے... سجاد پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ وہ نوکری ختم ہونے کا صدمہ سہہ نہیں سکے گا، وہ خودکشی کر لے گا... عاصمہ رو رو کر بے حال ہونے لگی..."

عمران اپنے جسم پر لحاف کو درست کرنے کے لیے چند سیکنڈ کے لیے رکا تو میں نے کہا۔ "شاید تم یہ کہنے جا رہے ہو کہ تم نے عاصمہ کے کہنے پر اپنی گرفتاری دے دی اور یوں اس کا سہاگ اجڑنے سے بچا لیا۔ یہ تو ڈرامائی سی کہانی لگتی ہے۔"

"ہاں، یہ ڈرامائی کہانی ہے... ایک خوش شکل عورت کے کہنے پر ایک مفرور کا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا... لیکن جب تم اصل بات جانو گے تو تمہیں مزید حیرانی ہو گی۔ پتا نہیں کہ تم اس پر یقین کرو گے بھی یا نہیں۔"

"تم سچ بتاؤ گے تو میرے دل کو خود بخود یقین آنے لگے گا۔" میں نے کہا۔

عمران نے گہری سانس لے کر اپنی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو انگلی سے چھوا اور بولا۔ "عاصمہ جس طرح بلک بلک کر میرے سامنے روئی، میرا دل پسیج گیا۔ تم جانتے ہی ہو، میں نے ہمیشہ بُرائی کا مقابلہ اچھائی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ نفرت کا مقابلہ محبت سے، غصے کا تحمل سے، عداوت کا دوستی سے۔ میں نے اس رات اشک بار عاصمہ کے سامنے بیٹھے بیٹھے سوچ لیا کہ میں سجاد کی اس نفرت کا جواب ایک انوکھے طریقے سے دوں گا جو وہ پاکستانیوں کے خلاف رکھتا ہے۔ میں اس کی عداوت اور کم ظرفی پر ایثار اور ظرف کا وار کروں گا۔ مجھے اپنی قوتِ بازو اور اندر کی سچائی پر بھروسا تھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ سجاد موبل کو گرفتاری دے کر بھی میں انڈین پولیس کی گرفت سے بچ نکلوں گا۔ میں نے روتی بلکتی عاصمہ کو یقین دلایا کہ پروڈیوسر منوج کمار کی ٹانگوں میں گولیاں مارنے والا پاکستانی ملزم ضرور گرفتار ہو گا اور سجاد ہی اسے گرفتار کرے گا۔ اب میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں جسے سننے کے بعد تم اس کہانی کو مزید ڈرامائی قرار دے دو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سچائی پر بھی تھوڑا بہت شک کرنے لگو۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں نے کہا ہے نا عمران کہ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میرے دل کو یقین آنا ہی آنا ہے۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''فلموں، ڈراموں میں لوگوں کی شکلیں ہو بہو ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور یہ ایک افسانوی بات ہوتی ہے۔ لیکن عام زندگی میں اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ عاصمہ کی صورت شبانہ سے ملتی ہے مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے قد کاٹھ اور چہرے مہرے میں کچھ جھلکیاں ایسی ہیں جو مجھے شبانہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اس کی ناک، اس کے ہونٹ، خاص طور سے اس کے بولنے کا انداز۔ اس کے اندر کی یہی جھلکیاں تھیں جنہوں نے اس رات میرے ارادے کو مزید طاقت دی... اور میں جو ایک خطرناک پلاننگ کے ساتھ سجاد موہل کے گھر میں گھسا تھا، ایک بالکل دوسرے رخ پر چل پڑا... میں نے انوکھا کام کیا اور ایسے انوکھے کام تمہارا یہ یار ہی کر سکتا ہے۔ اس رات میں نے انسپکٹر سجاد موہل کو گرفتاری دے دی... ہاں، ان دنوں وہ انسپکٹر ہی تھا۔ ڈی ایس پی تو اسے میری گرفتاری نے بنایا۔''

''لیکن پھر تم بھاگ گئے؟''

''تمہارا یہ یار بھاگنے میں بھی ماہر ہے۔ اگر میں سرکس کو جوائن نہ کرتا تو ضرور سیاست میں آجاتا۔''

''میں سجاد موہل کی حراست سے بھاگنے کی بات کر رہا ہوں۔''

''سجاد موہل کی حراست سے نہیں بھاگا تھا یار۔ اس کی حراست سے بھاگتا تو پھر وہ ڈی ایس پی کیسے بنتا اور آتما ہتھیا کا ارادہ کیسے بدلتا؟ یہ موہل بھی ایک عجیب کیس ہے یار۔ اصل میں یہ کھلاڑی تھا اور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے پولیس میں بھی آگیا۔ لیکن اس میں اصلی پولیس والوں جیسا دم خم نہیں تھا اور نہ ہی شروع میں اس کا مزاج پولیس والوں جیسا تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی کامیابی ملی اور نہ یہ خود کو محکمے میں اچھی طرح ایڈجسٹ کر سکا۔ بعد میں جب اس کا بھائی انور موہل پاکستان میں مارا گیا تو یہ بالکل ہی مایوس ہو گیا بلکہ دیوداس بن بیٹھا۔ یہ روزانہ تین بوتل شراب پی جاتا تھا اور یہ مقدار بڑھ رہی تھی۔ ایک دفعہ خودکشی کی کوشش کر چکا تھا اور دوسری دفعہ کرنے والا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں میں نے اسے اپنی گرفتاری کا سہارا دیا اور اس کے کیریئر کے ساتھ ساتھ شاید اس کی زندگی بھی بچائی۔''

''لیکن پھر اپنی زندگی کیسے بچائی تم نے؟''

''میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ مجھے عدالت کی پیشی کے بعد واپس جیل لایا جا رہا تھا۔ ایک موٹے تازے ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ تین اور اہلکار بھی پولیس کی گاڑی میں ہمارے ساتھ تھے۔ شام کے وقت بمبئی کی سڑکوں پر رش بہت ہوتا ہے۔ ہماری گاڑی ایک پل پر رکی ہوئی تھی۔ نیچے سے نہر کا پانی رواں دواں تھا۔ میں نے اچانک موٹے کانسٹیبل کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا اور کوئی چالیس فٹ نیچے پانی میں چھلانگ دی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ پولیس والے اپنی رائفلیں کندھوں سے بھی نہیں اتار سکے۔ پانی تیز تھا۔ موٹا کانسٹیبل غوطے کھانے لگا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے تیرنا آتا ہو لیکن وہ بدحواس تھا کہ ٹھیک سے تیر بھی نہیں سکا۔ پانی بھی بہت ٹھنڈا تھا۔ اوپر سے پولیس والے گولی بھی نہیں چلا سکتے تھے۔ اس کی فائرنگ سے ان کا اپنا ساتھی ہی سورگ باشی ہو سکتا تھا۔ جتنی دیر میں وہ پل سے اتر کر نہر کے کنارے پہنچتے، ہم ڈیڑھ سو میٹر آگے جا چکے تھے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے بے ہوش موٹے کو کھینچ کر پانی سے نکالا۔ کندھے پر لادا اور درختوں میں گھس گیا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک امپالا کار کھڑی تھی۔ اس میں ایک لڑکا لڑکی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کے کپڑوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور نو بیاہتا ہیں۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ کانسٹیبل صاحب پانی میں ڈوب کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔ نوجوان جوڑے کے لیے شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ڈھائی تین من کا کانسٹیبل پانی میں لاش بن کر میرے کندھے پر بے سدھ پڑا تھا۔ نوجوان خدمتِ خلق کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ میں کانسٹیبل سمیت پچھلی نشست پر آگیا۔ گاڑی فوراً روانہ ہو گئی۔ اسی دوران میں مجھے پھل کاٹنے والی ایک چھری نظر آگئی جو پھلوں والے لفافے کے اندر ہی رکھی تھی۔ میں نے چھری نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دی اور شوہر صاحب سے کہا کہ اگر وہ اپنے ہنی مون کو آج کی شام یہیں پر ختم کرنا نہیں چاہتا تو سیدھا چلتا رہے۔ سمجھا مستقیم۔''

اب یہ ساری روداد میری سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ میرا یار واقعی انوکھا شخص تھا۔ بظاہر چلبلا، کھلنڈرا لیکن اندر سے بہت حساس اور سنجیدہ بھی۔ ایک انجان عورت کے آنسو سیدھے اس کے دل پر گرے تھے اور اس نے عورت کے جنونی شوہر کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ ویسے بھی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ”اگر کوئی مناسب موقع ہوتا اور میرے اندر حوصلہ بھی ہوتا تو میں جوتا اتار لیتا اور تمہارا سر پلپلا کر دیتا۔ بندہ پوچھے کہ اگر تم نے ایک بار اتنی بڑی نیکی کما ہی لی تھی تو دوسری بار اوکھلی میں سر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب خود پھنسے ہو اور مجھے بھی پھنسایا ہے۔“

”یار! تمہیں بتایا ہے نا کہ عاصمہ میں شبانہ کی تھوڑی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ بس یہ جھلک ہی لے کر بیٹھ گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا یہ جنم اور اس سے اگلے سات آٹھ جنم بھی اس پر قربان کر دوں۔ اور کیا پتا کہ اسی جنم میں ہی کوئی کام بن جائے۔ میری یہ ڈبل قربانی کوئی رنگ لے آئے۔“ وہ پھر مذاق کے موڈ میں تھا۔

میں نے کہا۔ ”عمران! سچ کہتا ہوں۔ میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ اب کیا ضرورت تھی اتنے بڑے پنگے کی۔ اب تو یہ بندہ خیر سے ڈی ایس پی بن چکا ہے اور اس کا خودکشی وغیرہ کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر تم کیوں اس کے ہتھے چڑھے ہو؟“

”یار! میں نے بتایا تو ہے تمہیں۔ یہ بڑا خطرناک بندہ ہے۔ جب اس پر غصے کا حملہ ہوتا ہے تو بالکل بدلہ ہوا شخص نظر آتا ہے... ایک دم حیوان بن جاتا ہے...“

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا عمران... اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تم نے ایک بار پھر اس بندے کو فی سبیل اللہ گرفتاری دی ہے۔ اب شاید تم اسے ایس پی بنوانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں نفسیاتی ماہر کو دکھائے جانے کی ضرورت ہے۔“

”نفسیاتی مریض کو نفسیاتی مریض بڑی جلدی پہچان لیتا ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔“

”لعنت ہے تم پر۔“ میں نے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ مجھے واقعی اس پر تاؤ آ رہا تھا۔

کچھ دیر ایسے ہی گزری پھر میرے کان میں کھجلی ہوئی۔ وہ میرے کان کو کسی تنکے سے چھیڑ رہا تھا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے گہری سانس لے کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”یار! سچی بات بتاؤں گا تو تم اور ناراض ہو جاؤ گے۔ دیکھو، بات یہ ہے کہ میرے دل میں ان دونوں میاں بیوی کے لیے ہمدردی موجود ہے۔ خاص طور سے اس کی بیوی کے لیے۔ میں نے اس کی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے لیے اور اس کے شوہر کے لیے جو کچھ بھی ہو سکا، کروں گا اور میں نے کر کے دکھایا۔ یہ حقیقت ہے کہ میری گرفتاری ہی تھی جس کی وجہ سے سجاد موبل کی زندگی کی ڈوبتی کشتی کو سہارا ملا... اب میری گرفتاری اس کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ اسی کیس کی وجہ سے اپنے محکمے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ وہ کیس اس کی ساکھ ہے۔ یہ ساکھ بنانے میں، میں نے موبل کی بہت مدد کی ہے۔ اب اسے اپنے ہاتھوں سے برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ خبطی بندہ پھر اسی جگہ پر آ جائے گا جہاں دو سال پہلے تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا بھرم قائم رہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ ہمارے CLASH میں اسے کوئی نقصان پہنچ جائے گا۔ باقی اپنی اور میری رہائی کی فکر نہ کرو۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”کس طرح بائیں ہاتھ کا کھیل ہے؟“

”یار! تم نے ایتھا بھ پچن کا وہ مشہور ڈائیلاگ نہیں سنا جس میں وہ کہتا ہے... جیلر! تم اپنی جیل کی سلاخیں جتنی بھی مضبوط کر لو اور دیواریں جتنی بھی اونچی لے جاؤ، جب میں نے یہاں سے نکلنا ہو گا تو نکل جاؤں گا۔“

”کوئی گیدڑ سنگھی ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں، فی الحال تو صرف گیدڑ ہے اور وہ پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل میرا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے اسٹیل کا ایک جگ اسے مارنے کے لیے اٹھایا۔ اس نے فوراً بوسیدہ تکیے کو ڈھال بنا لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم میں باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو جاتی اور ہماری چونیں پھر تازہ ہو جاتیں، کوٹھی کے پورچ میں دو گاڑیاں تیزی سے داخل ہوئیں اور تیزی سے رک گئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی تو وہی تھی جس میں سجاد موبل ہمیں ہوٹل سے پکڑ کر یہاں لایا تھا۔ دوسری گاڑی ایک پجیرو جیپ تھی۔ اس میں سے تین چار ہٹے کٹے افراد باہر نکلے... اور ہمارے کمرے کی طرف بڑھے۔ موبل اور اس کے دو اہلکار بھی ساتھ تھے۔ موبل کے اشارے پر حوالدار فیاض نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ تمتمائے چہروں والے سارے افراد ہمیں یوں دیکھنے لگے جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں۔ پھر شرابی آنکھوں والا ایک سانولا شخص بولا۔ ”تو تم ہو عمران دانش... تمہاری غائبانہ شہرت تو ہمارے محکمے میں خوب ہے۔ تم نے مشہور پروڈیوسر منوج صاحب کی ہتھیا کی اور پھر فلمی انداز میں چالیس فٹ اونچے پل سے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی تم یہاں پولیس کو ننگی کا ناچ نچاتے رہے۔ تمہاری اور موبل صاحب کی





کہانی میں تھوڑا سا مرچ مسالا اور شامل کر لیا جائے تو فلم بن سکتی ہے۔“

باقی افراد نے بھی حسبِ توفیق ہم پر ریمارکس پاس کیے۔ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں چاروں افراد موبل کے قریبی دوستوں میں شامل ہیں اور موبل انہیں اپنی یہ حیران کن اپوئنٹ دکھانے کے لیے یہاں لایا ہے۔ یہ تینوں چاروں افراد نشے میں تھے اور سگریٹ بھی پھونک رہے تھے۔ وہ ہمیں گرل دار کھڑکی میں سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں بند جانوروں کو دیکھا جاتا ہے۔

ایک گھنی مونچھوں والے شخص نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”انور موبل ہمارے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ وہ روٹی روزی کے لیے پاکستان گیا تھا۔ تم لوگوں نے اسے بدیش میں تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ بتاؤ کیسے مارا تھا تم نے اسے... کیسے مارا تھا؟“

عمران نے کہا۔ ”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں اس بندے کو جانتا نہیں، میں نے کبھی زندگی میں اسے دیکھا تک نہیں۔ اس کے قتل سے میرا کیا تعلق ہے؟“

”تمہارا تعلق ہے... ہے تمہارا تعلق۔“ سجاد موبل شرابی لہجے میں گرجا۔ ”تم پاکستانی ہو۔ اور جن کتوں نے اسے مارا وہ بھی پاکستانی تھے۔ اب بتاؤ کیا سلوک کیا جائے تمہارے ساتھ؟“

گھنی مونچھوں والے نے کہا۔ ”سجاد بھائی! پچھلی واردات تمہارا مغز پھر گیا تھا جو تم نے اس کی گرفتاری ڈالی اور اسے کورٹ میں پیش کیا۔ اس دفعہ ایسا نہیں کرنا۔ کمینے کو مار کر یہیں اس کمرے کے فرش میں گاڑنا ہے۔“

”لیکن گاڑنے سے پہلے اس کی پوری پوری مہمان نوازی بھی کرنی ہے۔“ ایک دوسرا شخص بولا۔ ”جب مرجائے گا تو اس کی جان چھوٹ جائے گی مگر مرنے سے پہلے اسے جو علاوہ پڑی ہم کھلائیں گے، اس کی یاد مرنے کے بعد بھی اس کے من میں تازہ رہے گی۔ جگدیش بھائی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ یہاں سے نکل کر کورٹ کچہری کے چکر میں پڑے گا تو پھر پنچ کر نکل جائے گا۔“

عمران نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ انور موبل کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

جگدیش بولا۔ ”انور موبل نہ سہی، منوج کمار سہی۔ منوج جی کو تو تم نے ہی مارا ہے نا؟“

”منوج نے ایک نابالغ لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ دوسرے سے بُرے سلوک کا حق دار تھا لیکن میں نے پھر بھی اسے مارا نہیں، صرف زخمی کیا اسے۔“

”لیکن وہ تمہارے دیے ہوئے زخموں کی وجہ سے ہی مرا۔ یہ ہتھیا ہی کی شکل ہے۔“ سجاد نے دانت پیس کر کہا۔

”چھوڑو یار ان باتوں کو۔“ موٹی توند والے ایک شخص نے کہا۔ ”یہ بازی گر ہے، سرکس میں تماشے دکھاتا ہے۔ آج ہمیں بھی اس کا کوئی تماشا دیکھنے دو۔“

اسی دوران میں حوالدار فیاض اور اس کے ساتھی کانسٹیبل نے چار پانچ کرسیاں لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی تھیں۔ سجاد موبل اور اس کے مہمان ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز واقعی تماشا دیکھنے والا ہی تھا۔ لیکن جب کھڑکی کے لکڑی کے پٹ باہر سے بند کر دیے گئے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب یہ لوگ کوئی بھی تماشا کیسے کر سکیں گے۔

اچانک ایک انجن چلنے کی آواز آئی۔ غالباً یہ کوئی ڈیزل انجن تھا۔ ایسے انجن ٹیوب ویل وغیرہ چلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یکا یک ہمارے بند کمرے میں گاڑھا دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ دھواں چھت کے کسی سوراخ سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ہمارا دم گھٹنا شروع ہو گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ملیریا وغیرہ سے بچانا چاہتے ہیں۔ کمرے میں دھونی دے رہے ہیں۔“

دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھونی ہمارے لیے عذاب بن گئی۔ ہم منہ پر کپڑے رکھے کھانستے جا رہے تھے۔ پھر دم ٹوٹنے لگا۔ ”دروازہ کھولو۔“ میں چلایا اور زوردار لات آہنی دروازے پر رسید کی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

سنا تھا کہ آگ میں جل کر مرنے والے بہت تکلیف سے مرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔ غالباً آگ کی جلن کے ساتھ ساتھ اس دھوئیں کی بے پناہ اذیت بھی مرنے والے کے حصے میں آتی ہے جو پھیپھڑوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ میں نے بہت دیر تک سانس روکنے کی کوشش کی۔ آخر بے بس ہو گیا... ڈیزل کا گاڑھا زہریلا دھواں سینے میں گھسا اور لگا کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ میں تکلیف کے سبب تڑپنے لگا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے کھڑکی کی گرل پر ٹانگیں رسید کیں۔ مگر یہ کوشش ”سعی لاحاصل“ کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے عمران کو دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب ہے۔ کھانستے کھانستے مجھے زور کی ابکائی آئی، مجھے لگا میں بے ہوش ہو رہا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ اچانک ایک کونے میں لگا ہوا بڑے سائز کا ایگزاسٹ فین تیزی سے گھومنے لگا۔ اس فین نے چند سیکنڈ میں دھوئیں کو کھینچ کر باہر پھینک دیا۔

میں کھانستے کھانستے فرش پر گر گیا تھا۔ تکلیف اور اذیت برداشت کرنے کی ساری مشق آج دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ عمران کی حالت مجھ سے کافی بہتر رہی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی سانس غیر معمولی وقت تک روکے رکھی تھی۔ بہرطور اس کا رنگ بھی بالکل زرد ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے گئے۔ سجاد موبل اور اس کے ساتھی بڑے تمسخر سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جگدیش نامی شخص نے دھسکی کا طویل گھونٹ لے کر الٹے ہاتھ سے اپنے سیاہی مائل ہونٹ پونچھے اور بولا۔ ”جی جناب! کیسا لگا فلم کا یہ ٹریلر؟“

”اچھا تھا۔“ عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔

”فلم اور بھی اچھے لگے گی۔ بڑی مزاحیہ فلم ہے۔ ہنس ہنس کر بُرا حال ہو جائے گا تمہارا۔ پھیپھڑے، دل، جگر سب کچھ منہ کے رستے باہر آ جائے گا۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ عمران نے میری بُری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

سجاد موبل بولا۔ ”سب کچھ ایک ہی سانس میں بک دو، فٹافٹ... کس چکر میں یہاں آئے ہو۔ تمہارے کتنے ساتھی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ کیا کر چکے ہو اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”میں سچ کہتا ہوں۔ میرے پاس تمہیں بتانے کو کچھ نہیں ہے۔ اور اگر میں کچھ بتاؤں گا تو وہ صرف وقت ٹالنے کے لیے اور تمہارے اس ڈیزل انجن سے بچنے کے لیے بتاؤں گا۔ ہاں، اگر تم مجھے منوج کو زخمی کرنے کی سزا دینا چاہتے ہو تو یہ اور بات ہے۔ مگر اس بارے میں بھی یہ ضرور کہوں گا کہ جرم کے مقابلے میں سزا بہت بڑی ہے۔“

سجاد گرجا۔ ”بکومت۔ کوئی سزا بڑی نہیں ہے تم لوگوں کے لیے۔ تم نے اپنے ملک میں میرے ننھے بھائی کو مارا ہے۔ اس کو چھلنی کیا ہے۔ میں بھی چھلنی کروں گا۔ مجھے جہاں کوئی سرحد پار کا بندہ نظر آئے گا، اسے جیون اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا... یوں کر کے۔“ اس نے شراب کی خالی بوتل کو انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے الٹا پکڑ کر ہوا میں جھلایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ کھڑکی کے پٹ پھر سے بند کر دے۔ اس نے پٹ بند کر دیے۔ ڈیزل انجن کی منحوس آواز پھر سے بلند ہونے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ”ٹھہرو، میں بتاتا ہوں تمہیں۔ کھڑکی کھولو۔“

کھڑکی پھر کھل گئی۔ انجن کی آواز بھی تھم گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اب ان لوگوں سے کچھ وقت لینا چاہتا ہے اور اس دوران میں ہی وہ کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ کیا کرے گا؟ اس بارے میں وثوق سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہرحال، مجھے اس پر اعتماد تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر کر ہی گزرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ عمران اور سجاد موبل میں بات چیت شروع ہوتی اور عمران اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنے ڈھب پر لاتا، ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔ ایک دراز قد شخص تیزی سے ہماری طرف آیا۔ یہ دراصل جگدیش کا ڈرائیور تھا جو پجیرو گاڑی کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ جگدیش کے لیے کسی کی کال تھی۔

جگدیش موبائل لے کر کال سننے میں مصروف ہو گیا جبکہ لمبے قد والا ڈرائیور بڑے غور سے عمران کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جگدیش نے فون بند کیا تو ڈرائیور نے ادب سے جھک کر کہا۔ ”مالک... یہ اندر نیلی جینس والا کون ہے؟“

”یہ بہت بڑے ہیرو نے جنم لیا ہے ہمارے پڑوسی ملک میں۔“ سجاد نے ہرخند انداز میں بولا۔ ”چالیس فٹ اونچے پل سے تین من کے بندے کے ساتھ پانی میں چھلانگ لگاتا ہے اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے فلمی ہیرو سنی دیول اور سنجے وغیرہ تو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ تو نے کوئی آٹوگراف وغیرہ لینا ہے تو لے لے اس سے۔ پھر یہ لوگ بہت مصروف ہو جائیں گے۔ جناب نے بہت ٹھکائی کروانی ہے ہم سے۔“

ڈرائیور سمجھ گیا کہ یہ بات مذاق میں کی جا رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے عمران کو دیکھا پھر جگدیش کمار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مالک! اس بندے کی تو فوٹو چھپی ہے اخبار میں۔ کافی بڑی فوٹو تھی۔ شاید کل کے اخبار میں تھی۔ میں دیکھتا ہوں اخبار گاڑی میں پڑا ہوگا۔“

جگدیش بولا۔ ”کسی اور کی ہوگی... یہ تو ایک دم پردہ نشین قسم کے بندے ہیں۔“

”نہیں مالک... میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔“ ڈرائیور نے کہا اور تیزی سے واپس گاڑی کی طرف گیا۔

چند سیکنڈ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں انگلش کا اخبار تھا۔ وہ ورق گردانی کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ پھر اس کے





چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ ”یہ دیکھیں مالک۔“ اس نے کہا اور اخبار کا ایک صفحہ جگدیش کمار کے سامنے پھیلا دیا۔

سجاد موبل سمیت سب نے سر جوڑ لیے۔ پھر ان کے تاثرات بدلے بدلے نظر آئے۔ انہوں نے اخبار کی تصویر کا موازنہ بار بار عمران سے کیا۔ آخر سجاد موبل معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بھئی، یہ تو سچ مچ اسی خبیث کی تصویر ہے۔“ تب اس نے اخبار ہماری طرف کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ”کیوں بے! یہ تو ہی ہے نا؟“

دھوئیں کی وجہ سے عمران کی آنکھیں ابھی تک اشک بار تھیں۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے دھیان سے تصویر دیکھی۔ میں نے بھی غور کیا۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ نفیس کوٹ اور ٹائی میں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تلاش گمشدہ کا اشتہار تین کالمی تھا اور بیرونی صفحے پر تھا۔ انگریزی کے اس اشتہار کا متن کچھ اس طرح تھا۔

”اسٹار سرکس کمپنی کے اسٹاف ممبر اور معروف فن کار مسٹر عمران دانش پچھلے قریباً ڈیڑھ برس سے لاپتا ہیں۔ ان کے قریبی ذرائع کے مطابق وہ اپنے کسی ذاتی کام سے پاکستان سے بھارت آنے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے تھے۔ سفری دستاویزات سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ پچھلے سال جون میں واہگہ اٹاری کے راستے بھارت میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی گمشدگی ان کے قریبی عزیزوں کے لیے سخت تشویش کا باعث ہے۔ کوئی ان کے بارے میں جانتا ہو تو اطلاع دے۔ وہ خود پڑھیں تو فوری طور پر رابطہ کریں۔“

”یہ کیا چکر ہے بھائی؟“ سجاد موبل اور جگدیش وغیرہ نے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔

”فون لگا کر دیکھو۔“ موٹی توند والے سیٹھ نما شخص بنسی لال نے کہا۔

سجاد موبل نے جگدیش سے موبائل فون لیا۔ پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی پاکٹ سے ایک دوسری سم نکال کر موبائل سیٹ میں لگائی اور اخباری اشتہار سے نمبر پڑھ کر ملانے لگا۔

اس کی پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی۔ رابطہ ہو گیا۔ دوستوں کو گفتگو سے آگاہ کرنے کے لیے سجاد نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ”ہیلو... کون؟“ دوسری طرف سے بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

سجاد بولا۔ ”اخبار میں آپ کا دیا ہوا ایڈ دیکھا ہے، پاکستانی فن کار عمران دانش کے بارے میں...“

”جی جی... فرمائیں۔“

سجاد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”ہمارے پاس آپ کے لیے ایک اہم جانکاری ہے۔“

”جی... جی... بتائیں... اور آپ بول کون رہے ہیں؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“

”بالکل نہیں۔ اگر آپ اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔“

”اگر ہم آپ کو اس بندے کے بارے میں کوئی تصدیق شدہ جانکاری دیتے ہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟“

”اس کے لیے نہایت معقول انعامی رقم ہے۔ اشتہار میں اس کا ذکر مناسب نہیں تھا۔“

”کیا رقم ہے؟“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی جیسے بولنے والا سوچ رہا ہو کہ کہیں یہ کوئی فیک کال تو نہیں اور وہ اپنا وقت تو برباد نہیں کر رہا۔

موبل نے اپنا سوال دہرایا۔ ”آپ چپ کیوں ہو گئے؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اگر آپ کی جانکاری واقعی مصدقہ اور کارآمد ہے تو پھر انعامی رقم آپ کی توقع سے زیادہ ہوگی۔“

موبل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں۔

”آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”یہیں الٰہ آباد سے۔ ہم تھوڑی دیر بعد آپ سے پھر رابطہ کرتے ہیں۔“

”کتنی دیر تک؟“

”قریباً ایک گھنٹے بعد۔“ موبل نے کہا۔

اس نے فون بند کر دیا۔ ان سب کے چہروں پر سنسنی کے آثار تھے۔

”یہ کوئی لمبا چکر ہے بھیا۔“ بنسی لال نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سجاد موبل نے اپنی عقابی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گاڑیں۔ ”ہاں بھئی بازی گر! یہ تیرے کون سے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں یہاں؟ کسی سے کوئی لمبی چوڑی ٹھگ بازی تو نہیں کی ہوئی تو نے؟“

بنسی لال بولا۔ ”یا ہو سکتا ہے کہ کسی کی لڑکی شوکی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھگائی ہو۔ اس کی گندی آنکھ میں سور کا بال تو صاف نظر آتا ہے۔"

عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔ "آپ کو کوئی صدمہ پہنچ چکا ہے شاید اس سلسلے میں۔"

اس کی چوٹ پر بنسی لال تلملا گیا۔ "اوئے... اوئے سور کے تخم۔" وہ پھنکارا۔ اس نے اپنے سفید کُرتے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے عمران پر گولی چلا دے گا۔

سجاد نے اس کا پستول والا ہاتھ تھاما۔ "اوئے کیا کرتا ہے بنسی! اگر اس کتے کو مارنا ہی ہے تو اتنی آسانی سے نہیں ماریں گے۔ اس کو ڈیزل کے دھوئیں والی مزاحیہ فلم دکھائیں گے اور ہنس ہنس کر اس کی ساری اندر کی چیزیں منہ کے رستے باہر نکل آئیں گی۔ چل آ میرے ساتھ۔ ابھی ذرا اشتہار کا پوسٹ مارٹم تو کرلیں۔"

سجاد اٹھ کھڑا ہوا۔ جگدیش، بنسی اور ان کا تیسرا ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بنسی لال جاتے جاتے بھی خونی نظروں سے عمران کو گھور رہا تھا۔ عمران نے سرگوشی کی۔ "لگتا ہے اس کی بیٹی واقعی کسی کے ساتھ بھاگی ہے۔"

"یہ گئے کہاں ہیں یار؟"

"ظاہر ہے کہ مشورہ کرنے ہی گئے ہیں۔"

دھوئیں کی آفت ابھی تک ذہن پر سوار تھی۔ سینہ جیسے اندر سے زخمی ہو گیا تھا۔ ایک انسان نے دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کرلیے ہیں۔ کہیں زدوکوب کرنا، کہیں درد کے انجکشن اور کہیں یہ گاڑھا دھواں۔ اس دھوئیں سے دھیان ہٹانے کے لیے میں نے عمران سے کہا۔ "یہ کیا چکر چل گیا ہے؟ تصویر تو سو فیصد تمہاری ہی ہے... باقی تفصیل بھی درست ہے۔"

"اس کو کہتے ہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑے بلکہ دو بار پڑے۔ ابھی راجواڑے کے طلسم سے نکل کر گھر بھی نہیں پہنچے کہ یہ سجاد والا سیاپا سامنے آ گیا اور اب یہ اشتہار والا ٹینٹا کھڑا ہو گیا ہے۔"

"کہیں اس کا تعلق راجواڑے والے واقعات سے تو نہیں... میرا مطلب ہے جارج اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی موسٹ؟ یہ اشتہار انگریزی کے اخبار میں چھپا ہے۔ اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہو سکتی ہے۔"

"نہیں تابی! میں نہیں سمجھتا کہ اس کا تعلق راجواڑے والی مار دھاڑ سے ہوگا۔ مجھے اس میں کسی اور معاملے کی بُو آ رہی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے باس... سرکس کے مالک جان محمد صاحب تمہاری تلاش میں سرگرداں ہوں؟"

"وہ ایسے اشتہاری انداز میں اتنی بھاری رقمیں خرچ کر کے مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اشتہار ایک اخبار میں نہیں کئی اخباروں میں آیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں بھی دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ یہ اشتہار پہلی بار ہی آیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ گاہے بگاہے چند ہفتوں یا مہینوں سے دیا جا رہا ہو۔"

"کہیں ہماری بے خبری میں ہمارا کوئی سودا وغیرہ ہی نہ ہو جائے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"ہاں، اگر سودا کرنے والی کوئی ارب پتی بیوہ یا راجکماری وغیرہ ہو تو "بکنے" میں کوئی ایسا حرج بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس راجکماری کی کوئی بہت خوب صورت کزن بھی ہو۔ اس کا ٹانکا تم سے جڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں، باقی زندگی عیش آرام سے گزار سکتے ہیں۔ ایسی عورتیں اپنے پیارے رکھیلوں کو بڑے مزے کرواتی ہیں۔ میں پہلے بھی ایک ایسے خوب صورت تجربے سے گزر چکا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خوب صورت تجربے کے شوہر یا ابا وغیرہ نے تمہاری ایسی تیسی کرنے یا پھر جنس ہی تبدیل کروانے کے لیے یہ اشتہار چھپوایا ہو۔"

"کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔"

وہ بظاہر میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا مگر اس کی خوب صورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مسلسل سوچ بھی رہا ہے۔ یہ معاملہ اس کے لیے بھی انوکھا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد سجاد موبل دوبارہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ صرف اس کے مسلح ماتحت ہی تھے۔ موبل کے چہرے پر دبا دبا جوش صاف دکھائی دیتا تھا۔ موبل کی ہدایت پر ہمارے ٹارچر سیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ کم از کم تین رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہم کسی طرح کی مہم جوئی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں ایک برآمدے سے گزار کر نہایت آرام دہ کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک شاندار ڈبل بیڈ، فریج اور الیکٹرک ہیٹر وغیرہ کی سہولت یہاں موجود تھی۔ ڈیکوریشن پیس کے طور پر شیشے کی ایک برہنہ مورتی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں اس کمرے میں داخل کر کے دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ عاصمہ کا دیا ہوا موبائل عمران کی جیب میں تھا۔ ہم نے شکر کیا کہ دوبارہ ہماری تلاشی



نہیں ہوئی تھی۔

عمران نے بہت پوچھا کہ یہ لطف و کرم اور عنایت کس سلسلے میں ہے لیکن موبل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس معنی خیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔

ہمارے اگلے چوبیس گھنٹے بڑی اچھی طرح گزرے۔ نہ صرف ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کیا گیا بلکہ نئے کپڑے بھی دیے گئے۔ شیو اور غسل کے سارے لوازمات پہلے ہی کمرے کے واش روم میں موجود تھے۔

عمران بولا۔ "ہو سکتا ہے یہ واقعی کسی راجکماری کا چکر ہو یار۔ مجھے بڑے عرصے سے شوق ہے کسی راجکماری کے کام آ کر اغوا ہونے کا اور اپنی تمام مردانہ دلکشیوں کے ساتھ اس کی "خدمت" کرنے کا۔"

"میں پھر وہی بات کہوں گا۔ اگر کوئی "راجکمارا" ہوا اور اس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ چکانا ہوا تو پھر؟ میں تو یونہی حالت میں مارا جاؤں گا۔"

"تم مرنے کے پیسے لے لینا یار مگر اس طرح کی مایوس کن باتیں نہ کرو۔ اور کیا پتا تمہاری یہ ساری بدگمانیاں دور ہو جائیں اور ہم واقعی کسی اچھے مقصد کے لیے اشتہاری قرار پائے ہوں۔"

"تمہارے کرتوت تو کبھی ایسے نہیں رہے۔ تم نے خود کو [illegible] ہے، سرکس میں آنے کے بعد تم ہر طرح کے لوگوں سے ہر طرح کے پنگے لیتے رہے ہو۔ کیا پتا، کوئی ایسا ہی پنگا پھر سے [illegible] ہو گیا ہو۔"

"میڈم صفورا ایسے حالات میں بڑے صائب مشورے دیتی ہے لیکن افسوس وہ بھی نہیں ہے۔ کاش، ہم اس کو بھی اپنے ساتھ ہی یہاں لا سکتے۔"

"تو اب پھنسوا دو اسے۔ اس بندے کا پتا بتا دو جس کے ذریعے کپتان اجے نے ہوٹل میں ہمارے کمرے بک کروائے تھے۔ یہ تمہارا یار ڈی ایس پی چنگیز خان نہ صرف ہم بلکہ اسد اور نوری، صفیہ وغیرہ کو بھی یہاں لے آئے گا۔ پھر سارے مل کر روئیں گے۔"

"بس ہر بات کو رونے کی طرف لے جانا۔" عمران نے برا سا منہ بنایا۔

اسی دوران میں عمران کی جیب میں پڑے موبائل فون نے وائبریٹ کیا۔ عمران نے احتیاط سے موبائل نکالنے کے بعد میسج چیک کیا۔ یہ ڈی ایس پی کی جواں سال بیٹی عاصمہ کی طرف سے ہی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "بھائی جان! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو باہر والے کمرے سے نکال کر

## انداز ہمدردی

بس میں بہت زیادہ رش تھا۔ ایک بزرگ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے ڈنڈا پکڑ کے کھڑے تھے۔ قریب ہی سیٹ پر ایک نوجوان کھڑکی پر سر ٹکائے سو رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اس خیال سے اسے جگانے کی کوشش کی کہ کہیں اس کا اسٹاپ نہ نکل جائے۔ نوجوان آنکھیں کھولے بغیر بولا۔ "میں سو نہیں رہا، تم اپنا کام کرو۔"

"سو نہیں رہے تو پھر اس طرح آنکھیں بند کیے کیوں بیٹھے ہو؟" کنڈیکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"میں بزرگ کو کھڑے ہو کر سفر کرتے نہیں دیکھ سکتا۔" نوجوان نے جواب دیا۔

ملیر (کراچی) سے محمد عزیر کا جذبۂ ہمدردی

## سبحان اللہ

حضرت علیؓ ایک دشمن سے جنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے تلوار کا زور سے وار کیا اور اس کی تلوار دو ٹکڑے کر دی۔ آپؓ غیر مسلح شخص پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اس لیے فوراً ہاتھ روک لیا۔ وہ شخص کہنے لگا۔ "مجھے تلوار دو میں مقابلہ کروں گا۔" آپؓ نے اسے تلوار دی۔

وہ حیران ہو کر بولا۔ "تعجب ہے، آپؓ خود غیر مسلح ہو گئے۔"

آپؓ نے جواب دیا۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے مانگنے والے کا سوال رد کیا ہو۔ تم نے مجھ سے تلوار مانگی، میرے پاس ایک ہی تلوار تھی اس لیے میں نے وہ تمہیں دے دی۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "وہی اللہ جس نے اب تک تمہیں مجھ سے بچایا ہے۔" یہ سن کر وہ شخص اسلام لے آیا۔

وسیم خان، کوئٹہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انیکسی میں لے آئے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا ہے۔ سجاد اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سمارہے کہ انہوں نے آپ کو دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن مجھے سب پتا ہے۔ اگر آپ خود نہ چاہتے تو وہ آپ کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ آپ اپنے وعدے کا پاس کررہے ہیں اور اس کے لیے آپ نے خود کو ایک بڑی مصیبت میں ڈال لیا ہے۔ کاش، یہ وعدہ ہمارے درمیان نہ آیا ہوتا۔ اور اگر آیا تھا تو پھر یہ صورتِ حال ہی نہ بنتی جواب بنی ہے۔ آپ کا اور سجاد کا آمنا سامنا ہی نہ ہوتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ اللہ کرے میں ہی مرجاؤں اور آپ پر سے یہ بلائل جائے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بتائیں میں کس طرح آپ کی مدد کروں؟''

عمران نے جواب میں لکھا۔ ''گھبراؤ مت۔ تمہاری مدد کے بغیر ہی مدد پہنچ رہی ہے اور اس کا ایک ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ ہم اس نارچر سیل سے اس آرام دہ مہمان خانے میں آگئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آگے اور ترقی کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے ایس ایم ایس کا سلسلہ موقوف کردیا۔ میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ وعدے وغیرہ کا کیا معاملہ ہے؟ یہ کیسا وعدہ تھا جس کی وجہ سے تم نے اس مگرمچھ کے جبڑوں میں اپنا سر دیا ہے؟''

''عشق پر کسی کا زور نہیں غالب... تمہیں بتایا تو ہے اسے دیکھ کر میرے دل کو کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو میں اب تک سہرا باندھ چکا ہوتا۔ اب بھی میں نے اسے آفر دے رکھی ہے کہ اگر وہ اپنے کھڑوس شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو سیکنڈ آپشن کے طور پر میں حاضر ہوں۔''

''میں جانتا ہوں یہ بات تم صرف مذاق میں کرتے ہو اور عاصمہ بھی یہ بات سمجھتی ہے۔''

''تمہارے جیسے دوست کے ہوتے ہوئے بندے کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی... شیکسپیئر نے اپنی ایک پنجابی نظم میں لکھا ہے کہ اے فرینڈ ان نیڈ از فرینڈ ان ڈیڈ... اس کا مطلب یہ ہے کہ...''

وہ پھر پٹڑی سے اتر گیا تھا لیکن اس بار میں بھی پٹڑی سے اتر گیا۔ میں نے اسے بے نقط سنائیں۔ میں نے کہا کہ وہ ہر بات کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے ہر وقت مخمصے میں رکھنے کی اسے عادت پڑ گئی ہے۔ میں اب یہ عادت مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ مجھے جب واقعی غصہ آجاتا تھا تو وہ فوراً سنبھل جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے حسبِ عادت فوراً ہاتھ جوڑ دیے اور اتنے مسکین لہجے میں مجھے منانا شروع کیا کہ میں اپنا غصہ برقرار نہ رکھ سکا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تانی! یہ ہماری مشرقی عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بس جس کے پلے بندھ گئیں، بندھ گئیں۔ ڈی ایس پی سجاد ہرگز اچھا شوہر نہیں لیکن عاصمہ کے لیے تو سب کچھ وہی ہے۔ وہ اس کی مار بھی کھاتی ہے اور پوجا بھی کرتی ہے... اس کی ترقی اور بھلائی کی دعائیں اس کا معمول ہیں۔ جس رات میں سجاد کو سبق سکھانے کے لیے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا، عاصمہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے بجا طور پر یہ خدشہ لاحق تھا کہ آج رات سجاد خودکشی کرلے گا یا کثرتِ شراب نوشی سے موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ عاصمہ کی گریہ زاری دیکھ کر پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے سجاد کو گرفتاری دے دی۔ یہ گرفتاری ایک ایسے بے بدل ٹانک کی طرح تھی جس نے سجاد کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے ابھارا اور اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کردیا۔ میرے خیال میں تمہیں یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہوگا لیکن اس بات کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ اس رات، ٹوٹے پھوٹے اور اپنی ہی آگ میں راکھ ہوتے سجاد کے لیے میری گرفتاری کتنی ضروری تھی... میری گرفتاری کے دسویں بارھویں روز عاصمہ برقع پہن کر رازداری کے ساتھ مجھ سے ملنے جیل آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ روتے ہوئے میرے قدموں پر سر رکھ دیتی۔ وہ میری رہائی کے بارے میں بہت فکرمند تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ میں اس سنگین معاملے سے کس طرح نکل پاؤں گا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ایک مسئلہ بھی لے کر آئی تھی۔ اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ جھانسی کی ایک پیر زادی سیدہ جویریہ رضوی کی انتہائی معتقد ہے اور ان سے راہنمائی لیتی ہے۔ سیدہ جویریہ استخارہ کرتی تھیں اور فال وغیرہ نکالتی تھیں۔ انہوں نے عاصمہ سے سارے حالات معلوم کرنے کے بعد ایک خاص بات بتائی تھی اور وہ یہ کہ جس بندے کی بے لوث قربانی اور ہمدردی کی وجہ سے سجاد موبل خطرناک مایوسی اور ابتلا کے دور سے نکلا ہے، وہی بندہ کسی دوسرے موقع پر سجاد کی زندگی کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا ہے... اس لیے سجاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ آئندہ اپنے اس محسن سے دور رہے یا پھر وہ محسن اس بات کا خصوصی خیال رکھے کہ ان دونوں کی ملاقات دوبارہ نہ ہونے پائے۔ اور اگر ایسا ہو ہی جائے تو پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محتاط رہیں...

''اپنی فال ہی کے ذریعے اس مستقبل بیں خاتون





''یار! میرا خیال تھا کہ ہم راستے میں کچھ نہ کچھ کر گزریں گے اور شاید کسی مناسب طریقے سے سجاد سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوجائیں۔ لیکن تم نے دیکھ ہی لیا، اس نے گاڑی میں ہماری کوئی بات سنی اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی موقع دیا۔ پھر تمہارے پاؤں میں بھی اچانک ہی زنجیر ڈال دی گئی۔ جہاں تک کیس کے سنگین ہونے کا تعلق ہے، میرا نہیں اندازہ تھا کہ یہ اتنا سنگین ہے۔ میں نے پروڈیوسر منوج کو صرف زخمی کیا تھا... جان سے نہیں مارا تھا۔ اب یہ لوگ اسے قتل کہہ رہے ہیں لیکن یہ کسی طور قتل نہیں بنتا... اور اب تو... یہ ویسے بھی کوئی دوسرا کیس بنتا جارہا ہے۔'' عمران نے کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔

''دوسرا کیس؟''

''جگر! یہی اشتہار والا معاملہ۔ جس طرح ہمیں ایک دم حوالاتی سے وی آئی پی بنا دیا گیا ہے، مجھے لگتا ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یہ وہی ٹریٹ منٹ ہے جو بکروں کا مالک قربانی کے بکروں کو دیتا ہے۔''

کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ تھی۔ کوئی عورت ادھر آرہی تھی۔ امکان تھا کہ یہ عاصمہ ہی ہوگی۔ یہ امکان درست نکلا۔ وہ اس مختصر لاؤنج میں آگئی جو ہمارے کمرے کے سامنے واقع تھا۔ یہاں حوالدار فیاض چوکس حالت میں موجود تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی لیکن اس کی توجہ ہماری ہی طرف تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور رنگت اڑی اڑی تھی۔ وہ دراز قد اور خوش شکل تھی۔ کھلی ہوئی رنگت، تھوڑے سے ابھرے ہوئے رخسار اور ستواں ناک میں لونگ کی مدھم چمک۔ وہ ہاتھ کا بنا ہوا لمبا اونی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گلابی رنگ کی گرم شال کوٹ کے ہم رنگ تھی۔ میں نے اسے خاصی توجہ سے دیکھا۔ عمران نے بتایا تھا کہ عاصمہ میں کسی حوالے سے شبانہ کی ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ وہی شبانہ جس نے شبّو بن کر عمران کے دل پر راج کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ہم سے بات کرنا چاہتی ہے مگر حوالدار فیاض اور ہیڈ کانسٹیبل کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل تو قدرے دور تھا مگر حوالدار بالکل ہمارے سر پر موجود تھا۔ حوالدار کی توجہ ذرا دوسری طرف ہوئی تو عاصمہ نے بڑے التجائی انداز میں عمران کو اشارہ کیا۔ وہ اس سے درخواست کررہی تھی کہ وہ موبائل فون آن کرے۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ واپس چلی گئی۔

کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد عمران نے

ے عاصمہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور میں چند دن کے اندر ہی خود کو قانونی گرفت سے بچانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ جیل میں ہونے والی اس ملاقات میں عاصمہ نے رو رو کر مجھ سے فریاد کی کہ میں اس سے ایک وعدہ کروں۔ آئندہ اگر کبھی میرے اور سجاد کے درمیان تصادم یا ٹکراؤ کی کوئی بھی صورت پیدا ہوئی تو میں خود کو روک لوں گا اور اس تصادم سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔

''میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شوہر پرست عورت اس وقت شدید دباؤ میں ہے اور اس کا شکار ہے۔ میں نے اس کی تشفی کے لیے اس سے وعدہ کیا کہ بالفرض کبھی اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا ہوئی تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ وہ اس طرح مانی نہیں تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا... میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں۔ اور میں نے اس کی خاطر قسم کھالی۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ پیشین گوئیاں بھی کبھی درست بھی ثابت ہوجاتی ہیں لیکن ان کی کوئی سائنسی بنیاد تو نہیں ہے یار۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سجاد موبل سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ لیکن جب پارک ویو ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے میں نے اچانک اسے دیکھا اور اس نے مجھے تو میرے ذہن میں وہ تمام باتیں تازہ ہوگئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا دیا ہوا قول بھی۔''

عمران نے ذرا سا توقف کیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''وہ سچویشن تم نے بھی دیکھی تھی۔ سجاد موبل اس وقت غصے سے دیوانہ ہورہا تھا۔ ایسا شخص شدید تناؤ میں دوسروں کو یا پھر خود کو شدید نقصان پہنچالیتا ہے۔''

عمران نے بات ختم کی اور پُرسوچ انداز میں سگریٹ کے لمبے کش لینے لگا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی باتیں بھی انوکھی تھیں۔

دو سال پہلے وہ بمبئی شہر کی ایک پُرفسوں رات میں ایک عورت کی حالتِ زار سے متاثر ہوا تھا... اس کے لیے ایک انوکھی قربانی دی تھی اور پھر اس سے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ عورت اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی اس سے اسے کوئی مطلب تھا۔ وہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا فائدہ بھی لینا نہیں چاہتا تھا مگر اس سے کیا ہوا عہد اسے یاد تھا۔ اس عہد کی خاطر اس نے خود کو بے ورلغ مشکل میں ڈال دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری منطق نرالی ہے یار... اور سچی بات یہ ہے کہ پوری طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ تمہیں پتا تھا کہ تم ایک سنگین کیس میں ملوث ہو اور پولیس کی کسٹڈی سے بھاگے ہوئے بھی ہو پھر بھی...''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موبائل آن کرلیا۔ چند ہی منٹ بعد موبائل نے وائبریٹ کیا اور عاصمہ کا میسج آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''بھائی جان! آپ مجھے کیوں اتنی سخت سزا دے رہے ہیں۔ آپ صرف میری خاطر اس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں اور مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے ہیں۔ سجاد پتا نہیں کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کل سے تھانے بھی نہیں گئے۔ ایک لینڈ کروزر پر کچھ لوگ شام کے وقت سجاد سے ملنے آئے تھے۔ ان میں ایک بندہ کسی یورپی کنٹری کا لگتا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹا یہاں رہے۔ پھر سجاد کا دوست جگدیش ان کے ساتھ چلا گیا۔ یہ جگدیش مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس کے رابطے غلط لوگوں سے ہیں۔ پلیز! مجھے جواب دیں۔''

عمران نے لکھا۔ ''تم خود کو خطرے میں نہ ڈالو اور اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ رہو۔ جب بھی کوئی خوب صورت لڑکی میری خاطر خود کو خطرے میں ڈالتی ہے، میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ خاص طور سے منگل اور بدھ کو ایسا ہوتا ہے۔ اور آج منگل ہے... میں اپنی حفاظت کرلوں گا۔ پلیز! اب رابطہ نہ کرنا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ خدا حافظ۔''

اس میسج کے بعد عمران نے فون حتمی طور پر بند کر دیا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عاصمہ نے کسی غیر ملکی کی بات کی ہے۔''

''ہاں، یہ قابلِ غور بات ہے۔''

ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ دو بڑی جیپیں کوٹھی کے ڈرائیوے پر نظر آئیں اور پورچ میں آ کر رک گئیں۔ ان میں سے ایک شاندار لینڈ کروزر جیپ کے شیشے سیاہ تھے۔ گاڑیوں میں سے آٹھ دس افراد اترے۔ ان میں کچھ مسلح تھے اور کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کے اہلکار لگتے تھے۔ ان کمانڈو ٹائپ اہلکاروں نے تاریک شیشوں والی عینکیں لگا رکھی تھیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ سادہ شیشوں والی لگژری جیپ میں سے دو سوٹڈ بوٹڈ افراد اترے۔ ان میں سے ایک کے بال سفیدی مائل تھے۔ بہرحال، ہم ان کی صورتیں ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے۔ سجاد موبل اور جگدیش پہلے سے پورچ میں موجود تھے۔ انہوں نے مہمانوں کا استقبال کیا اور انہیں کوٹھی کے اس حصے میں لے آئے جہاں ہم موجود تھے۔

''لگ رہا ہے کہ اب ہمارا چل چلاؤ ہے۔ یہ موبائل فون کہیں چھپا دینا چاہیے۔'' عمران نے کہا۔

میں نے جلدی سے ایک چھوٹے صوفے کو ترچھا کیا اور اس کے نیچے کا کپڑا بلیڈ سے ذرا سا کاٹ کر موبائل سیٹ اس میں گھسا دیا۔

دو تین منٹ بعد بھاری قدموں کی چاپوں سے کمرے کے سامنے والا لاؤنج گونج اٹھا۔ حوالدار فیاض نے کمرے کے دروازے کو ''اَن لاک'' کیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ ہماری طرف کوئی گن ''پوائنٹ'' نہیں کی گئی تھی۔ گنیں اہلکاروں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن کسی بیرل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ تھری پیس سوٹ والا ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور سپاٹ لہجے میں ہم دونوں سے ہمارے نام پوچھے اور ولدیت دریافت کی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چھپانے سے فائدہ نہیں۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے بارے میں مکمل معلومات موجود تھیں۔ عمران کی ٹیمیں کی آستین اٹھا کر اس کے بازو پر پرانے کٹ کا ایک نشان دیکھا گیا۔ اسی طرح میرے کندھے پر، گردن کے قریب دو تل تلاش کیے گئے۔ یہ تل شناختی کارڈ میں علامت کے طور پر موجود تھے۔

ادھیڑ عمر شخص نے شستہ اردو میں کہا۔ ''امید ہے کہ آپ دونوں ہم سے تعاون کریں گے۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم آپ سے آپ کے بارے میں پوچھیں۔''

''آپ کو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن فی الحال ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ ہمیں عارضی طور پر آپ دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھنا ہوگی۔'' ادھیڑ عمر شخص نے پھر شائستہ لہجے میں کہا۔

''اگر ہم انکار کریں تو پھر؟'' عمران نے کہا۔

''ہمیں افسوس ہوگا کہ آپ ہمارے دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہے۔''

''اوکے۔'' عمران نے کہا۔

ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھی گئیں۔ دو افراد نے ہم دونوں کو بازوؤں سے پکڑا اور لے کر چل دیے۔ ہمارے عقب میں اور دونوں طرف کم و بیش آٹھ مسلح افراد موجود تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ زبردست تربیت یافتہ ہیں۔ ہمیں پورچ میں لا کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ اگلی گاڑی تھی اور وہی تھی جس کی کھڑکیوں میں تاریک شیشے تھے۔

ہمارا سفر شروع ہوا۔ ہمارے گرد مسلح افراد موجود تھے اور وہ بالکل خاموش تھے۔ ادھیڑ عمر شخص بھی اسی گاڑی میں موجود تھا اور وہ اگلی نشست پر تھا۔ عمران نے راستے میں ایک دو سوال پوچھنے کی کوشش کی مگر ادھیڑ عمر شخص کا رویہ اب پہلے سے زیادہ خشک ہو چکا تھا۔ اس نے عمران کو فی الوقت





خاموش رہنے کی ہدایت کی...

ہم الٰہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزر کر قریباً پون گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ یہ منزل بھی کوئی رہائشی عمارت ہی تھی۔ یہاں رکھوالی کے بڑے..... کتے موجود تھے اور ماربل کے فرش پر لوگوں کے ٹھک ٹھک چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک دو افراد کو انگریزی بولتے بھی سنا۔ ان میں سے ایک یقیناً کوئی غیر ملکی خاتون تھی۔ اس عورت نے عمران کو دیکھ کر حیرت اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا... اس کے الفاظ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آ سکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمیں ایک اور گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرک نما گاڑی تھی... تاہم نشستیں نہایت آرام دہ تھیں۔ اس موقع پر عمران نے اپنی پٹی اتارنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک سکھ گارڈ نے پنجابی لہجے میں کہا۔ ''نہیں، ابھی نہیں جی۔ ابھی سرجی کا آرڈر آئے گا تو پٹی ہٹا لیجیے گا۔''

ہمارے اندازے کے مطابق گاڑی میں شاید گتے کے بہت سے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گاڑی پہلے سے یہاں ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔

دو تین منٹ بعد ایک انٹرکام جیسی آواز سنائی دی۔ ''اب آپ اپنی پٹیاں ہٹا سکتے ہیں۔''

ہم دونوں نے پٹیاں ہٹا لیں اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اردگرد دیکھا۔ ہم ایک چھوٹے سائز کے کنٹینر میں تھے۔ تاہم یہ کوئی عام کنٹینر نہیں تھا۔ اس کا انٹیریئر زبردست تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس کیبن میں سفر کر رہے ہیں... ایک طرف ایک لمبا سائز کا ریفریجریٹر بھی موجود تھا اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے آکسیجن کے سلنڈر بھی رکھے تھے۔

عمران نے کنٹینر کی دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کنٹینر کی بیرونی دیواریں نہیں ہیں۔ یہ ڈبل دیواروں والا کیبن تھا۔ یعنی اگر ہم اندرونی دیوار کو پیٹنا بھی شروع کر دیتے تو شاید باہر تک اس کے اثرات نہ پہنچ پاتے۔ اس چھوٹے چوڑے اور قریباً آٹھ فٹ لمبے کیبن میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کیبن کی ایک دیوار گتے کے اسٹائلش ڈبوں کی تھی۔ یہ ڈبے فرش سے چھت تک چنے ہوئے تھے۔ عمران نے ان ڈبوں پر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھنا شروع کیا۔ ''ہارڈ ویئر زاینڈ اسپیریز فارمان کمپنی لمیٹڈ الٰہ آباد۔''

عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ کمپیوٹرز کے پرزہ جات ہیں جو فیکٹری سے کسی مارکیٹ میں پہنچائے جا رہے ہیں۔''

''اور ہمیں ان کی آڑ میں پہنچایا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

میری آواز ذرا بلند تھی۔ عمران نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری آواز سنی جا رہی ہے۔

دفعتاً انٹرکام نما آلہ پھر جاگ اٹھا۔ کسی مقامی شخص نے ریڈیو اناؤنسر کی سی آواز میں کہا۔ ''فریج میں آپ کے کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ دائیں طرف شیلف پر اوون پڑا ہے جس میں آپ کھانا گرم کر سکتے ہیں۔ بائیں طرف جو چھوٹا دروازہ نظر آ رہا ہے، وہ واش روم کا ہے۔ پانی محدود ہے اس لیے آپ کفایت سے استعمال کریں۔''

''لیکن ہم...'' عمران کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ انٹرکام بند ہو چکا تھا۔

''ہیلو... ہیلو۔'' عمران نے ایک دو مرتبہ کہا پھر گہری سانس لے کر لگژری بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

''لگتا ہے ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

عمران نے ٹانگ سے فریج کا دروازہ کھولا اور اندر موجود کھانے پینے کی اشیا کو دیکھ کر بولا۔ ''ان چیزوں کو دیکھا جائے تو پھر چار پانچ دن کا سفر تو بنتا ہی ہے۔''

''لیکن اگر تمہاری بھوک کو دیکھا جائے تو پھر کچھ کم بنتا ہے۔''

''تمہیں زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں بچے۔ کھٹمنڈو پہنچ کر بولتی بند ہو جائے گی... وہاں کڑاکے کی سردی ہو گی۔''

''یہ کھٹمنڈو بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

''بھئی جس جگہ سے ہم چلے ہیں اور جدھر کا ہمارا رخ ہے، ہم چار پانچ دن میں کھٹمنڈو تو پہنچ ہی جائیں گے... نہ ہوا تو تبت ہوگا یا پھر سن کیانگ وغیرہ۔ کیوں جی، ایسا ہی ہے نا برادرز۔'' عمران نے آخری الفاظ کنٹینر والوں کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کنٹینر بڑی رفتار سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی موٹروے جیسی سڑک پر جا رہا ہے۔ عمران نے اداسی بھرے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

مجھ پر بھی اداسی سوار ہو رہی تھی۔ بالو بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ وہ معصوم ماں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے تو جدا ہو ہی چکا تھا، اب مجھ سے بھی دور تھا۔ بہر حال، مجھے میڈم صفورا کی ہوشیاری اور اسد کی دلیری سے خاصی توقعات تھیں۔ امید تھی کہ وہ حالات کا مقابلہ کریں گے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ انہیں اجے کا تعاون بھی حاصل تھا۔

کپتان اجے کا خیال آتے ہی وہ سارے واقعات ذہن میں اودھم مچانے لگے جو صرف چند روز پہلے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمارے ساتھ پیش آچکے تھے... ایسا لگتا تھا کہ ہم 1857ء کی جنگِ آزادی کے دور سے ایک دم جدید دور میں لوٹ آئے ہیں۔ قاسمیہ کے پرانے قلعے کے اردگرد ہونے والی خوں ریز لڑائی، آگ، دھواں، بارود، تلواروں کی جھنکار... اور پھر اس سے پہلے اسٹیل اور منیارڈ کی موت، سولیاں چڑھائے جانے کے مناظر اور بازاروں میں ہونے والی قتل و غارت اور عصمت دری۔ وہ سب واقعات آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

وہ سب کچھ اب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا لگتا تھا۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

"اسٹیٹ کی لڑائی کو یاد کر رہا ہوں... اور تم؟"

"میں لاہور کو یاد کر رہا ہوں۔ لگتا ہے اپنا ملک اور اپنا شہر دیکھنے کی حسرت پھر دل میں ہی رہ جائے گی۔ ہائے پاکستان... ہائے لاہور۔"

☆☆☆

ہمارے اگلے پانچ روز ایک انوکھے تجربے جیسے تھے۔ ہم نے یہ پانچ دن ایک چھ ضرب آٹھ فٹ کے کیبن میں گزارے تھے... اور یہ کیبن تقریباً دن رات حرکت کرتا رہا تھا۔ کبھی ہموار سڑکوں پر، کبھی بہت ہموار سڑکوں پر۔ ہم کہاں سے گزرتے رہے تھے، ہمیں کچھ خبر نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ باہر سے کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی... نظر کا راستہ بھی یکسر مسدود تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا واحد رابطہ وہ انٹر کام تھا جس کے ذریعے کبھی ایک مرد اور کبھی ایک عورت ہمیں مخاطب کرتے تھے اور یہ رابطہ بھی دن میں صرف ایک آدھ بار ہی ہو پاتا تھا۔ ہمارا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے پانچویں روز یہ سفر اختتام کو پہنچا۔ عمران کی رسٹ واچ شام ساڑھے پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ پانچ روز بعد پہلی بار ہمارے لگژری کیبن کا دروازہ کھلا اور ہمیں کسی آدم زاد کی صورت نظر آئی۔ اس آدم زاد کے پیچھے ایک اور آدم زاد بھی تھا جس کے ہاتھ میں خطرناک "اے کے 56" رائفل تھی... ہم سے بڑے شائستہ لیکن فیصلہ کن لہجے میں ایک بار پھر درخواست کی گئی کہ ہم اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا لیں۔ اس درخواست کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہماری آنکھوں پر سیاہ ریشمی پٹی باندھ دی گئی۔ مسلح کمانڈوز ٹائپ افراد نے ہمیں بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ ہمارے اردگرد بہت سے بوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ موسم خاصا ٹھنڈا تھا۔ قریباً پچاس میٹر پیدل چلانے کے بعد ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا اور آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ ہم باقی سب باتیں فراموش کر کے اندازے لگانے میں مشغول ہو گئے کہ ہم کس مقام پر ہیں۔ یہ انڈیا تو ہرگز نہیں تھا۔ کمرے کی ڈیکوریشن اور دیگر اشیا سے بھی کچھ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمارے اردگرد موجود افراد تو کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ ورنہ ان کی زبان اور لہجے سے کوئی قیافہ لگایا جاتا۔

عمران نے پوچھا۔ "کیا خیال ہے، انڈیا، نیپال یا چائنا؟ ویسے مجھے تو ماحول کچھ کچھ نیپال جیسا لگتا ہے۔ اور یہ پینٹنگ دیکھو۔ اس میں بھی کچھ ایسا ہی رنگ ہے۔"

"لیکن یہ فرش دیکھو... یہ ماربل ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق کھٹمنڈو وغیرہ میں اچھے ہوٹلوں کے فرش اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں اور یہ پردوں کا اسٹائل... یہ بھی کچھ دکھنی ٹائپ کا ہے۔"

اچانک عمران کی نظر ایک دیوار گیر الماری پر پڑی۔ وہ اس کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا بالائی سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک اسٹائلش ایگزاسٹ فین نظر آ رہا تھا۔ عمران نے اس فین کی پلاسٹک جالی سے باہر جھانکا۔ پھر بے اختیار پکار اٹھا۔

"اوئے ہوئے ہوئے۔" اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"خود دیکھ لو اوپر آ کر۔"

میں نے عمران کی تقلید کی اور الماری کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا ایگزاسٹ فین کی جالی تک پہنچا۔ میں دنگ رہ گیا۔ اس دوسری منزل سے بلند درختوں کے پیچھے مجھے جو منظر نظر آیا، وہ مینارِ پاکستان کا تھا۔ مینارِ پاکستان کا اوپر والا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ لاہور کا جانا پہچانا آسمان تھا۔ یہ لاہور تھا... شام ڈوب رہی تھی۔ سرخ افق پر پتنگیں ڈول رہی تھیں...

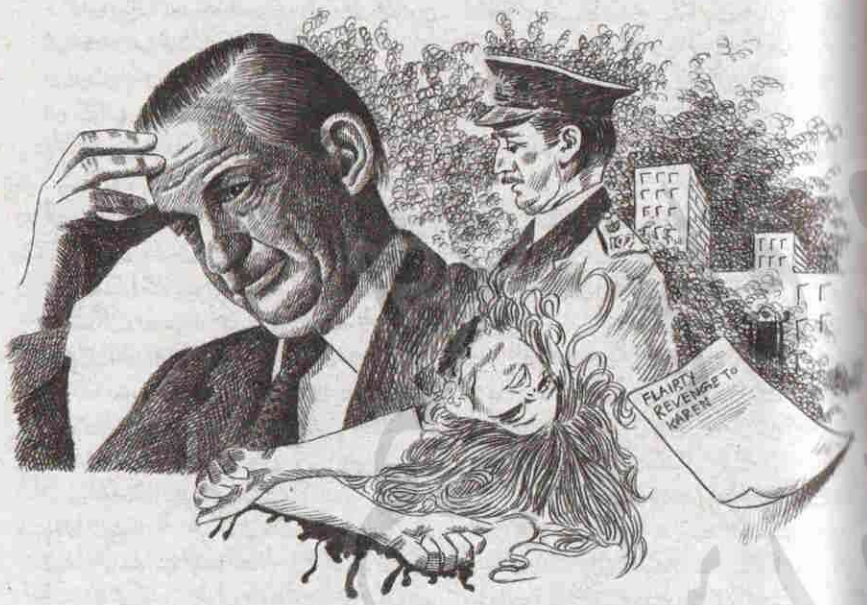
خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں





# گمشدہ سر

مختار آزاد




کوئی خرابی یا خطا... اس نوعیت کی ہوتی ہے... جو انسان کو درست راہ پر لے آتی ہے... یا پھر اس کی شخصیت میں کوئی بڑا بگاڑ پیدا کر کے اسے یکسر تبدیل کر دیتی ہے... کسی کی خطا... کسی کی جزا... ایک خطا کار کی ایسی ہی غلطی جس کا خمیازہ نہ صرف اسے بلکہ دوسروں کو بھی بھگتنا پڑا...

**ڈراما نگاری اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے قارئین کے لیے ایک تخلیق کار کا دل گداز قصہ**

یہ واقعہ لائبریری میں پیش آیا تھا۔

پوری یونیورسٹی میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل چکی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ہر شخص خوف زدہ اور حقیقت جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اطلاع ملتے ہی سب سے پہلے یونیورسٹی کی سیکیورٹی انتظامیہ موقع پر پہنچی۔ یونیورسٹی کے سیکیورٹی اہلکاروں نے جائے وقوعہ کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ واقعے کی اطلاع فوری طور پر پولیس کو دے دی گئی تھی، وہ بھی پہنچنے والے ہی تھے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ سب لائبریری کے داخلی دروازے پر کھڑے تھے۔ ان کے بیچ مارتھر موجود تھا۔ اُس نے ہی سب سے پہلے یہ خبر دی تھی۔ وہ یونیورسٹی لائبریری کا پارٹ ٹائم ملازم تھا۔ وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ ایوننگ شفٹ میں تعلیم بھی حاصل کررہا تھا۔ اُس کا کام کتابوں، قلمی مخطوطات، رسائل، جرائد اور بوسیدہ کتابوں کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے کاموں میں معاونت کرنا تھا۔ مجمع کے بیچ وہ گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ اسی دوران میں پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی آئیں اور ان کے عین سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ گاڑیوں میں سے کئی پولیس والے جلدی جلدی باہر نکلنے لگے۔

''کیا ہوا ہے؟'' سراغ رساں ڈیشلے اسمتھ نے مجمع کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ مرکزی دروازے پر ہجوم دیکھتے ہی اُس نے اندازہ لگالیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اُسے پہنچنا تھا۔ باقی پولیس والے ڈیشلے کے پیچھے کھڑے تھے۔ ڈیشلے دراز قد، خراٹ شکل وصورت اور خشک لہجے والا..... افسر تھا۔ وہ ان پولیس والوں کا سینئر ہی نہیں بلکہ سربراہ بھی تھا۔

''وہ... یہاں ایک پُراسرار پاؤں ملا ہے۔'' ڈیشلے کی بات سن کر مارتھر نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے اٹکتے ہوئے ادھوری بات کہی۔

''کیا...'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''لو... یہاں ایک پاؤں ملا ہے اور ہم سب قتل کی اطلاع سمجھ کے پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے اپنے ایک ماتحت افسر کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ یہ جملہ سُن کے دو تین پولیس والوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''پوری بات بتاؤ دوست۔'' وہ اپنے ساتھیوں کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرکے مارتھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ ''ایک پاؤں ملا ہے۔ اس ٹوٹے پھوٹے جملے سے ہماری سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔''

''بات یہ ہے کہ اس نے لائبریری میں ایک خون آلود پاؤں دیکھا ہے۔'' ڈیشلے کی بات سن کر فلیرٹی نے آگے بڑھ کر کہا۔ وہ لائبریری کا ایڈمنسٹریٹر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اُس کی ذمے داری ہے کہ پولیس کو تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کرے۔

''اچھا...'' ڈیشلے نے یہ سُن کر حیرت سے فلیرٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پاؤں مل گیا ہے تو وہیں چلو، یہاں کھڑے کھڑے کیا ہم جھک ماریں۔''

''مگر پاؤں تو غائب ہوچکا۔'' یہ سن کر فلیرٹی نے آہستہ سے کہا۔

''تم پاگل ہو یا مجھے پاگل سمجھ رہے ہو؟'' یہ سن کر ڈیشلے نے درشت انداز میں کہا اور فلیرٹی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آرہا ہے کہ تم دونوں بتانا کیا چاہ رہے ہو۔ ایک کہہ رہا ہے کہ پاؤں ملا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ وہ غائب ہے۔''

''بات یہ ہے کہ مارتھر نے کام کے دوران میں کتابوں کے ایک بڑے ڈبے میں خون آلود پاؤں دیکھا۔ وہ گھبرا ہوا نیچے آیا اور جب ہم وہاں پہنچے تو کتابوں کا وہ ڈبا غائب تھا۔'' فلیرٹی نے اس کی تسلی کرتے ہوئے کہا۔

''غائب کیسے ہوسکتا ہے؟'' ڈیشلے نے حیرت سے کہا۔

''وہ اس لیے کہ میں نے گھبراہٹ میں ڈبا کنویئر بیلٹ پر رکھ دیا تھا۔'' مارتھر نے مداخلت کی۔ ''جب ہم سب واپس اُس جگہ پہنچے تو کسی نے پہلے ہی کنویئر بیلٹ چلا دی اور اب آدھی بڑی لائبریری میں وہ ڈبا کہاں پہنچ چکا ہوگا، ہم میں سے کسی کو علم نہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں سراغ رساں کتے کی مدد لینی پڑے گی۔'' فلیرٹی نے ڈیشلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید نہیں کہ ہم اتنی بڑی لائبریری میں آسانی سے پاؤں والا ڈبا تلاش کرسکیں گے۔''

''تمہارے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔'' ڈیشلے نے فلیرٹی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے ہم ہیں اور یہ ہمارے کرنے کا کام ہے۔ اس لیے اب آپ مشورے دینے اور ہمیں سمجھانے سے گریز کریں گے... تو یہی مناسب ہوگا۔''

ڈیشلے نہایت ذہین پولیس افسر تھا۔ اسے اپنے کام میں کسی کی مداخلت پسند نہیں تھی اسی لیے اُس نے صاف صاف فلیرٹی سے کہہ دیا۔

''نفسیاتی مریض۔'' فلیرٹی بڑبڑایا۔ جس لہجے میں ڈیشلے نے اُسے ڈانٹا تھا، اسے وہ اپنی بے عزتی سمجھ رہا تھا۔ ویسے ڈیشلے نے حقیقت میں اس کی بے عزتی ہی کی تھی۔ فلیرٹی کو اسے یہ پولیس افسر پہلی ہی نظر میں اچھا نہیں لگا تھا۔

''چلو...'' ڈیشلے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں جائے واردات پر ہونا چاہیے، یہاں نہیں۔'' اُسے آگے بڑھتا دیکھ کر یونیورسٹی کے سیکیورٹی اہلکار، فلیرٹی، مارتھر اور پولیس والے بھی لائبریری کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ معاملہ صرف ایک پاؤں تک ہی محدود رہے گا؟'' اس نے چلتے چلتے فلیرٹی کی طرف دیکھ



ہوئے کہا۔ ''ویسے وہ پاؤں ہے کتنا بڑا؟ کچھ اندازہ ہوا کہ...''

''نہیں... میں نے ابھی تک وہ پاؤں تو دیکھا ہی نہیں ہے۔'' اُس نے قطع کلامی کی۔

''خود کو پُرسکون رکھو اور اُسے تلاش کرنے میں ہماری مدد کرو۔'' اس نے فلیرٹی کے لہجے میں پوشیدہ کرواہٹ کو محسوس کرلیا تھا۔ ''ویسے ہے بہت مزیدار بات۔ ایک پاؤں وہ بھی خون آلود۔ ذرا سوچو تو سہی کہ ایک پاؤں ڈبے میں رکھ کر جانے والا کیسے مٹک مٹک کر چل رہا ہوگا۔''

''وہ چلنے والی بھی ہوسکتی ہے۔'' یہ سُن کر فلیرٹی نے 'والی' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔'' اس نے فلیرٹی کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا۔ ''تم میں سے کسی کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ خون آلود پاؤں ہے کتنا بڑا؟ میرا مطلب ہے کہ اس طرح ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس انسان کا وہ پاؤں ہے، وہ کتنا بڑا ہوگا اور یہ کہ وہ مرد ہے یا عورت!'' یہ کہہ کر اُس نے ایک بار پھر استفساریہ نگاہوں سے فلیرٹی کو گھورا۔ ''دلچسپ بات ہے نا... آدمی اپنا ایک پاؤں کاٹ کر، دوسروں کو پریشان کرنے کے لیے اُسے ڈبے میں رکھ کر چلا جائے۔''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہنا اور کرنا چاہتے ہو؟'' فلیرٹی نے جھلا کر کہا۔ ''میں نے آج تک ایسا شخص نہیں دیکھا جس کا ایک پاؤں چرا لیا گیا ہو یا وہ رکھ کر چل دیا ہو۔ معاملہ وہ نہیں جو تم کہہ رہے ہو۔ یہ کچھ اور بات بھی ہوسکتی ہے۔''

''کچھ اور بات مگر...'' ڈیشلے نے کچھ کہنا چاہا۔

''میرے خیال میں یہ آسیبی معاملہ بھی ہوسکتا ہے۔'' وہ جھلایا ہوا تھا۔

''آسیبی معاملہ۔'' یہ سن کر ڈیشلے نے ہونٹوں کو سیٹی بجانے کے انداز میں سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ماتحت پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ ''بھئی ان کے بقول یہ کیس تو پولیس کا رہا نہیں۔ یہ آسیبی معاملہ عامل جانے۔ ہم تو جھک ماریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ دو چار قدم آگے بڑھانے کے بعد ایک بار پھر اس نے فلیرٹی کی طرف دیکھا۔ ''تم ایڈمنسٹریٹر ہو نا؟''

''ہاں... مگر تمہیں کیسے پتا؟'' فلیرٹی نے حیرت سے کہا۔

''تمہارے گلے میں لٹکے کارڈ پر لکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آہستہ سے طنزیہ ہنس دیا۔

''مسٹر ایڈمنسٹریٹر... یہ لڑکا کرتا کیا ہے؟'' اس نے مارتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارا اسٹوڈنٹ ہے اور یہاں پر پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرتا ہے۔''

''اچھا... تو یہ بھی مریخ میں ملازمت کرتا ہے۔'' ڈیشلے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر فلیرٹی کی جھلاہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا... یا پھر اُسے جھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے والے لوگوں کو جلانے میں اور مزہ آتا تھا۔

☆☆☆

مریخ، یونیورسٹی کی وسیع وعریض لائبریری کا نام تھا۔ یہ نام شروع شروع میں تو ہر سننے، پڑھنے والے کے لیے بہت عجیب وغریب تھا مگر یہ نام رکھنے میں یونیورسٹی انتظامیہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مدتوں پہلے جب یہ لائبریری تعمیر کی جارہی تھی تو اُس وقت یونیورسٹی کے پاس فنڈز کی شدید کمی تھی جس کی وجہ سے پیشکش کی گئی تھی کہ لائبریری کی تعمیر کے لیے جو شخص سب سے زیادہ عطیہ دے گا، اُسی کے نام پر عمارت کا نام رکھا جائے گا۔ اب شومئی قسمت کہ... جس کاروباری شخصیت نے سب سے بڑا عطیہ دیا، اُس کا نام مریخ تھا۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ یونیورسٹی انتظامیہ ایک لمحے کے لیے یہ بھی بھول گئی کہ کسی ادبی تحقیقی مرکز اور لائبریری کے لیے مریخ کا نام کتنا عجیب لگے گا۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد انتظامیہ نے اپنے وعدے کا پاس رکھا، یوں مدتوں سے یہ عمارت 'مریخ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر برائے لٹریچر' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

دراصل یہ بہت عرصے پہلے تعمیر کی گئی وسیع وعریض چار منزلہ عمارت تھی جس کے بُک شیلف میں متروک کتابوں اور رسائل پر مشتمل چالیس ہزار بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ پچھلی چند دہائیوں میں یہ عمارت پوری یونیورسٹی کی خستہ حال کتابوں کا گودام بن چکی تھی۔ ایسا گودام جس میں پانچ ہزار جستی ڈبے تھے جن میں اُن کتابوں اور دستاویزات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان جستی ڈبوں میں سے ہر ایک کی لمبائی چوڑائی ایک چھوٹے تابوت جتنی تھی جنہیں کئی منزلہ عمارت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لانے لے جانے کے لیے بجلی سے چلنے والی کنویئر بیلٹ موجود تھی۔ لائبریری کی بالائی منزلیں تو مکمل طور پر ان جستی تابوتوں کے باعث کتابوں کا قبرستان بن گئی تھیں۔ البتہ گراؤنڈ فلور پر طالب علموں اور محققین کے لیے تحقیق کی سہولت موجود تھی۔ فلیرٹی گزشتہ تیس سال سے اس عمارت کا ایڈمنسٹریٹر تھا۔ یہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی پہلی اور آخری ملازمت تھی۔ ویسے بھی اب وہ عمر کے جس حصے میں تھا، اُس میں نئی نوکری کی تلاش نہیں کی جاتی، ریٹائرمنٹ کے سال، مہینے اور دن گنے جاتے ہیں۔

فلیرٹی کو یہ عمارت اس لیے بھی پسند تھی کہ وہ فرصت کے لمحات میں یہاں پر تحقیق کا شوق بھی پورا کرلیتا تھا۔ اسے قدیم یورپی ادب میں دلچسپی تھی۔ قدیم یورپی ڈراما..... کی نگاری اس کا ہمیشہ سے پسندیدہ موضوع رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے تحقیقی مقالے کو کتابی شکل میں شائع کرکے کسی یونیورسٹی کو بھیجے گا کہ اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جائے۔ اس نے لگ بھگ بیس پچیس سال پہلے یہ مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ لائبریری میں آجاتا اور گھنٹوں تحقیق میں مصروف رہتا۔ کیمپس میں ہونے کی وجہ سے لائبریری رات آٹھ بجے تک کھلی رہتی تھی۔ ویسے یہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایڈمنسٹریٹر تھا اور جب چاہے یہاں پر آجاسکتا تھا۔ البتہ کئی سال سے ایک عجیب تبدیلی اُس میں رونما ہوئی تھی۔ پہلے جب وہ لائبریری میں آتا تھا تو اس کے پاس نوٹس بک اور کاغذات کے پلندے ہوتے تھے۔ وہ کتابیں تلاش کرتا، نوٹس لیتا اور پھر دوبارہ کتابوں کی تلاش میں مصروف ہوجاتا... مگر پچھلے پانچ سال سے اس کا یہ شغل ختم ہوچکا تھا۔ اب بھی وہ رات گئے تک لائبریری میں بیٹھا یورپی ڈراما نگاروں کے بارے میں کتابیں پڑھتا رہتا مگر اب نوٹس نہیں لیتا تھا۔ فلیرٹی ایک عام سا شخص تھا۔ اس کے زیادہ دوست بھی نہیں تھے اس لیے اُس کی زندگی میں ہونے والی اس تبدیلی کو کسی نے محسوس کیا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ اب وہ خالی ہاتھ لائبریری میں کیوں آتا ہے یا نوٹس کیوں نہیں لیتا؟ ویسے جب وہ ایسا کرتا تھا، تب بھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ یہاں بیٹھ کر عرق ریزی سے کس موضوع پر تحقیق کررہا ہے۔ خود فلیرٹی نے بھی اس بارے میں کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔

ہوا یہ تھا کہ کوئی چھ سال پہلے اپنی دانست میں اس نے سمجھا کہ مقالہ مکمل ہوچکا ہے۔ کئی سو صفحات پر مشتمل نہایت ضخیم مقالہ برسوں کی محنت کے بعد ہاتھوں سے لکھا تھا۔ اگرچہ وہ ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر کا استعمال بھی کرسکتا تھا لیکن بچپن میں وہ ایک پہاڑی سے گر پڑا تھا۔ جب وہ نیچے گرا تو اوپر سے لڑھکتا ہوا ایک بڑا پتھر بھی نیچے گرا۔ فلیرٹی منہ کے بل گرا تھا۔ وہ زمین پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ سر سے آگے تھے۔ فلیرٹی کو نیچے گرتا دیکھ کر وہاں موجود کئی لوگ دوڑے مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھالتے، پتھر اس کے دونوں ہاتھوں پر آگرا۔ اس حادثے کے نتیجے میں اُس کی جان تو بچ گئی البتہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بُری طرح زخمی ہوگئیں۔ انگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ کئی ماہ کے علاج کے بعد وہ ٹھیک تو ہوگیا مگر اس چوٹ کی وجہ سے وہ اب بھی دس پندرہ منٹ سے زیادہ ٹائپ رائٹر یا کمپیوٹر کی بورڈ پر انگلیاں نہیں چلا پاتا تھا۔ اکثر اوقات تو وہ گھنٹا بھر ایک ہی نشست میں بیٹھ کر قلم سے کاغذ پر لکھتا رہتا، تب بھی اس کی انگلیاں شدید درد کرنے لگتی تھیں۔

جب اس کا مقالہ مکمل ہوگیا تو اس نے سوچا کہ اسے ٹائپ کروانا چاہیے۔ اس کی تحریر بہت صاف ستھری نہیں تھی۔ اس لیے وہ یہ کام کسی کمپنی کو دینے کے بجائے ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو اس کے گھر پر بیٹھ کر کمپیوٹر پر ٹائپ کردے تاکہ اگر اس میں ترمیم یا تصحیح کرانے کی ضرورت ہو تو وہ بھی ہاتھ کے ہاتھ ہوتی جائے۔ اگر وہ چاہتا تو اسے کیمپس سے ایسا آدمی آسانی سے مل سکتا تھا لیکن وہ اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یونیورسٹی میں اس کی نوکری تعلیمی نہیں، انتظامی کیٹگری میں آتی ہے۔ اس لیے وہ ڈرتا تھا کہ اگر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس نے مقالہ لکھا ہے تو شاید یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان بُرا منائیں یا اس کا مذاق اڑائیں۔ اس لیے وہ راز کو راز رکھنے کے لیے اپنے طور پر باہر کے آدمی کی تلاش میں تھا۔ آخر ایک دن اس نے مقامی روزنامے کے سنڈے ایڈیشن میں اپنے پرائیویٹ ای میل اور موبائل نمبر کے ساتھ ایک اشتہار دیا۔ جواب میں کئی لوگوں کی درخواستیں آئیں لیکن اسے ایک لڑکی بہت مناسب امیدوار لگی۔ اس نے فون پر انٹرویو کیا اور اسے یہ کام دے دیا۔

کیرن نامی لڑکی نے مقامی یونیورسٹی سے لٹریچر میں ماسٹرز کی ڈگری لی تھی اور ان دنوں نوکری کی تلاش میں تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ، بالخصوص قدیم یورپی ڈراما نگاری سے سوجھ بوجھ اُسے بہت پسند آیا تھا۔ فلیرٹی نے شرط رکھی تھی کہ شام پانچ سے رات آٹھ بجے تک وہ یہ کام کرے گی مگر اس کے گھر پر۔ وہ بھی بخوشی تیار ہوگئی۔ فلیرٹی نے اسے بہت عمدہ معاوضے کی پیشکش کی تھی۔ کیرن کا کام مل جانے پر بہت خوش تھی۔ ایک تو رقم اور دوسرے کام بھی اُس کی اپنی دلچسپی کا تھا۔ اس نے دوسرے ہی دن سے کام شروع کردیا۔

فلیرٹی نے کیرن کو گھر کی ایک اضافی چابی بنوا کر دے دی تھی تاکہ وہ اگر اس کی غیر موجودگی میں بھی آئے تو کام میں



کوئی حرج نہ ہو۔ کیرن کئی مہینے تک نہایت دلجمعی سے مقالہ ٹائپ کرتی رہی۔ فلیرٹی بھی ہر روز ٹائپ شدہ مواد کا جائزہ لیتا اور اس میں ترمیم یا اضافہ کرتا رہتا۔ دسمبر کے اوائل میں اس کا مقالہ تکمیل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یونیورسٹی میں پندرہ دسمبر سے کرسمس کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ فلیرٹی نے اس بار کرسمس اپنی اکلوتی اور چھوٹی بہن کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا تھا جو شمالی کیرولینا کے ایک نواحی قصبے میں رہتی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ مقالہ پندرہ دسمبر سے پہلے پہلے ٹائپ ہوجائے۔'' فلیرٹی نے کافی کا کپ کیرن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اُس دن برف باری ہورہی تھی اور کیرن کھڑکی کے سامنے رکھے کمپیوٹر پر لکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے پار باہر کا منظر نہایت دلفریب تھا۔

''اوہ... کیا کہیں جارہے ہیں آپ؟'' یہ سن کر کیرن نے کی بورڈ پر چلتے ہاتھ روکے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... بہن کے ساتھ کرسمس منانے۔''

''بہت اچھا... اس سے پہلے ہی یہ کام ختم ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر اُس نے استفساریہ نگاہوں سے فلیرٹی کو دیکھا۔ ''آپ یہ مقالہ بہن کو پڑھوانا چاہتے ہیں؟''

''ارے نہیں...'' یہ سُن کر وہ ہنسا۔ ''اُسے ان چیزوں کا شوق نہیں، وہ تو بس بیس بال کی دیوانی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کافی کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھر کر کہنے لگا۔ ''دراصل میں چاہ رہا تھا کہ کام مکمل ہوجائے تاکہ تمہیں بھی پیسے دے دوں اور یہ بوجھ بھی سر سے اُتر جائے۔ ویسے بھی جب تک یہ شائع نہیں ہوجاتا، میں کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا۔''

''تو کسی پبلشر سے بات ہوئی ہے؟'' کیرن نے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں... ویسے بھی اس کے چھپنے میں مزید کئی سال لگیں گے۔''

''وہ کیوں؟'' کیرن نے حیرت سے کہا۔ ''ہے کوئی بات... اور ہاں، تم بھی بھی بھول کر کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا کہ میں نے مقالہ لکھا ہے۔''

''جانتی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

یہ ہفتے کی شام اور دسمبر کی تیرہ تاریخ تھی۔ پیر سے یونیورسٹی میں بھی یکم جنوری تک چھٹیاں ہوچکی تھیں۔ اُس شام کیرن نے مقالہ مکمل کرلیا تھا۔ ''یہ لو... دو ہزار ڈالرز اور کرسمس مناؤ شان سے۔'' فلیرٹی نے معاوضے کی آخری قسط اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اور یہ رہی آپ کے گھر کی چابی۔'' کیرن نے نوٹوں کا لفافہ پرس میں رکھا اور گھر کی چابی اس کی طرف بڑھادی۔

دوسرے دن فلیرٹی شمالی کیرولینا کے لیے روانہ ہوچکا تھا۔

کرسمس کو گزرے دو ہی دن گزرے تھے کہ اُسے ایک صبح یونیورسٹی انتظامیہ کے ایک افسر کا فون ملا۔ اس نے اسے یہ دل سوز خبر سنائی کہ... رات کے کسی پہر اچانک اُس کے گھر میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جب تک یونیورسٹی کا فائر بریگیڈ عملہ آگ پر قابو پاتا، تب تک سب کچھ جل کر راکھ ہوچکا تھا۔ ایسا کچھ بھی نہیں بچا جو قابلِ استعمال ہوتا۔ ملبا صاف کردیا گیا تھا۔ افسر نے اسے یہ بھی بتایا کہ اسے دوسرا گھر الاٹ کیا جارہا ہے۔ وہ کوشش کرے گا کہ اسے یونیورسٹی خرچ پر فرنشڈ کردیا جائے۔ افسر نے اس سے اور کیا کچھ کہا، یہ اُس کو ذرا بھی یاد نہیں۔ آتشزدگی کا سُن کر اس نے اپنا دل تھام لیا۔ آگ نے گھر کو ہی نہیں، اس کی برسوں کی علمی محنت اور اُن سب دستاویزات کو جلا کر راکھ کردیا تھا جس کی بنیاد پر اس نے مقالہ لکھا تھا۔ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تشنہ رہ گئی تھی۔

اُس واقعے کے بعد سے فلیرٹی نے بالکل چپ سادھ لی تھی۔ وہ دن گیا اور یہ دن آگیا تھا۔ کئی سال گزر چکے تھے لیکن فلیرٹی نے ایک بار بھی نہ تو مقالے کے بارے میں سوچا اور نہ ہی کبھی کچھ لکھا۔ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر، یا پھر کبھی کبھی لائبریری... یہی اس کی زندگی کا لگا بندھا محور تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ اس نے ناشتے کے بعد کافی کا کپ لیا اور اسٹڈی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں نیویارک ٹائمز کا تازہ اخبار تھا۔ کچھ دیر تک وہ اخبار پڑھتا رہا اور پھر اس نے ہفتہ وار ایڈیشن 'بک ریویو' کھول کر کتابوں پر تبصرے پڑھنا شروع کردیے۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ یہ ایک کتاب پر تبصرہ تھا، ساتھ ہی لکھنے والے کا انٹرویو بھی تھا جو دو صفحات پر مشتمل تھا۔ وہ پڑھتا جارہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا خون بھی کھول رہا تھا۔ اس نے رسالہ فرش پر پٹخا اور صوفے پر نیم دراز ہوکر گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کی کنپٹی سائیں سائیں کررہی تھی۔ کافی دیر بعد فلیرٹی کی حالت سنبھلی۔

اس واقعے کو کئی ہفتے گزر چکے تھے۔

☆☆☆

اُس دن صبح جب فلیرٹی دفتر پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ پرانے یورپی ڈراما نگاروں کی کتابوں پر مشتمل وہ ڈبے جو مدتوں سے بند پڑے ہیں، انہیں تہ خانے میں منتقل کردیا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے۔ اس نے ای میل پر دیے گئے حکم میں لائبریرین سے کہا تھا کہ کمپیوٹر ریکارڈ کے مطابق پچھلے پانچ سالوں میں ان کتابوں کو کسی نے بھی سرچ نہیں کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی افادیت کھو چکی ہیں اس لیے انہیں تہ خانے میں رکھ کر دیگر کتابوں کے لیے جگہ بنائی جائے۔ ساتھ ہی ان کتابوں والے ڈبّوں کے سیریل نمبر بھی دیے گئے تھے جنہیں تہ خانے میں رکھوانے کا کہا تھا۔

لائبریرین نے فوری طور پر مارتھر کو اس کام پر لگایا۔ ابھی وہ پہلے ڈبّے کو ہی بھگوانے کی تیاری کر رہا تھا کہ لائبریرین نے بتایا کہ ایک محقق کو آرٹ ویل کا ایک ڈراما درکار ہے۔ مارتھر نے ڈبّے کا ٹیگ نمبر دیکھا تو شومئی قسمت سے یہ وہی تھا جسے وہ تہ خانے میں بھیجنے والا تھا۔ جیسے ہی اس نے ڈبّا کھولا، اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اندر ایک خون آلود پاؤں رکھا ہوا تھا۔ انسانی پاؤں جسے یقیناً جسم سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا اور پھر ڈبّے میں رکھا گیا تھا۔ خون جم چکا تھا اور اس کا رنگ سرخ کے بجائے سیاہی مائل سرخ ہو چکا تھا۔ البتہ کتابوں پر جمے خون کی پپڑیاں دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ جب پاؤں ڈبّے میں رکھا گیا ہوگا، تب اُس سے خون بہہ رہا ہوگا۔ گھبراہٹ میں اس سے یور خنچ گیا جس سے وہ ڈبا کنویئر بیلٹ پر آ گیا مگر مارتھر اتنا گھبرا گیا تھا کہ اُس نے اس طرف بالکل توجہ نہ دی اور دوڑتا ہوا گراؤنڈ فلور پر لائبریرین کے کمرے میں پہنچا۔ یہ خبر اتنی حیرت انگیز تھی کہ چند لمحوں کے لیے وہ بھی چکرا گیا مگر پھر اس نے فلیرٹی کو انٹر کام پر اطلاع دی۔

"کسی کو کچھ مت بتاؤ، میں پہنچ رہا ہوں۔" لائبریرین کی بات سنتے ہی اس نے جلدی سے حکم دیا۔ "مارتھر کو کہو جب تک میں نہ آ جاؤں، بالکل خاموش وہیں کھڑا رہے۔"

"اوکے سر!" لائبریرین نے یہ کہہ کر فون رکھا اور چہرہ اوپر اٹھایا مگر مارتھر وہاں نہیں تھا۔

مارتھر بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے لائبریرین کو فون کرتے دیکھا تو استقبالیہ پر جا کر یونیورسٹی کی سیکیورٹی انتظامیہ کو خبر کر دی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ اونچی آواز میں یہ سارا ماجرا سنا گیا۔ اُن لوگوں نے یہ سنا تو فوراً دوسروں کو ایس ایم ایس کرنے لگے۔ فلیرٹی کا دفتر یونیورسٹی کے انتظامی بلاک میں واقع تھا۔ جب تک وہ پہنچا، تب تک یہ خبر پوری یونیورسٹی میں پھیل چکی تھی۔ جیسے ہی وہ لائبریری میں پہنچا، وہاں داخلی دروازے پر درجنوں لوگ موجود تھے۔ یونیورسٹی سیکیورٹی والے بھی کھڑے تھے لیکن انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خون آلود پاؤں کی اطلاع سن کر تماشا دیکھنے کے لیے یہاں پہنچنے والے لوگوں کو کس طرح عمارت سے دور رکھیں۔ پھر بھی وہ اپنے طور پر پوری کوشش کر رہے تھے کہ کوئی غیر متعلقہ شخص اندر داخل نہ ہونے پائے۔ فلیرٹی سے پہلے ہی سیکیورٹی انچارج نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ یوں جب وہ پہنچا، تب تک صورتِ حال بالکل بدل چکی تھی۔ خود فلیرٹی بھی پریشان تھا کہ وہ اب کس طرح اس معاملے کو سنبھال سکتا ہے۔

☆☆☆

لائبریری کا استقبالیہ وسیع و عریض لاؤنج میں تھا جس کے بیچوں بیچ نیم گول دائرے کی شکل میں استقبالیہ کاؤنٹر موجود تھا۔ یہ کاؤنٹر بھی خاصا اونچا اور بڑا تھا۔ پولیس والوں کے پیچھے تمام متعلقہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے..... سراغ رساں ڈیشلے چل رہا تھا۔ وہ استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ کر رکا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ کاؤنٹر کا چکر لگاتے ہوئے اُس کا بغور جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک میز کے نیچے سے ایک بوڑھی عورت کا سر نمودار ہوا۔ جس طرح سر نمودار ہوا تھا، وہ ڈیشلے کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ وہ جس کیس کی تفتیش کے لیے آیا تھا، وہ خاصا انوکھا تھا۔ پہلے خون آلود پاؤں کا دیکھا جانا اور پھر غائب ہو جانا... اب یہ سر۔ اگلے ہی لمحے سر اوپر اٹھنے سے چہرہ واضح ہوتا چلا گیا۔ "اوہ۔" ڈیشلے کے منہ سے نکلا۔ پھر میز کے پیچھے سے پستہ قامت بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ مسکراتی ہوئی ڈیشلے کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ وہ اس طرح اُسے خوش آمدید کہہ رہی تھی جیسے وہ یہاں کا دورہ کرنے آیا ہو۔ وہ بوڑھی عورت یہاں کی استقبالیہ کلرک مسز لائنا وٹن تھی۔

"انہیں اُس جگہ کا معائنہ کروانا ہے؟" فلیرٹی نے لائنا سے کہا۔

"اوہ..." اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سمجھ گئی ہے کہ فلیرٹی کس جگہ کی بات کر رہا ہے۔ "اچھا، ٹھیک ہے... آؤ۔" یہ کہہ کر وہ استقبالیہ کاؤنٹر سے باہر نکلی اور اُن پولیس والوں کو لے کر لائبریری کے اُس حصے کی طرف بڑھنے لگی جہاں طالب علم تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ یہ حصہ، استقبالیہ کاؤنٹر سے خاصا دور اور الگ تھلگ تھا۔ یہاں بیٹھے طالب علموں کو ابھی تک نہیں پتا چلا تھا کہ بالائی منزل پر کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ اس لیے وہ سب اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں منہمک تھے۔ یہاں سے گزر کر کافی آگے



جانے کے بعد زینہ تھا جس کے ذریعے بالائی منزل پر اُس جگہ تک پہنچا جا سکتا تھا، جہاں خون آلود پاؤں دیکھے جانے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ ڈیشلے، مسز لائنا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے پستہ قامت بوڑھی عورت کا دل ہی دل میں تجزیہ بھی کر رہا تھا۔

"یہ تو بڑی سخت گیر لگ رہی ہے؟" ڈیشلے چلتے چلتے مڑا اور آہستہ سے اپنے ماتحت سے کہا کہ کہیں وہ سُن نہ لے۔

"شاید... ویسے یونیورسٹی میں کام کرنے والے سبھی ایسے ہی پاگل لگتے ہیں۔" ڈیشلے یہ سُن کر مسکرا دیا۔ لگتا تھا کہ اسے اپنی پسند کا جواب ملا ہے۔

"میں نے ہی مسز لائنا سے کہا تھا کہ وہ آپ لوگوں سے تعاون کریں۔" فلیرٹی نے بھی اُن دونوں کی بات سن لی تھی اسی لیے اس نے وضاحت کی۔ "ویسے مسز لائنا وٹن یونیورسٹی کے تعلقاتِ عامہ کے امور بھی دیکھتی ہیں۔ یہ اُن کا فرض بھی بنتا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر وضاحت کی۔ اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے ڈیشلے کا تبصرہ پسند نہیں آیا۔

"اچھا..." اس نے منہ بناتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

"ویسے اُس لڑکے نے جس چیز میں خون آلود پاؤں دیکھا تھا، وہ کہاں ہے؟" ڈیشلے نے چلتے چلتے فلیرٹی سے پوچھا۔ "میں نے درخواست بھی کی تھی۔ ویسے مجھے تو یہ سارا ڈراما ہی لگ رہا ہے۔" جب وہ یہاں آیا تھا تو اُس وقت کچھ کنفیوز لگ رہا تھا مگر اب اس نے کافی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا۔

"کیسی درخواست... کس سے کی تھی؟" فلیرٹی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں۔" مارتھر نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ ڈبّا جس میں پاؤں ملا ہے، کیا اس پر سیریل نمبر تھا یا پھر وہ ڈبّے کا ٹھ کباڑ کی طرح وہاں بھرے پڑے ہیں۔"

"تو تم نے بتایا نہیں؟" فلیرٹی نے افسرانہ شان سے کہا۔ وہ ایسی افتاد پر دل ہی دل میں بہت پریشان تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ لائبریری پر یہ دن بھی آ سکتا ہے کہ جب پولیس والے کتابوں کے ڈبّے کی تلاش میں پہنچیں گے۔

"میں بتانے والا تھا مگر بھول گیا۔" مارتھر نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ڈیشلے کو مخاطب کر کے کہا۔ "ڈبّے پر 5578 نمبر کا سیریل نمبر لگا ہوا ہے اور وہ شیلف نمبر تین میں ہے۔"

"تمہیں یہ ڈبّا اتارنے کے لیے کس نے کہا تھا؟" ڈیشلے نے پلٹ کر سوال کیا۔

"صبح جب میں کام پر آیا تو لائبریرین نے جو فہرست مجھے دی تھی، اُن میں یہ سرِ فہرست تھا۔" مارتھر نے اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔ "فہرست میں درج تمام نمبروں والے ڈبّے تہ خانے میں پہنچانا تھے۔"

"تو تم نے ڈبّا کیوں کھولا؟"

"ابھی میں ڈبّا رکھ ہی رہا تھا کہ لائبریری اسسٹنٹ نے ایک کتاب تلاش کرنے کو کہا۔ ایک طالب علم کو اس کی ضرورت تھی۔ یہ اُسی ڈبّے کا نمبر تھا۔ بس جیسے ہی ڈبّا کھولا..."

"سمجھ گیا۔" ڈیشلے نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کمپیوٹر ریکارڈ ہے تمام کتابوں کا؟" اس نے سوال کیا۔

"جی ہاں..." اس بار فلیرٹی نے جواب دیا۔ "اسی سے پتا چلتا ہے کہ کون سی کتابیں پچھلے پانچ سال سے دیکھی نہیں گئی ہیں۔ ایسی کتابیں رولز کے تحت تہ خانے میں منتقل کر دی جاتی ہیں۔"

"وہ ڈبّا کس فلور پر تھا؟" ڈیشلے نے مارتھر کی طرف منہ کر کے کہا۔

"دوسری منزل پُر ہم وہیں چل رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور کیا کچھ تھا اُس میں؟" ڈیشلے نے ایک بار پھر

## خوش نصیب

بیمہ فروش نے ایک صاحب کو بیمہ پالیسی کے بے شمار فوائد گنوانے کے باوجود پالیسی لینے پر آمادہ نہ پایا تو اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر استعمال کرتے ہوئے ان سے کہا۔ "بیمہ آپ کے بیوی بچوں کے لیے خوش حال زندگی کا ضامن ہے۔ یہاں سے تیسری گلی میں اسلم صاحب نے چند مہینے پہلے بیس لاکھ کی انشورنس پالیسی لی تھی۔ چوتھے دن ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے بیمے کی صرف پہلی ششماہی رقم ادا کی تھی۔ ان کے انتقال کے دو ہفتوں بعد ہماری کمپنی نے ان کی بیوہ کو پورے بیس لاکھ کا چیک دے دیا... آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں، اگلے خوش نصیب آپ بھی ہو سکتے ہیں۔"

عائشہ عمر، اسلام آباد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوال کیا۔

"صرف ایک پاؤں تھا اُس میں۔"

"میرا مطلب یہ نہیں..." ڈیشلے نے جلدی سے کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب ہے، کیا اُس میں کتابیں وغیرہ بھی تھیں؟"

"کچھ کتابیں تھیں۔" لڑکے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ پاؤں والا ڈبا میری جلد بازی کی وجہ سے غائب ہوگیا۔" اُس کے لہجے سے ندامت اور حیرت کا ملا جُلا تاثر ظاہر ہورہا تھا۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ لگتا ہے سب پاگل ہوچکے ہیں۔" یہ سُن کر ڈیشلے نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔" ایک پولیس والے نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"مجھے تو یہ سب کچھ مکمل طور پر پاگل پن لگ رہا ہے۔ خون آلود پاؤں..." یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔

"جی ہاں سر! مجھے تو اس لڑکے کے بھی کچھ اسکروڈھیلے لگ رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم چلتے ہیں اور پاگل خانے والوں کو یہاں بھیج دیتے ہیں۔"

"تجویز اچھی ہے۔" ڈیشلے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔" ڈیشلے نے آہستہ سے جواب دیا۔ "جس پُراسرار انداز میں پاؤں نظر آیا تھا، اب اسی پُراسرار انداز میں اس کی موجودگی کا ہر ثبوت غائب ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "معلوم نہیں کیا چکر ہے۔" اس نے سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو..." پولیس والے باتیں کرتے کرتے دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ ابھی وہ اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے کہ بالائی منزل سے کسی نے چلّاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو دیکھو... یہاں خون پڑا ہوا ہے۔"

"ارے یہاں پر بھی خون کے دھبّے ہیں۔" اس سے پہلے کہ پولیس والے کچھ کہتے، اگلے ہی لمحے کوئی اور چلّایا۔ "یہاں، جنوبی دیوار کے قریب بھی خون نظر آرہا ہے۔" اس نے لگ بھگ چیختے ہوئے کہا۔

تیسری منزل پر ہونے والی یہ گفتگو سنتے ہی ڈیشلے اور اس کے ماتحتوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ "اوپر چلو۔" اس نے جلدی جلدی زینے چڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان صندوقوں کا ایک ایک کرکے جائزہ لینا ہوگا۔"

فرش پر خون نظر آتے ہی دو پولیس والوں نے جلدی جلدی وہاں پر زرد فیتہ باندھنا شروع کردیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ فیتے کے اندر اب کوئی نہ آئے۔ یہ مقام اب پولیس کے زیرِ تفتیش ہے۔

فلیرٹی ڈیشلے کی بات پر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح تابوت نما ان سیکڑوں جستی صندوقوں کی تلاشی لے گا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ ایک خون آلود پاؤں کس طرح چل کر تیسری منزل پر ان ڈبّوں تک پہنچ سکتا ہے؟" کافی دیر تک گھوم پھر کر جائزہ لینے کے بعد اُس نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ جو ہوا، وہ یہیں ہوا ہے۔" فلیرٹی نے فرش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا۔

"لعنت ہو اس پاؤں پر۔" ڈیشلے اسے مسکراتا دیکھ کر جل بھن گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگا ہے۔ "میرا خیال ہے کہ وہ یہیں پر ہوگا۔" اس نے ماتحت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے تو سمجھ نہیں آرہا کہ کس طرح پاؤں کو تلاش کریں۔ لگتا ہے کہ یہیں دن پورا ہوجائے گا۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"خیر، مکمل تلاشی تو لینی ہی ہوگی۔" ڈیشلے نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"بہت مشکل ہے۔" یہ سن کر فلیرٹی نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے خود کلامی کی۔ "خیر... جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔" فلیرٹی نے دل میں سوچا۔

"جس طرح وہ پاؤں ملا اور پھر غائب ہوا، وہ بھی ڈبّے سمیت تو اسے دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ انتظار کریں کہ وہ ایک بار پھر خود ہی نمودار ہوجائے۔" ایک پولیس والے نے لقمہ دیا۔

"نہیں..." ڈیشلے نے تڑپ کر کہا۔ "ہم اس کے نمودار ہونے کا انتظار نہیں کرسکتے۔ ہمیں ان سب ڈبّوں کی ایک، ایک کرکے تلاشی لینا ہوگی۔ اپنی احمقانہ بکواس بند کرو اور مجھے سوچنے دو کہ تلاشی کس طرح شروع کی جائے۔"

"کیا..." اس بار فلیرٹی نے مداخلت کی۔ اس کا لہجہ بھی کچھ سخت تھا۔ "جانتے ہو یہ چھوٹے تابوت نما ڈبّے یہاں پانچ چھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔ ہلکے پھلکے چھوٹے چھوٹے ڈبّے نہیں کہ جھٹ پٹ ان کے اندر جھانک لیا جائے۔ یہ بہت بھاری ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "ناممکن... یہ کام تو نہیں ہوسکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم یہ کرسکتے ہیں۔ یہاں ان ڈبّوں کو ہلانے جُلانے کا سارا سسٹم موجود ہے... پھر کیوں نہیں کیا



جاسکتا؟" یہ کہہ کر ڈیشلے مڑا اور سب کے چہروں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہم سیٹ کی شکل میں ان صندوقوں کی تلاشی لیں گے۔"

"کیا مطلب؟" فلیرٹی نے پوچھا۔

"سیریل نمبر کے حساب سے کچھ ڈبّوں کو سیٹ کی شکل میں ترتیب دیں گے اور باری باری ان کی تلاشی لینا شروع کردیں گے۔" ڈیشلے نے پوری بات اُسے سمجھائی۔

"جیسا تم بہتر سمجھو۔" فلیرٹی نے بیزاری سے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈیشلے مشقت بھری مشق کرنے پر تُل گیا ہے اس لیے اس نے بھی ہاں میں ہاں ملادی۔ ڈیشلے نے مڑ کر مارتھر کی طرف دیکھا۔ "ڈبّے کس ترتیب سے رکھے جاتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جہازی سائز کتابیں اور تحقیقی مقالوں پر مشتمل جرائد بڑے ڈبّوں میں رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر آرٹ کے موضوع پر ہیں۔" لڑکے نے بتانا شروع کیا۔ "ان سب کا ریکارڈ لائبریری کے کمپیوٹر میں موجود ہے جس سے ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ وہ کون سی کتابیں اور رسالے ہیں جنہیں یہاں آنے والے زیادہ تلاش کرتے ہیں۔ ایسی کتابیں جنہیں زیادہ یا بالکل بھی سرچ نہیں کیا جاتا، ان کا بار کوڈ تبدیل کرکے دوسری جگہ رکھ دیا جاتا ہے تاکہ تلاش کرنے والوں کو فراہم کرنے میں آسانی رہے۔" یہ کہہ کر اس نے ڈیشلے کی طرف دیکھا۔ "البتہ تمام ڈبّوں کا سیریل نمبر، بار کوڈ اور ان میں موجود کتابوں کا مکمل کمپیوٹر ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ چاہیں تو آپ خود کمپیوٹر پر دیکھ سکتے ہیں۔"

"بہت سی کتابیں اور رسائل ایسے ہوں گے جنہیں کم افادیت کے پیشِ نظر ایسے ہی ڈبّوں میں ٹھونس دیا جاتا ہوگا؟"

"ہاں، ایسا بھی ہوتا ہے لیکن بہت کم۔" مارتھر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ خود دیکھ لیں، یہ کوئی چھوٹی لائبریری تو ہے نہیں۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں ہیں یہاں پر۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔" ڈیشلے نے معنی خیز انداز میں پہلے مارتھر اور پھر بڑے بڑے شیلف پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہاں پاؤں ہے۔" اسی دوران کوئی زور سے چلّایا۔ یہ سنتے ہی ڈیشلے اور دیگر لوگ اس طرف دوڑے۔ وہ خون آلود دایاں پاؤں تھا۔ یہ جس ڈبّے میں رکھا ہوا تھا، وہ شیلف کی سب سے نچلی قطار تھی۔ اُس ڈبّے میں ڈراما نگار ٹونر کے لکھے ہوئے ڈراموں کے مجموعے رکھے ہوئے تھے۔

"ارے... یہ یہاں ایک اور کھلا ہوا ڈبّا ہے۔" اچانک ایک اور آواز آئی۔ ڈیشلے اُس طرف بھاگا۔ "میرے ساتھ چلو۔" اس نے مارتھر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہی ہے وہ ڈبّا!" ڈبّا دیکھتے ہی مارتھر اچھل گیا۔

یہ بایاں پاؤں تھا اور ٹونر کی پرانی کتابوں والے ڈبّے سے برآمد ہوا تھا۔ یہی وہ ڈبّا تھا جو آج صبح مارتھر نے دیکھا، جس کے بعد سارا قصہ شروع ہوا تھا۔

دوسرا پاؤں ملنے کے بعد ڈیشلے نے پوری عمارت کو سیل کرنے کا حکم دے دیا۔ لائبریری کے تمام عملے کو سختی سے ہدایت دے دی گئی تھی کہ کوئی بھی یہاں سے باہر نہ جائے۔ تیسری منزل پر دو تین جگہوں پر زرد فیتہ لگا کر پولیس نے اس میں لوگوں کا داخلہ بند کردیا تھا۔ ڈیشلے حیرانی سے ان دونوں پاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں پاؤں ٹخنوں کے اوپر سے کاٹے گئے تھے۔ پاؤں اور ٹخنوں کے اوپری حصے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کسی دراز قد اور دُبلی پتلی عورت کے ہوسکتے ہیں۔ ان پاؤں کو دیکھ کر ڈیشلے کا خیال تھا کہ اسے قتل کرکے، لاش مختلف حصوں میں کاٹ کر ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قاتل کا تعلق لائبریری سے ہی ہوگا ورنہ کوئی باہر کا آدمی یہاں آکر ایسا کام نہیں کرسکتا۔ دوسری طرف یہ خیال بھی اس کے ذہن میں گردش کررہا تھا کہ کہیں قاتل نے پولیس کو بھٹکانے کی کوشش تو نہیں کی ہے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہورہا تھا کہ دونوں پاؤں صرف ادبی کتابوں کے ڈبّوں سے ہی کیوں برآمد ہوئے؟ ابھی تک تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ جلد ہی یہ گتھی سلجھا لے گا۔ کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ "ایمبولینس منگواؤ۔ انہیں مردہ خانے بھیجنا ہے۔" اس نے ایک ماتحت کو ہدایت دی۔

تیسرے فلور پر اب بھی کئی لوگ حیران پریشان کھڑے تھے۔ اس قضیے کو شروع ہوئے کئی گھنٹے ہوچکے تھے۔

"پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا؟" لائنا نے سرگوشی میں فلیرٹی سے کہا۔

"ہمیں ایک عامل کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ بہت عجیب ہورہا ہے۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔ ضرور کوئی آسیبی معاملہ ہے۔" فلیرٹی کے لرزتے لہجے سے خوف عیاں تھا۔

"ہوسکتا ہے۔" لائنا ضعیف الاعتقاد عورت تھی۔ یہ سنتے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی اس کے روبرو کھڑے ہو گئے۔ اس نے جلدی سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ''کتابیں بھی خون سے خراب ہو چکی ہوں گی۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

پولیس والے تن دہی سے ڈبّوں کے نمبر تلاش کر کے انہیں سیٹ کی شکل دینے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ لائبریری اسسٹنٹ، مارتھر اور چند دوسرے لوگ اُن کی معاونت کر رہے تھے۔ زرد فیتے کے بیچ ڈیشلے بیٹھا حیرانی سے ڈبّوں کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ ڈبّوں کو دیکھتا رہا۔ آخر اس نے جیب سے آج کا اخبار نکال کر کراس ورڈ معما نکالا اور حل کرنے لگا۔ یہ ڈیشلے کا پسندیدہ کھیل تھا۔ پولیس والے تلاشی میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے کرنے کے لیے فی الحال کوئی کام نہیں تھا، سو وہ وقت گزاری کے لیے اپنے پرانے شغل میں مصروف ہو گیا۔

لائنا نے جب دیکھا کہ ڈیشلے اپنی دھن میں مگن ہے تو وہ سمجھی کہ شاید خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اُس نے جھک کر زرد فیتہ عبور کیا اور ڈیشلے کے پاس پہنچ گئی۔ ''لنچ کا ٹائم ہونے والا ہے۔'' اس نے منمناتی آواز میں کہا۔ ''کیا میں لنچ...''

''کیا مطلب...'' ڈیشلے نے یہ سنتے ہی اس کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''جب تک تفتیش جاری ہے، ہمیں لنچ کی کوئی پروا نہیں اور تم برائے مہربانی دور ہٹ جاؤ۔ یہ جائے واردات ہے۔ تمہاری مٹر گشت میں کوئی اہم ثبوت ضائع بھی ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ''جب تک تفتیش جاری ہے، یہاں موجود کوئی بھی شخص کہیں نہیں جائے گا۔''

''بہتر ہے۔'' مسز لائنا نے منمناتی آواز میں کہا۔

''مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔'' وہ مسکرا کر بولا اور پھر معاصل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈیشلے کے غصیلے انداز سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ مُردہ قدموں سے چلتے ہوئے ایک بار پھر جھک کر زرد فیتے کے نیچے سے نکل گئی اور فلیرٹی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

تیسرے فلور پر پولیس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اس نے فون کر کے ڈپارٹمنٹ سے مزید پولیس والے بھی بلوا لیے تھے جو باقی تین فلور پر بھی موجود تھے۔ گراؤنڈ فلور پر تحقیق میں مصروف طالب علموں کو انتظامیہ نے معذرت کے بعد باہر بھیج دیا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر بھی دو پولیس والے تعینات تھے۔ داخلی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

''خون آلود، جسم سے کٹے ہوئے دو پاؤں ملے ہیں، وہ بھی دو پرانے ادیبوں کی کتابوں کے ڈبّوں میں سے۔ پہلے آرٹ ویل اور اب ٹونر... دو بڑے ادیبوں کی کتابوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ دو خون آلود پاؤں۔'' ڈیشلے کا لہجہ پُراسرار تھا۔ وہ معاصل کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں خود کلامی کر رہا تھا۔ اُس وقت دو پولیس والوں کے سوا باقی لوگ فیتے کے باہر کھڑے تھے۔

''یہ پاؤں خوں ریز کہانی میں زبردست موڑ ہے۔ جرم اور ادیب... واہ۔'' کچھ دیر بعد اس نے فلیرٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی کا کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ وہ سب پریشان کھڑے تھے۔

دوسرا پاؤں ملے آدھ گھنٹا ہی گزرا ہو گا کہ کوئی شخص چلّایا۔ ''ہاتھ ملا ہے۔'' یہ لائبریری کا ایک اسسٹنٹ تھا اور تیسری منزل پر ہی تلاشی کا کام کر رہا تھا۔ اُس نے شیلف کے پانچویں خانے میں رکھے کتابوں کے ڈبّے سے ایک ہاتھ دریافت کر لیا تھا۔ یہ کلائی پر سے کاٹا گیا تھا۔ خون آلود پاؤں کے بعد اب باری تھی خون آلود ہاتھوں کے ملنے کی۔

''میں آ رہا ہوں۔'' ڈیشلے نے چلّاتے ہوئے جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں تیسرا ڈبّا بھی وہیں پہنچ چکا تھا، جہاں باقی دو ڈبّے رکھے ہوئے تھے۔ ڈیشلے ایک کرسی پر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ ڈبّے پر لکھی ہوئی مختصر عبارت کو دیکھ رہا تھا۔ ''اِدھر آؤ فلیرٹی۔'' اس نے کافی دیر تک عبارت کو بغور دیکھنے کے بعد اسے آواز دی۔

''کہیے۔'' اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

''ذرا یہ دیکھو، کیا یہ بھی کسی...''

''جی ہاں...'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ اس ڈبّے میں بھی ادبی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ''ایڈم مارٹن اپنے عہد کے بہت بڑے برطانوی ادیب تھے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''مسز لائنا کہاں ہیں؟'' ڈیشلے نے اس کی بات نظر انداز کی اور وہاں کھڑے لوگوں کی طرف طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ کچھ دیر پہلے وہ وہیں کھڑی تھی مگر اب وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

''وہ جا چکی ہیں۔'' فلیرٹی نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں... میں نے منع بھی کیا تھا کہ کوئی نہیں جائے گا۔'' ڈیشلے کے لہجے سے ناگواری کا تاثر جھلک رہا تھا۔

''وہ نیچے گئی ہیں، کہہ گئی تھیں کہ اگر ضرورت پڑے تو میسج کر دینا، میں آ جاؤں گی۔'' فلیرٹی نے موبائل فون سے لائنا کو ایس ایم ایس کرتے ہوئے کہا۔ ''لو میسج بھیج دیا، وہ



ابھی آ جائیں گی۔'' اس نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ڈیشلے نے یہ سن کر کچھ کہے بنا منہ موڑا اور ماتحت پولیس والوں کو ہدایات دینے لگا۔

مسز لائنا بھوک کی کچی تھی۔ وہ کافی دیر تک ڈیشلے کی ہدایت کے مطابق چپ چاپ کھڑی رہی لیکن جب اسے محسوس ہوا کہ ڈیشلے کراس ورڈ بھرنے میں مصروف ہے تو اسے لگا کہ فی الحال اس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے اور وہ سب سے نظر بچا کر راستہ لیا کے کاؤنٹر پر چلی گئی تا کہ لنچ کر سکے مگر فلیرٹی کا ایس ایم ایس ملتے ہی وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

''ہم نے ایک ہاتھ بھی تلاش کر لیا ہے۔ اسے بھی ادبی کتابوں کے ڈبّے میں ٹھونسا گیا تھا۔'' کچھ دیر بعد جب وہ دوڑتی بھاگتی ڈیشلے کے پاس پہنچی تو اُس نے بتایا۔

''کیا میں اُسے دیکھ سکتی ہوں؟''

''نہیں... ہم جائے واردات پر غیر متعلقہ لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اسی لیے زرد فیتہ باندھا جاتا ہے تا کہ شواہد محفوظ رہیں۔'' ڈیشلے نے افسرانہ شان سے کہا۔

''تو پھر مجھے کس لیے بلایا ہے؟'' اُس نے منمناتی آواز میں پوچھا۔

''تا کہ اس بارے میں تمہاری رائے جان سکوں۔''

''کس بارے میں؟'' وہ پھر منمنائی۔

''بات یہ ہے کہ دو خون آلود پاؤں اور ایک ہاتھ ملا ہے اور وہ بھی صدیوں پرانے ڈراما نگاروں کی کتابوں کے ڈبّے سے۔'' ڈیشلے نے لائنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ جب ایک ہاتھ اور دو پاؤں مل سکتے ہیں تو پھر باقی جسم کے ٹکڑے بھی یہیں ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور کچھ دیر تک لائنا کے چہرے پر خاموشی سے نگاہیں جمانے کے بعد پھر بولا۔ ''ایک بات طے ہے کہ جسم کے باقی ٹکڑے بھی قدیم ڈراما نگاروں کی کتابوں والے ڈبّوں سے ہی ملیں گے۔ ہمیں یہ جاننا ہے کہ کیا صرف قدیم یورپی ڈراما نگاروں اور ادیبوں کی کتابوں والے ڈبّوں کی فہرست مل سکتی ہے؟''

''شاید نہیں...'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کتابیں ڈبّوں کے سیریل نمبر کے حساب سے ریکارڈ میں ہیں۔ جس طرح آپ چاہتے ہیں، وہ فہرست بنانے میں تو کئی دن لگ سکتے ہیں۔''

''اوہ خدایا۔'' یہ سنتے ہی ڈیشلے نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور جھلائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ''آرٹ ویل اور ٹونر کے ڈراموں پر مشتمل پرانی کتابوں سے پاؤں ملے ہیں۔ اب یہ ایڈم مارٹن... مجھے یہی بتا دو کہ یہ کتنے پرانے ادیب تھے؟'' اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ دونوں سترھویں صدی کے عظیم یورپی ڈراما نگار تھے۔ اپنے عہد کے سماج کی منظر کشی اُن دونوں نے...''

''خاموش ہو جاؤ۔'' ڈیشلے نے قطع کلامی کی۔ ''مجھے اُن کے ڈراموں کی منظر کشی میں کوئی دلچسپی نہیں، میرے لیے یہی منظر بہت ہے۔'' ڈیشلے نے فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں خون کے دھبّے دکھائی دے رہے تھے۔ ''ان دونوں ادیبوں یا ان جیسے پرانے ادیبوں کی کتابوں کے کتنے ڈبّے ہیں یہاں پر، یہی بتا دو۔'' اس نے آخری الفاظ دانت کچکچاتے ہوئے کہے۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' لائنا نے سادگی سے جواب دیا۔

## ضرورت

امپائر نے ایک کھلاڑی کو ایل بی ڈبلیو دے دیا۔۔۔ کھلاڑی بہت خفا ہوا اور پویلین کی طرف جاتے ہوئے سفید کوٹ والے سے مخاطب ہوا۔ ''جس طرح تم نے مجھے ایل بی ڈبلیو دیا ہے، اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہیں عینک کی ضرورت ہے۔''

''عینک کی ضرورت تمہیں بھی ہے۔'' سفید کوٹ والے نے کہا۔ ''کیونکہ میں امپائر نہیں آئس کریم بیچنے والا ہوں۔''

## لاعلمی

''لاعلمی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔'' ایک سائنس دان نے ایک خاص قسم کی مکھی پر لیکچر دیتے ہوئے کہا۔ ''سائنسی نقطۂ نظر سے اس مکھی کے پر اس کے جسم سے چھوٹے ہیں چنانچہ سائنس کی رو سے یہ مکھی اس قابل نہیں ہے کہ اڑ سکے لیکن کیونکہ مکھی کو اس اہم سائنسی حقیقت کا علم نہیں ہے اس لیے وہ آسانی سے اڑتی ہے۔''

گل شاد احمد شاد سومرو، جیکب آباد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر کیا معلوم ہوگا؟" ڈیشلے بدستور جھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔ "اچھا، یہ بتاؤ کہ آرٹ ویل اور ٹونر کی کتابوں کے کتنے ڈبے یہاں ہیں۔"

"پتا نہیں۔" لائنا نے اس بار بھی بھولپن سے جواب دیا۔

"تو کیا ایک ادیب کی کتابیں ایک ڈبے میں نہیں رکھی گئی ہیں؟"

"شاید نہیں..." لائنا نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ "کتابوں کو موضوعات، زبان، سنِ اشاعت اور اسی طرح کی چند دیگر خصوصیات کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا ہے۔"

"اچھا..." ڈیشلے نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کمپیوٹر ریکارڈ تو ہوگا نا کتابوں کا؟"

"لائبریری میں آتے ہی کتاب کا اندراج کرلیا جاتا ہے۔" لائنا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر ڈیشلے کھول اٹھا۔

"جاؤ اور ریکارڈ کے مطابق یہی دیکھ لو کہ آرٹ ویل، ٹونر اور ایڈم کی کتابوں کے کتنے ڈبے رکھے ہوئے ہیں؟" اس نے لاچار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مشکل کام ہے مگر کوشش کرتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور تیزی سے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خوش تھی کہ اسی بہانے نامکمل لنچ مکمل کرسکے گی۔

"اے سنو... کیا نام ہے تمہارا؟" ڈیشلے نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سامنے کھڑے شخص کو پکارا۔

"ڈیوڈ۔" وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ "میں یہاں لائبریرین ہوں۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے گلے میں پڑا ہوا یہ کارڈ بتا رہا ہے کہ تم کیا ہو۔" اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ "تم نے ہی مارتھر کو ڈبوں کی ترسیل کا کام سونپا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے وہ فہرست چاہیے جو تم نے اُسے دی تھی۔" ڈیشلے نے حکم دیا۔

"ابھی لاکر دیتا ہوں۔" اس نے تابع داری سے جواب دیا۔

"فوراً جاؤ اور لے کر آؤ۔" یہ حکم دینے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے شغل میں مصروف ہوگیا۔ بظاہر اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اور نظریں معمے پر جمی ہوئی تھیں مگر ذہن پوری طرح کیس پر مرکوز تھا۔

کچھ ہی دیر میں ڈیوڈ فہرست لے کر آگیا۔ "یہ لیں۔" اس نے زرد فیتے کے پار سے اسے آواز دے کر کاغذ بڑھایا۔ ایک پولیس والے نے وہ کاغذ اُس کے ہاتھ سے اُچک کر ڈیشلے کو تھما دیا۔ وہ غور سے اُسے پڑھنے لگا۔ فہرست کے مطابق کل بیس ڈبے تھے جنہیں تہ خانے میں منتقل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ فہرست کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر کاغذ تہ کرکے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ایک بار پھر اپنے پرانے شغل میں مصروف ہوگیا۔

دو پاؤں اور ایک خون آلود ہاتھ ملنے کے دو گھنٹے بعد بھی تلاش جاری تھی مگر اُس کے بعد سے اب تک جسم کا کوئی اور حصہ نہیں مل سکا تھا۔ "رابرٹ! اِدھر آؤ۔" ڈیشلے نے ماتحت سراغ رساں کو آواز دے کر بلایا۔ "یہ لو اور ان ڈبوں کی تلاشی لو۔" اس نے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"بہت بہتر۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ ڈیشلے کی دی ہوئی فہرست کے مطابق تمام ڈبے کھول کر تلاشی لے لی گئی تھی۔ بیس ڈبے کھولے گئے اور ان سب میں سے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ برآمد ہوتا گیا۔ وہاں موجود تمام لوگ سناٹے میں تھے۔ وہ جسمانی اعضا کسی عورت کے تھے جس کی عمر تیس پینتیس سال رہی ہوگی۔ سفاک قاتل نے بڑی صفائی سے جسم کو ٹکڑوں میں تبدیل کردیا تھا۔ البتہ حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس کو سر توڑ کوشش کے باوجود مقتولہ کا سر نہیں مل سکا تھا۔ اگر یہ ڈبے تہ خانے میں چلے جاتے تو پھر... ڈیشلے سمیت سب کو یقین تھا کہ قاتل کا منصوبہ کامیاب ہوجاتا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی لاش کے تمام ٹکڑوں کو اسپتال منتقل کردیا گیا۔ سر نہ ملنے کی وجہ سے پولیس نے لائبریری کو عارضی طور پر بند کرکے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ پولیس نے اُن تمام ڈبوں کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا جن سے نامعلوم مقتولہ کے جسم کے ٹکڑے برآمد ہوئے تھے۔ پولیس نے مسز لائنا، فلیرٹی، مارتھر اور کئی دوسرے لوگوں سے پوچھ گچھ کی۔ مسز لائنا کو تو پولیس نے ابتدائی تفتیش میں ہی بے گناہ قرار دے دیا تھا۔ مارتھر اور دیگر لوگ بھی بری الذمہ قرار دے دیے گئے مگر فلیرٹی کو گھر جانے کی اجازت دینے کے باوجود زیرِ تفتیش ہونے کا بتایا گیا تھا۔

فلیرٹی پر الزام تھا کہ لاش کے ٹکڑے انہی ڈبوں سے کیوں برآمد ہوئے جنہیں اُس نے تہ خانے میں منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ تاہم اس نے یہ الزام مسترد کردیا تھا۔ اس کی



دلیل مضبوط تھی۔ ان ڈبوں کی منتقلی کا فیصلہ گزشتہ ہفتے کی میٹنگ میں ہوا تھا اور ان کا انتخاب کمپیوٹر ریکارڈ کی مدد سے کیا گیا تھا۔ کمپیوٹر ریکارڈ کے مطابق جن ڈبوں کو تہ خانے منتقل کیا جارہا تھا، انہیں پچھلے آٹھ دس سالوں سے ایک بار بھی نہیں کھولا گیا تھا... جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ان کتابوں کی افادیت کم ہوچکی ہے۔ فلیرٹی کا کہنا تھا کہ یہ اُس کے نزدیک اتفاق ہے مگر ڈیشلے کو یقین تھا کہ یہ سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ فی الحال اس نے فلیرٹی کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ڈیشلے کو شک تھا کہ ممکن ہے فلیرٹی بے قصور ہو۔ قاتل نے یہ بات جان لی تھی کہ یہ ڈبے تہ خانے منتقل کیے جارہے ہیں اس لیے اُس نے اپنی دانست میں یہ بے داغ منصوبہ بنالیا ہو۔

☆☆☆

لاش دریافت ہوئے چار دن گزر چکے تھے۔ لائبریری میں تلاش کا کام جاری تھا مگر تمام تر کوششوں کے باوجود پولیس نہ تو گمشدہ سر برآمد کرسکی تھی اور نہ ہی قاتل کے بارے میں کوئی سراغ مل سکا تھا۔ اُس صبح بھی ڈیشلے اپنے کمرے میں بیٹھا اسی کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ "ہیلو... ڈیشلے بول رہا ہوں۔" اس نے فون اٹھاتے ہی کہا۔

"مرچ قتل کیس کی کیا رپورٹ ہے؟" دوسری طرف پولیس ڈپارٹمنٹ کا چیف تھا۔

"وہی جو پہلے روز تھی۔" ڈیشلے نے بیزاری سے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔"

"اس معاملے میں آپ تنہا ہی نہیں، مجھ سمیت کئی اور لوگ بھی حیرت زدہ ہیں۔" اس نے حسبِ عادت طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، کوشش کرو کہ یہ معاملہ جلد از جلد حل ہوجائے۔ اخبارات والے کیس کو بہت اچھال رہے ہیں۔ یہ یونیورسٹی کا معاملہ ہے۔" پولیس چیف نے یہ کہہ کر جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

"واہ! مرچ پہ قتل... کیا کیس ہے؟" اس نے فون رکھا اور طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے خود کلامی کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت پولیس چیف اسے دل ہی دل میں وہ کچھ سنا رہا ہوگا جو وہ فون پر نہیں کہہ سکا تھا۔ "کہنے دو، اپنا کیا بگڑتا ہے۔" زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے وہ پیچھے کو جھک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگانے والا ہی تھا کہ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں بجلی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرح کوندا۔ وہ جھٹکے سے سیدھا ہوا اور کیس کی فائل اٹھا کر پڑھنے لگا۔

''ایک کپ اسٹرانگ کافی بھجواؤ۔'' تقریباً آدھ گھنٹے کے مطالعے کے بعد اس نے فون پر کینٹین کو آرڈر نوٹ کروایا اور ایک سادے کاغذ پر مختلف حروف لکھ کر کراس ورڈ کی طرح کا کھیل کھیلنے لگا۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوگئی مگر وہ سب سے لاتعلق اپنے کام میں مگن رہا۔

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب ڈیشلے اپنے دفتر سے باہر نکلا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے فاسٹ فوڈ ریستوران کا رخ کیا اور کھانا کھانے کے بعد یونیورسٹی کیمپس کی طرف چل دیا۔

''ہائے مسٹر فلیرٹی۔'' سورج غروب ہو چکا تھا جب وہ اُس کے گھر پہنچا۔ حسبِ معمول وہ گھر پر ہی تھا۔

''ہائے... کیسے مزاج ہیں؟'' فلیرٹی نے رسمی لہجے میں اسے خوش آمدید کہا۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''اُس طرف آیا تھا، سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔'' ڈیشلے نے ہاتھ سے لائبریری کی سمت اشارہ کرتے ہوئے صاف جھوٹ بولا۔

''اوہ... اندر آیئے۔'' فلیرٹی نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔

''کافی لیں گے؟'' رسمی باتوں کے بعد فلیرٹی نے پوچھا۔

''یقیناً۔'' ڈیشلے نے مسکرا کر کہا۔ یہ سن کر وہ کچن میں چلا گیا اور ڈیشلے لیونگ روم کا جائزہ لینے لگا۔

یہ چھوٹا سا دو کمروں کا مکان تھا۔ کمرا بالکل سادہ تھا۔ سامنے آتش دان تھا، جس کے اوپر کارنس پر ایک جوڑے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر بہت عمدہ فریم میں لگی ہوئی تھی۔ وہ تصویر کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک چونک گیا۔ کارنس کی دیوار پر عین درمیان میں نہایت ہی خوبصورت انداز میں انگریزی حرف 'الیف' کندہ تھا۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا کہ فلیرٹی بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' ڈیشلے کو تصویر کی طرف گھورتا دیکھ کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''یہ کون ہیں؟''

''میرے ماں باپ...'' فلیرٹی نے اس کے سامنے کافی کا مگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دونوں کو اس دنیا سے گزرے بیس سال ہو چکے ہیں۔''

''اوہ...'' ڈیشلے کے منہ سے نکلا۔ ''اور یہ الیف...''

اس نے جھجکتے ہوئے انگلی سے کارنس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری ماں اور باپ دونوں کے نام الیف سے شروع ہوتے تھے۔''

''اور تمہارا بھی...'' ڈیشلے نے مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔

''بالکل...'' وہ بھی مسکرایا۔ ''اسی لیے میں نے الیف کندہ کروایا ہے۔''

''مگر آتش دان پر کیوں؟'' ڈیشلے نے منطقی سوال کیا۔

''یہ ایک خاص بات ہے۔'' فلیرٹی نے یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''الیف اور آتش دان سے مراد یہ ہے کہ جس طرح یہ روشن اور گرم ہے، اس طرح مجھ میں یعنی اس ''الیف'' کے دل میں اُن دونوں کی محبت زندہ ہے۔''

''واہ... تمہیں تو لفظ اور الفاظ سے بڑی قربت ہے۔'' ڈیشلے نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہہ سکتے ہیں۔'' فلیرٹی نے مسکرا کر جواب دیا۔

ڈیشلے لگ بھگ آدھ گھنٹا فلیرٹی کے ساتھ رہا۔ اس دوران میں نہ تو اس نے کیس کے متعلق کوئی بات کی اور نہ ہی فلیرٹی نے کچھ پوچھا۔ بس دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

فلیرٹی کے گھر سے اٹھنے کے بعد وہ سیدھا دفتر آیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس نے جلد از جلد پولیس پارٹی تیار کی۔ پلمبر اور مزدور بلوائے۔ مجسٹریٹ سے سرچ وارنٹ لیا اور پھر ایک گھنٹے کے بعد مزدور فلیرٹی کے گھر میں آتش دان کی کھدائی کر رہے تھے۔ فلیرٹی صوفے پر خاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ڈیشلے کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ آتش دان کے نیچے کھدائی کرنے پر پولیس نے لکڑی کے ڈبے سے ایک عورت کا سر برآمد کرلیا۔ سر کا برآمد ہونا تھا کہ گزشتہ چار پانچ روز میں پہلی بار ڈیشلے کے چہرے پر سکون کے آثار نمودار ہوئے۔

''چلو۔'' اس نے فلیرٹی کا ہاتھ پکڑ کر صوفے سے اٹھایا۔ کچھ دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن میں اس سے تفتیش کر رہا تھا۔

''یہ کیرن کون ہے؟''

''تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' فلیرٹی نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کردیا۔

''اس کا مطلب یہ کہ کیرن ہے اور تم اسے جانتے بھی ہو؟''

''اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تھی اور میں اُسے جانتا تھا۔'' فلیرٹی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''یہی میں پوچھ رہا ہوں کیسے جانتے ہو؟''

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ تم اُسے کیسے جانتے ہو؟'' فلیرٹی نے پھر سوال کردیا۔ یہ سن کر ڈیشلے زچ ہوگیا۔

''تمہارے گھر سے ایک سر ملا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسی مقتولہ کا سر ہے جس کے اعضا ٹکڑوں میں لائبریری سے ملے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فلیرٹی کو گھورا۔ ''سچ سچ بتادو۔ سر ملنے کے بعد اب تمہارا بچنا ناممکن ہے۔ یہ بات اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھالو کہ جھوٹ سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''مجھے بھی اب نفع نقصان کی کوئی فکر نہیں۔'' فلیرٹی کا لہجہ افسردہ تھا مگر اس کے چہرے پر ندامت کے بجائے طمانیت تھی۔ ''پہلے میں نے اُسے نہیں، اُس نے مجھے قتل کیا تھا۔'' اس کا لہجہ گمبھیر اور باتیں اُلجھی ہوئی تھیں۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' ڈیشلے دہاڑا۔ ''مجھے سیدھی طرح سچ بتاؤ ورنہ...''

''اوکے... تو پھر سنو۔'' فلیرٹی نے کہا۔

''کیرن بھی میرے پاس پارٹ ٹائم کام کرتی تھی۔ وہ میرا مسودہ ٹائپ کرتی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے فلیرٹی نے مسودہ ٹائپ کرنے سے لے کر آتشزدگی تک کے تمام واقعات تفصیل سے بتادیے۔

''آگے کیا ہوا؟'' جب وہ یہ سب کچھ کہنے کے بعد خاموش ہوا تو ڈیشلے نے بے تابی سے پوچھا۔

''اُس روز اس کی کتاب پر نیویارک ٹائمز کے بُک ریویو میں تفصیلی مضمون چھپا تھا۔'' فلیرٹی نے کہنا شروع کیا۔ ''اُسی سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میرے گھر میں آگ شارٹ سرکٹ سے نہیں بلکہ کیرن نے لگائی تھی تاکہ میرا کمپیوٹر اور مسودہ جل جائے اور میری کتاب کبھی شائع نہ ہو پائے۔ اس نے میرا مسودہ چوری کرلیا تھا۔ اس نے میرے گھر کی چابی کی ایک اور نقل بنوالی تھی اور جب میں کرسمس منانے کے لیے شہر سے باہر گیا تو اس نے نہ صرف میرے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک چرالی بلکہ گھر میں آگ بھی لگادی تاکہ چوری کا ہر ثبوت مٹ جائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جذباتی ہوگیا۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا؟'' ڈیشلے نے کہا۔

## روشن الفاظ، روشن تحریر

☆ دوسروں کی تلخی کو نظرانداز کردیجیے کیونکہ تلخی پیدا کرنے والے حالات ہوتے ہیں۔ حالات معاشرہ جنم دیتا ہے اور معاشرے کی تشکیل ہم کرتے ہیں۔

☆ اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے، اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔

☆ دھوکا ہو یا دکھ تب ان کا صدمہ زیادہ اور حملہ شدید ہوتا ہے جب انسان ذہنی طور پر تیار نہ ہو۔

☆ ضمیر ہمارے اندر اس آواز کا نام ہے جو ہمیں خبردار کرتی ہے کہ ہمیں کوئی دیکھ رہا ہے۔

☆ بول میں ایسی تاثیر پیدا کرو کہ دلوں میں اترتے چلے جائیں۔ ورنہ چپ رہو۔

☆ مصروف رہیں تاکہ مایوسی آپ پر حاوی نہ ہو۔

☆ معاف کرنے کا مطلب ہے کسی ناخوشگوار واقعے کو اس طرح سمجھ لیا جائے جیسے یہ کبھی وقوع پذیر ہی نہ ہوا ہو۔

☆ ندامت کا اظہار مخض لفظوں کا محتاج نہیں۔ یہ رویوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

☆ پھول کی زندگی مختصر سہی مگر خوب صورت ہے جو ہمیں پیغام دیتی ہے۔۔۔ ''اچھا جیو خواہ کم جیو۔''

☆ ایسی خوبیاں جو محض دکھاوے کے لیے اپنائی گئی ہوں، خامیوں سے بدتر ثابت ہوتی ہیں۔

☆ مصیبتیں ہمیں پریشان کرنے کے لیے نہیں آتی ہیں بلکہ بیدار کرنے کے لیے آتی ہیں۔

☆ نیکی کو کم سمجھو اور اسے چھپا کر کرو۔

عدیل شاد سومرو کے اعلیٰ خیالات سندھ سے

## عہد

ایک نوجوان اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کر رہا تھا۔ اچانک کشتی میں پانی بھرنے لگا۔ نوجوان گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا۔ ''اے خدا! اگر میں بچ گیا تو یہ عہد کرتا ہوں کہ شراب کو کبھی منہ نہ لگاؤں گا۔ جوا کبھی نہ کھیلوں گا اور خوب صورت۔۔۔''

گرل فرینڈ نے جلدی میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''آگے کچھ نہ کہو۔ ایک کشتی ہماری طرف آرہی ہے۔''

گل شاد سومرو کی معصومیت، جیکب آباد سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ نہیں، ماسوائے کیرن کے اعتراف کے مگر وہ میرے دل میں محفوظ ہے۔"

"قانون دل کی بات کو ثبوت نہیں مانتا۔" ڈیشلے نے قطع کلامی کی۔

"جانتا ہوں، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کوئی ثبوت نہیں۔"

"اچھا... آگے بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

"جب میں نے کیرن کی وہ کتاب خریدی تو اُس کا ہر لفظ میرا لکھا ہوا تھا اور نام کیرن کا تھا۔" فلیرٹی نے کہنا شروع کیا۔ "اُس نے مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ وہ ڈگری جس کا حق دار صرف میں تھا۔" یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آواز بھرا گئی۔ "اس نے اخباری انٹرویو میں جھوٹ کہا تھا کہ وہ قدیم یورپی ڈراما نگاروں پر برسوں تحقیق کرتی رہی ہے۔ اس نے میری کتاب ہی نہیں، میرے زندہ رہنے کا مقصد ہی چوری کر لیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔

"آگے کیا ہوا؟" جب وہ چپ ہوا تو ڈیشلے نے پوچھا۔ اس بار اُس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

"میرے پاس کیرن کا ای میل اور گھر کا نمبر تھا۔ میں نے اُس سے رابطہ کیا اور ایک دن اُس سے ملنے چلا گیا۔ وہ مجھ سے ملتے ہوئے بہت گھبرا رہی تھی۔" فلیرٹی نے کہنا شروع کیا۔ "خیر، بات کافی لمبی ہے۔ وہ ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اُس نے مجھ سے معافی مانگی اور میں نے بھی بظاہر اُسے معاف کر دیا۔ اُس نے مجھ سے رو رو کر درخواست کی تھی کہ میں اس راز کو راز رہنے دوں۔ میں نے وعدہ کر لیا اور اب تک یہ راز نبھایا مگر تم..." اس نے ڈیشلے کی طرف دیکھا۔ "تمہاری وجہ سے اب کیرن کا یہ راز دنیا کے سامنے آجائے گا۔ تم نے مجھے وعدہ خلاف بنا دیا۔"

"جب تم نے اُسے معاف کر دیا تھا تو پھر..."

"دل سے معاف نہیں کیا تھا۔" فلیرٹی نے قطع کلامی کی۔ "میں نے اسے خیر سگالی کے طور پر اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور چند روز پہلے رات کو وہ میرے گھر آئی تو میں نے سوپ میں نیند کی کئی گولیاں ملا دیں اور پھر اسے بے ہوشی کی حالت میں قتل کر کے لاش ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ میں نے اُس سے اپنے جذباتی قتل کا بدلہ لے لیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر افسردہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "اسے یورپی ڈراما نگار پسند تھے، میں نے اس کی قبر بھی انہی مصنفین کی کتابوں میں بنا دی۔ وہ نفرت بن کر میرے لہو میں دوڑ رہی تھی۔ اس لیے اس کا سر آتش دان کے نیچے دفن کر دیا کہ نفرت کا وجود ہمیشہ گرمایا ہوا رہے۔" فلیرٹی فلسفیانہ انداز میں اپنے جُرم کا اعتراف کر رہا تھا۔

دوسری طرف اس کا بیان سن کر ڈیشلے سوچ رہا تھا کہ اصلی مجرم کون ہے... کیرن یا فلیرٹی؟ وہ حقیقت جان لینے کے بعد فلیرٹی کو بے قصور سمجھ رہا تھا مگر قانون کو ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے اور تمام تر ثبوت فلیرٹی کو قاتل ثابت کر رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی کا راج تھا

"تم نے قتل کا سراغ کیسے لگایا؟" کافی دیر بعد فلیرٹی نے خاموشی توڑی۔

"تمہارے اپنے لفظوں سے۔" یہ کہہ کر ڈیشلے نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ "یہ تم نے لکھا تھا:

Flairty Revenge to Karen..."

فلیرٹی نے کیرن سے بدلہ لے لیا۔"

"تو تم سب کچھ جان چکے ہو۔" یہ سن کر فلیرٹی مسکرایا۔

"ہاں۔"

"مگر کیسے؟"

"لاش کے ٹکڑے جن بیس ڈبوں میں ملے ہیں، اگر ان پر لکھے مصنف کے نام کا پہلا حرف لے کر اُن بیس حروف سے جو جملہ بناؤ، وہ یہی بنتا ہے کہ فلیرٹی نے بدلہ لے لیا۔" ڈیشلے نے کہنا شروع کیا۔ "مگر ایک بات تھی۔ ایف اور لاش کا سر دونوں غائب تھے۔ اسی لیے تمہارا نام نامکمل تھا۔ یہ ایف ملا مجھے تمہارے لیونگ روم میں۔"

"بس کرو... میں سب سمجھ گیا۔" فلیرٹی نے قطع کلامی کی۔ "مجھے ایک گلاس پانی چاہیے۔"

یہ سن کر ڈیشلے اٹھا جیسے ہی اُس کی پیٹھ فلیرٹی کی طرف ہوئی، اس نے تیزی سے اپنی جیکٹ کی آستین سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور زہر منہ میں انڈیل لیا۔ جب ڈیشلے پلٹا، اس وقت تک زہر اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ جب سے کیرن کی لاش کے ٹکڑے ملے تھے، تب سے زہر کی یہ شیشی اس کے پاس تھی۔ وہ اس دن کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔

کیرن کی کتاب میں فلیرٹی کا لکھا ہوا آخری جملہ تھا۔

"سر ایڈم نے سترھویں صدی کے اپنے ڈرامے میں قاتل ہیرو کے منہ سے کہلوایا تھا جب زندگی میں زندہ رہنے کا مقصد نظر نہ آئے تو انسان دنیا کا سفر کرنا چاہیے۔"

فلیرٹی کو اسپتال پہنچایا جا رہا تھا مگر وہ راستے میں ہی انجان دنیا کے سفر پر گامزن ہو گیا۔

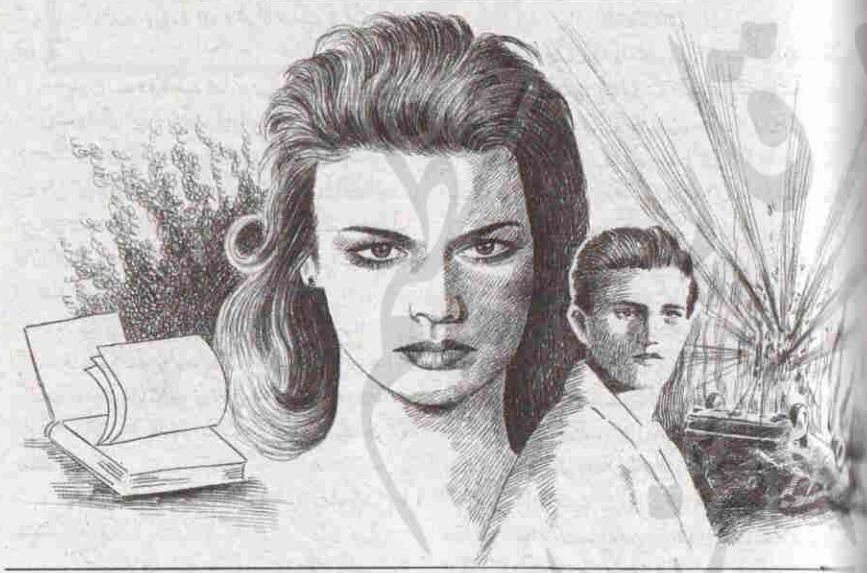


# خونی کتاب

جمال دستی

اختیار اور اقتدار کا کھیل شطرنج کی طرح نہایت طوالت اور تحمل مزاجی کا متقاضی ہوتا ہے... جس کے مہرے زیادہ طاقت ... اور بااختیار ہوتے ہیں... جیت اسی کی ہوتی ہے... جیت اور ہار کی دوڑ میں حصے لینے والے کھلاڑیوں کا خونی کھیل...

**اقتدار کی ہوس میں انسانیت کو طاق پر رکھ دینے والوں کا عبرت انگیز ماجرا**



رابرٹ کینیڈی اور جمی ہوفا کی پہلی ملاقات کچھ زیادہ خوش گوار نہ تھی۔ یہ واقعہ 1956ء کے موسمِ گرما میں پیش آیا۔ ان دنوں رابرٹ، ڈیٹرائٹ میں میکلینن کمیٹی کے چیف کونسل کے طور پر کام کر رہا تھا جبکہ ہوفا، ٹیمسٹر یونین کا نائب صدر تھا۔ یہ امریکا کے ڈرائیوروں اور باربرداری کے شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی نمائندہ تنظیم ہے۔ رابرٹ اپنے دو ساتھیوں پیری اور کاربن کے ہمراہ یونین کے مقامی دفتر پہنچا۔ ان کے پاس عمارت کی تلاشی کا وارنٹ تھا۔ جب رابرٹ نے دروازے پر دستک دی تو اس وقت ہوفا اپنے کارندوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ وہ غصے کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے تین افراد کھڑے تھے جن کی قیادت سفید سوٹ میں ملبوس رابرٹ کر رہا تھا۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ہوفا بہ آوازِ بلند بولا۔

"دیکھتے نہیں، میں اس وقت میٹنگ میں مصروف ہوں۔"

"انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنے دو۔" رابرٹ بولا۔ "ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔" یہ کہہ کر رابرٹ نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن ہوفا نے اس کا راستہ روک دیا۔ رابرٹ نے اسے اپنے سامنے سے ہٹانے کے لیے ہلکا سا دھکا دیا لیکن ہوفا اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے بھی جواب میں اسے دھکا دیا اور رابرٹ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ ایک بار پھر آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں آپس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں گتھم گتھا ہوتے، ہوفا کے عقب میں ایک شخص نمودار ہوا اور بولا۔

"کیا مسئلہ ہے ہوفا؟"

"یہ شخص ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے..... جارج۔"

جارج آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

"میرا نام جارج ہے اور میں وکیل ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کس سلسلے میں آئے ہو؟"

رابرٹ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے بولا۔ "میرا نام رابرٹ کینیڈی ہے اور میں میکلینن کمیٹی کا چیف کونسل ہوں۔ یہ عدالت کا سمن ہے۔ میں تمام کتابیں، ریکارڈ اور دیگر کاغذات دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جارج نے وہ کاغذ دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ میکلینن کمیٹی سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ سینیٹ کی کمیٹی تھی جو مزدور تنظیموں کی نامناسب سرگرمیوں پر نظر رکھتی تھی۔ جارج نے اس سمن کو پڑھنے کے بعد کوئی مزاحمت نہیں کی تو رابرٹ اور اس کے دونوں ساتھی دفتر میں داخل ہو گئے۔ رابرٹ فائل کیبنٹ کی درازیں کھول رہا تھا کہ ہوفا نے اسے دھکیلا اور درازیں بند کرتے ہوئے بولا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

رابرٹ نے مڑ کر جارج کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اسے بتا دو کہ ہمارے پاس تلاشی کا وارنٹ موجود ہے اور ہم تمام کتابیں، ریکارڈز اور دیگر کاغذات دیکھنے کا حق رکھتے ہیں۔"

جارج ناگواری سے بولا۔ "تمہارا یہ وارنٹ کچھ مبہم سا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" رابرٹ نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ وارنٹ غیر واضح ہے اور اس میں یہ نہیں لکھا کہ تمہیں کیا چاہیے اور کیوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" رابرٹ نے سنجیدگی سے کہا۔ "کوئی ایسا ثبوت جس سے تمہاری مجرمانہ سرگرمیوں اور مافیا کے ساتھ لین دین کا پتا چل سکے۔"

جارج قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

رابرٹ نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس کی نظریں ہوفا پر جم کر رہ گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو بُری طرح گھور رہے تھے اور کوئی بھی اپنی نظریں ہٹانے پر تیار نہ تھا۔ بالآخر ہوفا نے پلکیں جھپکائیں اور دوسری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم سے عدالت میں ملاقات ہو گی۔"

اس کے جانے کے بعد ہوفا کے ایک نمائندے نے اس سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" ہوفا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "کچھ بھی تو نہیں۔"

☆☆☆

اس روز یونین کا ایک عہدیدار جوئے مچل دیر سے گھر پہنچا تو اسے اپنے پڑوس کے گھر سے چیخنے چلّانے اور لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ آوازیں آنا بند ہو گئیں تو جوئے نے اطمینان کا سانس لیا۔ ویسے بھی یہ روز کا معمول تھا۔ اس لیے اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

جوئے کی جوان اور خوب صورت بیوی نے شوہر کی طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے باہر چلی آئی۔ وہ اپنی مردانگی دکھانے کے بعد اب بے سدھ سو رہا تھا البتہ اس کی سانسوں سے پھوٹتی شراب کی ناگوار بو اور قمیص کے کالر پر لپ اسٹک کے نشان اس کی بے راہ روی کی داستان سنا رہے تھے۔ ان کی شادی کو صرف دو سال ہی ہوئے تھے لیکن اس دوران میں کوئی ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرا تھا۔ جوئے کئی کئی دن بغیر بتائے گھر سے غائب رہتا اور جب وہ اس سے کچھ پوچھتی تو وہ اسے مارنا شروع کر دیتا۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اس نے باتھ روم کے آئینے میں اپنے سوجے ہوئے ہونٹ اور آنکھ کے زخم کو دیکھا تو اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

جوئے سے پہلے کسی نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اگر وہ اپنے دوستوں سے اس کا تذکرہ کرتی تو وہ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر پاتے کیونکہ ان کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ویسے بھی جوئے جیسے لوگوں سے الجھنا کون پسند کرتا؟ البتہ اگر اس کے باپ کو پتا چل جاتا تو وہ ضرور جوئے کی ٹھکائی کر دیتا لیکن بدقسمتی سے ایک سال پہلے وہ کار کے حادثے میں مارا گیا۔ اس کے باپ کے مرنے کے بعد جوئے کو کھلی چھٹی مل گئی اور وہ آزادانہ طور پر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑی اپنے



آپ کو دیکھتی رہی۔ کاش اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ اس طرح جوئے کے تشدد کا نشانہ نہیں بنتی۔ کاش وہ کبھی جوئے سے نہ ملی ہوتی۔

وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ جوئے کے ساتھ اس کا گزارہ ممکن نہیں اور اسے اپنی زندگی بچانے کے لیے جوئے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ لیکن جوئے بہت طاقتور تھا۔ وہ اس پر غلبہ نہیں پا سکتی تھی۔ اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے بارے میں سوچنے سے بہتر تھا کہ وہ خاموشی سے اس کی زندگی سے نکل جاتی۔

اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور سیڑھیاں اتر کر گیراج میں آئی۔ کار میں بیٹھ کر اس نے اگنیشن سوئچ آن کیا پھر اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنا پرس کھول کر دیکھا۔ اس میں صرف بارہ ڈالرز پڑے ہوئے تھے۔ یہ رقم زیادہ دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ لہٰذا وہ کار سے اتر کر دوبارہ گھر میں گئی۔ اس نے لابی میں کھڑے ہو کر حالات کا جائزہ لیا۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اس نے بیڈروم میں جھانک کر دیکھا۔ جوئے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ سیدھی اس کی اسٹڈی میں چلی گئی۔ سامنے دیوار پر ایک فریم شدہ تصویر نظر آ رہی تھی جس میں جوئے اپنے بڑوں ڈیوبیک اور ہوفا کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے تصویر اتار کر نیچے رکھی تو اس کے پیچھے سے ایک خفیہ سیف برآمد ہوئی۔ اسے نمبروں کی ترتیب معلوم تھی۔ لہٰذا سیف کھولنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اسے وہاں نوٹوں کی دو گڈیاں اور ایک نوٹ بک نظر آئی جس میں کچھ حساب کتاب لکھا ہوا تھا اور کچھ رسیدیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے وہ سب چیزیں سمیٹیں اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کا ارادہ بدل جاتا یا دماغ اسے یہ خطرناک کام کرنے سے روک دیتا، وہ وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ شوہر کو چھوڑ کر جانا ایک الگ بات تھی لیکن رقم لے کر فرار ہونا انتہائی خطرناک کام تھا۔ یہ رقم اس کی نہیں تھی اور نہ ہی جوئے بلاشرکت غیرے اس پوری رقم کا مالک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جن لوگوں نے جوئے کے پاس یہ پیسے رکھوائے تھے، وہ اس کی اس حرکت پر چراغ پا ہو جائیں گے لیکن اس کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی اور اس کے ملنے کے بعد یہ زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جلد از جلد کہیں چھپ جائے۔

وہ جانتی تھی کہ جلد یا بدیر وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے لیکن صبح ہونے اور جوئے کے بیدار ہونے سے پہلے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے شہر سے باہر نکل کر گاڑی کا رخ جنوب کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ یہ راستہ کلیولینڈ کی طرف جاتا تھا لیکن وہ کلیولینڈ کے بجائے ٹولیڈو جا رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اسٹیشن کا رخ کیا۔ اس نے شکاگو کا ٹکٹ خریدا کیونکہ وہاں جانے والی ٹرین روانہ ہونے کے لیے تیار تھی۔ تقریباً یہی وقت شمال میں ڈیٹرائٹ جانے والی ٹرین کا بھی تھا۔ چنانچہ وہ ڈیٹرائٹ واپس آنے کے لیے اسی ٹرین پر سوار ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے شمال میں واقع بے سٹی جانے کے لیے بس کا ٹکٹ خریدا۔ جب وہ وہاں پہنچی تو صبح ہونے والی تھی۔ اس نے کچھ وقت ایک ریستوران میں گزارا اور پھر سڑک پار کر کے سامنے ایلیبین ہوٹل میں چلی گئی اور مس اسپنسر کے نام سے کمرا بک کروا لیا۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو جوئے یہی سمجھا کہ جینی کا فون ہو گا لیکن اس کے بجائے ایک دوسری آواز سنائی دی۔

"ہائے جوئے! میں لین بول رہا ہوں۔"

"ہائے۔" جواب میں جوئے نے بیزاری سے کہا۔

"اسے تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

لین کا اشارہ سمجھ کر وہ سنبھل گیا اور بولا۔ "اوکے۔"

"تم جانتے ہو کہ لانڈری والے کچھ مسئلہ کر رہے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کے مالک سے ملو۔ اس کا نام ایلس ہے۔ وہ کوئی چیز دے گا۔ تمہیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ اسے صحیح جگہ پر رکھ دو۔"

"ٹھیک ہے۔" جوئے نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

لین نے اس کے لہجے میں چھپی ہوئی بیزاری محسوس کر لی اور بولا۔ "سب ٹھیک تو ہے نا جوئے؟"

## وجہ

"سچ سچ بتاؤ تم نے اپنی بیوی پر کس وجہ سے ہاتھ اٹھایا تھا؟" جج نے ملزم سے پوچھا۔

"تین باتوں کی وجہ سے جناب۔" ملزم نے جواب دیا۔ "پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں بیلن نہیں تھا اور تیسری بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے بھاگنے کے لیے دروازہ کھلا تھا۔"

نٹڈ وآدم سے فہیم خان کی برجستگی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں، جینی کہیں چلی گئی ہے۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس پر ہلکا ہاتھ رکھو لیکن تم نے میری ایک نہ سنی۔ اس لیے اس کے چلے جانے پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی۔"

"اس سے بھی بُری بات یہ ہوئی ہے کہ وہ سیف میں سے ساری رقم لے کر چلی گئی۔"

"یہ تو واقعی اچھا نہیں ہوا۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ رقم اس سے دوبارہ لے لوں گا لیکن وہ اس کے علاوہ ایک اور اہم چیز بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ میری یادداشت زیادہ اچھی نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ حساب کتاب کے معاملے میں کوئی گڑبڑ ہو۔ اس لیے میں ایک نوٹ بک میں اس کا اندراج کر لیا کرتا تھا۔ اس میں ان تمام لوگوں کے نام اور پتے درج ہیں جن سے ہمارا لین دین چلتا رہتا ہے۔ میں نے یہ نوٹ بک رقم کے ساتھ ہی سیف میں رکھی ہوئی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہی اس کے لیے محفوظ ترین جگہ ہے۔"

"اوہ میرے خدا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو جوئے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ نوٹ بک بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔"

"جانتے ہو کہ تم نے یہ کیا کر دیا؟" لین پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ "تم اتنے احمق کیسے ہو سکتے ہو؟ میرا انتظار کرو۔ میں آ رہا ہوں۔"

☆☆☆

اسٹیو براؤن ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا۔ اس کا دو کمروں پر مشتمل دفتر شکاگو کے وسط میں واقع ایک چھوٹی سی عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ وہ سامنے والے کمرے میں دفتری امور سرانجام دیتا اور عقبی کمرے میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ آج کا دن بہت سخت گزرا تھا۔ اس کا سارا وقت دو معمولی کیسز کی نذر ہو گیا۔ چھ بجے اس نے دروازہ بند کیا۔ کاغذات سمیٹ کر میز پر رکھے اور عقبی کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنی ٹائی اتاری۔ ایک گلاس پانی پیا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ یہ واحد شے باقی رہ گئی تھی جو اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر خریدی تھی اور اس کی زندگی کی آخری نشانی تھی۔ اس کی بیوی ڈاکوؤں کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی جب وہ دونوں ایک اسٹور میں خریداری کر رہے تھے۔

اسٹیو براؤن کو اس صدمے سے سنبھلنے میں چار مہینے لگ گئے۔ گو کہ وہ اب بھی پوری طرح نارمل نہیں ہوا تھا لیکن پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اسے معمول کی زندگی کی طرف لوٹنا ہی پڑا۔ دو ماہ قبل اس نے وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ اس کی ضرورت کے مقابلے میں کافی بڑا تھا۔ اس نے اس ٹیلی ویژن کے سوا گھر کی تمام اشیا فروخت کر دیں اور جب وہ اس کے سامنے بیٹھتا تو احساسِ تنہائی میں قدرے کمی آ جاتی۔ وہ اس وقت این بی سی سے خبریں سن رہا تھا جس میں ہوفا اور رابرٹ کے درمیان معرکہ آرائی کی تازہ ترین رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔

☆☆☆

عین اسی وقت لین کو نیویارک سے ایک کال موصول ہوئی۔ "کوئی خبر؟"

"ہاں، ابھی ابھی ہمارے آدمی نے ٹولیڈو سے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے اس کی کار اسٹیشن کے باہر کھڑی دیکھی ہے۔"

"گویا وہاں سے وہ ٹرین میں سوار ہو کر کہیں چلی گئی؟"

"ہاں، ٹکٹ گھر میں بیٹھے ہوئے شخص کو اس کا حلیہ یاد ہے۔ سنہری بال، سیاہ آنکھیں اور سوجا ہوا ہونٹ۔ وہ واقعی اتنی خوب صورت ہے کہ کوئی ایک دفعہ دیکھ لے تو اتنی جلدی نہیں بھول سکتا۔"

"اس نے کہاں کا ٹکٹ خریدا تھا؟"

"شکاگو۔"

"ٹھیک ہے۔ تم فوری طور پر شکاگو میں گلمکو سے رابطہ کرو اور کہو کہ ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے..... لیکن تم اپنے دوست جوئے کو بھی سمجھاؤ کہ انسان کی زندگی میں خاندان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اگر وہ بیوی پر تشدد نہ کرتا تو وہ کبھی اسے چھوڑ کر نہ جاتی۔ اس کی حماقت نے ہم سب کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔"

☆☆☆

ایڈی مارس شکاگو کے مشرقی حصے کے معاملات کا ذمے دار تھا۔ گلمکو نے اسے بتایا کہ اس لڑکی کو تلاش کرنا کتنا ضروری ہے۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اس کام کے لیے کسی بھی شخص کو استعمال کر سکتا ہے اور جتنی چاہے رقم خرچ کر سکتا ہے۔

"ہمیں صرف اس کے شوہر کو یہ بتانا ہے کہ وہ کہاں رہ



رہی ہے۔ یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان اس طرح کے تنازعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہم صرف ان کی مدد کر رہے ہیں۔"

ایڈی ایک ایسے شخص کو جانتا تھا جس سے اس سلسلے میں مدد لی جا سکتی تھی۔ اسٹیو براؤن نے ماضی میں ایک کیس کے سلسلے میں اس کی مدد کی تھی۔

☆☆☆

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وکیل جان سائی چیسٹی، مسٹر ہوفا کے لیے کام کر رہا تھا یا اسے رابرٹ کینیڈی نے تحقیقات کنندہ کے طور پر ملازمت دی تھی۔ جب ہوفا اس سے ملا اور چیسٹی نے اسے میکلین کمیٹی کی دستاویزات فراہم کیں تو ہوفا کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ایف بی آئی والے اس ملاقات کی تصویریں اتار رہے تھے۔ 13 مارچ کو ایسی ہی ایک میٹنگ کے بعد وہ واشنگٹن کے پلازا ہوٹل واپس پہنچا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ لفٹ میں داخل ہونے والا ہی تھا کہ اسے پانچ آدمیوں نے گھیر لیا۔

"ایف بی آئی۔" ان میں سے ایک بولا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" ہوفا نے کہا۔

"تم زیرِ حراست ہو۔"

"زیرِ حراست..... مگر کس جرم میں؟"

"سوال جواب بعد میں ہوتے رہیں گے۔ فی الحال تم ہمارے ساتھ چلو۔"

یہ سن کر ہوفا غصے سے پاگل ہو گیا اور گرج دار آواز میں بولا۔ "میں پہلے اپنے کمرے میں جا کر پولیس کو فون کروں گا، اس کے بعد تمہارے ساتھ جانے کے بارے میں سوچوں گا۔"

وہ پانچوں آدمی اس کے اور قریب آ گئے۔ ہوفا چلاتے ہوئے بولا۔ "رک جاؤ۔ مجھے اشتعال دلانے کی کوشش نہ کرو۔ اگر فساد چاہتے ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ اس لابی میں جتنے لوگ نظر آ رہے ہیں، ان میں زیادہ تر میرے آدمی ہیں۔ تم لوگ ہنگامہ آرائی پر آمادہ ہو جس کے نتیجے میں ایک بڑی لڑائی چھڑ سکتی ہے۔"

وہ پانچوں پیچھے ہٹ گئے۔ ہوفا نے ہوٹل کی لابی سے ہی اپنے وکیل ولیمز کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ایف بی آئی والوں کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں ایک ایجنٹ نے اس سے کہا۔

"بہتر ہو گا کہ تم خود ہی ساری کہانی بیان کر دو۔"

ہوفا کا پارا چڑھ گیا اور وہ غصے کے عالم میں بولا۔

"بہتر ہو گا کہ تم چور سپاہی والا کھیل جاری رکھو لیکن مجھ پر مہربان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میرا وکیل ہی تم سے بات کرے گا۔"

جب وہ ہیڈ کوارٹر پہنچے تو رابرٹ، اس کی بیوی ایتھل اور اخباری رپورٹرز کی ایک بڑی تعداد وہاں پہلے سے موجود تھی۔ رابرٹ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بہرحال ہم تمہیں پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

"تمہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" ہوفا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

ہوفا کی تصویریں اور انگلیوں کے نشانات لیے گئے اور اس پر جیسٹی والے معاملے میں رشوت دینے اور سازش کرنے کے الزامات عائد کر دیے گئے۔ رابرٹ نے اخبار نویسوں کے سامنے کیس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اس کیس میں ہوفا کو مجرم ثابت نہ کر سکا تو وائٹ ہاؤس کے گنبد سے چھلانگ لگا دوں گا۔"

☆☆☆

دوسرے روز علی الصباح ایڈی مارس اپنے دوست اسٹیو براؤن کے دفتر پہنچ گیا جو اپنی کرسی پر بیٹھا دیوار پر لگی

Monthly Digest
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
مکتبہ اہلاً وسہلاً
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی گھڑی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال بھی بے ترتیب تھے۔

''لگتا ہے تم نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا؟'' ایڈی نے اسے اس حالت میں دیکھ کر کہا۔

''تمہارا خیال درست ہے۔'' اسٹیو براؤن نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کس سلسلے میں آنا ہوا؟''

''یہ میں ناشتے کے دوران میں بتاؤں گا۔''

وہ دونوں سڑک پار واقع ایک ریستوران میں چلے گئے۔ ایڈی نے اپنے لیے کافی منگوائی جبکہ اسٹیو نے توس، انڈوں اور بلیک کافی کے ساتھ انصاف کیا۔ ناشتا کرنے کے بعد اسٹیو کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی اور وہ ایڈی کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایڈی نے اس سے جینی نچل کی تلاش میں مدد چاہی تو وہ بولا۔

''یہ تم نے کس طرح سوچ لیا کہ وہ شکاگو میں ہو گی؟''

''ہمیں اس کی کار ٹولیڈو کے اسٹیشن کے باہر کھڑی ہوئی ملی تھی۔ بکنگ کلرک سے معلوم ہوا کہ اس نے شکاگو کا ٹکٹ خریدا تھا۔''

''تمہیں اس کو تلاش کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

''دراصل دونوں میاں بیوی کے درمیان کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی اور وہ ناراض ہو کر گھر سے چلی آئی۔ اب شوہر اس کے بارے میں پریشان ہے لہٰذا ہم نے سوچا کہ اس کی تلاش میں اپنے دوست کی مدد کی جائے۔''

اسٹیو نے فوراً ہی اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ ایڈی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو بنا مطلب کسی دوسرے کے معاملے میں ٹانگ اڑائیں لیکن اسے اس کیس میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ ایڈی کا کہنا تھا کہ اسے اس سلسلے میں اخراجات کی بالکل بھی پروا نہیں کرنی چاہیے لہٰذا وہ یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ محض میاں بیوی کی لڑائی نہیں بلکہ اس سے آگے کا معاملہ ہے۔ ورنہ ایڈی اور اس کے ساتھی اتنی جلدی یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتے کہ وہ ٹرین کے ذریعے شکاگو آئی ہے۔ اس نے ایک بیگ میں اپنا سامان رکھا اور ٹولیڈو کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وکیل ولیمز نے ہوفا کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی اور یقین دلایا کہ وہ یہ کیس جیت جائیں گے۔ ولیمز ایک نہایت قابل وکیل تھا اور اپنے دلائل کے ذریعے جیوری کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ اس کا مؤکل بے گناہ ہے۔ چاہے حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ جب ولیمز نے وہ ثبوت دیکھے جو استغاثہ نے ہوفا کے خلاف فراہم کیے تھے تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے سے ٹافی لے لی جائے۔''

دلائل کی جنگ کے بعد اس کیس کا نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن سب سے اہم ثبوت اس نوٹ بک کی شکل میں موجود تھا جس میں ان تمام لوگوں کے نام و پتے اور لین دین کی تفصیلات درج تھیں جو غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے۔ اور اگر یہ نوٹ بک استغاثہ کے ہاتھ لگ جاتی تو ولیمز جیسا وکیل بھی اپنے مؤکل کو نہیں بچا سکتا تھا۔

☆☆☆

اسٹیو براؤن اپنی کار میں ٹولیڈو کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک عرصے بعد شہر سے نکلنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے آسمان کی جانب نظر دوڑائی تو اسے دور تک افق دکھائی دیا۔

ٹولیڈو پہنچتے پہنچتے اسے شام ہو گئی۔ وہ سیدھا ٹرین اسٹیشن گیا۔ جس کلرک نے جینی کے ہاتھ ٹکٹ فروخت کیا تھا، وہ اسی وقت ڈیوٹی پر آیا تھا۔ اسٹیو نے اسے جینی کی تصویر دکھائی تو کلرک نے تصدیق کی کہ اس لڑکی نے شکاگو جانے کے لیے ٹکٹ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی آنکھ کے نیچے زخم اور ہونٹ سوجا ہوا تھا جس سے اسٹیو کے شبے کی تصدیق ہو گئی اور وہ یہ بھی جان گیا کہ اس لڑکی نے شکاگو کا ٹکٹ اس لیے لیا ہو گا کہ وہ ایک بڑا شہر ہے اور اس کا تعاقب کرنے والے اسے وہاں اتنی آسانی سے تلاش نہیں کر سکتے۔ لیکن اسٹیو کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ لڑکی نے انہیں چکما دینے کے لیے شکاگو کا ٹکٹ لیا ہو گا اور وہ وہاں جانے کے بجائے کلیولینڈ یا جنوب میں واقع کولمبس چلی گئی ہو گی۔

''کیا تم نے اسے شکاگو کی ٹرین میں سوار ہوتے دیکھا تھا؟''

''نہیں۔'' کلرک نے جواب دیا۔ ''لیکن ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد پلیٹ فارم خالی ہو گیا تھا اور وہ ٹرین پر سوار کیوں نہ ہوئی ہو گی؟ اور جب اس نے شکاگو کا ٹکٹ لیا تھا تو نہ جانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''

''کیا وہ ٹرین راستے میں کہیں رکتی؟'' اسٹیو نے پوچھا۔

''نہیں، وہ کہیں رکے بغیر سیدھی شکاگو جاتی ہے۔''

''گویا تمہارے کہنے کے مطابق وہ لڑکی پلیٹ فارم پر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی پھر شکاگو جانے والی ٹرین آئی اور اس کی روانگی کے بعد پلیٹ فارم خالی ہوگیا۔"

"ہاں لیکن میں اسے ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکا کیونکہ درمیان میں ڈیٹرائٹ ایکسپریس حائل ہوگئی تھی۔"

"ڈیٹرائٹ ایکسپریس؟" اسٹیو نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، وہ بھی شکاگو جانے والی ٹرین کے ساتھ ہی روانہ ہوئی ہے۔"

اسٹیو نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اب ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے رات کا کھانا کھایا۔ گاڑی میں گیس ڈلوائی اور ڈیٹرائٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟ گو کہ ڈیٹرائٹ میں اس لڑکی کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا اور تعاقب کرنے والے اسے دوسری جگہوں پر ڈھونڈ رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ چھپنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو اپنا سفر جاری رکھتا۔ اس نے حساب لگایا کہ وہ کس وقت ڈیٹرائٹ پہنچی ہوگی۔

وہ ڈیٹرائٹ کے ٹرین اسٹیشن گیا اور کئی لوگوں سے اس بارے میں دریافت کیا لیکن انہوں نے کسی ایسی لڑکی کو اس اسٹیشن سے ٹکٹ خریدتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے اپنا سفر یہیں ختم کردیا ہو یا کوئی کار کرائے پر لے لی ہو لیکن اس میں خطرہ تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ بس کے ذریعے کہیں چلی گئی ہو۔ اسٹیو نے گاڑی کا رخ شہر کے مرکز... کی جانب موڑ دیا جہاں ہوورڈ اسٹریٹ پر بسوں کا اڈا تھا۔ یہ ایک مصروف جگہ تھی اس لیے اسے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ بالآخر وہ یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا کہ اس روز صبح سویرے ایک سنہری بالوں والی لڑکی سیاہ چشمہ لگائے یہاں آئی تھی۔ اس کی آنکھ کے نیچے زخم تھا جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس نے بے سٹی جانے کے لیے بس کا ٹکٹ خریدا تھا۔

☆☆☆

جب جینی نے بیگ کھول کر رقم گنی تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔ سترہ ہزار پانچ سو ڈالرز ایک بڑی رقم تھی اور اس کے شوہر کے دوست یقیناً اس رقم سے ہاتھ دھونے پر خوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ برف لگانے سے اس کے ہونٹ کی سوجن کافی کم ہوگئی تھی اور میک اَپ کی دبیز تہ نے اس کی آنکھ کے نیچے لگنے والے زخم کو کسی حد تک چھپا دیا تھا۔ لہٰذا وہ قریبی ریستوران میں ڈنر کے لیے جاسکتی تھی۔ وہاں این نامی ویٹرس نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اس سے دوستانہ انداز میں پیش آئی۔ جینی کو بھی اس اجنبی شہر میں کسی ایسے ہی دوست کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لہٰذا وہ تھوڑی دیر میں ہی اس سے خاصی بے تکلف ہوگئی۔

جینی نے ابھی تک اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے یا اسی شہر میں رک کر گرد کے بیٹھنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ایسی صورت میں اسے کافی عرصہ یہاں رکنا پڑتا کیونکہ تعاقب کرنے والے اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ اب بھی اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ لہٰذا اسے اس وقت تک یہیں چھپے رہنا پڑتا جب تک وہ مایوس ہو کر اس کی تلاش ختم نہ کردیتے۔ شاید این اس کی کچھ مدد کرسکتی اور اسے اسی ریستوران میں ملازمت مل جاتی۔ ایسی صورت میں اسے ان پیسوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

دوسرے روز وہ ناشتے کے لیے آئی تو این اس کی پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے بولی۔ "تمہارا کہنا ہے کہ اس شہر میں اجنبی ہو اور کسی کو نہیں جانتیں؟"

"ہاں۔"

"تھوڑی دیر پہلے ایک شخص تمہارے بارے میں پوچھتا ہوا یہاں آیا تھا۔" این نے گویا دھماکا کرتے ہوئے کہا۔

جینی کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بے تابی سے بولی۔ "تم نے اسے کیا بتایا؟"

"وہی جو سچ تھا۔" این مسکراتے ہوئے بولی۔ "یعنی یہ کہ تم کل یہاں آئی تھیں۔"

"تم نے اسے یہ تو نہیں بتایا کہ میں کہاں ٹھہری ہوئی ہوں؟"

"نہیں کیونکہ میں خود بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" این اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

جینی نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کچھ نوٹ میز پر رکھ کر وہاں سے چلی آئی۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے لفٹ کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے تک آگئی۔ دروازہ کھول کر وہ جونہی اندر داخل ہوئی تو حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور ایک شخص کرسی پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "ہائے جینی۔"



جینی اسے دیکھ کر دوبارہ دروازے کی طرف پلٹی لیکن وہ تیزی سے اٹھا اور دروازہ بند کرکے چابی جیب میں رکھ لی۔

"اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں جینی۔"

"تم یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"بہت آسانی سے۔ میں نے میڈ کو چکما دیا کہ تمہارا بھائی ہوں اور اچانک سامنے آکر تمہیں حیران کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتی۔" جینی کا خوف کچھ کم ہوگیا تھا۔ "کیا تمہارا تعلق ڈیٹرائٹ سے ہے؟"

"نہیں جینی! میں شکاگو میں رہتا ہوں۔ میرا نام اسٹیو براؤن ہے اور میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔"

"تمہیں میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"کسی سراغ رساں سے اس طرح کا سوال پوچھنا حماقت ہے۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو جینی! میں اپنے ایک دوست ایڈی مارس کے کہنے پر تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ تم اس کے دوست جوئے کی بیوی ہو اور وہ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ مجھے ایڈی کو فون کرکے یہ خوش خبری سنا دینی چاہیے لیکن مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ اس نے تمہارے بارے میں بتایا، وہ سچ نہیں ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"ایڈی کا کہنا ہے کہ جوئے تمہارے بارے میں بہت فکرمند ہے اور شدت سے تمہیں تلاش کر رہا ہے لیکن تمہارے زخم کو دیکھ کر یوں لگ رہا ہے کہ اسے تمہاری کوئی فکر نہیں۔ مجھے تو یہ کچھ اور ہی معاملہ لگ رہا ہے۔ جو کچھ ایڈی نے بتایا، اس سے بڑھ کر کچھ ہے اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ کوئی مجھے بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال سکے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟"

"سنو مسٹر!"

"اسٹیو براؤن..... تم مجھے اسٹیو کہہ سکتی ہو۔"

"تم جو کوئی بھی ہو، مجھے اس سے غرض نہیں۔ وہ مجھے صرف اس لیے تلاش کر رہے ہیں کہ....." وہ بولتے بولتے رک گئی جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے یہ بات بتانا چاہیے یا نہیں پھر بولی۔ "ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ میں اپنے شوہر سے ناراض ہو کر آئی ہوں لیکن مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں کچھ ایسی چیزیں بھی ساتھ لے آئی جو میری نہیں تھیں اور اسی لیے وہ میرا پیچھا

## بے اعتبار

ایک سہیلی دوسری کو بتا رہی تھی۔ "مردوں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ آج سے میں نے قسم کھائی ہے کہ طارق کا منہ بھی نہ دیکھوں گی اور مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کروں گی۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" سہیلی نے کریدا۔ "کیا طارق کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہے؟"

"نہیں بلکہ طارق نے مجھے ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا ہے جبکہ وہ مجھے کل بتا کر گیا تھا کہ وہ کراچی جا رہا ہے۔" سہیلی نے معصومیت سے کہا۔

لڑکی نے لڑکے کو فون کیا۔ "آج رات یہاں مت آنا۔ ابو کو معلوم ہوگیا ہے کہ رات کو ہم نے ان کی کار استعمال کی تھی اور وہ غصے سے پاگل ہو رہے ہیں۔"

"انہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم نے جن درجن بھر لوگوں کو ٹکر ماری تھی، وہ ان میں سے ایک ہیں۔" لڑکی نے بے چارگی سے کہا۔

سندھ سے شازیہ کوثر کا تعاون

## راہنمائی

ایک صاحب کچھ عجلت میں تھے اور ان کی کار کے بریک بھی خراب تھے۔ لہٰذا کار ایک مکان کی دیوار توڑتے ہوئے اندر جا گھسی۔ وہ گھبرا کر گاڑی سے اترے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔ بوکھلاہٹ میں خاتون خانہ سے مخاطب ہوئے۔

"معاف کیجیے گا میکانگی روڈ کس طرف ہے؟"

خاتون خانہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولیں۔ "سامنے بیڈ روم میں داخل ہو کر بیڈ کے سرہانے سے بائیں طرف مڑ جایئے گا۔ آگے ڈائننگ ٹیبل آئے گی۔ اس کے قریب سے دائیں ہاتھ مڑ جائیں۔ جب آپ کچن کی دیوار توڑتے ہوئے پیچھے نکلیں گے تو سامنے میکانگی روڈ ہوگا۔"

علی نواز، میرپور خاص کا تعاون



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہے ہیں۔ انہیں مجھ سے زیادہ ان چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اگر تم یہ چیزیں ان تک پہنچا دو تو وہ میری جان چھوڑ دیں گے۔''

''میں ایسا کر سکتا ہوں لیکن وہ تم سے ملنا اور بات کرنا چاہتے ہیں اور مجھے انہیں بتانا ہوگا کہ میں نے تمہیں تلاش کر لیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنا پرس اٹھانے کے لیے آگے بڑھی۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' اسٹیو اس حرکت پر چونکتے ہوئے بولا۔

''سگریٹ۔'' یہ کہہ کر اس نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا اور دوبارہ پرس میں ہاتھ ڈال کر لائٹر تلاش کرنے لگی۔ اس کے بجائے اس نے پستول نکالا اور اس کی نال کا رخ اسٹیو کی طرف کر دیا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟ ہٹاؤ اسے۔'' وہ گھبراتے ہوئے بولا۔

''شٹ اَپ۔ میری بات غور سے سنو۔ مجھے ان پیسوں اور اس فضول سی نوٹ بک سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایسے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی جو روزانہ مجھے مارتا ہو۔ میں اپنی مرضی کی زندگی جینا چاہتی ہوں۔ لہٰذا مجھے اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ اب میں اس کمرے سے باہر جا رہی ہوں..... ایک بار پھر روپوش ہونے کے لیے۔''

''میں تمہیں دوبارہ بھی تلاش کر سکتا ہوں۔''

''شاید نہیں۔ اگر میں انہیں وہ رقم اور نوٹ بک واپس کر دوں تو۔''

''کیسی نوٹ بک؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اب میں جا رہی ہوں۔''

اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اسٹیو نے اس کی جانب چھلانگ لگا دی اور پھرتی سے کلائی پکڑ کر اس سے پستول چھین لیا۔ پھر اس نے گولیاں نکالیں اور اسے بستر پر پھینک دیا۔

''میں نے تم سے اس نوٹ بک کے بارے میں پوچھا تھا؟'' اسٹیو نے کہا۔

جینی نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ اسٹیو اسے سہارا دے کر بستر تک لایا اور وہ تکیے پر سر رکھ کر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

اسٹیو کو اچانک ہی اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے اپنی بیوی لیزا یاد آ رہی تھی۔ وہ بھی اسی طرح اپنے باپ کے مرنے کی خبر سن کر بلک بلک کر روئی تھی۔ اسٹیو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو۔''

جینی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ باپ کے مرنے کے بعد پہلی بار کسی شخص نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اسٹیو کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ اندر سے پگھلنے لگی۔ اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ اٹھی اور اسٹیو کے کندھے پر سر رکھ کر ہولے ہولے سسکیاں لینے لگی۔ اسٹیو اس کے اندرونی دکھ کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ لیزا نہیں تھی لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ جینی کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو کتنا پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیا اور اسے خود سے قریب کر لیا۔ یہ ایک سکون بخش احساس تھا جس نے ان دونوں کو چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا۔ پھر جینی نے اپنا سر اٹھایا اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسٹیو نے اپنا رومال اسے دیا اور وہ اس سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر جینی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے رقم اور نوٹ بک اسٹیو کے سامنے رکھ دی۔ وہ اتنی بڑی رقم دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے نوٹ بک کے صفحات پلٹنا شروع کیے جس میں مختلف لوگوں کے نام، تاریخیں اور رقم کی تفصیلات درج تھیں۔ ان ناموں کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

☆☆☆

مقدمے کی کارروائی کے دوران استغاثہ ہوفا کے خلاف مکمل ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہا..... ولیز جیسے وکیل کی موجودگی نے ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دی تھیں۔

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ استغاثہ کی جانب سے اس کیس کی پیروی صحیح طریقے سے نہیں کی گئی۔ ان میں اس پیشہ ورانہ اہلیت کا فقدان تھا جس کے ذریعے وہ ہوفا کو مجرم ثابت کر سکتے۔

☆☆☆

اسٹیو براؤن نے نوٹ بک بند کی تو اس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے جینی سے پوچھا۔ ''ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے؟''

جینی اپنے شوہر کے بارے میں جتنا جانتی تھی، وہ اس نے بتا دیا۔ اسٹیو ٹہلتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا اور نیچے سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس عورت کے معاملے میں پڑنا خطرناک ہوگا۔ آسان اور محفوظ راستہ یہی ہے کہ اسے ان لوگوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے باوجود بھی وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ اس نے نوٹ بک پڑھ لی ہے۔ کیا وہ انہیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو سکے گا کہ وہ کسی کو بھی اس نوٹ بک کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا؟ پھر اس کے ذہن کے پردے پر لیزا کی شبیہہ ابھرنے لگی جو اسے اس عورت کی مدد کرنے پر آمادہ کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اس وقت یہاں موجود ہوتی تو کوئی سوال جواب کیے بغیر اس عورت کا ساتھ دیتی۔

رات کافی گزر چکی تھی لیکن ریستوران کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں سڑک پار کر کے ڈنر کے لیے وہاں چلے گئے۔ انہوں نے بیٹھنے کے لیے ایک کیبن کا انتخاب کیا تاکہ اطمینان سے باتیں کر سکیں۔ جب اس نے جینی کو بتایا کہ وہ اس معاملے میں اس کی ہر ممکن مدد کرے گا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔ اس کے چہرے کی اداسی یک دم رخصت ہو گئی۔ اسٹیو جان گیا تھا کہ رقم اور نوٹ بک کی واپسی سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ انہوں نے شیر سے دشمنی مول لی تھی اور وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کا صرف ایک ہی حل تھا کہ وہ شیر کا شکار کر لیں۔ ان کے پاس اسے ختم کرنے کے لیے ہتھیار موجود تھا اور انہیں اس کا استعمال کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ جیسے ہی انہوں نے اپنے مقصد کا تعین کیا تو ان کا خوف بھی عزم میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے اطمینان سے کھانا کھایا۔ کافی پی اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اسٹیو کے ایک صحافی سے تعلقات تھے۔ وہ اس کا پرانا دوست تھا اور کسی ایسے شخص کو ضرور جانتا ہوگا جس کا تعلق ٹیکلین کمیٹی سے ہو۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنے مگن تھے کہ انہیں باہر کسی کے بھاری قدموں کی آواز بھی نہیں سنائی دی اور نہ ہی وہ اس ٹرک ڈرائیور کو دیکھ سکے جو کاؤنٹر کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو ان میں سے کسی کا دھیان بھی اس کی جانب نہیں گیا جو بڑے عجیب انداز میں جینی کو دیکھ رہا تھا۔

ہوٹل واپس آنے کے بعد انہوں نے کچھ دیر باتیں کی پھر اسٹیو نے کہا کہ وہ نیچے جا رہا ہے تاکہ اپنی کار کے گلوو کمپارٹمنٹ سے ایڈریس بک لے آئے۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترا۔ جیسے ہی وہ لابی میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دو افراد لفٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا لیکن وہ انہیں نظر انداز نہ کر سکا۔ ان میں سے ایک اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی کار تک پہنچا اور گلوو کمپارٹمنٹ کھولا۔ جیسے ہی وہ جھکا تو اس کی نظر سڑک کے پار کھڑے ہوئے ٹرک پر گئی۔ تب اسے اس شخص کا خیال آیا جو کاؤنٹر کے پاس بیٹھا انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایڈریس بک وہیں چھوڑی۔ گلوو کمپارٹمنٹ بند کیا اور ڈکی کھولنے کے لیے بٹن دبا دیا جہاں کمبل کے نیچے ایک شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے لوڈ کیا اور ہوٹل کی جانب دوڑ لگا دی۔

لابی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا۔ کوریڈور میں بھی سناٹا تھا۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور جینی کے کمرے کے باہر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں خاموشی تھی۔ اس نے چند لمحے رک کر اپنی سانس درست کی اور دروازے پر لات مار کر اندر داخل ہو گیا۔

ٹرک ڈرائیور نے جینی کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر تھا جبکہ دوسرا شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اسٹیو کو دیکھتے ہی اس نے فائر کر دیا جو خطا گیا۔ اسٹیو نے پلٹ کر شارٹ گن اس کی جانب کی اور اس کے پیٹ میں گولی مار دی۔ دوسری جانب جینی نے ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ پر کاٹ لیا اور اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ ٹرک ڈرائیور بہت پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے اپنی بیلٹ سے گن نکالی اور دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسٹیو نے اسے مہلت نہیں دی اور اس کی ٹانگ میں گولی مار دی۔

''جلدی کرو۔'' وہ زور سے چلایا۔

جینی نے رقم اور نوٹ بک اپنے پرس میں رکھی اور زخمی ٹرک ڈرائیور کے اوپر سے پھلانگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسٹیو نے ایک نظر کرسی پر پڑے ہوئے مردہ شخص پر ڈالی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں جنوب میں واقع فلنٹ کی جانب جا رہے تھے۔ راستے میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سڑک پر بہت کم کاریں تھیں۔ البتہ ٹرکوں کی بھرمار تھی جن کی تیز روشنی اسٹیو کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

فلنٹ پہنچ کر اس نے شکاگو میں اپنے صحافی دوست کو فون کیا جو اپنی نیند خراب ہونے پر ناراض ہو رہا تھا لیکن جب اسٹیو نے ساری صورتِ حال اسے بتائی تو اس کی ناراضی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یک لخت دور ہوگئی۔ اس نے اسٹیو سے کہا کہ وہ اس کی فون کال کا انتظار کرے۔ وہ تھوڑی دیر بعد اسے فون کرے گا۔ بیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی اور اس کے دوست نے بتایا۔

''میں نے متعلقہ شخص کو فون کیا تھا۔ اس نے ایف بی آئی کے دو ایجنٹوں سے تمہاری ملاقات کا انتظام کر دیا ہے۔''

''ہماری ملاقات کب اور کہاں ہوگی؟'' اسٹیو نے پوچھا۔

''گرینڈ ریپڈ۔ وہاں شہر کے جنوب میں ایک ہوائی اڈا ہے جو ہلکے طیاروں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور ان دنوں بند ہے۔ وہ تم سے وہیں ملیں گے۔''

انہوں نے گاڑی میں گیس بھروائی اور مغرب کی سمت گرینڈ ریپڈ کی جانب روانہ ہوگئے۔ اب وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن اب ان کا موضوع مختلف تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے ساتھیوں سے محروم ہو چکے تھے اور ایک دوسرے کے درد کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اور منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے وہ اس نکتے پر متفق ہو چکے تھے کہ وہ دونوں آپس میں مل کر اس تنہائی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہوائی اڈے کے آثار دیکھے تو ہائی وے سے اتر کر ایک ذیلی سڑک پر گاڑی موڑ لی جو ایک تاریک عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں دو آدمی نظر آئے جو عمارت کے باہر کھڑی ہوئی کار پر جھکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور بولا۔

''کیا تم اسٹیو براؤن ہو؟''

''ہاں۔۔۔ اور تم؟''

اس شخص نے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور بولا۔ ''میں فیڈرل ایجنٹ کولس اور یہ میرا ساتھی ٹیڈ لوکس ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہارے پاس ایک ایسی نوٹ بک ہے جس میں میکلینن کمیٹی کے لیے انتہائی اہم ثبوت ہیں۔''

جینی نے رقم اور وہ نوٹ بک اس ایجنٹ کے حوالے کر دی۔ کولس نے نوٹ بک کھولی اور اس کے اندرونی صفحات پڑھنے لگا۔

''اس میں ایسے ایسے لوگوں کے نام ہیں جنہیں پڑھ کر تم حیران رہ جاؤ گے۔''

کولس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' جینی نے پوچھا۔

''وہ تمہاری تلاش تبھی ترک کریں گے جب انہیں یقین ہو جائے کہ تم مر چکی ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں کہیں غائب ہو جاؤں؟''

''ہاں، یونہی سمجھ لو۔''

اسٹیو اور جینی اس کا اشارہ سمجھ کر اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اسٹیو نے آسمان پر نگاہ ڈالی پھر جینی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کا چہرہ پُرسکون تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بھڑک اٹھی۔

☆☆☆

اسی شب ٹیلی ویژن کے لیٹ نائٹ شو میں رابرٹ کینیڈی نے مہمان کے طور پر شرکت کی اور ہوفا کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس یونین کی وجہ سے ہم سب کی زندگی مشکل میں ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہم خاموش تماشائی بن کر مسٹر ہوفا کی قیادت میں اس یونین کو سپر پاور بنتا دیکھیں جو عوام اور حکومت سے زیادہ طاقتور ہو۔ جب تک ان کا راستہ نہیں روکا جائے گا، اس وقت تک یہ ملک عوام کے بجائے ہوفا اور اس کے ساتھیوں کے کنٹرول میں رہے گا۔''

☆☆☆

مشی گن ریڈیو کی خبروں میں بتایا گیا۔ ''گرینڈ ریپڈ پولیس نے اعلان کیا ہے کہ ایک جلی ہوئی کار سے دو لاشیں ملی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت اور دوسری مرد کی ہے۔ لاشیں بری طرح جھلس چکی ہیں اور ان کی شناخت ناممکن ہے لیکن جائے حادثہ سے ملنے والی معلومات سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ دونوں لاشیں اسٹیو براؤن اور جینی مچل کی ہیں۔ یہ دونوں گزشتہ شب ایلسبین ہوٹل میں فائرنگ کر کے فرار ہوئے تھے جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک اور دوسرا شدید زخمی ہے۔ پولیس کو ان دونوں کی تلاش تھی۔''

☆☆☆

پولیس جلی ہوئی کار کے گرد کھڑی اپنی کارروائی کر رہی تھی۔ کافی لوگ اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر دو افراد کھڑے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

ٹیڈ نے پوچھا۔ ''اس نوٹ بک کا کیا کرنا ہے؟''

''اسے بھول جاؤ۔'' ایجنٹ کولس نے کہا۔

''کیا ہم اسے رابرٹ کینیڈی کے حوالے نہیں کریں گے؟''

''نہیں۔'' کولس نے کہا۔ ''اگر انہیں معلوم ہو گیا تو وہ اسے بھی مار ڈالیں گے۔ سمجھ لو کہ وہ خونی کتاب جینی کے ساتھ ہی شعلوں کی نذر ہو گئی۔''





# قاتل کون

بابر نعیم

ایجادات ہوں یا چیزیں ... سب ہماری سہولت کے لیے ہوتی ہیں... لیکن کبھی کبھی ان اشیاء کا استعمال ناقابلِ تلافی عمل کا سبب بن جاتا ہے ... قرینے وسلیقے سے زندگی گزارنے والوں کی ایک جھلک ... وہ کسی بھی پل ... کسی بھی لمحے اپنی زندگی کو شائستگی و نفاست سے مبرّا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے...

**اقدامِ جرم کا احاطہ کرتی ایک معاملہ فہم و باریک بین..... مختصر مگر مدلل کتھا**

''دیکھو ایلس۔'' ہربرٹ نے کہا۔ ''آج کل دنیا میں جو حالات چل رہے ہیں تو یہ بات قابلِ فہم ہے کہ اپنے پاس ایک ہتھیار رکھا جائے۔ تم جانتی ہو کہ صرف اپنی حفاظت کے لیے۔ میں کسی ایسے مسلح بدمعاش کا اس طرح سامنا نہیں کرنا چاہتا کہ میرے ہاتھ میں گن کے بجائے میری باؤلنگ گراتی ہو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

ایلس نے جھک کر شیلف میں سے ایک میگزین اٹھایا اور اس کے صفحات پلٹتے ہوئے وہ آرٹیکل نکال لیا جو وہ کچھ دیر پہلے پڑھ رہی تھی۔ اس نے آرٹیکل والا صفحہ اپنے شوہر کے سامنے کر دیا۔ ''یہ دیکھو... یہاں اس میں یہ لکھا ہے کہ گھر میں موجود ایک گن سے کسی مجرم کے بجائے گھر کے کسی فرد کی ہلاکت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔''

ہربرٹ نے آرٹیکل پر نگاہ ڈالے بغیر میگزین کو پرے کر دیا اور بولا۔ ''یہ نان سینس ہے۔ اگر کوئی اتنا احمق ہوا کہ اس نے ہمارے گھر میں زبردستی گھسنے کی کوشش کی تو اس سے حساب بے باق کرنے کے لیے میرا یہ بے بی میرے پاس موجود ہے۔ چونکہ ٹریسی شادی ہو کر اپنے گھر سدھار گئی ہے اور جیمز کالج چلا گیا ہے اور وہیں ہاسٹل میں رہتا ہے... تو اس قدیم بڑے سے گھر میں اب صرف ہم دونوں ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اگر کوئی دندناتا ہوا ادھر گھس آیا تو تم مجھ سے کیا توقع رکھتی ہو کہ میں کیا کروں گا؟''

''تم پولیس کو فون کر دینا۔'' ایلس نے کہا۔ ''وہ اور کس لیے ہوتی ہے؟''

''ہاں، پولیس والے۔'' ہربرٹ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جس وقت تک وہ یہاں پہنچیں گے تب تک ہم دونوں مر چکے ہوں گے اور وہ عادی مجرم کہیں دور نکل چکا ہوگا۔ اس کے علاوہ بندوقیں لوگوں کو ہلاک نہیں کرتیں...''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے قبل کہ ہربرٹ اپنا جملہ مکمل کرتا، ایلس نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے یک زبان ہو کر جملہ مکمل کر دیا۔
''...لوگ، لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔''

ہربرٹ نے ریوالور اپنے نائٹ اسٹینڈ کی دراز میں کھسکا دیا اور اپنا گاؤن بیڈ کے کنارے اچھالتے ہوئے بولا۔ ''اب سونے کے لیے لیٹ جاؤ، ایلس۔ ہم اس بارے میں صبح بات کریں گے۔''

''یہ بات تم مہینوں سے کہہ رہے ہو۔'' ایلس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اور اس گن کے بارے میں تم سے بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیوار سے بات کرنا۔''

ہربرٹ نے کمبل اوڑھا اور اندر کھسکنے کے بعد اپنے سائڈ کی لائٹ آف کرتے ہوئے بولا۔ ''کل صبح!''

ایلس سمجھ گئی کہ اب اس موضوع پر مزید بات کرنا فضول ہے۔ سو اس نے ایک لمحے کے لیے ہار مان لی۔ وہ بھی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی اور اپنی جانب کی لائٹ بجھا دی۔ وہ سوچنے لگی کہ کل صبح کی گفتگو کس نوعیت کی ہو سکتی ہے... کیا وہ کبھی ہربرٹ کو سمجھانے میں کامیاب ہو سکے گی؟

انہی خیالوں میں غلطاں وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

☆☆☆

''ہربرٹ! اٹھو... گھر میں کوئی گھس آیا ہے۔'' ایلس کی آواز میں ہیجان تھا۔

ہربرٹ نے نیند میں بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی اور کمبل کو مزید کھینچتے ہوئے اس میں دبک گیا۔

ایلس نے اس کا کمبل کھینچ لیا اور اس کے کان میں اس مرتبہ قدرے اونچی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''ہربرٹ! اٹھ جاؤ۔'' ساتھ ہی اس مرتبہ اس نے اپنے شوہر کو جھنجوڑ ڈالا۔

ہربرٹ نے کروٹ بدل کر آنکھیں ملنا شروع کر دیں۔

''کیا بات ہے، ایلس؟''

ایلس نے اپنا بازو اپنے شوہر کے سینے پر رکھ دیا اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے ہربرٹ۔ مجھے نیچے کچھ آواز سنائی دی ہے۔ میں...''

ہربرٹ نے اپنا ہاتھ ایلس کے منہ پر رکھتے ہوئے اسے خاموش کر دیا۔ ''شش!''

پھر وہ دونوں اپنے بیڈ پر ساکت لیٹے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے۔ تب ہربرٹ کو بھی کچھ سنائی دیا۔

وہ کسی کے قدموں کی چاپ تھی۔

ہربرٹ نے ایلس کے چہرے پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور خاموشی کے ساتھ اپنے نائٹ اسٹینڈ کی دراز کھولی۔ اس کا ہاتھ چند سیکنڈ تک دراز کو ٹٹولتا رہا اور پھر جب اس کا ہاتھ دراز سے باہر آیا تو اس میں اس کا اعشاریہ تین دو کا اسمتھ اینڈ ولسن ریوالور دبا ہوا تھا۔

پھر وہ بیڈ کے کنارے پر سے کھسکتا ہوا نیچے اترا اور سلیپرز پہننے کے بعد بیڈ کے کنارے پر پڑا ہوا اپنا گاؤن اٹھا لیا۔

''اوہ ہربرٹ!'' ایلس نے روہانسی سرگوشی میں کہا۔ ''احتیاط کے ساتھ۔''

پھر ایلس نے بھی اپنا گاؤن پہنا اور پیروں میں سلیپرز پہننے کے بعد ایک ہاتھ کے فاصلے سے اپنے شوہر کے پیچھے باہر ہال میں نکل آئی۔ وہ دونوں چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اٹھاتے ہوئے زینے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

لینڈنگ پر پہنچ کر وہ رک گئے اور سننے کی کوشش کرنے لگے۔

نیچے سے وہ آواز پھر سنائی دی۔

وہی قدموں کی چاپ!

ہربرٹ اب چوکنے کے انداز میں نیچے اترنے لگا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لیا ہوا تھا اور داہنے ہاتھ میں ریوالور تان رکھا تھا جس کا رخ سامنے کی جانب تھا۔ ایلس عین اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ سب سے نچلے زینے پر پہنچ کر ہربرٹ ٹھہر گیا اور دوبارہ کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ قدموں کی چاپ رک گئی تھی۔

ہربرٹ وہیں رکا رہا اور دوبارہ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں ایلس کی گھٹی گھٹی سانسوں کی آواز آ رہی تھی، وہ اس کے عین پیچھے کھڑی تھی۔

چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ہربرٹ کو قدموں کی آہٹ پھر سنائی دی۔ یہ آواز کچن کی جانب سے آئی تھی۔

ہربرٹ محتاط قدموں کے ساتھ کچن کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا اور دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہربرٹ نے ایک جھٹکے کے ساتھ کچن کے گھومنے والے دروازے کو دھکا دیا اور تیزی سے کچن میں داخل ہو گیا۔ کچن کا عقبی حصہ پورے چاند کی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ اسے ایک سایہ چوروں کے مانند سامنے سے دبے پاؤں گزرتا دکھائی دیا۔

ہربرٹ نے اپنا ریوالور تان لیا اور گرجتے ہوئے بولا۔ ''رک جاؤ۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔''



وہ سایہ رک گیا اور اس نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکتی ہوئی چیز تھی۔

ہربرٹ نے اضطراری طور پر فائر کر دیا۔ سایہ تھوڑا سا اچھل کر فرش پر گر پڑا۔ ہربرٹ کچن میں دو قدم آگے بڑھ گیا۔ ایلس نے لپک کر کچن کی لائٹ آن کر دی۔

وہ ایک نوجوان تھا جو منہ کے بل کچن کے فرش پر گرا ہوا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں دبی ہوئی وہ چمک دار شے اب واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ایک کفچہ تھا۔

کفچہ؟ ایک منٹ... فرش پر پڑا ہوا وہ نوجوان جانا پہچانا لگ رہا تھا۔

ایلس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ فرش پر گرے ہوئے نوجوان کی جانب دوڑ پڑی۔ نوجوان کے قریب پہنچ کر وہ فرش پر بیٹھ گئی اور نوجوان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور آہ و بکا کرنے لگی۔

تب ہربرٹ کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ نوجوان کا چہرہ شناسا سا کیوں لگ رہا تھا۔

وہ ان کا بیس سالہ بیٹا جیمز تھا۔

''جیمز!'' ہربرٹ چیخ پڑا۔ ''یہ جیمز ہی ہے نا؟ یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟''

ایلس روتے ہوئے اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ جیمز کا سر بدستور اس کی گود میں تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور روہانسے لہجے میں بولی۔ ''تم نے اسے مار ڈالا۔ تم نے ہمارے بیٹے کو مار ڈالا۔''

ہربرٹ نے ریوالور کچن ٹیبل پر رکھ دیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ریوالور کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی غلاظت ہو اور چھونے سے اس کے ہاتھ آلودہ ہو جائیں گے۔

''م... مجھے معلوم نہیں تھا۔ اور... اور کیونکر معلوم ہوتا؟ جیمز کو یہاں سے گئے ہوئے لگ بھگ دو سال ہو چکے ہیں۔ وہ آدھی رات کو اندھیرے میں یہاں کیا کر رہا تھا؟''

ایلس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے بیٹے کا سر گود میں لیے بدستور رو رہی تھی۔

ہربرٹ نے میز پر پڑے ہوئے ریوالور کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''اگر وقت واپس لوٹ آئے اور مجھے دوبارہ یہ موقع ملے تو میں اپنی جان دینے کو ترجیح دوں گا لیکن...''

''آپ کو یہ موقع دوبارہ مل سکتا ہے۔''

اس آواز نے ہربرٹ کو چونکا دیا۔ یہ اس کے بیٹے جیمز کی آواز تھی جو اپنی ماں کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے کروٹ لے رہا تھا۔ ''آپ اب بھی اس ملعون شے سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے گھر اور ممی کے تحفظ کا کوئی اور طریقہ تلاش کر سکتے ہیں۔''

ایلس اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور جیمز کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔ پھر اس نے ایک نگاہ کچن ٹیبل پر موجود ریوالور پر ڈالی اور دوبارہ اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم سمجھتے ہو کہ ہم تمہیں اصلی گولیوں کے ساتھ یہاں نیچے آنے کی اجازت دے دیتے؟ یہ بہت بُرا ہوا کہ یہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں یہ ڈھونگ رچانا پڑا۔ لیکن ہمیں صرف یہی ایک طریقہ سجھائی دیا تھا جس سے تمہیں اس شے سے نجات حاصل کرنے پر قائل کر سکتے۔''

ہربرٹ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ساتھ ہی اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور وہ اپنا سینہ دبوچے گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ رہی تھی اور ہونٹ نیلے ہو چکے تھے۔

اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔ ''بندوقیں لوگوں کو ہلاک نہیں کرتیں۔ لوگ، لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔''

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی سانسیں تھم گئیں... اس کی روح نے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

## پندرہ بچے

نجومی نے سائل کا ہاتھ دیکھنے کے بعد کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیے صاحب! میں کسی کو جھوٹی تسلی یا امید دلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا علم کہتا ہے کہ اکتالیس برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہو جائے گا۔ اڑتیس سال کی عمر میں آپ کی شادی ہو گی اور آپ کے سولہ بچے ہوں گے۔''

''کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔'' سائل بگڑ کر بولا۔ ''اڑتیس سال کی عمر میں میری شادی ہو گی اور اکتالیس سال کی عمر میں، میں مر جاؤں گا اور میرے سولہ بچے ہوں گے۔۔۔ کیسے؟''

''آپ کی شادی جس بیوہ عورت سے ہو گی، وہ پندرہ بچوں کی ماں ہو گی۔'' نجومی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نادر شاد سومرو، جیکب آباد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



قسط : 32

# رابطہ

اسما قادری

## تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے ۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے ۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

### گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان خاصت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پا کر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نخاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گوراجس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو آرمی کسٹڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہریار، ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر شہریار پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ شہریار ماریا سے شادی کر لیتا ہے۔ اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کر کے اسے راکے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ غلام محمد نامی ایجنٹ پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشاہر م خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ آفتاب اور کشور میر پور خاص آ جاتے ہیں۔ شہریار جگو کو فون کر کے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالسنان شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑ اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ چودھری چراغ پا ہو جاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، لٹی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور لٹی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور لٹی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جرو اور اسلم میں خونی تصادم ہوتا ہے۔ لٹی اس تصادم میں جرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شبانہ آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھر لی جاتی ہے اور اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ وہ لوگ آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ آفتاب کو شہریار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ماہ بانو کو تھوڑا دور ایک مقام پر چھوڑ کر اس کے بہنوئی کے پاس پہنچتا ہے اور اسے شفقت کا حوالہ دے کر اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو کو لینے کے لیے اس مقام پر پہنچتے ہیں تو ماہ بانو کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ تاہم ماہ بانو ایک چٹان کے پیچھے اسے سوتے ہوئے مل جاتی ہے۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔ ادھر شہریار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مراد شاہ کو ماں کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ پاکستان آ جاتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیر لیتے ہیں۔ گھیرا ڈالنے والے لوگ حامد راؤ سے کہتے ہیں کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات سن کر حامد راؤ گولی چلا دیتا ہے اور پھر وہاں دو بدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آ جاتے ہیں۔ حامد راؤ، اسلم کے بارے میں جان جاتا ہے تاہم وہ اس کی کہانی سن کر اسے اچھی زندگی گزارنے کے لیے نوکری کی پیشکش کرتا ہے۔ ادھر مشاہرم خان شہریار کو خاقانہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشاہرم خان کو دوبارہ ثابلی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشاہرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔ بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کان جو آواز سنتے ہیں، وہ گولی چلنے کے دھماکے کی ہوتی ہے۔ اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ وہ پراسائیں کے ہرکاروں کے جتھے چڑھ جاتا ہے جو اس پر تشدد کر کے اس کی زبان کھلوانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ نور بخش کے بیٹے کی مدد سے وہاں سے فرار ہو کر شہریار کے پاس پہنچتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کر جاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اسلم اس سے اپنی ماں کے بارے میں استفسار کرتا ہے مگر وہ ہراساں نظروں سے اس کی پشت پر موجود دروازے کو دیکھتی ہے جو اسلم اپنے اضطراب میں کھلا چھوڑ آتا ہے۔

**اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے**

کھلے دروازے کے اس پار نظر آنے والے چہرے اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ نواز چانڈیو اور اس کا بھائی سرفراز چانڈیو تھے جو خون آشام نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔ ماہ بانو کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوئی کہ اس کی محتاط روی کے باوجود وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یقیناً ان دونوں بھائیوں نے یہ کام بے حد ہوشیاری اور چالاکی سے کیا تھا، جب ہی وہ گاؤں سے یہاں تک ان میں سے کسی کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے اور اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اب تک تمام تر صورتِ حال سے بے خبر اسلم دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر پلٹا اور اپنے دیرینہ دشمنوں کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''آخر ہم نے تجھے ڈھونڈ ہی لیا اسلم! تُو بہت بھاگا اپنی موت سے لیکن آج تیرا وقت پورا ہو ہی گیا۔'' نواز چانڈیو نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا وقت پورا نہیں ہوا بلکہ تمہاری موت کھینچ کر تمہیں یہاں تک لائی ہے۔'' وہ فوری جھٹکے سے سنبھل چکا تھا چنانچہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بے خوفی سے بولا۔

''میرے ہتھیار کے سامنے تُو خالی ہاتھ کھڑا ہے اور دھمکی دے رہا ہے۔ کیا کہنے بھئی تیرے۔'' اپنے پسٹل کی نمائش کرتے ہوئے نواز چانڈیو نے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

''ہتھیاروں پر بھروسا تیرے جیسے نامرد کرتے ہیں۔ تیری گردن توڑنے کے لیے تو میرے بازوؤں کی طاقت ہی کافی ہے۔'' اسلم اس سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

''میں نامرد ہوتا تو تیری اس دودھ شریک بہن کو ماں نہ بنا پاتا۔ افسوس کے تجھے مہلت نہیں ملے گی ورنہ میں تجھ سے کہتا کہ کبھی گوٹھ جا کر اپنی بہن سے پوچھ کہ کیسے نواز چانڈیو نے اسے اغوا کر کے اپنے نکاح میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ بڑی اڑیل گھوڑی تھی تیری بہن پر آج میرے گھر میں میری چپلیں سیدھی کرتی ہے اور میرے بچے کو پالتی ہے۔'' وہ اسلم کو کچوکے لگانے کی نیت سے بولا اور جس تیزی سے اسلم کے چہرے کی رنگت سرخ پڑی، اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہے۔ ابھی تک ہونے والی گفتگو میں اس کے بھائی سرفراز نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، وہ اسلم پر نظریں جمائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ دوسری طرف ماہ بانو بھی بالکل خاموشی سے یہ مکالمے بازی سن رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سچویشن میں خاموش تماشائی کے علاوہ اور کون سا کردار ادا کرے۔





''میری بہن کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کی ایک ایک بوند کا حساب تجھے اپنے خون کے قطروں سے دینا ہوگا۔ تیرا بھائی تو بہت آسان موت مرا تھا، تجھے میں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔'' اسلم کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ماہ بانو اس کا یہ انداز دیکھ کر اندر سے کانپ اٹھی...

''میرے بھائی کی موت کے بدلے کے لیے تو تیری ماں کی دردناک موت ہی کافی ہے۔ سسک سسک کر مری ہے بڑھیا۔ آخری وقت تیری یہ رکھیل وہاں پہنچ گئی ورنہ تو اس کے حلق میں پانی کی دو بوند بھی ٹپکانے والا کوئی نہ ہوتا۔'' نواز چانڈیو کے الفاظ نے جہاں اسلم کو کرنٹ لگایا وہاں ماہ بانو بھی بے بسی کے شدید احساس سے تلملا کر رہ گئی۔ جس خبر کو وہ بہت قرینے سے اسلم تک پہنچانا چاہتی تھی، نواز چانڈیو نے بڑی بے رحمی و بیدردی سے اسے سنا ڈالی تھی۔ اس وقت تو وہ اسلم کی شکوہ کناں نظروں کے جواب میں اپنی پلکیں جھکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسلم نے بھی بس پل بھر کے لیے ہی اس کی طرف دیکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نواز پر جھپٹا۔ ہتھیار بدست نواز چانڈیو جو نہتے اسلم کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھ رہا تھا، بجلی کے اس کوندے سے کسی طور نہیں بچ سکا اور اسلم نے اسے لمحہ بھر میں ہی زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی اس کا پسٹل بھی ہاتھ سے نکل گیا اور چارپائی کے نیچے جا گرا۔

''بس سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ یہ لڑکی اپنی جان سے چلی جائے گی۔'' اب تک خاموش کردار بنا سرفراز چانڈیو، بھائی کو زیر ہوتے دیکھ کر فوراً حرکت میں آیا اور تیزی سے ماہ بانو کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں اس طرح جکڑ لیا کہ اس کے ہاتھوں کی ذرا سی جنبش ماہ بانو کی گردن کا منکا توڑ سکتی تھی۔ اس کی دھمکی سن کر اسلم اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ دنیا میں اپنی ماں، بہن کے علاوہ اس نے جس عورت کو بے تحاشا چاہا تھا، وہ ماہ بانو تھی۔ ماں اور بہن کو تو وہ کھو چکا تھا اب صرف ماہ بانو بچی تھی جسے وہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتا تھا چنانچہ خود بخود ہی نواز چانڈیو پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر نواز نے فوراً ہی اسے اپنے اوپر سے دھکیلا اور کھڑے ہو کر اس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر لگائی۔

''سوچ سمجھ کر ہاتھ پیر چلانا نواز! میں ابھی بے بس ہوں تو یہ نہ سمجھ کہ آگے بھی یہی صورتِ حال رہے گی۔ میں تیرا حشر بگاڑ کر رکھ دوں گا۔'' اسلم نے قہر برساتی آواز میں اسے دھمکی دی۔

''تو دیکھے گا کہ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔'' جواب میں نواز نے بھی نفرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک تھپڑ اور دے مارا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اسلم کے گال کا اندرونی حصہ پھٹ گیا اور منہ سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ خون دیکھ کر ماہ بانو کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

''آواز بند کرو ورنہ یہیں گلا گھونٹ کر پھینک دوں گا۔'' اسے گرفت میں لیے کھڑا سرفراز غرایا۔

''یاد رکھ سرفراز کہ اس لڑکی کا بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تم لوگوں کی زندگی کی ضمانت ہے۔ اسے کچھ ہوا تو تم دونوں بھائیوں کا وہ حال کروں گا کہ لاشیں بھی پہچانی نہیں جائیں گی۔'' اسلم کی غراہٹ سرفراز چانڈیو کی غراہٹ سے کئی گنا قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک پل کے لیے تو وہ دونوں بھائی بھی اپنی برتری کے باوجود اندر سے لرز کر رہ گئے مگر اچانک ہی دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے ہر ایک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔

''کون ہے؟'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد نواز چانڈیو نے پوچھا۔ اس اثنا میں سرفراز، ماہ بانو کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے آواز نکالنے سے محروم کر چکا تھا جبکہ اسلم کو بھی اس نے آنکھ کے اشارے سے یہ بات سمجھا دی تھی کہ اس کا بولنا ماہ بانو کو نقصان پہنچا دے گا۔

''میں ہوٹل کا مالک ہوں۔ اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟'' باہر سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''کچھ نہیں بھائی سب خیر ہے۔ ہم ذرا اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر رہے تھے اس لیے تھوڑا شور شرابا ہو گیا۔ اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی، تم جاؤ۔'' نواز نے اپنی آواز کو نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا میں اندر آ کر دیکھ سکتا ہوں کہ تم لوگوں نے فرنیچر کی کیسی سیٹنگ کی ہے؟'' ہوٹل کے مالک کی سوچتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''نہیں بھائی صاحب! اندر ہماری پردے دار زنانی موجود ہے ہم تمہیں اندر نہیں بلا سکتے۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''ٹھیک ہے لیکن اب مجھے یہاں سے کوئی شور شرابا سنائی دیا تو میں تمہیں اپنے ہوٹل سے نکال دوں گا۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے جو تم یہاں اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر رہے ہو۔'' ہوٹل کے مالک نے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر یوں محسوس ہوا کہ وہ وہاں سے چلا گیا ہو۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ آدمی کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے بھائی جی۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔" سرفراز نے تشویش زدہ لہجے میں نواز سے کہا تو اس نے گردن ہلا دی اور اسلم کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"سیدھی طرح کوئی گڑبڑ کیے بغیر ہمارے ساتھ چلے گا تو تجھے چند سانسوں کی مہلت اور مل جائے گی ورنہ میں ہر انجام سے بے پروا ہو کر بھرے مجمع میں تجھے اور اسے گولی مار دوں گا۔ یہ تیری کنپٹی چیختی ہے، یہ تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ ویسے ایک گل میں مانتا ہوں کہ تو نے عورت بڑی زبردست ڈھونڈی ہے اپنے لیے۔ سالی ہوشیار بھی بڑی ہے۔ اس کی ہوشیاری دیکھ کر ہی میں اور سرفراز بس میں اس کے ساتھ آنے کے بجائے ریل گاڑی سے یہاں پہنچے تھے۔ پھر بس اڈے پر پہنچ کر پہلے سے دو تانگوں میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ تیرے سے ہم نے ساز باز کر لی تھی کہ لڑکی اگر اس کے تانگے میں بیٹھے تو وہ ہمیں اس کا پتا بتا دے۔ ہماری ترکیب کامیاب رہی ورنہ یہ چوکنی ہرنی تو ایسے گردن گھما گھما کر اڈے پر چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے خطرے کی بُو سونگھ رہی ہو۔"

نواز چانڈیو کی بے وقت کی راگنی نے ماہ بانو کی یہ الجھن دور کر دی کہ وہ دونوں اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود آخر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب کیسے ہو گئے۔

"میرا اور اس کا جو معاملہ ہے وہ ہمارے درمیان ہے۔ تو یہ یاد رکھ کہ اب تو اپنے غلیظ منہ سے اس کے لیے کوئی گالی نہیں نکالے گا ورنہ میں بھی ہر انجام کو بھول کر یہیں تیرا مردہ دفن کر دوں گا۔" اسلم کی کنپٹیوں پر ابھری رگیں اس کے غصے کی شدت کا پتا دے رہی تھیں۔

"اس کی بڑکوں کو چھوڑو بھائی جی! پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اس کی بکواس کا مزہ ہم اسے بعد میں چکھائیں گے۔" سرفراز چانڈیو کی چھٹی حس نے شاید کسی خطرے کی بُو سونگھ لی تھی جو مسلسل یہاں سے روانگی پر زور دے رہا تھا۔ شاید اسے گمان گزرا تھا کہ ہوٹل کے مالک کی وارننگ محض وارننگ نہیں تھی بلکہ وہ واقعی پولیس کو یہاں بلا سکتا تھا۔

"چل پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔" غصے میں ہونے کے باوجود نواز کو بھائی کی بات سمجھ آ گئی۔ اس موقع پر اسلم نے بھی کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ ترکِ جرم کا عہد کرنے کے باوجود وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ قانون کی نظر میں وہ اب بھی ایک مفرور ڈاکو ہے جسے کسی بھی طور معاف نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی زندگی کے بہت سے سال برباد ہو جانے کے بعد اب مزید ماہ و سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ زندگی کے بہت سے بنجر سال گزارنے کے بعد اب کہیں جا کر اس کی آنکھوں نے خواب بُننے شروع کیے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کی اس دنیا میں حقیقت میں بسنا چاہتا تھا۔۔۔ چنانچہ بے حد محتاط تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے وہ اس ترتیب سے باہر نکلے کہ نواز نے اسے اپنے ساتھ رکھا تھا جبکہ ماہ بانو اور سرفراز پیچھے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا ہوا تھا جیسے وہ چاروں آپس میں شناسا ہوں لیکن یہ تو اسلم کو معلوم تھا کہ نواز چانڈیو کا دایاں ہاتھ جو کہ اس کی جیب کے اندر ہے، ایک بھرے ہوئے پسٹل کو گرفت میں لیے ہوئے ہے اور وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی حرکت ہونے پر اسے استعمال کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرے گا۔ اسلم نے اپنی زندگی کے پچھلے چند سالوں میں اسلحے کا اتنا استعمال کیا تھا کہ اس کے لیے پسٹل کی حیثیت محض ایک کھلونے کی سی تھی۔ وہ چاہتا تو جس وقت وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہے تھے اور گاہکوں سے بھرے ہوٹل کے ہال سے گزر رہے تھے تو کسی بھی لمحے نواز اور سرفراز کو چابکدستی سے زیر کر سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی پھرتی اور طراری کے سامنے وہ دونوں بھائی ٹک ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ پنجاب کے ایک جنگل سے فرار ہونے والے اسلم کو سندھ میں بھی کوئی شناخت کر لیتا اور اس کے بعد تو انجام بس جیل کی کوئی سیلن زدہ، تاریک کوٹھری ہی ہو سکتی تھی چنانچہ وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوٹل سے باہر نکلتا چلا گیا۔ باہر ایک تانگا موجود تھا۔ نواز کے اشارے پر وہ لوگ تانگے میں سوار ہو گئے۔ ماہ بانو نے پہچان لیا کہ اس تانگے کا کوچوان وہی شخص ہے جس نے بس اڈے سے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔

"چلو۔" وہ چاروں تانگے میں بیٹھ چکے تو نواز نے کوچوان کو حکم دیا۔ اس نے فوراً ہی گھوڑے کو چابک رسید کی اور گھوڑا حرکت میں آ گیا۔ گھوڑا ہوٹل سے چند قدم ہی آگے بڑھا ہو گا کہ انہوں نے موٹر سائیکل پر سوار دو پولیس والوں کو ہوٹل کے سامنے رکتے ہوئے دیکھا۔ سرفراز نے معنی خیز نظروں سے نواز کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی معاملہ فہمی پر بڑے بھائی سے داد طلب کر رہا ہو اور یہ تھی بھی حقیقت کہ اگر وہ لوگ چند منٹ اور ہوٹل کے کمرے میں رکے رہتے تو پولیس والوں سے ٹکراؤ ہونا لازمی تھا۔ وہ جو ایک شک ساتھا کہ ہوٹل کا مالک محض وارننگ پر اکتفا نہیں





کرے گا، سچ ثابت ہوا تھا۔

"دیکھو صاحب کوئی گڑبڑ ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں غریب آدمی ہوں اس لیے تھوڑے سے پیسوں کے لالچ میں تمہارے کام کے لیے راضی ہو گیا لیکن کسی پھڈے میں نہیں پڑ سکتا۔ تمہاری کسی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے جیل جانا پڑا تو پیچھے میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔" گھوڑا گاڑی کچھ اور آگے بڑھی تو کوچوان نے تشویش زدہ لہجے میں نواز سے کہا۔ اپنے لباس اور چہرے مہرے سے وہ واقعی غریب آدمی محسوس ہو رہا تھا جو لالچ میں آ کر خطرہ تو مول لے بیٹھا تھا لیکن انجام سے خوف زدہ تھا۔

"چپ کر کے تانگا چلا بڈھے۔ جب ایک بار میں نے تجھ سے کہہ دیا ہے کہ تجھے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ تو ہمیں ہماری مرضی کی جگہ پر چھوڑنا اور اپنی رقم لے کر واپس پلٹ جانا تو تجھے پھر کس چیز کا ڈر ہے۔ تجھ جیسے ڈیڑھ پسلی کے آدمی سے میں کوئی توپیں تو چلوا نہیں سکتا۔ تو بس اتنا کرنا بعد میں اگر کوئی تجھ سے ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ سواریوں کو بس اڈے کے قریب اتار دیا تھا۔ تو خود ہی پریشانی سے بچا رہے گا۔" نواز چانڈیو نے سخت لہجے میں کوچوان کو جواب دیا جس پر وہ چپ سادھ کر اپنے گھوڑے کے ساتھ مصروف ہو گیا البتہ اس کے بشرے سے تشویش کے آثار اب بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس کی حالت اس شخص کی سی تھی جو اوکھلی میں سر تو دے بیٹھا تھا لیکن اب موصلوں سے خوف زدہ تھا۔

مختلف کچی پکی سڑکوں سے گزرتا ہوا تانگا آخر کار شہر کے آباد حصے کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف بڑھنے لگا۔ ویرانے میں پہنچتے ہی ماہ بانو کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ نواز اور سرفراز، اسلم کے جانی دشمن تھے جو ظاہر ہے اسے کسی نیک ارادے سے تو اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہے تھے۔ دوسری طرف اسلم کو اطمینان محسوس ہونے لگا۔ کسی ویرانے میں وہ آبادی کے مقابلے میں ان دونوں سے زیادہ اچھی طرح نمٹ سکتا تھا۔ نواز اور سرفراز بھی یقیناً ایسا ہی کچھ سوچ رہے تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں مگن تانگے کے ان سارے سواروں کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ویرانے کی خاموشی میں ابھرتی گھوڑے کی ٹاپیں بند ہو گئیں۔

"بس صاحب! اس سے آگے میں نہیں جا سکتا۔" کوچوان نے تانگا روکتے کے ساتھ ہی اعلان کیا۔

"ٹھیک ہے۔ زیادہ آگے جا کر ہمیں بھی واپسی میں مشکل ہو گی۔" نواز چانڈیو نے اعتراض کیے بغیر اس کی بات مان لی اور وہ سب تانگے سے اُتر گئے۔ نیچے اترنے کے بعد نواز چانڈیو نے کوچوان کو رقم تھمائی۔ یہ ایسا موقع تھا جب اس کی توجہ اسلم کی طرف سے لمحہ بھر کے لیے ہٹ گئی۔ اگر اسلم چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے زیر کر سکتا تھا لیکن اس نے مناسب سمجھا کہ تانگے والے کو اپنے تانگے سمیت وہاں سے نکل جانے دے۔ وہ غریب آدمی تھا اور تھوڑے سے لالچ میں آ کر اس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا۔ اس بے چارے کا مزید کسی مشکل سے دوچار ہوئے بغیر ہی یہاں سے نکل جانا مناسب تھا۔ آخر کار وہ اپنا تانگا لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے تانگے کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی چنانچہ جلد ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ اور وہ سب پورے ارتکاز کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سرفراز اور نواز کی آنکھوں سے نکلتی نفرت کی چنگاریاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔

اسلم کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا بلکہ اس کا نقصان تو کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان دونوں نے تو صرف اپنا ایک بھائی کھویا تھا جبکہ اسلم نے اپنی ماں اور بہن کو کھونے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی برباد ہوتی دیکھی تھی۔ پھر ایک ستم رسیدہ فاخرہ بھی تھی جسے اس کی دودھ شریک بہن ہونے کے جرم میں نواز چانڈیو جیسے بھیڑیے کی بیوی بننا پڑا تھا۔ وہ دونوں اس سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے آئے تھے لیکن اگر وہ حساب کرتا تو اس کا نقصان ہر صورت زیادہ تھا۔ ماہ بانو الگ سراسیمہ تھی۔ اسلم سے محبت نہ کرنے کے باوجود وہ اس کی خیر خواہ تھی اور ہر صورت اس کی بھلائی چاہتی تھی۔ وہ ان بھائیوں کے ہاتھوں زیر ہو کر مارا جاتا تو بھی اسے دکھ ہوتا اور انہیں زیر کر کے جرم قتل کا مرتکب ہوتا تو بھی وہ تکلیف محسوس کرتی۔

"میں چاہوں تو ایک گولی تیرے بھیجے یا دل میں اتار کر ایک پل میں تیرا کام تمام کر دوں لیکن اس طرح میرے دل میں بھڑکتی انتقام کی آگ پوری طرح نہیں بجھے گی۔ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا تب ہی میرے سینے میں ٹھنڈ پڑے گی۔" آخر کار نواز چانڈیو نے ہی بولنے میں پہل کی اور اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ یہ نفرت اس کے چہرے پر بھی لکھی ہوئی تھی۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ چنانچہ اس ویرانے میں وہ چاروں ایک دوسرے کے تاثرات بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ ماہ بانو نے بھی دیکھا کہ نواز چانڈیو کی بکواس کے جواب میں اسلم نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا لیکن اس کے چہرے پر کسی زخمی درندے کی سی وحشت اُتر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئی۔۔۔اور پھر جیسے کوئی کوندا لپکتا ہے بالکل اسی طرح اس نے پھرتی سے اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر کھینچا اور نواز کے پسٹل والے ہاتھ پر دے مارا۔ اس کا نشانہ اتنا درست تھا کہ خنجر کے اِدھر اُدھر جا کر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نواز چانڈیو کے ہاتھ سے پسٹل نکل کر دور جا گرا اور اس نے زوردار چیخ مارتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ سے خون آلود ہاتھ تھام لیا۔ دوسری طرف خود ماہ بانو نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور جھکائی دے کر سرفراز سے خاصے فاصلے پر چلی گئی۔ وہ ایک بار اسلم کو اپنی وجہ سے ان لوگوں کے سامنے مجبور ہوتا دیکھ چکی تھی اب اتنی جلدی اس صورتِ حال کو دوبارہ دیکھنے اور سہنے کے موڈ میں نہیں تھی اس لیے اس کی ذہنی اور جسمانی چابکدستی زوروں پر تھی۔ جھکائی دے کر اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے اس نے اس بات کو ذہن میں رکھا تھا کہ نواز کا پسٹل کس سمت میں گرا ہے چنانچہ اس نے اسی طرف کا رخ کیا اور پسٹل اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہوگئی۔

"اپنی اپنی جگہ پر سیدھے کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گی۔" نہایت مہارت سے پسٹل پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے دھمکی دی تو اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج تم مجھے ان کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لینے دو ورنہ یہ بار بار میری راہ میں آ کر کھڑے ہوتے رہیں گے۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم اپنی حفاظت کے علاوہ کسی بھی دوسری صورت میں اس ہتھیار کا استعمال نہیں کرو گی۔ یہ مردوں کی لڑائی ہے اور میں اسے مردانہ وار ہی لڑنا چاہتا ہوں۔"

اسلم کی بات نے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا لیکن پھر اسے لگا کہ اس کے پاس اس کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ زبانی دھمکی دینا الگ بات تھی لیکن اس کے لیے نواز اور سرفراز کو گولی مار کر ان کا قصہ ختم کر دینا آسان نہیں تھا۔ وہ شدید مجبوری کے علاوہ کسی انسان پر گولی چلا ہی نہیں سکتی تھی اور یہاں تو اسلم موجود تھا اس سب سے نمٹنے کے لیے چنانچہ وہ اپنی رضامندی کے اظہار کے لیے اثبات میں سر ہلاتی ہوئی ایک جانب کھڑی ہوگئی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ان پر اسلحے کا استعمال نہیں کیا جائے گا، دونوں بھائی نڈر ہو گئے اور بیک وقت اسلم پر چھلانگ لگا دی۔

اسلم کی عقابی نظریں ان کے بدن کی ایک ایک جنبش کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ دونوں بھائی دائیں بائیں سے اس پر حملہ آور ہوئے، وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور ان دونوں کے ٹکرانے سے قبل ہی جھکائی دے کر ذرا فاصلے پر جا گرا۔ دونوں بھائی اپنے ہی زور میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بلبلاتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ انہیں اٹھنے کی مہلت دیے بغیر اسلم حرکت میں آیا اور ان کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے اپنی بائیں ٹانگ کو اس طرح گھمایا کہ وہ پہلے نواز کے جبڑے کا مزاج پوچھتی ہوئی سرفراز کی ناک سے جا ٹکرائی۔ پیروں میں موجود سخت تلے والے جوتوں کی وجہ سے دونوں ہی نے ضرب کی تکلیف کو شدت سے محسوس کیا اور حلق سے نکلنے والی چیخوں کو کسی طرح نہ روک سکے۔ خاص طور پر سرفراز زیادہ تڑپا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ نتھنوں سے بہہ کر ہونٹوں پر آتے خون کا تمکین ذائقہ وہ اپنی زبان پر محسوس کر سکتا تھا۔ اپنے ہی خون کے ذائقے نے اس کو وحشت زدہ کر دیا اور وہ کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر غراتا ہوا اسلم کی طرف لپکا۔ اس کے انداز میں اتنی وحشت تھی کہ اسلم اپنی تمام تر پھرتی کے باوجود خود کو اس کے وار سے نہ بچا سکا اور سرفراز کا پتھر جیسا سر اس کے پیٹ سے ٹکرا گیا۔ ضرب شدید تھی چنانچہ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ اسی لمحے نواز بھی سنبھل کر اس پر حملہ آور ہوا اور دونوں بھائیوں نے مل کر اسے پچھاڑ لیا اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اور ایک نے اس کے پیر اور دوسرے نے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ دونوں بھائی اس پر حاوی آ چکے ہوں لیکن وہ اسلم تھا۔ خطروں اور مشکلوں کو خاطر میں لائے بغیر ان سے بچ نکلنے کی تدبیر کرنے والا۔ اپنی خراب پوزیشن کے باوجود اس نے اپنے حواس قائم رکھے اور یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ نواز کی گرفت اپنے زخمی ہاتھ کی وجہ سے ذرا کمزور ہے۔ حقیقت میں تو وہ اس ہاتھ کو جس پر اسلم نے خنجر سے وار کیا تھا، استعمال کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ نواز کی یہ کمزوری بھانپتے ہی اس نے پھرتی سے اپنے جسم کے بالائی حصے کو حرکت دی اور لیٹے لیٹے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر پوری قوت سے سرفراز پر دے مارا۔ نواز کے جسم کے زور سے سرفراز پیچھے کی طرف الٹ کر گر پڑا۔ اسلم ایک لمحہ لگائے بغیر پھرتی سے کھڑا ہوا اور ان دونوں پر جا پڑا۔ اب ان کے پاس خود کو بچانے کے لیے کوئی مہلت نہیں تھی۔ اسلم کے چاروں ہاتھ پیر چل رہے تھے اور تابڑ توڑ ان کے جسموں پر پڑ رہے تھے۔ وہ دو ہونے کے باوجود اپنے اوپر ٹوٹ پڑنے والی اس افتاد سے بچنے کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے





تھے۔ جسم کے ایک حصے کو بچانے کے لیے ہاتھ سامنے کرتے تو دوسرا حصہ زد میں آ جاتا اور وہ یوں تڑپ اٹھتے جیسے کسی بھاری ہتھوڑی سے کاٹا جا رہا ہو۔ اندھا دھند لگائی جانے والی ان ضربوں میں سے ایک ضرب اس شدت سے سرفراز کی کنپٹی پر پڑی کہ وہ اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکا اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر نواز کی گھگی بن گئی اور وہ تھوڑی بہت جو مزاحمت کر رہا تھا، اس سے بھی گیا۔

"بہت تڑپا تڑپا کر مارا ہے نا تو نے میری ماں کو۔ اب بتا کہ تجھے کون بچائے گا؟ تو نے اپنے لیے جگہ کا انتخاب خود کیا ہے۔ یہاں میں تیرے جسم کا ریشہ ریشہ بھی الگ کر دوں گا تو کوئی تیری چیخ و پکار سن کر بچانے والا نہ ہوگا۔" دایاں پیر اس کی گردن پر جما کر وہ جس سفاکی سے بولا، اسے محسوس کر کے نواز چانڈیو تو کیا ذرا فاصلے پر کھڑی محوِ تماشا ماہ بانو بھی پوری جان سے تھرّا گئی۔

"مجھے معاف کر دو اسلم! اب میں تیری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔" کچھ دیر قبل بڑکیں مارنے والا نواز چانڈیو اس وقت کسی حقیر کیچوے کی طرح زمین پر پڑا اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے مضروب ہاتھ کے علاوہ بھی جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ جبڑے پر لگنے والی ضرب نے تو ایسا کام دکھایا تھا کہ وہ اپنے اندرونی کان تک میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور اسے صحیح سے بولنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

"تجھے معاف کر دوں تجھے؟ تو نے اور تیرے خاندان نے مل کر میری زندگی تباہ کر دی۔ یہ تم ہی لوگ تھے نا جن کے لالچ کی وجہ سے مجھے ہاتھوں سے قلم چھوڑ کر ہتھیار اٹھانا پڑا۔ میں اعلیٰ افسر بننے کے خواب بھول کر لٹیرا بن گیا اور جب میں اس جرم میں پکڑا گیا تو تم نے میری بہن کا رشتہ اپنے بھائی سے ختم کر کے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ صرف تم لوگوں کی وجہ سے قاتل بھی بنا اور ڈاکو بھی۔ میری زندگی کے کتنے قیمتی سال کسی درندے کی طرح جنگلوں کی خاک چھانتے گزر گئے اور اس پر بھی تم لوگوں کو چین نہیں آیا۔ تم نے ایک طرف فاخرہ جیسی معصوم لڑکی کی زندگی برباد کی تو دوسری طرف میری بوڑھی بے بس ماں کو تڑپا تڑپا کر مارا۔ اتنا سب کچھ کرتے ہوئے تمہیں رحم نہیں آیا۔۔۔تو پھر آج مجھ سے معافی کی امید کیوں رکھتے ہو۔ میں تو تم دونوں کی بوٹی بوٹی الگ کر کے چانڈیو خاندان کو تحفے میں بھیجوں گا کہ اگر ان میں اب بھی کسی سورما میں دم ہے تو اسلم کے سامنے آئے اور اپنا انجام دیکھ لے۔"

وہ گویا قہر و غضب میں بپھرا ہوا سمندر تھا جو سب کچھ پاش پاش کر کے رکھ دینا چاہتا تھا۔ اپنے اس جنون میں اس نے نواز کی گردن پر سے پیر ہٹا کر اس کی مضروب ہتھیلی کی انگلیوں کو پاؤں کے نیچے دبایا اور پوری قوت سے آر پار ہو جانے والے خنجر کو کھینچ لیا۔ خنجر نکلتے ہی اس کے ہاتھ سے ایک بار پھر تیزی سے خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن اسلم کو گویا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بہت چمکتی ہوئی نظروں سے اپنے محبوب خنجر کی دھار کو پرکھ رہا تھا۔ ہمہ وقت اس کی پنڈلی سے بندھا رہنے والا یہ خنجر کئی نازک مواقع پر اس کے کام آیا تھا۔ خوش قسمتی سے آج بھی نواز اور سرفراز میں سے کسی کو ہوٹل سے روانہ ہونے سے قبل اس کی جامہ تلاشی کا خیال نہیں آیا تھا چنانچہ نہ صرف خنجر پکڑا جانے سے بچ گیا تھا بلکہ وہ رقم بھی محفوظ رہی تھی جسے احتیاط کے پیشِ نظر وہ کپڑوں کے نیچے اپنے جسم سے باندھ کر رکھتا تھا۔

چند لمحوں کے لیے خنجر کا جائزہ لینے کے بعد اس کا ہاتھ اٹھا اور قوس بناتا ہوا نواز چانڈیو کے جسم کی طرف بڑھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور تکلیف کے خیال سے اس نے پہلے ہی ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"بس اسلم! تم اسے نہیں مارو گے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" خنجر نواز چانڈیو سے چند انچ کی دوری پر تھا کہ ماہ بانو نے لپک کر اسلم کا خنجر والا ہاتھ تھام لیا۔ نازک ہاتھوں کی یہ گرفت اسلم کے لیے بڑی مضبوط تھی۔ بے پناہ طیش میں ہونے کے باوجود وہ چند انچ کا باقی رہ جانے والا فاصلہ اپنے خنجر کو طے نہ کروا سکا۔

"مجھے مت روکو ماہ! اس شخص کے کھاتے میں اتنے مظالم ہیں کہ اسے اس کے انجام تک پہنچائے بغیر میرے دل میں ٹھنڈک نہیں پڑے گی۔" اس نے نہایت بے بسی سے ماہ بانو سے درخواست کی۔ آج پہلی بار اس نے اس کے لیے یہ طرزِ تخاطب استعمال کیا تھا اور نہایت مخدوش حالات کے باوجود ماہ بانو کے دل کو اس کا یہ طرزِ تخاطب پسند آیا تھا لیکن یہ وقت اپنی پسند ناپسند کے اظہار کا نہیں بلکہ بپھرے ہوئے اسلم کو سنبھالنے کا تھا۔

"تم میرے سامنے جرائم سے مکمل طور پر کنارہ کش ہونے کا وعدہ کر چکے ہو اسلم اور میں یہ کسی طور گوارا نہیں کر سکتی کہ تم میرے سامنے کسی کی جان لو۔ اگر معاملہ دفاع کا ہوتا اور تم اس کا کوئی وار بچاتے ہوئے اسے ہلاک کر دیتے تو میں نظر انداز کر دیتی لیکن اب یہ بالکل نہتا اور بے بس تمہارے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدموں میں پڑا ہے اور تم سے اپنی جاں بخشی کا طالب ہے۔ اب کسی طور اس بات کی گنجائش نہیں نکلتی کہ تم اسے کوئی نقصان پہنچاؤ۔'' وہ بہت ٹھوس لہجے میں اپنے عمل کے حق میں دلائل دے رہی تھی۔

''یہ آج بے بس ہے اس لیے اس کا سر کچل دینا بہتر ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا تو پھر یہ مجھ پر وار کرنے کے لیے کبھی نہ کبھی میرے سامنے آ کھڑا ہوگا۔'' اس نے جوابی دلیل دی۔

''اللہ، رسولؐ، قرآن جس کی چاہے قسم لے لو اسلم آج کے بعد میں کبھی تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ اگر کبھی اتفاق سے بھی تمہارا سامنا ہو گیا تو نظر چرا کر گزر جاؤں گا۔'' نواز جو ذہنی طور پر اپنی موت کے لیے تیار ہو گیا تھا، مایوسی کے گھپ اندھیرے میں نظر آنے والی امید کی کرن کو دیکھ کر جھٹ بول پڑا۔ اس کی بات ایسی تھی کہ اسلم بھی ٹھٹک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نواز کے خاندان کے لوگ لاکھ لالچی اور کینہ پرور سہی لیکن اس درجے ذلیل نہیں تھے کہ اللہ، رسولؐ یا قرآن کی قسم کھا کر کوئی جھوٹا وعدہ کر سکیں۔

''اس کی بات کا یقین کر لو اسلم! یہ درمیان میں جو حوالے لے آیا ہے، ہم انہیں رد کر ہی نہیں سکتے اور پھر فاخرہ کا بھی سوچو۔ چاہے زور زبردستی کے نتیجے میں ہی سہی لیکن تمہاری منہ بولی بہن اس کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو فاخرہ بیوہ اور اس کا بچہ یتیم ہو جائے گا۔'' اسے نرم پڑتا دیکھ کر ماہ بانو نے ایک ضرب اور لگائی۔ وہ پہلے ہی قائل ہونے لگا تھا، فاخرہ کا ذکر آنے پر بالکل ہی ڈھے گیا۔ رشتوں کا احترام اور محبت اس کی گھٹی میں موجود تھے۔ وہ کیسے اس بات کو نظر انداز کر دیتا۔۔۔

''ٹھیک ہے لیکن اسے یہ وعدہ بھی کرنا ہوگا کہ فاخرہ کو آئندہ اس کی ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور یہ پوری عزت اور محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کا ہر حق اپنا فرض سمجھ کر ادا کرے گا۔'' اس نے شرط عائد کی۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی تم میں سے کسی کا گاؤں آنا ہو تو فاخرہ سے مل کر خود معلوم کر لینا کہ میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہوں۔ تمہیں میری طرف سے کوئی شکایت سننے کو نہیں ملے گی۔'' وہ گویا کسی قبر کے کنارے کھڑا تھا اور ڈر رہا تھا کہ اسلم کی کوئی بھی بات ماننے سے لمحہ بھر کی بھی دیر کی تو وہ لات مار کر اسے قبر میں دھکیل دے گا چنانچہ جلدی جلدی بنا کسی تاخیر کے اس کی ہر شرط قبول کرتا جا رہا تھا۔

''میں نے تیرے ہر وعدے پر یقین کر لیا۔ اگر کبھی تیری یا تیرے بھائی کی طرف سے کوئی وعدہ خلافی ہوئی تو یاد رکھنا کہ میں تجھے اتنی مہلت بھی نہیں دوں گا کہ تو مجھ سے رحم کی بھیک مانگ سکے۔'' سفا کی سے کہتا ہوا وہ پیچھے ہٹا اور اپنا خنجر اس کے کپڑوں سے صاف کر کے واپس پنڈلی سے باندھ لیا۔ خنجر کی دہشت زدہ کر دینے والی نوک نظروں کے سامنے سے ہٹی تو نواز چانڈیو کی جان میں جان آئی۔

''تمہارا بہت شکریہ ادی! تمہاری وجہ سے ہماری جانیں بچ گئیں۔'' کچھ دیر قبل ماہ بانو کے لیے حقیر ترین الفاظ استعمال کرنے والا اسے بہن کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ یہ بھی ایک کمال تھا۔

''مجھے ادی کہہ کر پکارا ہے تو پھر اس لفظ کا بھرم بھی رکھنا۔ میں نے سنا ہے تمہاری قوم میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو ادی کہہ دے تو پھر ساری زندگی اس لفظ کی لاج رکھتا ہے۔۔۔ چاہے اپنی جان سے ہی کیوں نہ چلا جائے۔''

''تم ہمیں انہی غیرت مندوں میں سے پاؤ گی۔ آج کے بعد تمہیں یا اسلم کو ہماری طرف سے کوئی تکلیف پہنچنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہاں اگر تم کسی اور وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو تو اپنے اس بھائی کو مدد کے لیے پکار سکتی ہو۔'' وہ کافی تکلیف میں تھا اس لیے بولتے ہوئے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ زندگی بچ جانے کی خوشی نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ اس وقت وہ خود کو ان کا سب سے بڑا خیر خواہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''اب چلو ماہ! کیا اس مردود سے مذاکرات کرنے میں ہی ساری رات گزار دو گی؟'' اسلم اس کی خواہش پر ان دونوں بھائیوں کی جان بخشی تو کر چکا تھا لیکن بہر حال، اتنا اعلیٰ ظرف نہیں تھا کہ خود کو اتنے ڈھیر سارے نقصانات پہنچانے والے شخص سے اسے باتیں کرتا دیکھ کر اپنے خون کو کھولنے سے روک سکے چنانچہ اسے ٹوک ہی دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے ہم اب چلتے ہیں۔'' وہ فوراً ہی اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس ویرانے سے نکلنے کے لیے ان کے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے یہ طے تھا کہ اچھا خاصا فاصلہ انہیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ نواز اور سرفراز کو بھی اسی طریقۂ کار پر عمل کرنا پڑتا لیکن ان کی روانگی فوری طور پر متوقع نہیں تھی۔ سرفراز بے ہوش تھا۔ نواز کو اسے ہوش میں لانے میں کچھ دیر لگتی پھر دونوں ہی کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ وہاں سے نکلتے تو گرتے پڑتے ہی وہ فاصلے طے کر پاتے۔ اچھے خاصے زخمی ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ماہ بانو اور





اسلم کی رفتار سے سفر کرنا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ انہیں ایسا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ واپسی کے سفر میں وہ دونوں ان کے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی کر سکیں۔ احتیاطاً روانگی سے قبل اسلم نے دونوں کی جامہ تلاشی بھی لے لی تھی لیکن پہلے ہی ماہ بانو کے قبضے میں آ جانے والے پسٹل کے علاوہ ان کے پاس سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا تھا۔ یقیناً ان دونوں سے اسلم کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی تھی اور وہ محض اپنے دو ہونے کے زعم میں بغیر مناسب تیاری کے ہی اس کے مقابل اتر آئے تھے۔ اب نتیجہ خود ان کے سامنے تھا۔ اسلم ان کی جاں بخشی کا احسان ان کے سر رکھ کر انہیں اس ویرانے میں چھوڑ کر خود نہایت اطمینان سے وہاں سے جا رہا تھا۔

''ہوٹل کے کمرے میں تمہاری کوئی خاص چیز تو موجود نہیں ہے؟ میں نہیں چاہتا کہ ہم سامان لینے کے لیے ہوٹل جائیں اور کسی مشکل میں پڑ جائیں۔'' وہ لوگ جب اتنا فاصلہ طے کر چکے کہ انہیں دونوں بھائی نظر آنا بند ہو گئے تو اسلم نے اس سے پوچھا۔

''ہم اس وقت ہوٹل کے بجائے کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کی بات سن کر ماہ بانو نے حیرت سے استفسار کیا۔

''میں آج رات ہی یہ شہر چھوڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں۔ نواز کے وعدے پر یقین ہونے کے باوجود میں کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ زندگی نے بہت مشکل سے مجھ پر تھوڑا سا مہربان ہونا شروع کیا ہے اور میں اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد اب تھوڑا سا سکون چاہتا ہوں اس لیے ہماری آج رات ہی یہاں سے روانگی ضروری ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل کر بس اڈے تک پہنچنے کے لیے اتنی مہلت مل جائے گی کہ آخری روانہ ہونے والی بس میں سوار ہو سکیں۔'' وہ پورا پروگرام طے کر چکا تھا۔

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نہ ہی ہوٹل کے کمرے میں میری ایسی کوئی چیز موجود ہے جس کی خاطر میں وہاں جانا چاہوں۔'' ماہ بانو نے حامی بھر لی۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' وہ مطمئن ہو گیا۔ اپنے طور پر تو وہ جانتا ہی تھا کہ چند جوڑے کپڑوں کے علاوہ روزمرہ استعمال کی بس چند اشیا ہی ان کے اسباب میں شامل تھیں اس لیے ہی یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ اپنا اسلحہ بھی حامد راؤ کے پاس امانتاً رکھوا کر آیا تھا اور رقم کا کافی بڑا حصہ بھی۔ شناختی کاغذات سے وہ اور ماہ بانو دونوں ہی فی الحال محروم تھے اس لیے سامان میں ان کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ویرانے سے آبادی تک کا پیدل سفر طے کر کے آخر کار وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے انہیں ایک آٹو رکشا مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر وہ بس اڈے پہنچ گئے۔ آخری بس روانہ ہی ہونے والی تھی اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس میں چند سیٹیں خالی تھیں۔ ٹکٹ اور کھانے پینے کی چند چیزیں خرید کر اسلم اس کے ساتھ بس میں سوار ہو گیا۔ ان کے سوار ہوتے ہی بس چل پڑی۔ ماہ بانو نے بس کے اندر جلتی لائٹوں میں پہلی بار اسلم کے چہرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہاں بے تحاشا حزن و ملال ثبت تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کی یہ کیفیت اپنی ماں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دینے اور پھر نواز و سرفراز کو انتقام لیے بغیر چھوڑ دینے کی وجہ سے ہے اس کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اسلم کے گھٹنے پر رکھے اس کے دائیں ہاتھ پر رکھا۔ اتنے سے عمل میں ہی اس کی انگلیاں کپکپانے لگی تھیں۔ اس کی اس انوکھی حرکت پر اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''سوچ سوچ کر خود کو اتنا نڈھال نہ کرو۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں کہ میں جب تمہارے گاؤں پہنچی تو وہاں کیا حالات پیش آئے۔ دکھ تو بالکل فطری بات ہے لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم بہت سی باتیں جان کر اطمینان بھی محسوس کرو گے۔'' وہ خود ہی اسے ایک ایک تفصیل سے آگاہ کرتی چلی گئی البتہ اس تفصیل کو بیان کرتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ دکھ دینے والی باتوں کا تذکرہ سرسری ہی رہے۔ اسلم نے اس کا ہر لفظ پوری توجہ سے سنا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی سرخی البتہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا ہے۔ سب کچھ سُن لینے کے بعد اس نے اپنا سر پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بہت دیر وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ماہ بانو نے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے مخاطب کر سکتی۔ وہ یونہی بس میں موجود مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں اکثریت مردوں کی تھی جو چند ایک عورتیں تھیں بھی تو اتنے سخت پردے میں کہ ان کے ہاتھ پیروں کی انگلیاں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ایسے میں محض چادر میں لپٹی ماہ بانو کا وجود بہت سوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان حریصانہ نظروں کی چبھن سے شدید الجھن محسوس کرتی ہوئی وہ ایک بار پھر اسلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بند آنکھوں کے باوجود نہ جانے کیسے اس نے اس کا متوجہ ہونا محسوس کر لیا اور نہایت آہستہ آواز میں اسے پکارا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ماہ۔۔۔'' چند گھنٹوں میں وہ دوسری بار اس کے لیے یہ طرزِ تخاطب استعمال کر رہا تھا۔

''ہوں۔'' اسے لگا کہ اسلم کی وہ پکار کچھ غیر معمولی ہے اس لیے خود بھی اتنی ہی دھیمی آواز میں اسے جواب دیا۔

''ہم یہاں سے حامد راؤ کے گھر پہنچتے ہی نکاح کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' دل کی دھڑکن کچھ معدوم سی ہونے لگی تھی اس کے باوجود اس نے اسے اثبات میں جواب دیا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔ ''لیکن حامد راؤ کے سامنے تو آپ نے ہمارے رشتے کے بارے میں کچھ اور ہی بتایا تھا۔ ہم ان کے گھر میں کس طرح نکاح کر سکتے ہیں؟''

''ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔'' اسلم نے حل بتایا۔

وہ دونوں بے حد احتیاط سے بس اتنی آواز میں بات کر رہے تھے کہ ان کی آوازیں کسی تیسرے کے کانوں میں نہ پڑ سکیں یوں بھی خوش قسمتی سے ان کے آگے والی سیٹ خالی پڑی ہوئی تھی۔

''ہمارے پاس تو شناختی کاغذات بھی نہیں ہیں۔ ہم کورٹ میرج کیسے کر سکتے ہیں؟'' اس نے اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

''تو پھر ہم کسی مسجد کے ملا کو پکڑ لیں گے کہ بس جناب شرعی تقاضے پورے کر دیں، باقی دنیاوی و قانونی مسائل سے ہم بعد میں نمٹتے رہیں گے۔'' اس کے پاس کوئی مسئلہ لاینحل نہیں تھا۔

''ہاں ایسا تو ہو سکتا ہے لیکن اتنے اہم موقع پر کسی اپنے کو تو موجود ہونا چاہیے۔ کسی ایسے شخص کو جو ہماری خوشی میں خوش ہو سکے۔'' وہ کچھ اُداس سی تھی۔ یقینی طور پر اس نے بھی ہر لڑکی کی طرح اپنی شادی کے حوالے سے کچھ خواب بُن رکھے تھے اور ایسی عجیب سی شادی کے خیال سے دکھی ہو رہی تھی۔

''میرا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کوئی اپنا باقی ہی نہیں رہا۔ ہاں اگر تمہارا کوئی ایسا اپنا ہے جسے تم اپنی خوشی میں بلا سکو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' وہ بہت کول موڈ میں تھے۔ البتہ ماہ با نو سوچ میں پڑ گئی۔ بے جی اور ابا جو اس کی شادی پر سب سے زیادہ خوش ہوتے' چودھری کے کارندوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ سگی ماں پاگل ہو چکی تھی اور باپ اس کے پیچھے خوار تھا۔ ایک بھائی اور بہن زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور جو ایک بہن بچی تھی وہ بھی اپنے سسرال والوں کی وجہ سے مجبور ہو جاتی۔ سکھی سہیلیاں تو بس ویسے ہی چھوٹ چکی تھیں غرض یہ کہ چودھری سے پالا پڑنے کے بعد اس نے اس کے سارے اپنے چھوٹ گئے تھے۔ اپنوں کی اس قحط سالی میں بس ایک شخص ملا تھا جو دل کو اپنا لگا تھا لیکن پھر معلوم ہوا کہ وہ بھی ڈاکٹر ماریا کا ہو گیا ہے۔ اس کا خیال دل میں آنے پر وہ بے چین سی ہو گئی۔ کوئی عہد و پیمان نہ ہونے کے باوجود آج بھی دل میں یہ یقین تھا کہ وہ اسے پکارے گی تو وہ ضرور آئے گا۔ اس نے فی الحال اسلم سے کچھ نہیں کہا لیکن دل میں یہ طے ضرور کر لیا کہ وہ اپنے اس یقین کو آزمائے گی ضرور۔۔۔

☆☆☆

''کہاں کی تیاری ہے جناب؟'' وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے ماریا کا عکس نظر آیا۔ وہ بڑے دلربا انداز میں مسکراتی ہوئی اس سے سوال کر رہی تھی۔

''بس۔۔۔ ایک دوست سے ضروری ملاقات کرنی تھی۔'' اس نے سرسری سا جواب دیا۔

''یہاں آ کر بھی آپ کے ضروری کاموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ میری نہ سہی ممانی جان کی محبت میں آپ گھر میں ٹک کر بیٹھیں گے اور کچھ وقت فیملی کو دیں گے لیکن آپ کا تو وہی پرانا حال ہے۔ نور کوٹ ہو یا لاہور آپ کو رہنا سرکاری افسر ہی ہے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس، فائلوں میں سر دیے اور میٹنگوں میں مصروف۔'' اس نے شکوہ کیا۔ وہ لوگ آج صبح سویرے ہی لاہور پہنچے تھے۔ لاہور آنے کا یہ پروگرام شہریار نے رات گئے اچانک ہی طے کر لیا تھا اور اب چند گھنٹوں بعد ہی گھر سے نکل پڑنے کو تیار تھا۔

''ہر محبت کا اپنا مقام ہوتا ہے بیگم صاحبہ! ممانی جان کے لیے بے شک میرے دل میں بہت محبت ہے لیکن اس وقت وطن کی محبت کا تقاضا ہے کہ میرا اپنے دوست سے ملنے کے لیے جانا ضروری ہے۔ بلکہ تم یہ سمجھو کہ میری لاہور آمد کا اصل مقصد ہی یہی تھا۔۔۔ سوچا ساتھ میں ماموں اور ممانی سے بھی مل لیتے ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ ایک موقع نکلا تو میں نے اسے ضائع نہ کرنا مناسب سمجھا۔'' اب وہ سامنے سجی پرفیوم کی شیشیوں میں سے اپنے لیے کوئی خوشبو منتخب کر رہا تھا۔ ماریا نے اس کا انتخاب مکمل ہونے سے پہلے نیلگوں محلول والی ایک بوتل اٹھائی اور اسپرے کا بٹن دبا دیا۔

''اگر آپ کا وہ دوست کوئی فی میل نہیں ہے تو یہ خوشبو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت مناسب رہے گی۔'' اس کے لہجے اور انداز میں کچھ شوخی تھی۔

''دوست فی میل بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہاں البتہ اگر کوئی گرل فرینڈ ہوتی تو الگ بات تھی۔'' اس نے ماریا کی بات کا برا مانے بغیر ذومعنی لہجے میں جواب دیا۔

''میرے ہوتے ہوئے آپ گرل فرینڈ بنائیں گے؟'' اس نے ہلکا سا مکا شہریار کے بازو پر مارا۔ ابتدائی دنوں کے مقابلے میں ان دونوں کے تعلقات کافی خوشگوار ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصی بے تکلفی سے پیش آنے لگے تھے۔

''افسوس کہ مجھے تمہارے نہ ہوتے ہوئے بھی کبھی اس کام کی فرصت نہیں مل سکی۔'' اس نے چہرے پر خوامخواہ کی اداسی طاری کی۔

''اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ جایئے اب جا کر اپنے میل فرینڈ سے ہی ملاقات پر اکتفا کیجیے۔'' اس کی اداکاری پر ماریا کو ہنسی آ گئی۔

''وہ تو میں جا ہی رہا ہوں۔ تمہیں دھکے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

''خوامخواہ کی الزام تراشی مت کیجیے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کو روکنا بھی چاہا تو آپ ہرگز نہیں رکیں گے۔'' ماریا نے حقیقت بیان کی تو وہ مسکرا دیا۔

''اچھا تو پھر اجازت؟''

''بالکل اجازت ہے جناب لیکن آپ کی تیاری میں کچھ کمی سی لگ رہی ہے۔'' اس نے شہریار کا تنقیدی جائزہ لیا۔

''کیسی کمی؟''

''ٹائی کے ساتھ ٹائی پن نہیں ہے۔ آپ ایک منٹ رکیں میں لے کر آتی ہوں۔ پچھلی بار آپ کے لیے خریدی تھی لیکن دینی یاد نہیں رہی۔'' وہ لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوبارہ واپس آئی تو اس کی مٹھی میں کچھ دبا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر خود ہی وہ پن شہریار کی ٹائی میں لگا دی۔ اس نے آئینے میں جائزہ لیا۔ گٹار کی شکل کی وہ ٹائی پن اپنی بناوٹ کے اعتبار سے اگرچہ خاصی نفیس تھی لیکن اسے اپنے ذوق سے کافی ہٹ کر کچھ بچکانا سی لگی۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ ماریا کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ جبراً مسکرا کر تھینکس کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی جسے وہ خود ڈرائیو کر کے لاہور لایا تھا۔ مشاہم خان کے ٹائی والا سے زخمی حالت میں واپس آنے کی وجہ سے اس نے اسے اتنی لمبی ڈرائیو کے لیے زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اسے نور کوٹ میں آرام کے لیے چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت بھی اسے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے ایک فور اسٹار ہوٹل جانا تھا جہاں میجر ذیشان سے اس کی ملاقات طے تھی۔

کل رات میجر ذیشان نے ہی اسے فون کر کے یہاں ملاقات کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ وہ خاصا پُرجوش محسوس ہو رہا تھا اور گفت وشنید کے لیے سیل فون کو نامناسب قرار دیتے ہوئے بالمشافہ ملاقات کا خواہش مند تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چونکہ آج کل لاہور میں موجود ہے اس لیے ملاقات کے لیے یہ وقت خاصا مناسب ہے۔ شہریار کے لیے بھی لاہور کا ایک مختصر دورہ ترتیب دینا ایسا کوئی خاص مشکل نہیں تھا چنانچہ وہ یہاں پہنچا ہوا تھا اور اب میجر ذیشان سے ملنے جا رہا تھا۔ طے شدہ ہوٹل تک پہنچنے میں اسے مشکل سے بیس منٹ لگے۔ گاڑی پارکنگ میں روک کر اترتے ہوئے اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور مطمئن ہو گیا کہ وہ دیے گئے وقت سے چند منٹ قبل ہی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے پارکنگ سے نکلتے ہوئے بچکانا محسوس ہونے والی ٹائی پن نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ کر اسے پہلی تفصیلی نظر میں ہی میجر ذیشان ایک میز پر دکھائی دے گیا۔ پابندیِ وقت وہاں بھی عروج پر تھی۔

''بہت اچھا لگا تمہیں یہاں دیکھ کر۔'' سلام دعا سے فارغ ہو کر اس نے میجر ذیشان سے بے تکلفی سے کہا۔ یہ بات پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ آپ جناب کا تکلف ترک کر کے ایک دوسرے سے دوستوں کی طرح بات کریں گے تاکہ ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ آسانی رہے۔

''اچھا تو مجھے بھی لگا تمہارے شہر میں آنا۔'' وہ جانتا تھا کہ شہریار اصل میں لاہور کا رہائشی ہے جو ملازمت کے سلسلے میں نور کوٹ میں مقیم ہے اس لیے خوش دلی سے مسکراتا ہوا بولا پھر اپنی بات کو مزید آگے بڑھایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں مجھے دیکھنے سے زیادہ اس خوش خبری کو سن کر زیادہ خوشی ہوگی جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔''

''یعنی میں نے تمہیں جو اسپیشل فورس کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیا تھا، اس میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟'' اس نے دبے دبے جوش سے کہتے ہوئے فوراً اندازہ لگایا۔

''نہیں۔'' میجر ذیشان نے اطمینان سے انکار کیا۔

''تو پھر کیا خوش خبری ہو سکتی ہے؟'' وہ الجھا کہ اس نے تو یہی کام اس کے ذمے لگایا تھا۔





''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو چاہتے تھے وہ میرے یا تمہارے کچھ کہنے سے قبل پہلے ہی ہو چکا ہے۔۔۔ ہمارے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ہمارے بڑوں میں ابھی تک کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جو اس وطن اور اپنے ہم وطنوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ کارنامہ ایسے ہی کچھ گنے چنے کرنلوں اور جنرلوں نے مل کر انجام دیا ہے۔'' وہ خود تفصیل سنانے کے لیے بے چین تھا لیکن ویٹر کو قریب آتے دیکھ کر اسے اپنی گفتگو کا سلسلہ روکنا پڑا۔ اسے آرڈر نوٹ کروانے کے بعد انہوں نے ٹوٹا ہوا گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑ لیا۔

''میں تمہاری دی ہوئی تجویز پر بات کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ ایک دن کرنل صاحب نے فوج سے میرا استعفیٰ طلب کر کے حیران کر دیا۔ میں ان کے اس مطالبے پر ہکا بکا رہ گیا لیکن جب انہوں نے وجہ بتائی تو میں نے بہ خوشی اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیا۔

''یعنی اب تم پاکستان آرمی میں نہیں ہو۔'' اسے صدمہ سا ہوا۔

''ظاہر اُور نہ آج بھی اپنے وطن کا ایک سپاہی ہوں۔'' میجر ذیشان اطمینان سے مسکرایا۔

''اصل قصہ کیا ہے فوراً بیان کرو۔'' اس نے عجلت دکھائی۔

''وہ ہی سنانے جا رہا ہوں۔ ہوا کچھ یوں کہ جب میں نے کرنل صاحب کے مطالبے پر حیرت اور پریشانی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میری حب الوطنی اور بہادری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے اور یہ فیصلہ تھا مجھے اس اسپیشل فورس میں شامل کرنے کا جن کے زیادہ تر ملازمین فوج سے یا پھر پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ سویلینز بھی ہیں لیکن ان سے زیادہ حساس نوعیت کے کام نہیں لیے جاتے۔ کرنل صاحب نے مجھے بتایا کہ اس اسپیشل فورس کا قیام چند سال قبل ہی ناگزیر حالات میں عمل میں لایا گیا ہے جس سے پاکستان کی سیاسی قیادت کا تعلق نہیں ہے۔ فورس کے قیام کی تجویز ان محب وطن افسران نے پیش کی تھی۔ حفاظتِ وطن کے لیے بنائی گئی اس فورس کو خاصا خفیہ رکھا گیا ہے اور یہ لوگ بظاہر ایک سیکیورٹی ایجنسی کی صورت میں کام کر رہے ہیں۔ اس ایجنسی کی کئی برانچز ملک کے تقریباً ہر اہم شہر میں موجود ہیں۔ بہت زیادہ معاوضے پر کام کرنے والی اس سیکیورٹی ایجنسی کے ملازمین کو اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ یا ادارے ہی ہائر کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک تو اخراجات کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو جاتا ہے دوسرے ان افراد تک رسائی ہو جاتی ہے جو ملک کے خلاف سازشوں کے جال بُن رہے ہیں۔ ہر برانچ میں مختلف درجوں کی صلاحیتیں رکھنے والے افراد کام کر رہے ہیں۔ کہاں کس کی ڈیوٹی لگانی ہے، یہ ضرورت دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ کسی وزیر، سفیر وغیرہ نے خدمات طلب کی ہوں تو اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کا انتخاب ہوتا ہے جو اپنے ظاہری فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اہم معاملات پر بھی نظر رکھ سکیں۔ کچھ وہ افراد ہیں جنہیں فورس کے اندرونی معاملات سے باخبر نہیں رکھا جاتا اور وہ خود کو حقیقتاً صرف سیکیورٹی گارڈ ہی سمجھتے ہیں۔ البتہ ان کا انخراج ان سے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ لیتا رہتا ہے ہر جگہ تعینات گارڈز کو شفٹ تبدیل ہونے کے بعد پہلے دفتر آ کر تحریری رپورٹ جمع کروانی ہوتی ہے پھر ہی اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہوتا ہے چونکہ ہماری ایجنسی میں باقی تمام جگہوں کے مقابلے میں بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں اس لیے کوئی اس ٹف روٹین پر اعتراض بھی نہیں کرتا۔''

میجر ذیشان نے جو تفصیلات بتائیں انہیں سن کر اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات ابھر آئے لیکن زبان سے فوری طور پر اس لیے اظہار نہ کر سکا کہ ان کی ٹیبل پر دیا گیا آرڈر سرد ہو رہا تھا۔ ویٹر آرڈر سرد کر کے مؤدبانہ ایک طرف کھڑا ہوا تو ذیشان نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

''یہ سب تو بہت زبردست ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ ہمارے ملک میں بھی ایسے دردمند لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو اس ملک کی سلامتی کے لیے سوچتے ہیں ورنہ یہاں تو جو جتنا بڑا افسر ہے اتنا ہی بڑا سپر پاور کا غلام ہے۔''

''میں بھی کچھ اسی طرح کی سوچ رکھتا تھا لیکن CFP کے وجود نے ہر شکوہ دور کر دیا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ابھی چند محب وطن افراد عوام کے علاوہ خواص میں بھی موجود ہیں اسی لیے تو ہمارا وطن اب تک قائم ہے۔'' میجر ذیشان نے اس کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اور انشاء اللہ تا قیامت قائم رہے گا۔'' اس نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

''انشاء اللہ۔'' چمچہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے میجر ذیشان نے بھی کہا۔

''تمہارا تقرر کس شہر میں ہوا ہے؟'' شہریار نے بھی کھانے سے انصاف کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت وہ خود کو جتنا ریلیکس محسوس کر رہا تھا، اسے لفظوں میں بیان نہیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرسکتا تھا۔

''یہیں لاہور میں۔ ابھی کل ہی تو میں نے آفس جوائن کیا ہے۔ میرے ذمے دن بھر جمع ہونے والی رپورٹس میں سے اہم رپورٹوں کو پڑھنا اور ضرورت کے مطابق احکامات جاری کرنا ہے۔ کوئی بڑا معاملہ ہو تو مجھے اپنے سینئر کو اطلاع دینی ہوگی۔'' اس نے بتایا۔

''ویری گڈ۔ مجھے امید ہے کہ اپنے اس عہدے پر کام کرتے ہوئے تم میری بھی خاطر خواہ مدد کرسکو گے۔'' شہریار نے امید ظاہر کی۔

''شیور۔۔۔ میرے آدمی ہر طرح سے ٹرینڈ ہیں۔ خاموش نگرانی سے لے کر مار دھاڑ تک ان سے ہر کام لیا جاسکتا ہے۔ کرنل صاحب سے تمہارا تعارف تو ہے ہی۔ میں خود بھی ان سے سرسری تذکرہ کر چکا ہوں۔ اپنے ذاتی اختیارات سے ہٹ کر اگر کوئی بڑا معاملہ پیش آیا تو میں ان سے باقاعدہ اجازت بھی لے سکتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر جو کرنا چاہتے ہو کرو، پاکستان کی حفاظت کی خاطر تمہیں CFP کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی۔

''سی ایف پی۔۔۔ اس سیکیورٹی ایجنسی کا نام میرا سنا ہوا تو ہے لیکن یہ حروف کس کا مخفف ہیں، یہ معلوم نہیں۔''

''سی ایف پی کا مطلب ہے کیئر فار پاکستان (Care for pakistan) اسی لیے جو شخص بھی پاکستان کی کیئر کرتا ہو ہم اس کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔'' آج میجر ذیشان کی گفتگو کا ڈھنگ ہی نرالہ تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پراعتماد لگ رہا تھا۔

''اس طرف آجانے سے تم آشیش کمار والے معاملے سے الگ ہوگئے ہو گے۔ میں اس شخص کو کسی صورت نہیں بھول سکتا کیونکہ وہ مجھے ان لوگوں تک پہنچا سکتا ہے جو ملک و قوم کے ہی نہیں میرے ذاتی مجرم ہیں۔ میرا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے سجاد بھائی اور ثنیا کے کفن میں لپٹے ہوئے وجود یاد نہ آتے ہوں۔'' وہ جذباتی ہونے لگا۔

''ریلیکس یار! مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے اور تم بے فکر ہو جاؤ۔ مجھے آشیش والے معاملے سے الگ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسی معاملے کی وجہ سے میں سی ایف پی میں شامل ہوا ہوں۔'' آشیش سے ہمیں جو کلیوز ملے ہیں ان ہی پر کام کرنے کے لیے مجھے لاہور بھیجا گیا ہے۔ کراچی والی برانچ میں بھی اس معاملے پر کام ہو رہا ہے بلکہ الرٹ تو ساری ہی برانچز کو کیا گیا ہے لیکن ورما اور پانڈے وغیرہ کی زیادہ تر موومنٹ چونکہ ان دونوں شہروں میں دیکھی گئی ہے اس لیے یہاں خاص طور پر کام کیا جارہا ہے۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی تو اسے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

''تھینک یو۔۔۔ یہ تم نے مجھے ایک اور اچھی اطلاع دی ہے۔ اس معاملے میں جو بھی پیش رفت ہو، تم مجھے اس سے باخبر رکھنا۔''

''بالکل، تمہیں کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' ذیشان نے یقین دہانی کروائی اور پھر کچھ چونکتے ہوئے بولا۔ ''ارے ہاں یاد آیا، مجھے تمہارے چودھری صاحب کے بارے میں بھی ایک خبر دینی تھی ویسے تو خیر ایسی خاص نہیں ہے اور شاید مجھ تک بھی نہ پہنچتی اگر کسٹمز سے چودھری افتخار کا نام میرے لوگوں کے سامنے نہ آتا۔ آج صبح ہی مجھے اس بارے میں بتایا گیا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے لاہور میں موجود کارخانے کے لیے ہماری سیکیورٹی ایجنسی سے خدمات حاصل کی ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ پچھلے دنوں اپنے کارخانے میں لگنے والی آگ کے سلسلے میں وہ تشویش کا شکار ہیں کہ کہیں یہ کسی دشمن کی کارروائی نہ ہو اس لیے وہاں تربیت یافتہ گارڈز رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہری طور پر یہ ایک عام سا معاملہ تھا اس لیے میرے ماتحت نے وہاں عام گارڈز کی ڈیوٹی لگا دی لیکن دوسری طرف کچھ ایسے چھوٹے تاجروں سے بھی چودھری کے ربط ضبط کی خبریں ملی ہیں جن کا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں ہے۔ یہ وہ تاجر ہیں جو اسمگل شدہ کپڑے، الیکٹرونکس آئٹمز اور خشک میوہ جات سے لے کر اسلحے تک سب کچھ فروخت کرتے ہیں۔ چودھری کا سابقہ ریکارڈ جیسا ہے اس کی روشنی میں اس کا اس طرح کے بے ایمان تاجروں سے ربط ضبط سمجھ تو آتا ہے لیکن فی الحال یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کس چکر میں ہے۔''

''اس شخص کی ہوس کا پیٹ کسی صورت نہیں بھرتا۔ کہنے کو تو اللہ نے بے تحاشا دولت سے نوازا ہے لیکن وہ پھر بھی حرام راستوں سے کمانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اب بھی کسی کالے دھندے کے چکر میں ہوگا۔ معاملہ سامنے آئے تو تم خود نمٹ لینا۔'' اس نے چودھری کے ذکر پر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو ذیشان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد بھی وہ کھانے کے ساتھ ساتھ کئی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ سلسلہ تھما تو انہیں احساس ہوا کہ دو ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الوداعی مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے۔

شہریار نے اپنی گاڑی پارکنگ سے نکالی ہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آتا





نمبر چیک کیا تو بالکل اجنبی نمبر دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کا یہ موبائل نمبر چند بہت ہی خاص لوگوں کے پاس تھا اس لیے اس نمبر پر کسی اجنبی نمبر سے کال آنا اچنبھے کی بات تھی۔ حیرت کے باوجود اس نے کچھ سوچتے ہوئے کال وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''السلام علیکم اے سی صاحب! میں ماہ بانو بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اسے ہلا کر رکھ دیا اور اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ بہک سا گیا۔

''کیا ہوا سر آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ آپ کو میری آواز آرہی ہے نا؟'' اس کی خاموشی پر وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

''تم کہاں ہو ماہ بانو؟ کہاں چلی گئی تھیں تم؟ مجھے اپنا پتا بتاؤ۔'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ماہ بانو سے کہا۔

''میں یہیں لاہور میں ہوں سر! لیکن فی الحال آپ کو اپنا کوئی پتا نہیں بتا سکتی اصل میں یہاں میرا ایسا کوئی ٹھکانا ہے ہی نہیں جہاں میں آپ کو ملاقات کے لیے بلا سکوں لیکن میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

''تمہیں جہاں بھی ملنے میں سہولت ہو، مجھے بتا دو میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے فوراً ہی کہا۔ ماہ بانو کو اس نے کبھی فراموش کیا ہی نہیں تھا اور اب اچانک اس کی آواز سن کر ہیجان میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جواب میں ماہ بانو نے اسے جگہ کا نام بتا دیا۔ وہ جگہ اس مقام سے کافی دور تھی جہاں وہ اس وقت موجود تھا چنانچہ بولا۔

''میں ایک گھنٹے کے اندر وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا۔'' اس کے بعد اس نے خلاف عادت گاڑی بھگانی شروع کردی۔ رش والی جگہوں پر مجبوری تھی لیکن جہاں بھی سڑک خالی ملتی، وہ گاڑی کی رفتار تیز کر دیتا۔ اس مارم ماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حسب وعدہ اس فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ تک پچاس منٹ میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جس کا پتا ماہ بانو نے اسے بتایا تھا۔

ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا کہ جانے وہاں ماہ بانو کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ لیکن اس کا ہر خوف اور وسوسہ اس وقت دور ہوگیا جب اس نے ڈائننگ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک میز کے سامنے بیٹھا دیکھ لیا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور ہوگئی تھی لیکن اس کی دلکشی و دلربائی وہی تھی جس نے پہلی نظر میں ہی اسے اپنا اسیر کرلیا تھا اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنا دامن اس کی محبت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

''کیسی ہو ماہ بانو؟'' اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

''زندگی کے طوفانوں سے نمٹتی ابھی تک جی رہی ہوں۔ کب کوئی موج غرق کردے نہیں معلوم۔ آپ اپنی سنائیں کس حال میں ہیں۔ بیگم صاحبہ تو ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے حزنیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ اچھے خاصے طویل عرصے تک منظر سے غائب رہنے کے باوجود وہ اس کی شادی سے واقف تھی، یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔

''سب ٹھیک ہے۔ تم اپنا احوال سناؤ۔ مجھے تمہارے بارے میں جو آخری اطلاع ملی وہ یہ تھی کہ تمہیں ٹاہلی والا نام کے کسی گاؤں میں دیکھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے بھی یقیناً بہت کچھ پیش آیا ہوگا۔ کراچی کے ہاسٹل سے اغوا ہونے کے بعد جنگل میں ڈاکوؤں کے ڈیرے تک پہنچنے سے لے کر ٹاہلی والا اور پھر یہاں لاہور تک کا سفر آسان تو نہ ہوگا۔ میں اس سارے سفر کا احوال جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے حکم دیا اور ماہ بانو کے لیے اس کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی۔ وہ اسے سب کچھ سناتی چلی گئی۔ اس آپ بیتی میں اسلم کا ذکر ناگزیر تھا لیکن وہ فوری طور پر یہ بتانے کی ہمت نہیں کرسکی کہ وہ اسلم سے شادی کا وعدہ کرکے اس کے ساتھ جنگل سے فرار ہوئی تھی۔

''تمہاری سہیلی راحیلہ کے ڈاکٹر بھائی پر مجھے بھی شبہ ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو اسی شخص نے چودھری کو تمہارے بارے میں اطلاع دی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کافی چھان بین بھی کروائی تھی جس کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ شخص خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے بیوپار میں بھی ملوث ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ملک سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ پیچھے اس کی بہن ملی تھی لیکن وہ خود اپنے بھائی کی اصلیت کھلنے پر حیران پریشان تھی اس لیے میں نے اس کی چھوٹی موٹی خطائیں معاف کر دیں۔''

''اچھا کیا۔ راحیلہ تو بس ایک سبب تھی۔ میرے نصیب نے مجھے جہاں لے جانا تھا وہاں لے جا کر رہا۔'' اس کے انداز گفتگو سے شہریار کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مختصر دورانیے میں ہی اپنی عمر کے کئی سال طے کرگئی ہو۔

''اب بھی یقیناً تم اسلم کے ساتھ ہی کہیں رہ رہی ہو اسی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے اس کی گرفتاری کے ڈر سے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتا نہیں بتایا۔'' اس نے ماہ بانو سے ایک نازک سوال کیا۔

''آپ کا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔'' اس نے انکار نہیں کیا۔ ''اسلم اور میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن ایسے مسائل سے دوچار ہیں جن کے حل کے لیے اپنے میزبانوں سے مدد نہیں لے سکتے اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہے اور اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''کیسی مدد چاہیے تمہیں؟'' شہریار نے یہ پوچھتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی، کوئی ایسی تبدیلی جس کی وجہ سے وہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

''میں اور اسلم شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں۔ آپ ہمیں وہ کاغذات بنوا کر دیں گے۔'' آخر کار اس نے دھماکا کر ہی دیا۔

''تم ایک ڈاکو سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' وہ حیران ہوا۔

''میرے لیے وہ میری عزت کا محافظ پہلے ہے ڈاکو بعد میں ویسے بھی وہ اپنی مرضی سے ڈاکو نہیں بنا تھا۔ اسے حالات نے مجبور کر دیا تھا اور اب وہ اپنی اس زندگی کو ترک کرنا چاہتا ہے تو میں اس کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں شہریار کو جواب دیا۔

''انسانی ہمدردی اچھی چیز ہے لیکن تم اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا رہی ہو؟ وہ شخص قانون کو مطلوب ہے جلد یا بدیر گرفتار ہو جائے گا پھر تمہارا مستقبل کیا ہوگا؟'' اسے گمان ہوا کہ ماہ بانو اپنی ہمدردی فطرت کی وجہ سے اسلم سے شادی کرنا چاہتی ہے اس لیے اسے اس کے فیصلے کے مضمرات سے آگاہ کرنے لگا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر! میں ہمدردی میں اسلم سے شادی نہیں کر رہی ہوں۔ میں اس لیے اس کا ساتھ قبول کر رہی ہوں کہ وہ اس دنیا کا واحد شخص ہے جو دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتا ہے اور مجھے میری تمام تر خامیوں اور مسائل کے ساتھ قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' بڑی بیدردی سے سپاٹ لہجے میں یہ جملے ادا کرتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ شہریار کو اس کی بات سے کتنی تکلیف پہنچ رہی ہے لیکن وہ کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کا کہنا بھی ایک طرح سے درست ہی تھا۔ وہ اسے چاہنے کے باوجود اپنانے کا فیصلہ بروقت اسی لیے تو نہیں کر پایا تھا کہ وہ عمر، تعلیم اور سماجی رتبے کے اعتبار سے اسے خود سے کافی پیچھے معلوم ہوئی تھی۔ اس کے احساسات سے بے خبر ماہ بانو کہتی جا رہی تھی۔

''رہی اس کی گرفتاری کی بات تو میں نے آپ کو اسی لیے مدد کے لیے بلایا ہے۔ آپ ہم دونوں کو ایک نئی شناخت کے ساتھ پاکستان سے باہر نکلنے میں مدد دیں گے تاکہ ہم بلاخوف و خطر اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکیں۔''

''تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں تمہاری مدد کروں گا؟'' شہریار نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''شاید اس لیے کہ آپ پہلے بھی ہر مشکل میں مدد کرتے رہے ہیں۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''وہ الگ معاملہ تھا۔ میں تمہیں مظلوم اور بے قصور سمجھ کر تمہاری مدد کرتا رہا لیکن اب ایک مبینہ ملزم کے فرار کا معاملہ ہے۔ میں کیسے کسی مفرور ملزم کا مددگار بن سکتا ہوں؟'' اس نے اعتراض کیا۔

''آپ کو ایسا کرنا پڑے گا کیونکہ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے۔ اسلم اور میں دونوں حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ اور آپ کا تعاون ہمارے مستقبل کو محفوظ کر دے گا۔ ہم محفوظ و مامون ہو گئے تو شاید کبھی اس دنیا میں کوئی کارآمد کردار بھی ادا کر سکیں۔ اسلم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر بہرحال آپ کوئی کارنامہ انجام نہیں دیں گے۔'' وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں مضبوطی سے بات کر رہی تھی۔ شہریار نے خود کو اس کے سامنے مجبور پایا۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کے دلائل مضبوط تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ماہ بانو تھی جس کی خوشی اسے دل و جان سے عزیز تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا یہ کام کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ.....'' وہ ہتھیار ڈال رہا تھا لیکن لہجہ سپاٹ اور کٹھور تھا۔

''ہاں، ایک کام اور ہے۔'' اس نے کہا اور پھر پل بھر کے توقف سے بولی۔ ''آپ کو میرے نکاح میں شریک ہونا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کوئی تو اپنا اس موقع پر میرے پاس موجود ہو۔'' نہ چاہنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ گئے۔ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس کے دل کو کتنا اپنا لگتا ہے۔

''میں آجاؤں گا۔ تم مجھے دن اور وقت بتا دینا بلکہ اس سلسلے میں جو بھی انتظامات کرنے ہوں، وہ بھی میں کر دوں گا۔'' اس کے آنسوؤں نے شہریار کو موم کر دیا۔





''تھینک یو سر! اب میں چلتی ہوں۔'' اس کے لیے مزید شہریار کے سامنے رکنا ممکن نہیں رہا۔ شہریار نے بھی اسے نہیں روکا۔ نہ ہی اس کے جانے کے بعد فوراً اپنی جگہ سے اٹھا یہاں تک کہ اس کا پیچھا کر کے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں رہ رہی ہے۔ اتنے عرصے بعد ماہ بانو کے ملنے کی ساری خوشی اس کے تازہ فیصلے نے برباد کر دی تھی۔ وہ خودغرض نہیں تھا کہ ماہ بانو کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا لیکن اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ حالات کے گرداب سے نکلنے کی خواہش میں کر ڈالا ہے لیکن اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ کسی اور گرداب میں نہ پھنس جائے۔ وہ اسے اس کے فیصلے سے باز بھی نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھی۔ اب اسے صرف اس کی مدد کرنی تھی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کہ وہ خوش رہے۔ حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ خود بھی ریسٹورنٹ سے روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل رانا ہاؤس تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس کا آفرین رانا سے سامنا ہو گیا۔

''تم دونوں میاں بیوی ہم سے ملنے آئے ہو یا دوستوں سے ملاقاتیں کرنے؟'' اسے دیکھتے ہی انہوں نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

''ماریا بھی کہیں گئی ہوئی ہے کیا؟'' ان کے جملے سے اندازہ لگاتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

''ہاں اسے بھی اپنی کسی فرینڈ سے ملنے جانا تھا۔ مریم کی گاڑی لے کر گئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ لیکن اس نے کہا کہ میں خود ہی ڈرائیو کر لوں گی۔'' انہوں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''پہلے وہ لاہور میں ہی تو رہتی تھی ظاہر ہے یہاں اس کی دوستیں بھی ہوں گی۔ اچھا ہے ملنے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ تب تک میں آپ کو کمپنی دے دیتا ہوں۔'' حقیقتاً اس وقت وہ مکمل تنہائی کا خواہش مند تھا لیکن اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ سجاد اور شینا کے انتقال کے بعد وہ بہت زیادہ تنہائی کا شکار ہو گئی ہیں اور اب واحد اس کی ذات ہی ہے جس سے انہوں نے اپنی بچی کھچی خوشیاں اور خواہشیں وابستہ کر رکھی ہیں اس لیے اپنے احساسات کو پسِ پشت ڈال کر ان کے ساتھ وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

''ارے نہیں بیٹا! میں تم سے شکایت نہیں کر رہی تھی۔ بس ایسے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔ تم جاؤ جا کر آرام کرو۔'' وہ اس سے ماں جیسی محبت کرتی تھیں پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان سے اس کے دل کی خواہش چھپی رہ جاتی۔ انہوں نے فوراً ہی اسے اپنی طرف سے ریلیکس کر دیا۔

''آرام بھی کر لوں گا۔ پہلے آپ چائے تو بنوائیں، ساتھ بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پیتے ہیں پھر آرام بھی ہو جائے گا۔'' وہ وہیں لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ اگر اس کے لیے ممتا کے جذبات رکھتی تھیں تو خود وہ بھی انہیں سگی ماں سے بڑھ کر ہی درجہ دیتا تھا کہ مائیں تو سب ہی اپنی اولاد سے پیار کرتی ہیں لیکن آفرین رانا وہ ہستی تھیں جنہوں نے اسے بچپن میں اس کے والدین کی حادثاتی موت کے بعد بے پناہ محبت اور شفقت سے نوازا تھا۔ ان کے لیے اگر اسے اپنی طبیعت پر تھوڑی دیر جبر کرنا پڑتا تو بھی گوارا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ کھل اٹھیں اور خوشی خوشی ملازم کو بلا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے پاس بہت سے موضوعات تھے۔ خصوصاً وہ لیاقت رانا کی بیماری اور مریم کی تنہائی کی طرف سے بہت فکرمند تھیں۔ خود وہ بھی ان دونوں کے لیے دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن انہیں تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا۔ دیکھا جائے تو حالات نے سب سے زیادہ انہیں ہی متاثر کیا تھا لیکن انہوں نے کمزور عورت ہونے کے باوجود ظاہری طور پر خود کو بہت سنبھال لیا تھا۔ وہ انہیں تسلیاں اور دلاسے دیتا گفتگو کا رخ بہت ہوشیاری سے موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ چائے آنے تک وہ خاصے لائٹ موڈ میں آچکی تھیں۔ چائے کے دوران بھی وہ دونوں ہلکے پھلکے موضوعات پر ہی گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران میں ماریا بھی واپس آکر ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

''جاؤ اب تم دونوں جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ دوبارہ رات کے کھانے کے بعد نشست جمائیں گے۔'' آخر آفرین رانا ہی کو خیال آیا تو انہوں نے ان دونوں سے کہا۔ اس بار شہریار نے بھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ وہ فارمل ڈریس میں خود کو تھوڑا سا بے آرام محسوس کر رہا تھا اس لیے خود بھی چینج کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ اور ماریا ساتھ ساتھ چلتے اپنے لیے مخصوص کمرے میں آئے۔

''آپ کی ٹائی پن کہاں ہے؟'' کمرے میں پہنچ کر وہ کوٹ اتارنے لگا تو ماریا نے اس سے سوال کیا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ہی اپنے کوٹ کی جیب کی طرف رینگ گیا لیکن جیب خالی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی ساری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پارکنگ سے نکلتے ہوئے اس نے ٹائی پن نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی تھی لیکن اب



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ وہاں موجود نہیں تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹائی پن جیب میں رکھنے کے بجائے وہیں کہیں گرا بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' ماریا نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کچھ تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''سوری ڈیئر! شاید وہ کہیں گر گئی ہے۔'' اس نے معذرت کر لینا ہی مناسب سمجھا۔

''میں نے اتنے پیار سے آپ کو وہ ٹائی پن گفٹ کی تھی اور آپ نے ذرا بھی قدر نہیں کی۔'' اس کا موڈ آف ہو گیا۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری ڈارلنگ! مجھے واقعی نہیں پتا چلا کہ وہ کہاں اور کب گری۔'' اس وقت وہ سخت ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ ماہ بانو سے ہونے والی ملاقات نے اس کے اندر تہلکہ مچا رکھا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی سے اسے ایسے نازک وقت میں ہی ہر رشتے کے نخرے اٹھانے پڑ رہے تھے۔

''آدمی کو کسی کے دیے گفٹ کی قدر ہو تو وہ اسے جان سے لگا کر رکھتا ہے۔ آپ کے نزدیک میرے گفٹ کی اہمیت ہی نہیں تھی تو آپ اسے سنبھالتے کیسے؟'' ماریا کا شکوہ برقرار تھا۔ اس میں مزید حوصلہ نہیں رہا کہ وہ اسے منانے کے لیے کچھ کہہ سکے۔ وہ منہ پھلا کر ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے خود وہیں رک گیا اور خلافِ مزاج کوٹ اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ نیم دراز حالت میں ہی اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور پھر مکمل طور پر لیٹ کر ایک تکیے سے سر اور منہ بھی چھپا لیا۔ اگر اس وقت آفرین رانا اسے دیکھ لیتیں تو انہیں سخت دھچکا لگتا اور وہ سمجھ لیتیں کہ وہ کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوا ہے کیونکہ اس انداز میں تو وہ بس صرف بچپن کے ان دنوں ہی تکیوں میں منہ چھپا کر لیٹتا تھا جب اس کے والدین کا انتقال ہوا تھا۔

☆☆☆

''کیا پروگریس ہے چودھری؟'' چودھری کو الفا کی طرف سے بھجوایا گیا خصوصی موبائل فون پیر آباد میں ..... مل گیا تھا۔ اب جبکہ وہ لاہور میں رہ کر اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا، پہلی بار اس موبائل فون کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ کال ریسیو کرنے سے پہلے ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ دوسری طرف کون ہو گا۔ فون ریسیو کرنے کے بعد اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

دوسری طرف الفا اپنے مخصوص حاکمانہ اور اکھڑ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ حکم چلانے والے چودھری کو اس کا یہ لہجہ سخت ناگوار گزرتا تھا لیکن برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہوسِ زر کے علاوہ اب دوسری مجبوریاں بھی اس کے دامن سے لپٹ گئی تھیں۔ پچھلی بار بات ہونے پر الفا اسے صاف طور پر دھمکی دے چکا تھا کہ کسی بھی قسم کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ وڈی چودھرائن کی پُراسرار موت کے سلسلے میں چند ..... ایسے شواہد فراہم کر دے گا جس کے بعد اس کے لیے اپنے بیٹے کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے بلیک میلنگ کے اسی واحد ہتھکنڈے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ موبائل فون کے ساتھ اسے ایک سربمہر لفافہ بھی موصول ہوا تھا اور اس لفافے میں موجود تصویریں دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ جدید کیمرے سے کھینچی گئی ان تصویروں میں وہ لنڈا کے علاوہ ان کال گرلز کے ساتھ بھی نظر آ رہا تھا جن کے ساتھ وہ لندن میں قیام کے عرصے میں رنگ رلیاں مناتا رہا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ تصویروں پر تاریخیں اور وقت بھی پرنٹ تھا اور ظاہر ہے یہ ایک بین ثبوت تھا کہ جن دنوں وہ وڈی چودھرائن کے علاج کے بہانے لندن میں رہ رہا تھا حقیقتاً وہاں اس کی کیا مصروفیت تھی۔ تصویروں کے ساتھ کوئی خط وغیرہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہی اس سے فون پر ان کے متعلق کچھ کہا گیا تھا لیکن وہ تصویریں خود چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھیں کہ چودھری افتخار عالم شاہ تمہارے پرخچے کر دیے گئے ہیں اس لیے اب اُڑنے یا اُڑنے کی کوشش نہ کرنا۔

''پروگریس بہت اچھی ہے جناب! کارخانے کی حفاظت کا معقول انتظام کر لیا گیا ہے۔ میرے ذاتی ملازمین کے علاوہ تربیت یافتہ گارڈز بھی موجود ہیں۔ مارکیٹ میں بھی میں نے تیزی سے روابط قائم کر لیے ہیں اور کئی ایسے لوگوں سے مل بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو ہمارے بزنس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں۔'' اس نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ حقیقی معنوں میں آج پہلی بار وہ مکمل طور پر زیرِ ہو کریات کر رہا تھا ورنہ اس سے قبل لاج میں مبتلا ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی دل میں موجود رہتا تھا کہ جب چاہے ان کے مال کو ٹھوکر مار کر خود کو ان سے الگ کر سکتا ہے لیکن اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی صورت ان کے چنگل سے نہیں نکل سکتا۔

''گڈ! تم اچھے جا رہے ہو۔ مقامی منڈی میں تمہاری کارکردگی سے میں بھی مطمئن ہوں لیکن تمہیں اصل کام مال کو بیرونِ ملک ایکسپورٹ کرنے کے سلسلے میں کرنا ہو گا۔ مقامی منڈی میں تو میں تمہیں پہلے بھی بتا ہی چکا ہوں کہ میرے آدمی





آل ریڈی کام کر رہے ہیں۔'' الفا کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا۔ البتہ اپنی گفتگو سے وہ اس پر یہ ظاہر کرنے میں ضرور کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ اس کی طرف سے بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہے اور یہ بات چودھری کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس حد تک زیرِ نگرانی ہے اور اس کی کون کون سی سرگرمیاں ان لوگوں کے علم میں ہیں یا آتی رہیں گی۔

''ہمیں کن ممالک میں مال ایکسپورٹ کرنا ہو گا؟'' سارے وسوسے اور اندیشے اپنے آپ تک محدود رکھتے ہوئے اس نے کام کا سوال کیا۔

''امریکا..... ہمارا اصل ہدف یونائٹڈ اسٹیٹ آف امریکا ہو گا۔'' الفا کے جواب نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ دوسرے ملکوں کا معاملہ الگ تھا لیکن امریکن ائرپورٹس پر جس سختی سے چیکنگ کی جاتی تھی وہاں سے مال نکالنا بہت مشکل تھا۔

''یہ تو بہت مشکل کام ہو گا۔ اس کے لیے تو خصوصی تربیت یافتہ اور تجربہ کار ایجنٹس کی ضرورت ہو گی اور مجھے محسوس ہے کہ میرے پاس ایسے لوگ نہیں ہیں۔'' اس نے بات کر کے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کر ہی دیا۔

''اوہ..... اگر ایسا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے پاس لوگوں کی کمی ہو سکتی ہے لیکن میرے پاس ان یادگار تصویروں کے بے شمار پرنٹس موجود ہیں جو تمہیں یقینی طور پر موصول ہو چکی ہوں گی اور تم انہیں دیکھ کر خاصے محظوظ بھی ہوئے ہو گے۔ بائی دا وے تصویریں صاف تو آئی ہیں نا۔ گزرے ہوئے خوب صورت لمحات کی ان یادگاروں کو سنبھال کر رکھنا ویسے اگر نہ بھی سنبھال سکو تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس تو کئی پرنٹس ہیں۔ تمہیں جب ضرورت پڑے مجھ سے منگوا لینا۔'' وہ بڑے میٹھے لہجے میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

''میں نے آپ کو انکار نہیں کیا ہے مسٹر الفا۔'' اس کے سامنے موجود ہوتا تو وہ اپنا شملہ اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ مغربی تہذیب کا پروردہ الفا شملہ قدموں میں رکھنے کا مطلب سمجھتا بھی تھا یا نہیں۔

''مشکلات کا رونا نہیں رویا جاتا عقل سے کام لے کر ان کا حل نکالا جاتا ہے۔ اس بار میں تمہیں ایک ترکیب بتا دیتا ہوں آئندہ کے لیے تم اپنا دماغ خود لڑانا۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا پھر ذرا سے توقف کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہیروئن کی ترسیل کے لیے تم بچوں کے ڈائپرز استعمال کر سکتے ہو۔ عام طور پر ان ڈائپرز کی اندرونی سطح سفید ہی ہوتی ہے۔ تمہیں ایک ایسے ماہر کاریگر کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو ڈائپرز کے جاذب میٹریل کی جگہ مہارت سے ہیروئن کا سفوف بچھا سکے۔ اس سلسلے میں احتیاط یہ کرنی ہو گی کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہیروئن کی مقدار ایک حد سے تجاوز نہ کرے ورنہ بڑھا ہوا وزن شکوک کو جنم دے سکتا ہے، پچاس پینسر والا کسی بھی کمپنی کا تیار کردہ ڈائپرز کا پیک اس کام کے لیے کافی ہو گا۔ کیریر کے طور پر تمہیں کسی ایسی عورت کا انتخاب کرنا ہو گا جس کا چھ ماہ سے لے کر دو ڈھائی سال تک کا بچہ اس کے ساتھ سفر کر سکے۔ ایسی عورت ڈائپرز کا یہ پیک اپنے سفری بیگ میں بہ آسانی لے جا سکتی ہے۔ پیک کو کھلا ہی رہنے دینا اور اوپر کے چند پیسز کو ان کی اصلی حالت میں رکھنا۔ کسی بہت حفاظت سے پیک کی گئی چیز کے مقابلے میں کھلا ہوا پیک کسٹم والوں کو اپنی طرف کم متوجہ کرے گا۔ کسٹم پر موجود بو گیر کتوں سے بچنے کے لیے سفری بیگ میں تیز خوشبو والے پرفیوم کی ایسی بوتل رکھی جا سکتی ہے جو معمولی سی چٹخی ہوئی ہو۔ کاسمیٹک کے دیگر سامان کے ساتھ موجود ایسی بوتل کے بارے میں یہی سمجھا جائے گا کہ سامان رکھنے اتارنے میں بوتل چٹخ گئی ہے لیکن ہمارا کام ہو جائے گا اور تیز خوشبو بو گیر کتوں کو ڈاج دینے میں کامیاب رہے گی۔'' الفا کی بتائی ترکیب سن کر چودھری اَش اَش کر اٹھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ مقامی مارکیٹ میں بھی اس ترکیب سے مال سپلائی کرے گا۔ اس طرح کسی کو اندازہ نہیں ہو سکے گا کہ ڈائپرز کے کاروبار کی آڑ میں اصل دھندا کیا ہو رہا ہے۔

''شکریہ مسٹر الفا! آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ بس آپ مجھے وقت کا تعین کر کے بتا دیجیے گا باقی سارے انتظامات میں خود کر لوں گا۔'' وہ فوراً ہی چہکنے لگا۔

''یاد رکھنا کہ یہ ترکیب ایک آدھ بار استعمال ہو گی۔ بار بار اس کا اعادہ کیا گیا تو وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔ آئندہ کے لیے تمہیں خود ترکیبیں سوچنی ہوں گی۔ البتہ عمل سے پہلے مجھ سے ڈسکس کر سکتے ہو۔'' اس نے چودھری کے چہکنے کو محسوس کر کے فوراً ہی تنبیہہ کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔'' چودھری نے فوراً ہی فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ جواباً دوسری طرف سے الفا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کا یہ انداز چودھری کو سخت طیش دلاتا تھا لیکن وہ سوائے اپنی جگہ پیچ و تاب کھانے کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا چنانچہ سر جھٹک کر آئندہ انجام دیے جانے والے کاموں کے بارے میں سوچنے لگا کہ کون سا کام کس کے ذمے لگانا ہے۔ کل کا دن اسے مراد شاہ کے ساتھ گزارنا تھا۔ کل وہ واپس نیویارک روانہ ہونے والا تھا اس لیے وہ اسے وقت دینا چاہتا تھا۔ وقت نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ سے زیادہ کام آج ہی نمٹا لے چنانچہ وہ مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

وہ لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ چائے کا دور جاری تھا کہ شہریار کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے موبائل نکال کر چیک کیا تو دوسری طرف موجود شخص کی نشاندہی ہوگئی۔ وہ مشابرم خان تھا جو اسے کال کر رہا تھا۔ وہ ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر سب کے درمیان سے اٹھ گیا۔

''سوری سر ایک اہم اطلاع تھی اس لیے میں نے آپ کو اس وقت فون کیا ہے۔'' اس کی آواز سنتے ہی مشابرم خان نے معذرت خواہانہ انداز میں گفتگو شروع کی..... اس کے لہجے کا دبا دبا جوش بتا رہا تھا کہ اطلاع واقعی اہم ہے۔

''تکلفات میں پڑے بغیر سنا ڈالو۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں نے آپ سے ٹاہلی والا کے علی بخش کا ذکر کیا تھا نا، وہی لڑکا جس نے مجھے وہاں سے نکالا تھا اور ہمارے لیے مخبری کا کام کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ وہ لڑکا میرے پاس آیا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پیر سائیں کے خفیہ ٹھکانے پر کچھ لوگ ایک گاڑی میں بہت سے بند ڈبے لے کر پہنچے ہیں۔ وہ لوگ ڈبے اتار ہی رہے تھے کہ علی بخش اپنی گدھا گاڑی لے کر اطلاع دینے یہاں آ پہنچا۔ مجھے امید ہے کہ ہم فوری طور پر ٹاہلی والا پہنچ جائیں تو پیر سائیں کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور حاصل کرلیں گے۔'' مشابرم خان خاصا پُرجوش تھا۔

''تم انتظار کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور خود میجر ذیشان کا نمبر ملانے لگا۔ اس سے رابطہ ہونے پر اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اطلاع تو اہم ہے لیکن ٹائمنگ کا مسئلہ ہے۔ اس مخبر لڑکے کو ٹاہلی والا سے نور کوٹ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے ہوں گے۔ اب ہم کسی کارروائی کے لیے وہاں جائیں گے تو ہمیں بھی پہنچنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس وقت تک وہاں کچھ نہیں بچے گا اور ہماری ساری بھاگ دوڑ بیکار جائے گی۔'' اس کی بات سن کر ذیشان نے خدشات کا اظہار کیا۔

''یہ سب باتیں تو میرے ذہن میں بھی ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔'' وہ خاصا بے چین ہو رہا تھا۔

''فوری اور بروقت ایکشن کی تو ایک ہی صورت ہے کہ ہم وہاں کی پولیس کو ایکشن میں لائیں اور انہیں اس جگہ کا محاصرہ کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد خود پیچھے سے روانہ ہو جائیں۔'' ذیشان نے کچھ سوچتے ہوئے تجویز پیش کی۔

''اب تک میرے سامنے جو حالات و واقعات آئے ہیں ان سے ٹاہلی والا کی پولیس ناقابلِ اعتبار محسوس ہوئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہاں کے تھانے دار کو پیر سائیں کا پٹھو سمجھا جاتا ہے۔''

''پھر تو ہم وہاں کی پولیس سے کام نہیں لے سکتے۔'' ذیشان فکرمند ہوا۔

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ تمہارے اختیارات کی حد کہاں تک ہے اور تم کن کن لوگوں سے کام لے سکتے ہو۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں بولنا شروع کیا۔

''تم تجویز تو بتاؤ۔ جو کچھ ہو سکا میں ضرور کروں گا۔'' ذیشان فوراً بولا۔

''اگر ہم پولیس فورس کے بجائے ٹاہلی والا سے قریب ترین کسی چیک پوسٹ وغیرہ پر موجود فوج یا رینجرز کے جوانوں سے کام لے سکیں تو زیادہ اچھا رزلٹ آ سکے گا۔''

''اوہ یس۔ یہ اچھی تجویز ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں کہ وہاں سے قریب ترین علاقے میں فوج کا کوئی یونٹ کام کر رہا ہے یا نہیں۔ تم اگر ہمارے ساتھ چلنا چاہو تو تیاری رکھو۔ میں اس طرف سے کوئی پوزیٹو رسپانس ملنے پر تمہیں فون کروں گا پھر اگر ضرورت ہوئی تو ہم خود وہاں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔'' ذیشان نے سلسلہ منقطع کر دیا تو وہ خود تیاری کے لیے چل پڑا۔ لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور بھی ہولسٹر میں رکھ لیا۔ کسی ممکنہ مہم جوئی کے خیال سے اس نے فارمل ڈریس کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ کا انتخاب کیا تھا اور اسی مناسبت سے جوتے بھی جوگرز پہنے تھے۔ اپنی تیاری کی طرف سے مطمئن وہ گھر سے نکلنے کو تیار تھا کہ ماریا کمرے میں چلی آئی۔

''خیریت آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کی





دیکھتے ہوئے اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

''ضروری کام ہے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کی تیاری سے تو کچھ عجیب سا ہی احساس ہو رہا ہے۔ میں نے پہلے تو کبھی آپ کو دوستوں سے اس حلیے میں ملاقات کے لیے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' ماریا نے فوراً ہی اعتراض جڑا تو وہ دل میں خود کو ہی کوس کر رہ گیا۔ بچپن سے کچھ ایسے ماحول میں تربیت ہوئی تھی کہ وہ ملنے جلنے کے لیے ہمیشہ فارمل ڈریسنگ ہی کرتا تھا اور ظاہر ہے ماریا بیوی کی حیثیت سے اس کی اس عادت سے واقف تھی چنانچہ فوراً ہی اس کے جھوٹ کو پکڑ لیا۔

''او کے یار! میں مانتا ہوں کہ میں کسی دوست سے ملنے نہیں جا رہا ہوں لیکن ضروری کام سے بہرحال جا رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے وہاں کتنا وقت لگے گا اور میں واپس لاہور آ بھی سکوں گا یا نہیں۔ تم ایسا کرنا کہ پروگرام کے مطابق صبح نور کوٹ کے لیے روانہ ہو جانا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ڈائریکٹ وہیں پہنچوں۔'' اس نے آدھا ادھورا سا اعتراف کیا۔

''ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا شہریار کہ آپ ایک فون کال پر اچانک ہی اٹھ کر چل پڑنے کے لیے تیار ہیں اور جا بھی لاہور سے باہر رہے ہیں۔ آپ کو کم از کم ماموں اور ممانی جان کو تو بتا کر جانا چاہیے۔'' وہ خفگی کا اظہار کرنے لگی۔

''انہیں بتایا تو وہ تم سے بھی زیادہ سوال جواب کریں گے۔ بہتر ہے کہ تم انہیں میرے جانے کے بعد بتا دینا۔''

''لیکن بتاؤں کیا؟ مجھے تو خود کچھ معلوم نہیں کہ آپ کہاں، کس کے ساتھ اور کیوں جا رہے ہیں؟'' اس کی آواز تھوڑی سی بلند ہوئی۔

''جتنا تمہیں معلوم ہے بتا دینا۔ بعد میں، میں خود ان دونوں سے بات کرلوں گا۔'' وہ کسی طور کھلنے پر راضی نہیں تھا۔

''آپ مت جائیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کے انداز سے ظاہر ہے کہ آپ کسی خطرناک کام کے لیے جا رہے ہیں۔'' وہ یک دم ہی روہانسی ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

''یہ کیا بچپنا ہے ماریا! تم اتنا کیوں گھبرا رہی ہو؟ انشاء اللہ کل تم مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں نور کوٹ میں دیکھو گی۔'' اس نے نرمی سے ماریا کو ٹوکتے ہوئے اس کا شانہ سہلایا۔

''آپ صرف مجھے تسلی دینے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی تو گڑبڑ ہے۔'' وہ کسی طور مطمئن ہو کر نہیں دے رہی تھی۔

''ٹھیک ہے کوئی گڑبڑ ہے اور شاید تھوڑا سا خطرہ بھی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں۔ خطروں سے لڑنا تو مرد کی شان ہوتی ہے اور جب معاملہ بہت سی انسانی زندگیوں کے تحفظ کا ہو تو کسی نہ کسی کو تو خطرہ مول لینے کی ہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔ تم مجھے جانے دو اللہ نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔'' اس نے نرمی سے کہتے ہوئے ماریا کے بازو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی تو جواباً وہ مزید اس سے چپک گئی اور اس کے لبوں کا ایک بھرپور بوسہ لے ڈالا۔

''یہ بوسہ آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ آپ کو کسی کی خاطر واپس لوٹنا ہے اس لیے اپنا بہت خیال رکھیے گا۔'' وہ نہایت جذباتیت سے کہتی ہوئی اس سے الگ ہوئی۔ جواباً وہ صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کر سکا کیونکہ اس کے موبائل پر ذیشان کی کال آنے لگی تھی۔

''مبارک ہو شہریار! ٹاہلی والا کے ایک قریبی علاقے میں موجود رینجرز والوں کو ٹارگٹ کی طرف موو کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ سارے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے۔ اب تم بتاؤ کہ ان کی طرف سے رپورٹ آنے کا انتظار کرنا ہے یا ابھی یہاں سے روانہ ہونا ہے؟'' ذیشان نے اسے خوش خبری سناتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں تو فوری روانگی چاہتا ہوں کیونکہ مجھے کچھ نہ کچھ کامیابی ملنے کا پورا یقین ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے یہاں آ جاؤ ہم نے بھی روانگی کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔'' ذیشان نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''او کے ڈیئر! میں چلتا ہوں۔'' وہ ماریا کے گال کو ہلکے سے تھپتھپاتا ہوا چل پڑا۔ سی ایف پی کا دفتر وہاں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ یہ ایک پانچ منزلہ عمارت تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر سی ایف پی کا دفتر تھا جبکہ باقی عمارت میں دیگر مختلف نوعیت کے دفاتر تھے۔

''سر نیچے اپنے دفتر میں ہیں۔ آپ بھی وہیں چلے جائیں۔'' وہ دفتر پہنچا تو ایک شخص نے اس کا تعارف سننے کے بعد اسے اطلاع دی۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ گراؤنڈ فلور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر واقع اس دفتر کے علاوہ زیرِ زمین بھی تعمیر کی گئی ہے اور وہاں بھی سی ایف پی والوں کا قبضہ ہے اہلکار کی راہنمائی پر سیڑھیاں اتر کر نیچے جاتے ہوئے اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دفتر کا یہ حصہ ساؤنڈ پروف ہے اور یقیناً یہی سی ایف پی کی اصل سرگرمیوں کا مرکز بھی۔ ممکن تھا کہ وہ مشکوک افراد سے معلومات کے حصول کے لیے بھی اس حصے کو استعمال کرتے ہوں۔ زیرِ زمین موجود عمارت کے اس ساؤنڈ پروف حصے میں اگر کسی پر سخت جسمانی تشدد بھی کیا جاتا تو اس کی چیخیں باہر سنائی نہیں دیتیں۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے یہ سب سوچ رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ ہی اپنی سوچوں میں بہت زیادہ مگن تھا یا نیچے سے اوپر کی طرف تیزی سے بڑھتا وہ سیاہ پوش اہلکار بے پروائی کا مرتکب ہوا تھا جو ان دونوں کا تصادم ہو گیا۔ تصادم شدید تھا۔ اسے اپنے قدم ڈگمگاتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن خیر گزری کہ سیاہ پوش نے اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی سنبھال لیا اور ”سوری سر“ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ یہ سب اتنے مختصر دورانیے میں ہوا تھا کہ وہ اس کی شکل بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھ سکا۔ نیچے پہنچتے ہی اس کا ذیشان سے سامنا ہو گیا۔ وہ بھی چست سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔

”اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہم بس نکلنے ہی والے ہیں۔ گاڑی بالکل تیار ہے۔“ وہ اس سے مصافحہ کرتا ہوا بولا اور پھر اپنے ساتھ ہی لے کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ ذیشان کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اردگرد کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ کافی وسیع و عریض رقبے پر قائم دفتر کے اس حصے میں متعدد بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ دروازوں کے پیچھے کیا تھا وہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور لگا سکتا تھا کہ وہ لوگ خاصے منظم طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ ذیشان اسے اپنے ساتھ جس جگہ لے گیا وہ ایک بڑا گیراج تھا جہاں بیک وقت تین سے چار گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس وقت بھی وہاں دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک پراڈو اور دوسری لینڈ کروزر۔ اس وقت لینڈ کروزر کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ کے علاوہ پچھلی سیٹیں بھی آباد نظر آ رہی تھیں۔

”آجاؤ۔“ ذیشان نے کھلے دروازے سے اندر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ان دونوں کے اندر بیٹھتے ہی لینڈ کروزر حرکت میں آ گئی۔

”وہاں کی سچویشن کو تو رینجرز والے کنٹرول کر لیں گے۔ میں احتیاطاً اپنے ساتھ یہ تین بندے لے جا رہا ہوں تاکہ ہم اپنے طور پر جو کچھ کرنا چاہیں آسانی سے کر سکیں۔“ لینڈ کروزر رحم دار چڑھائی سے گزر کر عمارت کے پچھلے حصے سے باہر نکل رہی تھی جب ذیشان نے اسے بتایا۔ اس نے جواباً تحسین آمیز انداز میں سر ہلا دیا۔ مشکل سے پانچ منٹ ہی ان کا سفر خاموشی سے گزرا ہو گا کہ پچھلی سیٹ پر موجود دو افراد میں سے ایک ذیشان سے مخاطب ہوا۔

”ٹاہلی والا سے کال آ رہی ہے سر۔“

”لاؤ بات کرواؤ۔“ ذیشان نے فوراً اس سے سیٹ لے لیا اور بات کرنے لگا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دوسری طرف رینجرز کا کوئی ذمے دار ہے جو اپنے ٹاہلی والا کے قریب پہنچنے کی اطلاع دینے کے بعد مزید ایکشن کے لیے اجازت لے رہا ہے۔ ذیشان نے اسے اپنی جلد آمد سے آگاہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے اور ایکشن لینے کی اجازت دے دی۔

اس کال کے بعد آگے کا پون گھنٹا پھر خاموشی کا تھا۔ تیزی سے سفر کرتی لینڈ کروزر کے اردگرد کے مناظر بھی اسی رفتار سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے لیکن گاڑی میں موجود ان پانچ نفوس میں سے شاید کسی کی بھی توجہ ان معمولی تبدیلیوں کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب چشمِ تصور سے ٹاہلی والا میں ہونے والی کارروائی دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ذیشان کے ہاتھ میں موجود سیٹ ایک بار پھر جاگا تو ہر ایک ہمہ تن گوش ہو گیا۔ خصوصاً اس کے ساتھ بیٹھا شہریار۔ ذیشان سنجیدگی سے دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے حراست میں لیے گئے تمام افراد کو فی الحال ایک کمرے میں بند کر دیں اور وہاں موجود سامان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ میں ایکسپرٹس کی موجودگی کے بغیر وہاں سے کسی چیز کو ہٹانا مناسب نہیں سمجھتا۔“ نہایت سنجیدگی سے یہ ہدایات دینے کے بعد وہ اپنے سیٹ پر کہیں اور رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ رابطہ ہونے پر اس نے جو گفتگو کی اس سے اندازہ ہوا کہ وہ بارودی مواد و ہتھیاروں وغیرہ سے متعلق ماہرین کی خدمات کے لیے کسی سے درخواست کر رہا ہے۔ وہ اپنی اس گفتگو کو نمٹا کر فارغ ہوا تو شہریار کی بے چین سوالیہ نظروں سے سامنا ہو گیا۔

”ٹاہلی والا میں رینجرز نے آپریشن شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے دو گروہوں میں کارروائی کی تھی۔ ایک گروہ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے کام کر رہا اور دوسرا اس مشکوک عمارت کی طرف گیا تھا۔ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے





جانے والوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ نہ تو خانقاہ میں موجود تھا اور نہ ہی اس گھر میں جہاں آج کل اس کی رہائش بتائی جا رہی ہے۔ بہرحال ممکنہ حد تک گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا ہے اور کوشش یہی ہے کہ اگر وہ اب تک گاؤں سے نہیں نکل سکا ہے اور وہیں کہیں چھپا ہوا ہے تو اسے نکلنے نہ دیا جائے۔ اس کے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر کے ان سے بھی پوچھ گچھ کی جائے گی۔ دوسری طرف عمارت پر ریڈ کرنے والوں کو بڑی کامیابی ملی ہے۔ تمہیں شبہ تھا کہ وہ عمارت منشیات کے ذخیرے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے لیکن معاملہ صرف اتنا نہیں ہے۔ وہاں سے بہت سا بارودی ذخیرہ اور خودکار ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں نے رینجرز والوں کو زیادہ اٹھائیج اور چھیڑ چھاڑ سے روک دیا ہے۔ ہم نے رینجرز کے جس یونٹ سے مدد لی تھی، وہ فعال اور فرض شناس تو ثابت ہوا ہے لیکن افسوس کہ ان کے پاس زیادہ جدید آلات اور سہولیات موجود نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم باقی کام اپنی نگرانی میں کروائیں۔“

ذیشان نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ جو اطلاعات فراہم کیں انہیں سن کر وہ بھی ششدر رہ گیا۔ دشمن جانے کہاں کہاں اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔ بڑے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیاں ہی کیا کم تھیں کہ اب تسلسل سے مختلف گاؤں دیہاتوں میں ان کی موجودگی کے آثار ملنے لگے تھے۔ شاید شہروں سے پہلے انہوں نے ان چھوٹے موٹے علاقوں میں ہی اپنے قدم جمائے تھے جہاں انتظامیہ کی کمزور گرفت اور رہائشیوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے طویل عرصے تک ان کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چل سکا اور وہ دیمک کی طرح دھیرے دھیرے اپنا کام کرتے رہے۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ بڑے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کو ان چھوٹے علاقوں میں ہی بیٹھ کر کنٹرول کیا جا رہا ہو اور یہیں دہشت گرد بھی تیار کیے جا رہے ہوں۔ طبقاتی تفریق، معاشی بدحالی اور تعلیم و صحت کی سہولیات سے عاری کسی معاشرے میں ایسے نوجوانوں کو ڈھونڈنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا خصوصاً اس صورت میں کہ دشمن چالاک، کینہ پرور اور بے رحم تھا۔ جیتے جاگتے، صحت مند و خوب صورت جوانوں کو موت کی وادی میں دھکیل دینا بے رحمی نہیں تو اور کیا تھا لیکن محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہونے کا نعرہ لگانے والوں کو اپنی اس بے رحمی کا ادراک ہی کہاں تھا؟ یوں بھی دشمن سے رحم کی امید رکھنا بیکار تھا۔ اصل کام تو اپنے دفاع کو مضبوط کرنا تھا اور دفاع صرف فوج اور ہتھیاروں سے ہی نہیں ہوتا..... اپنے لوگوں کو شعور و آگہی کی روشنی بھی دینی پڑتی ہے لیکن لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے والے ایسی غلطی کیوں کرنے لگے۔ وہ تو ممکنہ حد تک کھاؤ پیو اور جمع کرو بلکہ کرتے ہی چلے جاؤ کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے تھے..... ایک جاتا نہیں تھا تو دوسرا اپنی باری کے لیے بے چین رہتا..... ایسے میں ملک بھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں، اس کا کھوج کون لگاتا اور کیوں لگاتا۔

وہ راستے بھر اسی طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔ سفر خاصا طویل تھا لیکن وہ نور کوٹ سے لاہور تک اکثر سفر کرتے رہنے کا عادی تھا۔ ٹاہلی والا تک کا وہ سفر مشکل سے مزید پندرہ بیس منٹ ہی طویل ثابت ہوا ہو گا۔ راستے میں ایک دو بار ذیشان نے رینجرز والوں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایات دی تھیں۔ ان میں سے ایک ہدایت گاؤں والوں کو اپنے مکانات تک محدود رہنے کے سلسلے میں دی گئی تھی۔ دوسری بار بات ہونے پر رینجرز کو لیڈ کرنے والے ان کے افسر نے بتایا تھا کہ مسجد سے اس سلسلے میں اعلان کر دیا گیا ہے اور گاؤں والوں نے اس ہدایت پر عمل درآمد بھی کیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں گھر گھر تلاشی کا کام شروع کر دیا گیا تھا تاکہ اگر پیر سائیں اپنے کسی چیلے کے ساتھ کسی گھر میں روپوش ہو تو اسے بازیافت کیا جا سکے۔ سفر طے ہونے تک انہیں اس سلسلے میں کسی کامیابی کی نوید نہیں ملی تھی اور اب وہ ٹاہلی والا میں داخل ہو رہے تھے۔

گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں ٹاہلی کے درخت نظر آنا شروع ہو گئے۔ یہی درخت گاؤں کی وجہ تسمیہ بھی تھے۔ اب تک بت کی طرح ساکت بیٹھا شہریار گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی اپنے خون میں جوش سا محسوس کرنے لگا اور اس کی نظریں گاڑی کے شیشوں سے باہر اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ طویل شاہراہوں پر فراٹے بھرنے والی لینڈ کروزر کی رفتار بھی گاؤں کی حدود میں پہنچنے پر کافی کم ہو گئی تھی۔ اردگرد کے مناظر پہلے کی طرح پلک جھپکنے میں نظروں سے غائب نہیں ہو رہے تھے تب ہی اس کی جائزہ لیتی آنکھوں نے ٹاہلی کے درختوں کے جھنڈ میں حرکت سی محسوس کی۔ پل بھر کو دکھائی دینے والی وہ متحرک شے نیلے رنگ کی تھی یعنی وہ کوئی جانور نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یقینی طور پر کوئی انسان تھا جس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

”گاڑی روکو۔“ اس نے بلند آواز میں کہا تو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اہلکار نے فوراً بریک لگا دیے۔ ابھی لینڈ کروزر پوری طرح رکی بھی نہیں تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکا اور ٹاہلی کے اس جھنڈ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس کے حساب سے اگر اس جھنڈ میں کوئی شخص موجود تھا تو وہ مشکوک تھا کیونکہ کسی عام دیہاتی کو گھر تک محدود رہنے کا حکم ملنے کے بعد یوں چوری چھپے یہاں موجود رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''تم جو کوئی بھی ہو فوراً ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ۔ دیر کرنے کی صورت میں سخت نقصان اٹھاؤ گے۔'' اندازے سے اس جگہ کے قریب پہنچنے پر جہاں اس نے مشکوک فرد کو غائب ہوتے دیکھا تھا، وہ بآواز بلند بولا اور اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ چند سیکنڈ گزر گئے لیکن دوسری طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے قدم بڑھاتے ہی ایک شعلہ سا لپکا اور فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ وہ خوش قسمت تھا جو اس فائر سے بچنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اس کے اضطراری طور پر نیچے گرتے ہی گولی عین اس مقام سے گزری جہاں اس کا سر تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اندازے سے ان دو درختوں کے درمیان فائر جھونک دیا جہاں اس کے خیال کے مطابق وہ شخص موجود تھا اور اب اس فائر کے بعد اس کے مشکوک ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ فائر کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ ٹھہرا نہیں رہا بلکہ تیزی سے قلابازی کھا کر ایک موٹے تنے کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس درخت کا انتخاب اس نے بہت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اس کے پیچھے چھپنے سے ایک تو وہ جوابی فائر سے بچ گیا تھا دوسرے اس کے اور حملہ آور کے درمیان فاصلہ بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی مقابلے میں اس کی پوزیشن بھی پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ پہلے اس کا مقابل چھپا ہوا تھا اور وہ اس کی نظروں میں تھا اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مقابل کی درست پوزیشن جاننے کے لیے اس نے ایک بار پھر اسی سمت..... فائر کیا۔ فوراً ہی پے در پے دو جوابی فائر داغے گئے لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ وہ فائر پہلے کے مقابلے میں زیادہ فاصلے سے کیے گئے تھے اور باقاعدہ سوچ سمجھ کر نہیں کیے گئے تھے بلکہ اسے محض یہ باور کروایا گیا تھا کہ اس کا مدِمقابل ابھی موجود ہے لیکن حقیقتاً وہ وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی تیزی سے حرکت میں آ گیا اور درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگا۔

ذیشان اور اس کے ساتھی بھی یقیناً اس کے پیچھے جھنڈ میں داخل ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے اب تک اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں دیا تھا اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس طرف موجود ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اس وقت تو وہ پورے ارتکاز سے فرار ہوتے شخص کی آہٹوں اور سرسراہٹوں کو محسوس کرتا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

تعاقب کا یہ سلسلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور اسے ایک بار پھر نیلے کپڑوں کی جھلک دکھائی دے گئی۔ اس نے فوراً ہی اس سمت دو فائر جھونک دیے لیکن یہ دونوں ہی فائر صرف اس شخص کو خوف زدہ کرنے کے لیے کیے گئے تھے اور مقصد صرف اسے خوف زدہ کرنا تھا۔ جواب میں فوراً ہی کئی فائر ہوئے۔ اس نے کیے گئے ہر فائر کی گنتی یاد رکھی تھی اس لیے اس وقت وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے مقابل کا ریوالور اب خالی ہو چکا ہے اور وہ مزید فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ اس بات کا یقین ہوتے ہی وہ بالکل بے خوف ہو گیا اور اندھا دھند اٹھ کر اس کی سمت دوڑا۔ اس کا اندازہ درست تھا مقابل کے پاس واقعی مزید گولیاں نہیں بچی تھیں اس لیے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ بدحواس سا ہو کر بھاگا لیکن اب شہریار اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی اپنے چھریرے ورزشی بدن کی وجہ سے اسے اس بے ڈھب پستہ قامت آدمی پر فوقیت حاصل تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے ایک لانگ جمپ لگائی اور سیدھا اس پر جا پڑا۔ اس کے حملے کے زور میں وہ زمین پر گر گیا۔ خود شہریار بھی اس پر جا پڑا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹھکائی کرنے لگا۔ بدحواس آدمی نے پہلے تین چار وار تو خاموشی سے سہہ لیے پھر وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے حرکت میں آیا اور شہریار کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

بے شک وہ پھرتیلا نہیں تھا لیکن اس کے موٹے جسم میں بلا کی طاقت تھی۔ شہریار کو یوں لگا کہ اس کی گردن کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنی گردن کے گرد موجود اس شکنجے کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن موٹی موٹی انگلیوں والے بے ڈھب ہاتھ تو جیسے کسی طاقتور سلوشن کی مدد سے اس کی گردن سے چپک گئے تھے اور لحہ بہ لحہ اس کے لیے سانس لینے کے عمل کو دشوار بناتے جا رہے تھے۔ اس نے اس شکنجے سے خود کو آزاد کروانے کی آخری ترکیب کے طور پر اپنے جسم کی تمام تر توانائی کو یکجا کیا اور دائیں ٹانگ کا گھٹنا آگے کی طرف موڑ کر پوری قوت سے مقابل کی ناف پر دے مارا اس کا یہ وار کارگر ثابت ہوا اور موٹے گھنگنے نے تڑپ کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ گردن آزاد ہوتے ہی شہریار نے اس کی ناک پر سرکی زوردار ٹکر ماری۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ سا چھوٹ پڑا۔





''بس اتنا کافی ہے۔ اب ہمیں اسے اریسٹ کرنے دو۔'' وہ ابھی اسے دو چار ہاتھ اور جڑنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ قریب سے ذیشان کی آواز سنائی دینے پر چونک گیا اور پھر فوراً ہی موٹے سے الگ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے پیچھے ہٹتے ہی ذیشان کے دو اسلحہ بردار ماتحت آگے بڑھے اور اسے اپنی زد میں رکھتے ہوئے ایک نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔ ہتھکڑی پہنانے کے بعد انہوں نے موٹے کو اٹھنے کا حکم دیا۔ خوفناک اسلحے کی موجودگی میں اسے اس حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی اس لیے وہ کراہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''آپ کا ریوالور سر۔'' ان میں سے ایک نے شہریار کا زمین پر گرا ریوالور اٹھا کر اسے مؤدبانہ پیش کیا تو اس نے خاموشی سے ریوالور تھام کر دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔ جوش میں اس نے فوراً ہی ریوالور ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا اور مقابل کو خالی ہاتھ زیر کرنے بیٹھ گیا تھا ورنہ سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتا اور اپنے حکم کی تعمیل کروا لیتا۔

''میں اور میرے یہ دونوں ساتھی تمہارے پیچھے ہی اس جھنڈ میں داخل ہو گئے تھے لیکن تم دونوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ میں نے اس موقع پر مداخلت کرنی مناسب نہیں سمجھی کیونکہ تم بہت پُرجوش تھے اور ہماری مداخلت پر کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر بھڑک سکتے تھے۔ ہم تینوں نے تم دونوں کے درمیان ہونے والی ہاتھ پیروں کی لڑائی بھی اچھی طرح دیکھی ہے۔ اگر تم چند سیکنڈ اور اپنی گردن اس شخص کے ہاتھوں سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو پاتے تو پھر مداخلت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے ہم میں سے کوئی تمہارا ساتھ دینے کے لیے سامنے آجاتا۔'' نیلے کپڑوں والے موٹے کو اپنے ساتھ لیے لینڈ کروزر کی طرف واپس جاتے ہوئے ذیشان آہستہ آواز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ جسے وہ ہونٹ بھینچے سنتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ ذیشان اسے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت اس نے کافی احمقانہ انداز میں بہادری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اندھا دھند دوڑ پڑنے کے بجائے ان لوگوں کو بھی آگاہ کر دیتا تو اس شخص کو زیادہ آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ کسی فائر کی زد میں نہیں آیا ورنہ حماقتیں تو اس نے کئی ایک کی تھیں۔

ان کے لینڈ کروزر میں واپس بیٹھتے ہی ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی جبکہ ایک اہلکار اسپرٹ میں بھیگی روئی سے زخمی ملزم کی ناک سے بہتا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ذیشان نے اسے گھورتے ہوئے وہیں اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا۔

''واجد جناب۔'' اس نے نہایت فرمانبرداری سے بتایا۔ اس نام کو سن کر شہریار چونک گیا۔ کچھ دن قبل پیر آباد سے گرفتار ہونے والا کالے میاں جو کہ بالے کی بیوی شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا تھا، اس نام کے شخص کو پیر سائیں کا خاص کارندہ بتا چکا تھا۔ مشاہر م خان کی تحقیقات کے نتیجے میں بھی یہ نام سامنے آیا تھا اور اب جن مشکوک حالات میں وہ شخص انہیں ملا تھا اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ وہی واجد ہے جس کا ذکر وہ سنتا رہا ہے۔

''ادھر جھنڈ میں کیا کر رہے تھے؟'' ذیشان نے کچھ اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''سخت حاجت ہو رہی تھی صاحب اس لیے گیا تھا۔'' اس نے خود پر کچھ اور معصومیت طاری کر لی۔

''کیوں تم نے اعلان نہیں سنا تھا کہ سب گاؤں والے اپنے گھر تک محدود رہیں۔''

''مجھے ذرا کم سنائی دیتا ہے صاحب۔ مجھے نہیں معلوم کسی اعلان کا۔'' اس نے پچکے منہ کے ساتھ جھوٹ بولا جسے سن کر ذیشان کا میٹر گھوم گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

''جھوٹ بولتا ہے سالا۔ میری ہر بات کا فر فر جواب دے رہا ہے اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ہونے والا اعلان سنائی نہیں دیا۔''

''ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں سر۔'' اسی وقت ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے اطلاع دی۔

''اسے بھی اتارو گاڑی سے اور دوسرے زیرِحراست افراد کے ساتھ رکھو۔ بعد میں، میں اس سے پوچھتا ہوں کہ اسے کیا سنائی دیتا ہے اور کیا نہیں؟'' غصیلے لہجے میں حکم صادر کرتا ہوا ذیشان لینڈ کروزر سے اترنے لگا۔ شہریار بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

''واجد نام کا یہ شخص اہم ہے اور پہلے ہی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہے۔'' اس نے ذیشان کو دھیمی آواز میں آگاہ کیا جس پر اس نے محض سر ہلایا اور رینجرز کے کمانڈ کرنے والے افسر کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے استقبال کے لیے پیش قدمی کر چکا تھا۔ ان لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وہی معلومات دہرانا شروع کر دیں جن سے وہ راستے میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی آگاہ کرتا رہا تھا۔ ان معلومات میں محض اتنا اضافہ ہوا تھا کہ رینجرز کے جوان مختصر آبادی والے اس گاؤں کے بیشتر مکانات کی تلاشی لے چکے تھے لیکن کہیں سے بھی پیر سائیں کو برآمد نہیں کیا جا سکا۔ معلومات کے اس تبادلے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے گیا۔ آسیب زدہ مشہور اس عمارت کے ایک کمرے میں گتے کے چند چھوٹے ڈبوں کے ساتھ لوہے کی بڑی بڑی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گتے کے دو تین ڈبوں کے علاوہ لوہے کی ایک پیٹی کھلی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ گتے کے ڈبوں میں سفید سفوف کی پڑیاں موجود ہیں جبکہ پیٹی میں بارودی مواد کا ذخیرہ تھا۔ منشیات اور اسلحے کے اس تباہ کن ذخیرے کو یکجا دیکھ کر وہ سب ہی اپنے اندر سنسنی سی محسوس کرنے لگے۔ یقینی سی بات تھی کہ پیر سائیں کے نام سے مشہور وہ شخص کسی خطرناک دشمن ملک کا ایجنٹ تھا جو روحانی پیشوا کے بہروپ میں اپنا گھناؤنا کام سرانجام دے رہا تھا۔

''اس پیر سائیں کو ہر حال میں گرفتار ہونا چاہیے آفیسر! اصل بندہ وہی ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' اس سارے ذخیرے کو دیکھ کر ذیشان اضطراری طور پر بول اٹھا۔

''میں نے ملنے والے احکامات اور ہدایات پر پوری طرح عمل کیا ہے جناب۔ اگر وہ بندہ یہاں ہوتا تو میں ضرور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس کا تو پورے گاؤں میں کہیں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔'' رینجرز آفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ایسا لگتا ہے کہ کسی نے عین وقت پر مخبری کر دی تھی کیونکہ ہم پروگرام کے مطابق دو گروپس میں دونوں طے شدہ ٹارگٹس تک پہنچے تھے۔ آپ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جس مکان میں پیر سائیں کے ہونے کا امکان تھا، ہم نے اسے گھیر کر اچھی طرح تلاشی لی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اہلِ خانہ بھی اس بات سے واقف نہیں تھے کہ پیر سائیں اپنے مخصوص کمرے میں موجود نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اس کے غائب ہونے کو اس کی کوئی روحانی کرامت سمجھا تھا کہ وہ خود تک خطرے کے پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو گیا تھا لیکن میرے حساب سے کسی نے مخبری کر کے عین وقت پر اسے فرار کروا دیا تھا۔ وہ مخبر کون ہو سکتا ہے، یہ کھوج لگانا آپ کا کام ہے کیونکہ مخبر کا آپ میں سے ہی ہونا یقینی ہے۔ میں یا میرے آدمی تو چند گھنٹے سے پہلے اس ساری صورتِ حال سے ... مکمل طور پر بے خبر تھے۔''

رینجرز آفیسر سپاٹ لہجے میں جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ قرین از قیاس تھا۔ پیر سائیں کا اتنی اچانک ٹاہلی والا سے غائب ہو جانا واقعی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے مخبری کی گئی ہے وہ بھی اتنے عین وقت پر کہ اسے منشیات اور بارود کے ذخیرے کو وہاں سے نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی اور وہ محض اپنے آپ کو بچا کر لے گیا۔

''واجد کو پکڑو۔ اس سے معلوم کرو۔ وہ اس بہروپیے کا سب سے قریبی ساتھی ہے وہ ضرور اس کے اور اس کے دھندوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوگا۔'' اس گمبھیر صورتِ حال میں شہریار کو تاریکی سے نکلنے کی جو راہ سجھائی دی، وہ اس نے اوروں کو بھی سجھائی۔

''ٹھیک ہے، اسے دیکھتے ہیں۔'' ذیشان نے جواب دیا اور فوراً ہی رینجرز آفیسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپ کے تعاون کا شکریہ آفیسر! اب جبکہ ساری صورتِ حال انڈر کنٹرول ہے تو باقی معاملات میں اور میرے ساتھی خود دیکھ لیں گے۔'' اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ آگے کے معاملات میں رینجرز والوں کی شمولیت نہیں چاہتا ہے۔

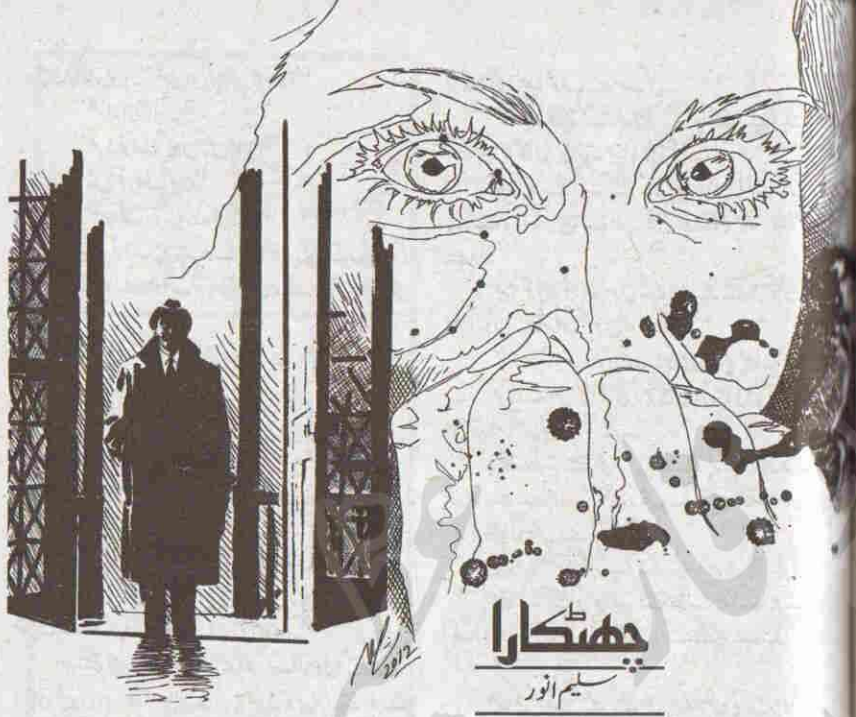
''او کے، میں اپنے جوانوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جاتا ہوں۔'' وہ اس کا اشارہ بھانپ کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''ایک بار پھر تھینک یو سو مچ۔'' ذیشان نے اس سے ہاتھ ملایا، شہریار نے بھی اس کی تقلید کی۔

''آؤ اب واجد کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میرے باقی آدمی یہاں پہنچ کر جب تک اپنا کام شروع کرتے ہیں بہتر ہے کہ اتنی دیر میں ہم اس شخص کو بھی ٹٹول لیں۔ ہم یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے جتنی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اتنا بہتر رہے گا کیونکہ اس طرح ہم حاصل شدہ معلومات پر فوری ایکشن بھی لے سکیں گے۔'' رینجرز آفیسر کی روانگی کے بعد ذیشان نے اس سے کہا اور پھر زیرِ حراست افراد کے لیے مخصوص کمرے میں جانے کے لیے اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی وہ بری طرح چونکا اور اس کے شانے کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی ٹی شرٹ پر چپکی کسی ہم رنگ شے کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی مدد سے الگ کیا۔ شہریار ششدر سا اس منظر کو دیکھتا رہ گیا۔

**یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے**
**مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں**





# چھٹکارا

سلیم انور

ایک ہی کشتی کے مسافروں کو اگر کسی ساتھی کی ہمراہی مل جائے تو پھر سفر آسان اور منزل قریب تر نظر آنے لگتی ہے... دو معاملہ فہم افراد کی یکجائی کا شاخسانہ جن کی سنگت نے انہیں منزل تک پہنچا دیا...

**آغاز سے اختتام تک کا مختصر مگر سنسنی خیز سفر..... کامیابی کا ایک انوکھا اور نیا طریقہ**

''تم اسے یہ بات بتا نہیں سکتیں... وہ تمہیں مار ڈالے گا۔'' رچرڈ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

جینا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''شاید۔''

رچرڈ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''ذرا سوچو کہ تم کہہ کیا رہی ہو۔ تم نہیں بتا سکتیں...''

''میں نے اپنا ذہن بنا لیا ہے۔'' جینا نے ہوٹل کے مہکتے ہوئے کمرے کے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر رکتے ہوئے بولی۔ ''فکر مت کرو، میں تمہارا نام نہیں لوں گی۔''

جینا ہوٹل سے نکل کر واپس اپنے گھر آ گئی۔ اس نے ایک نگاہ اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی۔ چھ بج رہے تھے۔ ہیتھ کی واپسی کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔

جینا نے کیبنٹ سے شاٹ گن نکالی اور اسے اپنے بیڈ روم کے میٹرس کے نیچے چھپا دیا۔ پھر جونہی وہ بیڈ کی چادر درست کر کے اٹھی تو اس کے کانوں میں ہیتھ کی فورڈ مسٹینگ کی مانوس آواز سنائی دی۔ ہیتھ کی کار ڈرائیوے میں داخل ہو رہی تھی۔

ایک منٹ بعد داخلی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

''بے بی، میں گھر آ گیا ہوں۔'' کچن سے ہیتھ کی آواز ابھری۔ پھر اس نے ایک زوردار آواز کے ساتھ کچن کا دروازہ بند کیا اور کچن کے فرش پر اس کے جوتوں کی آواز گونجنے لگی۔

جینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہیتھ کچن سے ہوتا ہوا اندر آ گیا۔ ''کھانا کہاں ہے؟ بڑی زوردار بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

جینا نے جواب دینے کے بجائے عجیب نظروں سے ہیتھ کی طرف دیکھا تو وہ رک گیا اور کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''تمہارا انتظار۔''

''تم نے کھانا کیوں نہیں پکایا؟''

''میں مصروف تھی۔''

''مصروف... کیا کر رہی تھیں؟''

جینا نے اب جو کچھ ہونے والا تھا، اس کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں رنگ رلیاں منا رہی تھی۔''

ہیتھ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔

''ایکسکیوزمی؟''

''میں گھر سے باہر ایک ہوٹل گئی ہوئی تھی اور وہاں ایک کمرے میں کسی کے ساتھ تھی۔''

''تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟'' ہیتھ نے بدستور حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔

جینا نے بہ مشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے اپنے خشک حلق کو تر کیا اور بولی۔ ''میرا ایک افیئر چل رہا ہے۔ میں اس شادی کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔''

یہ سنتے ہی ہیتھ کو ایسا لگا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیتے ہوئے نیچے پھسلتا گیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر جم گئیں اور اس کے چہرے کا رنگ اچانک پھیکا پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا۔

پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

چند لمحوں کے بعد جب ہیتھ نے سر اٹھا کر جینا کو دیکھا تو وہ کانپ گئی۔ خوف کی ایک لہر اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

''کون ہے وہ؟'' ہیتھ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

جینا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟'' ہیتھ کا لہجہ زہر آلود تھا۔

''یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔'' جینا نے جواب دیا۔

ہیتھ فرش پر سے کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں غصے سے بھینچتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم سے ایک سوال کیا ہے۔ وہ کون ہے؟'' اس کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔

''میں نہیں بتاؤں گی۔''

اس کی بات سن کر ہیتھ دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ جینا خوف سے سمٹ گئی۔

نزدیک پہنچنے کے بعد ہیتھ نے اچانک اپنے ایک ہاتھ سے جینا کا گلا دبوچ لیا۔ جینا ہانپنے لگی۔

پھر ہیتھ نے ایک جھٹکے سے جینا کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر دے مارا پھر جینا کے اوپر جھکتے ہوئے بولا۔ ''بتاؤ، کون ہے وہ؟''

جینا کو ہیتھ کی سانسوں کے ذریعے غصے کی تپش اپنے رخساروں سے ٹکراتی محسوس ہو رہی تھی۔

''بتاؤ!'' ہیتھ نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

جینا نے اس کی کلائی دبوچ لی اور بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو، میرا سانس گھٹ رہا ہے۔''

ہیتھ نے یہ سنتے ہی اس کے گلے پر دباؤ اور بڑھا دیا اور حقارت سے بولا۔ ''ابھی تو میں نے تمہیں حقیقت میں کوئی گزند پہنچائی نہیں ہے۔''

جینا اپنا حلقوم چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر چلانے لگی۔

ہیتھ نے پیچھے کی جانب جھکتے ہوئے جینا کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا جڑ دیا۔ پھر اس کے گلے پر سے اپنی گرفت ختم کر دی۔

ہیتھ کی گرفت سے نکلتے ہی جینا فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

ہیتھ نے اسے ٹھوکریں ماریں اور پھر اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ جب بھی غصے میں ہوتا تھا تو یہی کرتا تھا۔

ہر دفعہ کی طرح اس نے جینا کو گھسیٹ کر بیدردی سے بیڈ پر پٹخ دیا اور پھر ہمیشہ کی طرح اپنے کپڑے اتارنے لگا۔

جینا کی پسلیوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو درست کرنے کے لیے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے جلد ہی اپنی سانسوں پر قابو پا لیا۔

دوسرے لمحے وہ بیڈ پر سے لڑھکتی ہوئی بیڈ کی دوسری جانب چلی گئی اور ساتھ ہی میٹرس کے نیچے سے وہ شاٹ گن نکال لی جو اس نے کچھ دیر قبل وہاں چھپائی تھی۔ اس نے شاٹ گن کی نال کا رخ ہیتھ کے سینے کی جانب کیا اور سرد لہجے میں بولی۔ ''بس... مجھ پر تمہارا یہ ظلم آخری بار تھا۔''

ہیتھ نے نظریں اٹھا کر جب جینا کے ہاتھ میں دبی ہوئی شاٹ گن کو دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹ پڑیں۔

''یہ... یہ کیا ہے...؟'' وہ ہکلانے لگا۔

تب جینا نے شاٹ گن کا ٹریگر دبا دیا۔

لیکن ایک کھوکھلے کھٹکے کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیا۔



جینا بھونچکی رہ گئی۔

ہیتھ کی آنکھیں جو چند سیکنڈ پہلے خوف و دہشت سے پھیلی پڑ رہی تھیں، اب ان میں آگ برسنے لگی۔ اس نے جھپٹ کر شاٹ گن جینا کے ہاتھ سے چھین لی اور ایک جھٹکے سے شاٹ گن کے چیمبر میں داخل کرتے ہوئے حقارت سے بولا۔ ''اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

جینا نے ہیتھ کی انگلی کو شاٹ گن کے ٹریگر پر حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی آنکھیں میچ لیں۔ ہیتھ نے ٹریگر دبا دیا۔

ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔

جینا کے نتھنوں میں شدید جلن ہونے لگی۔ پھر ایک زوردار دھپ کی سی آواز آئی جیسے کوئی بھاری شے فرش پر گری ہو۔

اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

جینا نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور ہیتھ کے بے جان جسم سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو گھورنے لگی۔ شاٹ گن ہیتھ کی لاش کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ شاٹ گن کا فریم اور بیرل پھٹ کر مڑی تڑی حالت میں ہو چکے تھے۔

ہیتھ کے چہرے کے سامنے کا حصہ مسخ ہو چکا تھا اور وہاں خون اور گوشت کے لوتھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں دھات کے ٹکڑے بھی نمایاں تھے جو مسخ چہرے میں دھنسے ہوئے تھے۔

تکلیف کے باوجود جینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

وہ سوچنے لگی کہ اس بات کے خلاف کوئی قانون نہیں کہ کوئی بیوی اپنے شوہر کی شاٹ گن کے بیرل میں دھات پگھلانے والا سلوشن ڈال کر اسے اس طرح مضبوطی سے بند کر دے کہ فائر ہونے کے بجائے کارتوس اندر ہی چل جائے اور شاٹ گن کو پھاڑ دے۔

یہ بات پولیس بلاعذر قلم زد کر لے گی کہ یہ ایک اقدام قتل تھا جس کے نتیجے میں مشتبہ قاتل کی حادثاتی موت واقع ہوئی۔ اور اسے شوہر کے ہاتھوں مار کھانے والی اس بیوی کی نظر سے دیکھا جائے گا جو موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی۔

جینا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بڑبڑانے لگی۔

''اب رچرڈ کو اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کوئی تدبیر سوچنی ہوگی۔''

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# قتلِ مسلسل

کاشف زبیر

بچپن... عمر کا سنہرا اور یادگار دور سمجھا جاتا ہے... اس وقت ذہن صاف و شفاف سلیٹ کے مانند ہوتا ہے... اس پر جو تحریر ہو جاتا ہے... ہمیشہ کے لیے اپنے ان مٹ نقوش ثبت کر جاتا ہے... انسانی ذہن کی الجھنوں اور نفسیاتی پہلوئوں کو اجاگر کرتی ایک یادگار تحریر...

**قتل کی مسلسل وارداتیں قاتل و مقتول ایک معمے کی صورت اختیار کرتے گئے**

"ہمارا معاشرہ تنزلی کی طرف جا رہا ہے۔ جرائم کی شرح اور ان کی وجوہات میں تیزی آ رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جرم کا مقصد کمانا یا بدلہ لینا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ صرف نفسیاتی وجوہات کی بنا پر جرائم کی طرف بہت کم آتے تھے۔ دہشت گردی کا تو کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا لیکن اب بیشتر جرائم نفسیاتی وجوہات کی بنا پر ہو رہے ہیں۔ لوگ اپنی کسی ذاتی تکلیف کی بنا پر مجرم بن جاتے ہیں اور ان کا مقصد دوسروں کو اسی تکلیف سے دوچار کرنا ہوتا ہے جس سے وہ گزرتے آئے ہیں۔"

مائیک کی تقریر جاری تھی، اس نے کافی کا مگ تھام رکھا تھا اور پامیلا کی ڈیسک سے ٹکا ہوا تھا۔ پامیلا اس کی باتوں سے بے نیاز اپنے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف تھی جبکہ نیویارک پولیس کے ہومی سائڈ ڈیپارٹمنٹ کے باقی اراکین بظاہر تو مائیک کی تقریر سن رہے تھے لیکن ان میں شاید ہی کسی کا دھیان اس کی طرف تھا۔ وہ سب اپنے کاموں میں مگن تھے۔ مائیک جانتا تھا لیکن اپنی عادت سے مجبور تھا۔ جب اس کے پاس ذرا فرصت ہوتی، وہ اپنے ساتھیوں کو اپنے خیالات سے مستفید ضرور کرتا تھا۔

مائیکل جیمسن گزشتہ دس سال سے ہومی سائڈ میں کام کر رہا تھا، اس نے کرمنالوجی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی اور وہ براہِ راست افسر آیا تھا اس وقت وہ لیفٹیننٹ کے عہدے پر تھا اور امکان تھا کہ ایک دن وہی شعبے کا سربراہ بنے گا۔ دو دن پہلے اس کا سابق پارٹنر نیلسن اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے ریٹائر ہوا تھا۔ وہ مائیک کا استاد بھی تھا اور مائیک نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ تقریر کی وجہ یہی تھی کہ مائیک فی الحال فارغ تھا اگرچہ وہ دو کیسز پر کام کر رہا تھا لیکن کوئی پارٹنر نہ ہونے کی وجہ سے تفتیش کا کام رکا ہوا تھا۔ وقت گزاری کے لیے وہ اپنے تجربات سے دوسروں کو مستفید کر رہا تھا۔ اس کا مگ خالی ہوا تو اس نے دوبارہ بھرنے کے لیے کافی مشین کا رخ کیا تھا کہ کپتان کارلائل کی سیکریٹری جیلٹ نے اپنے کمرے سے جھانک کر اسے آواز دی۔

"تمہیں کپتان یاد کر رہا ہے۔"

مائیک اس کے دروازے کے پاس سے گزرا تو رک گیا۔

"کپتان کا موڈ کیسا ہے؟"

"اچھا ہے کیونکہ وہاں ایک عدد حسین عورت بیٹھی ہے۔ کم سے کم میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اتنی خوب صورت عورت نہیں دیکھی۔"

"یہ بات دوسری خواتین کو پسند نہیں آئے گی۔" مائیک نے کپتان کے کمرے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ مائیک کی عمر تقریباً پینتیس برس تھی لیکن اپنی چھریرے جسم اور لڑکوں جیسے نقوش کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں کم لگتا تھا۔ کارلائل کے کمرے میں سچ مچ ایک قیامت بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر مائیک کو جیلٹ کی بات کا یقین آ گیا۔ سرخ بال اور سرخ رنگت والی اس لڑکی کے نقوش ایسے تھے کہ اسے آسانی سے ہالی ووڈ میں کام مل سکتا تھا۔ اوپر سے چست وردی میں پھنسا اس کا متناسب بدن کسی سپر ماڈل سے کم نہیں تھا۔ مائیک کو حیرت ہوئی وہ یہاں کیا کر رہی تھی وہ تو بہ آسانی سیلیبریٹی بن سکتی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں ایک سحر تھا، جب اس نے نظریں اٹھا کر مائیک کو دیکھا تو وہ ساکت رہ گیا۔ کارلائل بولا۔

"مائیک بڈی... اس سے ملو۔ مارشا گبس۔"

"ہیلو۔" مائیک نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "مجھے مائیکل جیمسن کہتے ہیں۔"

"ہائے۔" اس نے مترنم لہجے میں کہا۔

"مائیک! مارشا ملواکی سے آئی ہے اور آج سے یہ تمہارے ساتھ کام کرے گی۔"

اگرچہ مائیک کو صنفِ نازک سے دلچسپی بس ایک حد تک تھی اور اس نے کبھی ساتھ کام کرنے والی خواتین میں دلچسپی نہیں لی تھی لیکن اس وقت اسے اپنی قسمت پر رشک آیا کہ یہ بت طناز اس کے ساتھ کام کرے گی اور دن میں کم سے کم آٹھ گھنٹے اس کے ساتھ رہے گی۔ کارلائل مارشا کو مائیک کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ اس کے ماتحتوں میں سب سے باصلاحیت ہے۔ مارشا بنا کسی تاثر کے کپتان کی باتیں سن رہی تھی۔ آخر اس نے ان کو جانے کی اجازت دے دی۔ مارشا اس کے ساتھ ہی آئی کیونکہ اس کی میز اب مائیک کے ساتھ ہی تھی۔ اس کی چال بھی اس کی طرح قیامت خیز تھی وہ چلتی تو اس کا بدن دائروں میں رقص کرتا محسوس ہوتا تھا۔

شعبے کے لوگوں کو معلوم تھا کہ ملواکی سے کوئی خاتون پولیس افسر یہاں آ رہی ہے لیکن یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ ایسی قیامت ہو گی۔ اسے دیکھ کر کئی مردوں کے منہ سے سیٹیاں نکل گئی تھیں۔ مائیک اور مارشا دوسروں کو نظر انداز کر کے اپنی میزوں پر آ گئے۔ اپنے اور مارشا کے لیے کافی نکال کر مائیک اسے اپنی میز پر لے آیا۔ "فی الحال چاہو تو تم یہاں بیٹھو کیونکہ میرے سابق پارٹنر کی کچھ چیزیں اس میز کی درازوں میں ہیں، وہ کل لے جائے گا تو یہ میز تمہیں مل جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" مارشا بولی۔ "ان دنوں تم کسی کیس پر کام کر رہے ہو؟"

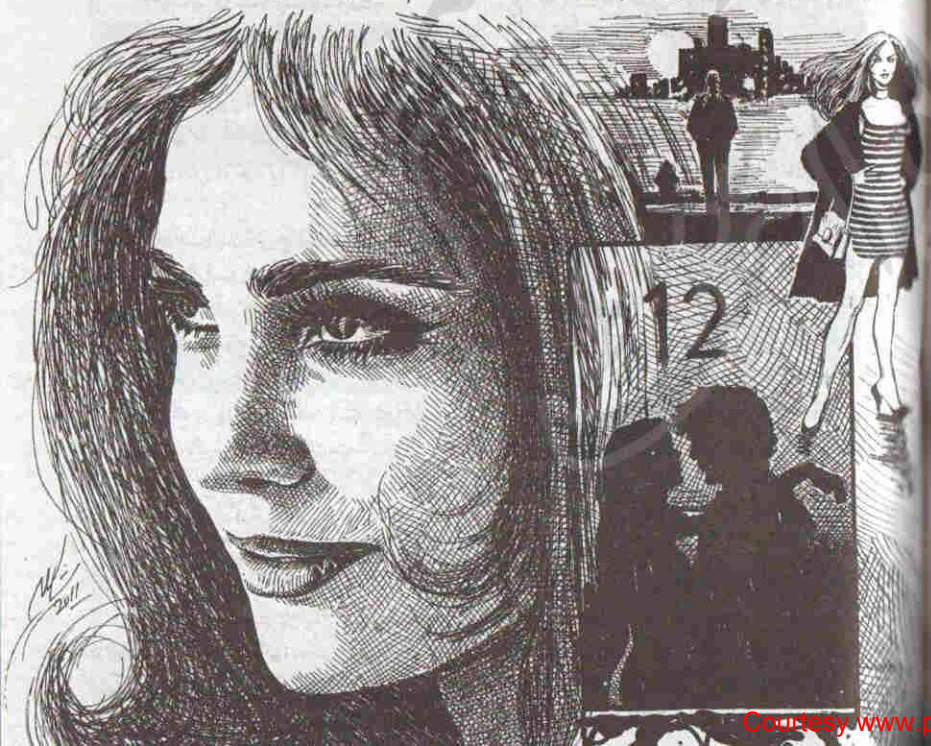
"ہاں دو کیس ہیں۔ لیکن جلدی کیا ہے، میں تمہیں آرام سے بتاؤں گا۔"

"میں یہاں کام کرنے آئی ہوں۔" مارشا نے آہستہ سے کہا لیکن مائیک کو اس کا لہجہ سخت لگا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے شانے اچکائے۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے اپنی میز کی درازوں سے دونوں کیسز کی فائلیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ "دو کیسز ہیں۔ دونوں میں قاتل کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔"

"اندھے قتل ہیں؟" مارشا نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مائیک کا موڈ کسی قدر خراب ہو گیا، اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھو میں ذرا آتا ہوں۔"





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مائیک کو سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی اور وہاں اس کے کئی ساتھی بلاتکلف دھواں اڑا رہے تھے حالانکہ دفتر میں سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ مائیک اپنی حد تک اس کی پابندی کرتا تھا۔ باہر آکر اس نے سگریٹ سلگائی۔ نومبر کے آخر تک موسم انتہائی سرد ہو چلا تھا اور آسمان سرمئی ہو رہا تھا۔ شاید ایک دو دن میں برف باری شروع ہو جاتی۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ اسے پتا نہیں چلا کہ کب مارشا اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اچانک کہا۔

"لگتا ہے، تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی؟"

مائیک نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ "نہیں، کام تمہارا اپنا مسئلہ ہے اس معاملے میں میں تمہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم کب کام کرو اور کب نہیں کرو۔"

"میں نے کیسز دیکھے ہیں۔ ٹرک والے کا قتل تو صاف ڈکیتی لگ رہا ہے اور اس کے قاتل کے پکڑے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"میں نے ناممکن سمجھے جانے والے کیسز میں بھی قاتل گرفتار ہوتے دیکھے ہیں۔"

"وہ صرف بدقسمتی سے پکڑے جاتے ہیں۔"

"اس کے برعکس میں نے انہیں پولیس والوں کی محنت اور ذہانت کی وجہ سے بھی گرفتار ہوتے دیکھا ہے۔ اگر تم اسے اپنی تعریف نہ سمجھو تو ایسے کئی کیس میں نے حل کیے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے تم بہت ذہین ہو لیکن بدقسمتی سے میں زیادہ ذہین نہیں ہوں اور میں اس قسم کے کیس کی تفتیش نہیں کر سکتی۔"

"تم طوائف والے کیس پر کام کرنا چاہتی ہو؟" اس بار مائیک نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے جیکٹ پہن لی تھی اور اس کی حشر سامانیاں کسی قدر چھپ گئی تھیں۔ اس کے باوجود اتنے نزدیک سے اسے دیکھنا خاصا سنسنی خیز کام تھا۔ اس کے جسم سے دلفریب خوشبو آرہی تھی۔

"ہاں، مجھے یہ زیادہ دلچسپ لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس میں قاتل کے پکڑے جانے کا امکان ہے۔"

مائیک نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "اتنی جلدی تم نے دونوں کیسز کی فائلیں دیکھ بھی لیں؟"

"نہیں، کیس تو میں پہلے سے ہی اخبارات اور ٹی وی پر دیکھتی آئی تھی، ہاں فائل سے اہم نکات دیکھے ہیں۔"

مائیک نے سگریٹ نیچے پھینک کر اسے جوتے کی نوک سے بجھا دیا۔ "جیسے تمہاری مرضی... لیکن کیس پرمل کر ہی کام کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ہاں میں دوسرے کیس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"تب ہم باضابطہ طور پر کیس تقسیم کر لیتے ہیں۔" مائیک نے تجویز دی۔ "ٹرک ڈرائیور والا کیس میں لے لیتا ہوں اور طوائف کا کیس تم لے لو۔"

مارشا ہچکچائی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم اس کیس میں بھی میری کچھ مدد کرو، میں پہلی بار نیویارک آئی ہوں۔"

دوسرے محکموں کے برعکس پولیس میں تبادلے بہت کم ہوتے ہیں، نوّے فی صد پولیس والے جس علاقے سے اپنے کیریئر کا آغاز کرتے ہیں، وہیں سے ریٹائر ہوتے ہیں۔ مائیک نے پوچھا۔ "تم نے نیویارک تبادلہ کیوں کرایا ہے؟"

"میں وہاں خوش نہیں تھی۔" مارشا نے جواب دیا۔

جواب واضح نہیں تھا لیکن مائیک مزید سوالات کر کے اس کے نجی معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ مارشا نے خود محسوس کر لیا کہ اس کا جواب ادھورا ہے، اس نے وضاحت کی۔ "میرا تعلق نیویارک سے ہی ہے اور میں پندرہ سال کی تھی جب یہاں سے گئی پھر میں نے ملوا کی میں تعلیم حاصل کی اور وہیں فورس جوائن کی لیکن میرا دل نہیں لگا تھا اس لیے نیویارک تبادلے کی درخواست دی اور یہاں آگئی۔"

مائیک نے سر ہلایا۔ "ویلکم بیک، لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اچھا خیال ہے، آج جلدی آنے کی وجہ سے میں نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا تھا۔" مارشا خوش ہو گئی۔

سڑک کے پار ایک چھوٹا سا ریستوران تھا جو عام طور سے پولیس والوں سے بھرا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے مائیک نے اس کے بجائے ذرا دور ایک اور ریستوران کا انتخاب کیا۔ اسے معلوم تھا، اس کے ساتھی اسے مارشا کے ساتھ دیکھ کر سکون سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ وہ ریستوران میں آئے، مائیک نے مارشا کی پسند پوچھ کر آرڈر کیا۔ ویٹریس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، کال گرل کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟"

"کوئی ایسا شخص جسے یہ عورت اچھی طرح جانتی تھی۔" مارشا نے جواب دیا۔ "قتل کا انداز بتاتا ہے۔"

شون نامی یہ عورت سترھویں اسٹریٹ پر واقع ایک بدنام بلڈنگ کی رہائشی تھی۔ اس بلڈنگ میں زیادہ تر طوائفیں رہتی تھیں اور اس وجہ سے وہاں کے ماحول کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شون گاہک لاتی تھی اور لوگوں کے ساتھ باہر بھی جاتی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ تھی لیکن اس نے ابھی تک خود کو سنبھال کر رکھا تھا۔ سنہری بالوں اور متناسب جسم کی وجہ سے اسے بھی گاہکوں کی



کمی نہیں ہوتی تھی۔ وہ پیر اور منگل والے دن آرام کرتی تھی اور اس مقصد کے لیے اپنی ماں کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس کی ماں خود بھی اسی پیشے سے متعلق رہی تھی اور اس نے ہی بیٹی کی تربیت کی تھی۔ وہ بھی اسی عمارت میں کام کرتی تھی۔ اصل میں یہ عمارت کئی نسلوں سے طوائفوں کے لیے مخصوص چلی آرہی تھی اور یہاں کام کرنے والی اکثر لڑکیاں اور عورتیں خاندانی کال گرل تھیں۔

ویک اینڈز پر گاہک زیادہ ملتے ہیں اور معاوضہ بھی اچھا مل جاتا تھا اس لیے شون پیر والے دن ماں کے گھر جاتی تھی۔ وہ صبح جاتی اور منگل کی رات کو واپس آجاتی تھی۔ اس کا یہ معمول اتنا لگا بندھا تھا کہ جب وہ پیر والے دن ماں کے پاس نہیں پہنچی اور اس کا موبائل بھی بند ملا تو اس کی ماں نے پولیس سے رابطہ کیا، وہ اپنی بیٹی کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی۔ معاملہ طوائف کا تھا لیکن براہ راست درخواست آئی تھی اس لیے پولیس کو جا کر دیکھنا پڑا۔ دستک کے جواب میں جب کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو پولیس نے دوسرے طریقے سے دروازہ کھول لیا اور اندر کمرے میں شون کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی کسی نے درندگی کے ساتھ چاقو یا خنجر کے درجن بھر وار کر کے لاش کو مسخ کر دیا تھا۔

لیکن قاتل نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ آس پاس رہائش پذیر خواتین نے بتایا کہ اتوار کی رات شون کے فلیٹ میں تیز آواز میں میوزک بج رہا تھا اور کسی نے اس پر توجہ نہیں دی کیونکہ اکثر وہ تیز آواز میں میوزک سنتی تھی۔ چند دوسرے افراد سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ شون اتوار کی رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان ایک آدمی کے ساتھ اپنے فلیٹ میں آئی تھی۔ اس کا فلیٹ دوسرے فلور پر تھا اور وہ عام طور سے سیڑھیاں استعمال کرتی تھی۔ اس آدمی کا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ اس نے ہڈ والا اوپر پہن رکھا تھا۔ وہ درمیانی جسامت کا شخص تھا۔ شون کی آمد کے فوراً بعد اس کے فلیٹ سے تیز موسیقی کی آواز آنے لگی اور کوئی دو بجے یہ آواز بند ہو گئی تھی۔ کسی نے اس شخص کو جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مزید کوئی شخص شون کے فلیٹ میں نہیں گیا تھا کیونکہ اس کے برابر میں رہنے والی لڑکی ساری رات جاگنے کی عادی تھی اور اس نے کسی قسم کی آہٹ نہیں سنی تھی۔ پھر پولیس سرجن نے بھی تصدیق کی کہ شون کا قتل رات دو بجے سے پہلے ہوا تھا۔

شون کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ پولیس نے عمارت کے سامنے رہنے والے افراد سے کسی ایسی گاڑی کے بارے میں پوچھ گچھ کی جسے انہوں نے رات ایک سے دو بجے کے درمیان عمارت کے سامنے دیکھا ہو۔ مگر کسی آدمی نے ایسی کوئی گاڑی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی رات کو وہاں کوئی اجنبی کار آکر کھڑی ہوئی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اب اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں، ایک تو قاتل اپنی گاڑی میں آیا تھا لیکن کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن مائیک کے خیال میں قاتل اپنی گاڑی کہیں دور کھڑی کر کے شون کے ساتھ پیدل آیا تھا اور اپنا کام کر کے پیدل ہی واپس چلا گیا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قتل کے ارادے سے ہی آیا تھا اور یہ کوئی اتفاقیہ یا اشتعال میں آ کر کیا جانے والا قتل نہیں تھا۔

کھانا آ چکا تھا۔ مائیک نے کھانے کے دوران میں کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ کسی جنونی کا کام ہے۔“

مارشا نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے ایسی مزید وارداتوں کا امکان ہے؟“

”شاید۔“

”لیکن اس قتل کو آج بائیس دن گزر چکے ہیں۔“

”سیریل کلر بعض اوقات مہینوں بعد بھی حرکت میں آتے ہیں۔“ مائیک نے آلو کا قتلہ کانٹے میں پھنساتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ انداز سیریل کلر کا ہی لگ رہا ہے۔“

”اب تک کوئی وجہ سامنے نہیں آئی ہے؟“

”تمہارا مطلب ہے کوئی ایسا تنازعہ جس کی وجہ سے شون کو جان سے گزرنا پڑا ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کا کسی سے ایسا جھگڑا نہیں تھا۔ اس معاملے میں مکمل تحقیق کی گئی ہے۔ عام طوائفوں کے برعکس شون ایک ہنس مکھ اور ہر کسی سے ملنے جلنے والی عورت تھی۔ اس بلڈنگ میں ہر شخص نے اس کی تعریف کی ہے، کسی سے اس کا جھگڑا نہیں تھا۔“

”ضروری نہیں جس کی ہر شخص تعریف کرے، اس کا کوئی دشمن نہ ہو۔“

”درست... اور آج کل تو لوگ ایسی معمولی باتوں پر قاتل بن جاتے ہیں کہ جب پولیس ان کو گرفتار کرتی ہے اور وجہ سامنے آتی ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔“

لنچ کے بعد وہ واپس دفتر آ گئے اور مارشا نے شون کیس کی فائل اپنی تحویل میں لے لی۔ مائیک نے کوئی اعتراض نہیں کیا حالانکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا پارٹنر الگ کیس پر کام کر رہا تھا۔ دس سالوں میں اس نے ایک بار بھی کسی کیس پر الگ کام نہیں کیا تھا۔ اس دن مارشا اس فائل میں گم رہی اور پھر اس نے دوسرے شعبوں سے کیس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ شام کو جب وہ دفتر سے نکل رہے تھے تو مارشا نے اس سے کہا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ شون کا فلیٹ ایک نظر دیکھ لوں۔“

”چلو، ویسے وہ ابھی سیل ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ شون خوش ہو گئی۔ ”لیکن میرے پاس گاڑی نہیں ہے، کیا تم مجھے گھر تک لفٹ دے سکتے ہو؟“

”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”سینٹرل پارک کے ساتھ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ مائیک نے سر ہلایا۔ وہ خود اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اگرچہ سینٹرل پارک کا علاقہ بہت بڑا ہے لیکن اسے امید تھی کہ اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔

شون کا فلیٹ جس عمارت میں تھا، وہ مین روڈ پر نہیں بلکہ ایک بغلی سڑک پر تھی اور اس کے سامنے کئی عورتیں منڈلا رہی تھیں اور ان کا حلیہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ کال گرلز ہیں۔ پولیس کے نشان والی کار دیکھتے ہی وہ غائب ہو گئیں۔ اگرچہ پولیس ان کے کام میں مداخلت نہیں کرتی ہے لیکن وہ کسی اور چکر میں پڑ کر اپنا وقت برباد کرنا پسند نہیں کرتیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ راستے میں ایک ہٹا کٹا اور ادھیڑ عمر شخص ایک نوعمر لڑکی کے کان میں سرگوشیاں کر رہا تھا اور وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر آدمی کا رنگ اڑ گیا اور جب مائیک نے اسے گھورا تو وہ فوراً وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ اوپر آ کر مارشا نے اس سے کہا۔

”تم بیکار میں اس کی فکر کر رہے تھے۔“

وہ شون کے فلیٹ کے دروازے پر رکے تھے۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ نوعمر لڑکی نہیں بلکہ پختہ کار طوائف ہے۔“

مائیک نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو مشکل سے چودہ برس کی ہے۔“

”بالکل، وہ اتنے ہی سال کی ہو گی لیکن وہ پکی کال گرل ہے، اسے معصوم مت سمجھو۔ مجھے یقین ہے وہ اس آدمی سے سودے بازی کر رہی تھی اور وہ اس سے معاوضہ کم کرنے کو کہہ رہا ہو گا۔“

مائیک کو یقین نہیں آیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیویارک میں کال گرلز کی بڑی تعداد اٹھارہ سال سے کم عمر کی تھی لیکن یہ لڑکی تو واضح طور پر کمسن تھی۔ قانون کے تحت اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکی سے جسمانی تعلق سنگین جرم شمار ہوتا تھا۔ اس نے تالا کھولا۔ دروازے پر پہلی پٹی موجود تھی۔ چابی اسی کے پاس تھی، اس نے اندر جانے سے پہلے چابی نکال کر مارشا کو دے دی۔ ”اب یہ کیس تمہارے پاس ہے اس لیے اس کی تمام اشیا بھی تمہارے پاس ہونی چاہئیں۔“

مارشا نے چابی لے لی۔ وہ اندر آئے، یہ چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ سامنے ایک لاؤنج اور اس کے بعد ایک بیڈ روم تھا۔ بیڈ روم



کے ساتھ ہی اٹیچ باتھ تھا۔ سوائے لاش اور بعض ضروری اشیا ہلانے کے تمام منظر ویسا ہی تھا جیسا قتل کے بعد دیکھا گیا تھا۔ فرش پر اس جگہ لاش کا خاکہ بھی بنا ہوا تھا جہاں لاش پائی گئی تھی۔ مارشا نے تصویریں بھی دیکھی تھیں اس لیے اسے جرم کا منظر سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ درحقیقت وہاں موجود کچھ بھی اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ مائیک کے خیال میں یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن مارشا نے اس سے مدد کی درخواست کی تھی اس لیے وہ اس کے ساتھ چلا آیا۔ مارشا نے معائنے کا کام مکمل کر لیا تو وہ باہر آئے اور مارشا نے دروازہ لاک کر دیا۔

”میرا خیال ہے میں کل اس جگہ کا ایک چکر اور لگاؤں۔ کیونکہ یہاں پائی جانے والی مخلوق صرف صبح کے وقت ہی مجھے مل سکے گی۔“

”آس پاس رہنے والی تمام کال گرلز کے تفصیلی بیانات فائل میں موجود ہیں۔“

مارشا مسکرائی۔ ”میں جانتی ہوں لیکن ممکن ہے کوئی نئی بات سامنے آ جائے۔ ویسے بھی اگر عورت سے عورت پوچھے تو فرق پڑتا ہے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ مائیک نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے تم میری بات سے متفق نہیں ہو؟“

”ایسی بات نہیں ہے، میں اس معاملے میں وہ سب کر چکا ہوں جو میرے ذہن میں آیا اس لیے مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا ہے لیکن تم ایک نئے نقطۂ نظر سے کام کرو گی تو ممکن ہے تمہیں کوئی نئی بات معلوم ہو جائے جو اس کیس کو حل کر دے۔“

”کیا تم واقعی ایسا سوچ رہے ہو؟“ مارشا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”میں اس بارے میں کوئی سوچ نہیں رکھتا۔“ مائیک نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ عمارت سے باہر آئے تو انہیں فٹ پاتھ پر وہی شخص نظر آیا جو اوپر کمسن لڑکی سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے وہاں سے کھسکنے کی کوشش کی لیکن مارشا نے اسے روک لیا۔

”اے مسٹر! ادھر آؤ۔“

”یس آفیسر۔“ اس نے رک کر شرافت سے کہا۔

مارشا نے پہلے اس سے شناختی کاغذات طلب کیے۔ اس کا نام رابرٹ شیڈ تھا۔ کچھ ضمنی سوال کیے، اس کے بعد وہ اصل بات پر آئی۔ ”تم اوپر اس لڑکی سے کیا کہہ رہے تھے؟“

رابرٹ پریشان ہو گیا۔ ”کچھ نہیں آفیسر۔“

مارشا کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”جھوٹ بولنے کے بجائے اصل بات بتاؤ۔ اس نے تمہاری شکایت کی ہے۔ تم جانتے ہو وہ کمسن ہے۔“

رابرٹ اچھل پڑا۔ ”اس حرافہ نے شکایت کی اور وہ کہاں سے کمسن ہو گئی؟ اس عمارت میں آنے والا شاید ہی کوئی شخص ہو جس کے ساتھ اس نے رات نہ گزاری ہو۔“

مارشا نے معنی خیز نظروں سے مائیک کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”تب تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟“

رابرٹ نے ہچکچا کر کہا۔ ”وہ زیادہ مانگ رہی تھی لیکن آفیسر! میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس پر تم مجھے گرفتار کر سکو۔“

”درست ہے اسی لیے میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔“ مارشا نے کہا اور اس کے کاغذات واپس کر دیے اور وہ تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

”تمہارا خیال درست تھا۔“ مائیک نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے تم کال گرلز کو بڑی اچھی طرح جانتی ہو۔“

مارشا ایک لمحے کو چونکی لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔... ”اب تم مجھے گھر چھوڑ دو۔“

جب مائیک نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو اس کا خیال تھا کہ وہ اخلاقاً اسے بھی اندر چلنے اور ایک کافی یا ڈرنک کا کہے گی لیکن وہ نیچے اتری اور اس کا شکریہ ادا کر کے ہاتھ ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کا مکان چھوٹا لیکن خوب صورت تھا۔ اس کے سامنے لان بھی تھا۔ اس کے اندر جانے کے بعد مائیک نے گہری سانس لے کر کار آگے بڑھا دی۔ مارشا خوب صورت عورت تھی لیکن وہ مائیک کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس کا رویہ بعض اوقات اچانک ہی بدل جاتا تھا۔ کبھی ایسا لگتا کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہی ہے اور کبھی بالکل اجنبی بن جاتی۔

مائیک کا گھر یہاں سے دو اسٹریٹ کے بعد تھا۔ یہ مکان اس نے دس سال قسطیں بھرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ دس سال میں اسے اچھی خاصی قیمت ادا کرنا پڑی تھی لیکن اب اس کی مالیت کم سے کم دوگنا زیادہ ہو گئی تھی۔ مائیک اکیلا ہی رہتا تھا۔ چند سال پہلے اس نے شادی کی تھی لیکن بیوی اس کی مصروفیات سے نالاں رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مائیک صبح جائے اور شام کو گھر آ جائے۔ جبکہ اس کی ذمے داری ایسی تھی کہ بعض اوقات آدھی رات کو بھی اٹھ کر جانا پڑتا تھا اور شاید ہی ایسا کوئی خوش نصیب دن ہوتا تھا جب وہ شام کو گھر آ جاتا ورنہ عام طور سے اسے دیر ہی ہوتی تھی۔

شادی کے تین سال بعد سیرل کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے مائیک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مائیک جانتا تھا اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے خود پر بہت جبر کیا تھا اور اس طلاق میں اس کا قصور نہیں تھا۔ قصور تو مائیک کا بھی نہیں تھا۔ اس کی نوکری کا بھی نہیں تھا، وہ صرف اپنی تقدیر کو قصوروار ٹھہرا سکتا تھا۔

آج وہ جلدی آ گیا تھا اس لیے معمولات اور کھانے سے نمٹ کر وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ آج رگبی لیگ کا سیمی فائنل تھا اور اتفاق سے کئی سال بعد نیویارک کی ٹیم سیمی فائنل میں پہنچی تھی۔ اس بار بعض وجوہات کی بنا پر ٹورنامنٹ تاخیر کا شکار ہوا تھا۔ مائیک نے میچ کا لطف اٹھایا اور جب نیویارک نے میچ جیت لیا تو اس کا لطف دوبالا ہو گیا۔ وہ سونے کے لیے اٹھ گیا۔ باہر سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ منچلے لڑکے اپنی ٹیم کی جیت کا جشن منا رہے تھے۔ اسے معلوم تھا آج رات خوب ہنگامے ہوں گے اور پولیس کو جگہ جگہ بھاگنا پڑے گا۔ اطمینان کی بات تھی کہ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ اس کا تعلق ہومی سائڈ سے تھا۔

رات دو بجے اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی کہ وہ سکون سے سو سکتا ہے۔ فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف کارلائل تھا۔ ”مائیک... شون مرڈر والی عمارت میں ایک اور طوائف کا قتل ہو گیا ہے۔“

”لعنت ہو۔“ اس نے زیر لب کہا۔

کارلائل اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہہ رہا تھا۔ ”فوری طور پر وہاں پہنچو اور معاملہ دیکھو۔“

”کیا کوئی اور آفیسر نہیں ہے اس وقت؟“ اس نے فریاد کی۔

”بدقسمتی سے نہیں ہے اور پھر اس کا تعلق تمہارے ایک کیس سے ہے، ممکن ہے اس میں بھی وہی قاتل ملوث ہو۔“

”کیا میں مارشا کو بھی اطلاع کر دوں؟“

”بالکل، یہ کیس اصل میں تو اسی کا ہے۔ مجھے رپورٹ کرو، میں جاگ رہا ہوں۔“ کارلائل نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مائیک نے اٹھ کر سب سے پہلے مارشا کو اطلاع دی اور پھر کافی کا پانی رکھا۔ جب تک اس نے کپڑے بدلے کافی تیار ہو چکی تھی۔ اسے ایک کاغذی مگ میں ڈال کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر غضب کی سردی تھی۔ اس نے دل میں اس طوائف کو کوسا جس کو اسی وقت قتل ہونا تھا۔ راستے میں گرم کافی نے اسے سہارا دیا اور وہ عمارت تک پہنچتے ہوئے چاق و چوبند ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ مارشا اس سے پہلے وہاں موجود تھی۔ وہ اس وقت موقع پر آنے والے پولیس افسر سے بات کر رہی تھی۔ مائیک بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ مائیک نے اپنا کارڈ دکھایا اور بولا۔ ”کیا صورتِ حال ہے؟“

افسر کے بجائے مارشا نے جواب دیا۔ ”کسی نے اسی لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔“

مائیک چونکا۔ ”کس لڑکی کو؟... جس سے ہم رات ملے تھے؟“

مارشا نے سر ہلایا۔ ”بالکل اسے ہی اور اس کی لاش اوپر اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔“

پیٹرول افسر کے مطابق اسے رات دو بجے یہاں آنے کا حکم ملا۔ اسے عمارت کا اپارٹمنٹ نمبر بارہ چیک کرنے کو کہا گیا۔ ایک پڑوسی عورت نے اطلاع دی تھی کہ اندر سے چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن جب افسر اپنے ساتھی کے ساتھ فلیٹ پر پہنچا تو اندر خاموشی تھی۔ دروازہ لاک تھا اور جب وہ اسے کھول کر اندر داخل ہوئے تو وہاں اس اپارٹمنٹ میں رہنے والی لڑکی کیتھرین کی لاش پڑی تھی۔ افسر نے مائیک کو بتایا۔

”کمرے میں ہر چیز پھیلی ہوئی تھی اور لڑکی کو قاتل نے چاقو سے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔“

کارلائل کا اندازہ درست تھا، یہ ان کا کیس ہی تھا۔ وہ اور مارشا اوپر آئے۔ مارشا آگے تھی، اس نے اپارٹمنٹ کے سامنے رک کر مائیک سے کہا۔ ”کیا خیال ہے، یہ اسی قاتل کی کارروائی ہے؟“

”شاید۔“ مائیک نے جواب دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے جہاں فوٹو گرافر اپنا کام کر رہا تھا اور ایک طرف کھڑا پولیس سرجن اپنے دستانے اتار رہا تھا۔ اس نے مائیک کو دیکھا اور زیادہ دلچسپی سے مارشا کو دیکھا۔ اس سردی میں بھی اس نے خاصا کم لباس پہن رکھا تھا۔

”وہی انداز ہے اور شاید قاتل نے آلۂ قتل بھی وہی استعمال کیا ہے۔“

لڑکی کی لاش بیڈ روم کے وسط میں پڑی تھی۔ قاتل نے اس کے ساتھ بے رحمی کی انتہا کر دی تھی۔ لاش کا معائنہ کرنے سے پہلے مائیک نے سرجن سے پوچھا۔ ”کیا اس کے ساتھ زیادتی بھی کی گئی ہے؟“

”اس کا تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی پتا چلے گا۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ قاتل نے لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔“

”قتل کس وقت ہوا؟“

”اندازاً دو سے ڈھائی کے درمیان ...اصل وقت پوسٹ مارٹم کے بعد ہی سامنے آئے گا۔“

مارشا ربر کے دستانے پہنتے ہوئے لاش پر جھک گئی۔ قاتل نے لڑکی کے عریاں بدن پر کوئی دو درجن وار کیے تھے۔ مارشا نے مائیک کی طرف دیکھا۔ ”بالکل وہی انداز ہے۔“

”میرا اندازہ درست تھا کہ یہ کوئی سیریل کلر ہے۔“



”مجھے بھی اب یہی لگ رہا ہے۔“ مارشا نے اعتراف کیا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ قاتل لڑکی کے ساتھ اندر آیا تھا کیونکہ زبردستی گھسنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس وقت سوا چار بج رہے تھے اور لڑکی کی ایک پڑوسن نے ڈھائی بجے نائن ون ون پر اطلاع دی کہ اس کے برابر والے اپارٹمنٹ میں کوئی گڑبڑ ہے۔ پولیس دو بج کر پچاس منٹ پر یہاں آئی اور دروازہ کھلنے پر لڑکی کی لاش پائی گئی تھی۔ قاتل جاتے ہوئے دروازہ بند کر گیا تھا اور اسے خودکار طریقے سے تالا لگ گیا تھا۔ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مطابق کسی نے اسے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

اس عمارت میں کل پچاس کے قریب فلیٹس تھے اور تمام فلیٹس صرف کال گرلز کے لیے مخصوص تھے۔ عمارت کا مالک اور منیجر باب ووگ ان کا ہمدرد تھا اور اصل میں اسی نے کال گرلز کو یہاں رکھا ہوا تھا۔ مائیک اس سے مل چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس ملک میں کسی کام کرنے والے کو اپنی محنت میں دوسرے کو حصہ نہیں دینا پڑتا ہے تو طوائفیں کیوں کسی کو حصہ دیں۔ دوسری جگہ کاروبار کرنے کی صورت میں کال گرلز کو اپنی آمدنی میں سے اچھا خاصا ان مافیا کو دینا پڑتا جو اس علاقے پر قابض ہوتی تھیں اور اس کے بغیر کال گرلز اپنا کام نہیں کر سکتی تھیں۔ انہیں اتنی محنت کے باوجود بس اتنا ملتا کہ وہ اپنا گزارہ کر سکتی تھیں۔ جب وہ اس کام کے قابل نہیں رہتی تھیں تو انہیں کوئی بھیک بھی نہیں دیتا تھا۔

باب کو اس طبقے سے ہمدردی تھی اور اس نے کوئی پچاس برس پہلے یہ عمارت کال گرلز کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ وہ ان سے یہاں رہنے کا کرایہ لیتا تھا اور اس کے بدلے ان کو تمام سہولتیں دیتا تھا۔ عمارت کی مرمت، دیکھ بھال و صفائی ستھرائی کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کیتھی اس فلیٹ میں اپنی ایک ساتھی لڑکی کے ساتھ رہتی تھی، اس کا بھی یہی پیشہ تھا اور اس رات وہ کسی کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھی۔

لاش کا معائنہ کرنے کے بعد اسے اٹھانے کی اجازت دے کر وہ باہر آئے۔ باب اپنے دفتر میں تھا اور خاصا پریشان تھا، اس نے مائیک کو دیکھتے ہی کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے یہ مافیا والوں کی کارروائی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کا حصہ دیے بغیر یہ عورتیں یہاں سکون سے اپنا کام کر سکیں۔“

”تم یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو؟“ مارشا نے پوچھا۔

”میرا اندازہ ہے۔“ باب نے کہا، وہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔

”مافیا والے اس طرح دہشت نہیں پھیلاتے ہیں۔“

مائیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کسی شخص کا انفرادی کام ہے۔“

”تم نے یہاں نگرانی کا کوئی انتظام نہیں رکھا؟“ مارشا نے پوچھا۔

باب نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہاں نگرانی کرنے کا مطلب ان عورتوں کے گاہکوں کو بھگانا ہوگا۔ ایسی جگہ کون آنا پسند کرے گا جہاں کیمرے لگے ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے یہاں کوئی بھی آ سکتا اور جا سکتا ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا؟“ مارشا نے کہا۔

باب نے شانے اچکائے۔ ”دیکھو، کسی بھی قسم کی نگرانی کا مطلب ہے یہاں آنے جانے والوں کا ریکارڈ رہے گا اور یہاں رہنے والی عورتوں میں کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”اس کے باوجود جبکہ ان میں سے ایک بیدردی سے قتل ہو چکی ہے؟“ مائیک بولا۔

”ہاں، میں نے شون کے قتل کے بعد ان سب سے بات کی تھی کہ ہمیں کم سے کم داخلی دروازے پر ایک کیمرا لگا دینا چاہیے تاکہ پتا چلتا رہے کہ کون آیا ہے اور گیا ہے لیکن یہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ ان کو خدشہ ہے کہ کیمرا دیکھ کر ان کے گاہک یہاں کا رخ کرنا چھوڑ دیں گے۔“

”اس کا نتیجہ آج دوسرے قتل کی صورت میں نکل آیا ہے۔“ مائیک نے تلخی سے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم اپنے دفتر میں کب تک ہوتے ہو؟“

”صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک۔ پھر میں اپنے فلیٹ میں چلا جاتا ہوں۔ وہ میرے دفتر کے پیچھے ہے بلکہ یوں سمجھ لو کہ میرے فلیٹ کا ایک کمرا میرا دفتر ہے اور اگر کسی کو کوئی مسئلہ ہو تو میرے فلیٹ پر آ جاتا ہے۔“

باب کا دفتر داخلی دروازے کے سامنے تھا اور وہ اس کے شیشے سے آنے جانے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن آٹھ بجے وہ دفتر بند کر کے چلا جاتا تھا اور اس کے بعد وہاں کوئی آئے یا جائے، اسے پتا نہیں چلتا تھا بلکہ دن میں بھی وہ سارا وقت دفتر میں نہیں رہتا تھا۔ مختلف مسائل کی وجہ سے اس کا بیشتر وقت دفتر سے باہر ہی گزرتا تھا۔ یعنی اس عمارت میں آنے جانے والوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ قاتل نے اسی چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری واردات کر دی تھی۔ اس بار تو کسی نے لڑکی کے ساتھ قاتل کو آتے دیکھا بھی نہیں تھا۔

مائیک سوچ رہا تھا کہ ان کی کم بختی آنے والی ہے کیونکہ سیریل کلر کا معاملہ میڈیا کی توجہ کہیں زیادہ حاصل کر لیتا ہے اور پھر تفتیشی افسران کی شامت آ جاتی ہے۔ باب سے بات کر کے وہ اس کے دفتر سے نکلے تو مارشا نے کیتھی کی پڑوسن بونی سے ملنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا ارادہ ظاہر کیا جس نے پولیس کو رپورٹ کی تھی۔ کیتھی کی لاش دیکھ کر اس کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے اعصاب کو سکون دینے والا انجکشن لگایا تھا۔ اس کے اثر سے وہ غنودگی میں چلی گئی تھی لیکن ڈاکٹر کا کہنا تھا، وہ جلد ہوش میں آجائے گی۔

وہ بونی کے فلیٹ تک آئے، اس کا دروازہ کیتھی والے فلیٹ کے بالکل برابر میں تھا۔ دستک کے جواب میں اس نے ذرا سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی دوا کا اثر ہے مگر اس کے حواس، بیدار تھے، اس نے انہیں اندر بلا لیا۔ فلیٹ اندر سے انتہائی گندا تھا اور ہر طرف گندے کپڑے اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مائیک نے اپنا اور مارشا کا تعارف کرایا۔

"پولیس کو تم نے اطلاع کی تھی؟" مارشا نے سوالات کا آغاز کیا۔

اس نے سر ہلایا۔ "مجھے لگا کہ کیتھی کے فلیٹ میں کوئی گڑبڑ ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"پہلے وہاں سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں پھر کیتھی چلّانے لگی۔ اس وقت بھی میں نے کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ وہ اکثر اپنے گاہکوں کو لطف اندوز کرنے کے لیے چیختی چلّاتی تھی، اسے خود بھی مزہ..."

"اپنا بیان واقعات تک محدود رکھو۔" مائیک نے اسے ٹوک دیا۔

"اوکے... میں نے اس کے چلّانے پر توجہ نہیں دی لیکن اچانک اس کی آواز بند ہوگئی اور پھر خاصی دیر تک اس کی آواز نہیں آئی۔ جبکہ کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی لکڑی پر ضرب لگا رہا ہو یا چیزیں الٹ پلٹ رہا ہو۔ یہ بات مجھے عجیب سی لگی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اور کیتھی بہت زیادہ بولنے والی لڑکی تھی، اس کے خاموش ہونے سے مجھے شک ہوا اور میں نے پولیس کو کال کردی۔"

"تم نے باہر نہیں دیکھا؟"

"سچی بات ہے، میں ڈر گئی تھی۔ مجھے شون کا قتل یاد آگیا تھا۔ اگر میں باہر جاتی تو مجھے ڈر تھا کہ قاتل مجھے بھی مار دے گا۔"

"تم نے کسی اور شخص کی آواز سنی؟"

بونی ہچکچائی۔ "میں نے دیوار سے کان لگا کر سنا تھا۔ جس وقت کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں تو مجھے ایک آواز بھی سنائی دی تھی لیکن وہ عجیب سی تھی۔"

"عجیب سے کیا مراد ہے؟"

"میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتی کہ اس آواز میں کیا بات تھی لیکن وہ قاتل کی آواز ہی تھی اور وہ مسلسل کچھ بول رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"میں نے کہا نا آواز انتہائی عجیب تھی جیسے کوئی شخص مکمل طور پر ناک کے بل بولے اور الفاظ بھی واضح نہیں تھے۔ اس کا کہا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔"

"آوازیں کتنی دیر آتی رہیں؟" مارشا نے سوال کیا۔

"میرا مطلب ہے کیتھی کے چپ ہونے کے بعد؟"

بونی نے غور کیا۔ "تقریباً دس منٹ تک۔"

"تم نے دروازے سے باہر نہیں دیکھا لیکن کیا تم نے کیٹ آئی سے بھی نہیں جھانکا؟" مائیک نے اچانک پوچھا۔

"ہاں۔" بونی نے روانی میں کہا۔ "نہیں..." وہ بوکھلا گئی تھی۔

"تم نے قاتل کو دیکھا تھا؟" مائیک کا لہجہ درشت ہوگیا۔

"تم یہ بات ہم سے چھپا رہی ہو۔"

بونی کانپ گئی۔ "نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بس ایک جھلک نظر آئی تھی۔"

"تم نے کیا دیکھا؟" اس بار مائیک کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"اس نے اوپر پہن رکھا تھا اور اس کا ہڈ اس کے سر پر تھا۔ نیچے اس نے سیاہ پتلون پہن رکھی تھی، میں نے اسے بس دو تین سیکنڈ کے لیے دیکھا تھا جب وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا۔"

"جسامت کیسی تھی؟"

"درمیانہ قد اور درمیانہ ہی جسم تھا لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کیونکہ اس نے بہت ڈھیلا سا اوپر پہن رکھا تھا۔"

"چلنے کا انداز کیسا تھا؟"

بونی سوچ میں پڑ گئی۔ "میں نے غور نہیں کیا لیکن وہ کچھ عجیب سے انداز میں چل رہا تھا... رک رک کر۔"

"رک رک کر؟" مائیک نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں، جیسے کوئی سنبھل کر نہیں چلتا ہے۔"

مارشا اور مائیک کچھ دیر مزید وہاں رکے رہے۔ انہوں نے سوالات کیے لیکن بونی کے پاس ان کی تسلی بخش جواب نہیں تھے۔ اس سے بس ان کو اتنی مدد ملی تھی کہ اس نے تصدیق کردی تھی کہ کیتھی کا قاتل بھی وہی تھا جو شون کا قاتل تھا۔ عمارت میں موجود کچھ دوسرے افراد سے پوچھ گچھ کرتے کرتے صبح ہوگئی تھی۔ وہ باہر نکلے تو روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ کیتھی کی لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ مارشا نے مائیک سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، اپر پوش نے کیتھی کو زیادتی کا نشانہ بنایا ہوگا؟"



"اس کے بارے میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی بتا سکے گی۔ لیکن اگر یہ وہی اپر پوش قاتل ہے تو اس کا امکان کم ہے۔ اس نے شون کو بھی زیادتی کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔"

"تب قاتل کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟"

"سیریل کلر ہمیشہ نفسیاتی ہوتے ہیں اور وہ بنا کسی مقصد کے صرف اپنے احساسات کے تحت قتل کرتے ہیں۔"

"لیکن طوائفوں سے اسے کیا پرخاش ہوسکتی ہے؟"

"ریکارڈ بتاتا ہے کہ دنیا میں سیریل کلر سب سے زیادہ طوائفوں کو ہی قتل کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ گرفتار بھی سب سے کم ہوتے ہیں کیونکہ طوائفوں کا طرز زندگی خود رازدارانہ ہوتا ہے۔ وہ عام طور سے اکیلی ہوتی ہیں اور کوئی ان کی فکر یا دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہوتا۔"

"لیکن وجہ...؟"

مائیک نے شانے اچکائے۔ "اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے لیکن سیریل کلر عام طور سے عورت کے اس روپ سے نفرت کرتے ہیں اس لیے وہ طوائفوں کو قتل کرنا شروع کردیتے ہیں۔"

وہ باہر آئے تو مائیک کو خیال آیا۔ "تم کیسے آئیں... تمہارے پاس تو گاڑی نہیں ہے؟"

"ایک پڑوسی سے اس کی کار ادھار لی تھی۔" مارشا نے بتایا۔ اس نے وردی کے بجائے منی اسکرٹ اور چست سویٹر پہن رکھا تھا۔ نیچے چست اونی موزے تھے جو اس کی خوب صورت ٹانگوں سے چسپاں تھے۔ مارشا کو اپنی خوب صورتی کا احساس تھا اور وہ اس کی نمائش بھی پسند کرتی تھی۔ ورنہ اس سردی میں ایسا لباس نہ پہنتی۔ مائیک نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں گھر جا کر کچھ دیر آرام کروں اور اس کے بعد دفتر جاؤں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" مارشا نے کہا۔ "ابھی ہمارے پاس دو ڈھائی گھنٹے ہیں۔"

مائیک نے اس وقت غور نہیں کیا کہ اس نے لفظ ہمیں کہا ہے۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو مارشا کی کار اس کے پیچھے آرہی تھی۔ غیر متوقع طور پر وہ اس کے گھر پر ہی رکی۔ مائیک کار سے اتر کر اس کے پاس آیا۔ "کیا بات ہے، تم نے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے؟"

"نہیں ارادہ تو ہے۔" وہ نیچے اتر آئی۔ "لیکن اپنے گھر نہیں، تمہارے گھر آنے کا ارادہ ہے۔"

اس کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی جسے مائیک محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ "آجاؤ لیکن تم آرام نہیں کرسکو گی۔ میرے گھر میں ایک ہی بیڈروم ہے۔"

اندر آتے ہی مارشا نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور سرگوشی میں بولی۔ "مجھے تمہارے گھر میں آرام کرنے کے لیے الگ بیڈروم کی ضرورت نہیں ہے۔"

مارشا کے نرم گرم وجود کا لمس ایسا تھا کہ مائیک کو سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو فون کی گھنٹی زور و شور سے بج رہی تھی اور مارشا اس کے بازو پر سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ مائیک نے جلدی سے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف کارلائل تھا، اس نے غرا کر کہا۔ "کہاں غائب ہو تم دونوں؟ مجھے ابھی تک رپورٹ نہیں ملی۔"

"سوری کیپٹن۔" مائیک نے جواب دیا۔ "میں گھر آگیا تھا، ابھی کچھ دیر میں پہنچتا ہوں۔"

فون کی گھنٹی اور مائیک کے حرکت کرنے سے مارشا کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنی فسوں خیز اور پرخمار نظروں سے اسے دیکھا۔ "کون تھا؟"

"کارلائل۔" مائیک بستر سے اترتے ہوئے بولا۔ "آج جھاڑ پڑے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" مارشا پھر لیٹ گئی۔

"اٹھو، وقت نہیں ہے۔ ہمیں دس منٹ کے اندر دفتر پہنچنا ہے۔" مائیک نے اس کا بازو ہلایا تو وہ بادل ناخواستہ بیدار ہوگئی اور اس نے اپنے آس پاس بکھرے کپڑے سمیٹے اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ جب تک مائیک تیار ہوا، وہ بھی کپڑے پہن کر اور منہ دھو کر آگئی۔ بال باندھ کر اور ہلکا سا میک اپ کر کے وہ بالکل تر و تازہ لگ رہی تھی۔ وہ باہر آئے۔ پڑوسی کی کار مارشا نے وہیں چھوڑ دی اور مائیک کے ساتھ دفتر روانہ ہوگئی۔ مائیک فکر مند تھا کہ دفتر میں کسی نے مارشا کو اس کے ساتھ آتے دیکھ لیا تو منٹوں میں یہ بات پورے ڈیپارٹمنٹ میں پھیل جائے گی۔ مارشا اس کے خدشے پر مسکرائی۔

"پھیلنے دو۔"

"محکمے میں میری ایک ساکھ ہے۔ میں آج تک کسی ساتھی عورت سے بے تکلف نہیں ہوا ہوں۔"

"ہمارے درمیان بے تکلفی نہیں بلکہ دوسرا تعلق ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ صبح جو ہوا تھا، وہ اس سے خوش تھی جبکہ مائیک کسی قدر بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے مارشا اسے اچھی لگی تھی لیکن اس مرحلے تک اتنی جلدی پہنچ جانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سیریل سے علیحدگی کے بعد اس کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آئی تھی۔ کئی سال بعد مارشا پہلی عورت تھی جو اس کے بیڈروم تک آئی تھی۔

دفتر میں کسی نے ان کو ساتھ آتے نہیں دیکھا تھا۔ کارلائل



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غصے میں تھا لیکن جب مائیک نے اسے رپورٹ دی تو اس کا غصہ کسی قدر سرد ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”اس کیس پر کام تیز کرو۔ تمہیں پتا ہے میڈیا اور اخبارات میں کیسی خبریں آ رہی ہیں؟“

”میڈیا اور اخبارات کا کام ہی خبریں دینا ہے۔“

”لیکن اوپر والوں کو اس کی بہت فکر رہتی ہے۔ مجھے سٹی آفس سے فون آ چکا ہے کہ میرا محکمہ اس کیس پر کیا کر رہا ہے۔ مائیک! مجھے نتیجہ چاہیے جلد از جلد۔“

”میں کوشش کروں گا۔“ مائیک نے بے دلی سے کہا۔ ”ورنہ تم بھی جانتے ہو، ان قاتلوں کو گرفتار کرنا آسان نہیں ہوتا جو نشانہ بنا کر اجنبیوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کا کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ بس وہ اپنی کسی نفسیاتی خرابی کی بنا پر یہ کام کر گزرتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن اس قاتل کو جلد از جلد پکڑو ورنہ میڈیا جینا حرام کر دے گا۔“ کارلائل فکرمندی سے بولا۔ وہ جس پوسٹ پر تھا، اس کی فکرمندی جائز تھی کیونکہ اسے بہت سارے لوگوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔ مائیک واپس آیا تو مارشا کیتھی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ رہی تھی۔ اس نے رپورٹ مائیک کے سامنے رکھ دی۔

”قاتل نے اس پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا اور دوسرے یہ کہ وہ بہت زیادہ خون بہہ جانے سے مری ہے۔“

مائیک نے رپورٹ دیکھی۔ اس کے مطابق اذیت پسند قاتل نے اسے فوری موت کے گھاٹ اتارنے کے بجائے چاقو سے وار کر کے آرام سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کیتھی یقیناً بہت تکلیف سے مری تھی۔ اس سے قاتل کی نفرت اور تشدد پسند ذہنیت کا پتا چل رہا تھا۔ دوسرے اس نے جتنے اطمینان سے یہ کام کیا تھا، ایک بھری پُری بلڈنگ میں اس طرح سے دو قتل کرنا کسی عام اعصاب کے مالک شخص کی بات نہیں تھی۔ قاتل نہ صرف مضبوط اعصاب کا مالک تھا بلکہ اسے قتل کرنے کی تربیت بھی حاصل تھی۔ وہ یقیناً جسمانی طور پر فٹ اور مضبوط تھا۔ سب سے پہلے مائیک نے مارشا کو بتایا۔

”کارلائل نے تمہارے ساتھ مجھے بھی اس کیس کی تفتیش سونپ دی ہے۔“

مارشا نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن نہ جانے کیوں مائیک نے محسوس کیا وہ اس پر خوش نہیں تھی۔ اسے اطلاع دے کر مائیک نے پیٹرولنگ پولیس کے انچارج سے رابطہ کیا۔ ”ڈیک! میں ہومی سائڈ سے لیفٹیننٹ مائیکل بات کر رہا ہوں۔“

”میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

مائیک نے اسے کیتھی کے قتل کے بارے میں بتایا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اس عمارت کے اطراف میں پولیس کا گشت بڑھا دیا جائے اور کم سے کم دو پولیس والے ہمہ وقت عمارت کے آس پاس رہیں۔“

”ان دنوں کام کرنے والوں کی کمی ہے لیکن میں لگا دیتا ہوں۔“

”وہاں جو بھی ہوں، ان سے کہنا کسی بھی ہنگامی حالت میں مجھ سے رابطہ کریں۔“ مائیک نے اسے مزید ہدایت دی اور فون بند کر دیا۔ مارشا خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے سوال کیا۔

”کیا اس طرح سے قاتل پکڑا جائے گا؟“

”نہیں لیکن وہ محتاط ہو جائے گا اور اسے اگلا شکار آسانی سے نہیں ملے گا۔“

”میرے خیال میں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ مارشا بولی۔ ”قاتل کو جلدی نہیں ہوگی، وہ آرام سے بھی اپنا کام کر سکتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔“ مائیک نے جواب دیا اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ اٹھائی۔ کیتھی کی عمر سولہ سال تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کم لگتی تھی۔ مائیک نے باب کے ذمے لگایا تھا کہ وہ کیتھی کی ساتھی کو لے کر آئے جو فلیٹ میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ کچھ دیر میں باب آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک بڑی عمر کی لڑکی تھی۔ جینٹ، کیتھی کی روم میٹ تھی اور وہ قتل کے وقت باہر گئی تھی۔ مائیک نے اس سے پوچھ گچھ مارشا کے سپرد کر دی اور خود اپنے لیے کافی نکالنے لگا۔ وہ مارشا کے سوالات اور جینٹ کے جوابات سنتا رہا۔ دونوں میں کام کی کوئی بات نہیں تھی۔ مارشا نے اپنے بارے میں درست کہا تھا۔ اس میں کسی کیس کی تفتیش کرنے والی مخصوص ذہانت کی کمی تھی۔

شام کو وہ دفتر سے نکلے تو مائیک نے جائے وقوعہ کا رخ کیا۔ مارشا اس کے ساتھ ہی تھی۔ ”کوئی خاص وجہ؟“

”ہاں، کچھ لوگ رہ گئے ہیں ذرا ان سے بات کرنی ہے۔“

یہ عمارت میں رہنے والے ایسے لوگ تھے جو براہِ راست اس معاملے سے متعلق نہیں تھے لیکن مائیک کا خیال تھا کہ شاید ان سے کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔ مارشا نے عمارت میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں بونی کے پاس جا رہی ہوں، ایک بار اس سے پھر مل لینا شاید مفید ہو۔“

مائیک نے سر ہلایا اور باب کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس نے باب سے عمارت کی صفائی کرنے والے اور لانڈری مین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ”لانڈری مین تو کوئی



نہیں ہے، سب اپنے اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں۔ البتہ صفائی کرنے والا ہے لیکن اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ سے شام چھ بجے تک ہوتی ہے۔“

”یعنی اس وقت وہ یہاں ہوگا؟“

باب نے سر ہلایا اور دفتر کے فون سے کسی کو کال کی۔

”فالرا کہاں ہو؟ ہاں، ایک پولیس افسر میرے دفتر میں تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ اس نے فون رکھ کر کہا۔ ”فالر آنے والا ہے۔“

لیکن اس سے پہلے فالر آتا، مائیک کے موبائل کی بیل بجی۔ دوسری طرف مارشا تھی۔ اس نے کہا۔ ”قاتل نے تیسرا شکار کر لیا ہے۔ اس نے بونی کو قتل کر دیا ہے۔ قتل ابھی ہوا ہے، شاید ہمارے آنے سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی۔“

”میرے خدا۔“ مائیک کے منہ سے نکلا۔ ”لاش دیکھی ہے تم نے؟“

”ہاں اور دیکھنے میں سیریل کلر کا کام لگ رہا ہے۔ میں پولیس کو اطلاع کرنے جا رہی ہوں۔“

”میں آ رہا ہوں۔“

باب اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”کیا ہوا ہے آفیسر؟“

”یہ بتاؤ کہ اس وقت کوئی اجنبی یہاں تو نہیں آیا... پچھلے ایک دو گھنٹے کے دوران میں؟“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس دوران میں میں کئی بار دفتر سے باہر گیا ہوں۔“ باب پریشان ہو گیا۔

”آخری بار تم کب دفتر سے باہر گئے تھے؟“

”کوئی ایک گھنٹا پہلے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آخری فلور پر ایک فلیٹ میں بجلی کا مسئلہ ہو گیا تھا، اسے دیکھنے گیا تھا۔“

”اور تمہاری واپسی کب ہوئی؟“

”کوئی نصف گھنٹا پہلے۔“

”اس دوران میں کوئی تمہارے سامنے عمارت سے باہر گیا؟“

باب نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”میرا خیال ہے کئی لوگ گئے ہوں گے لیکن بات کیا ہے؟“

”کسی نے بونی کو قتل کر دیا ہے۔“

”میرے خدا۔“ باب کے منہ سے نکلا۔ ”کب... کس نے اطلاع دی ہے؟“

”میری ساتھی آفیسر نے... وہ اوپر بونی سے ملنے گئی تھی۔“

باب نے سوچ کر کہا۔ ”میں سچ کہتا ہوں میری توجہ دروازے کی طرف نہیں تھی، مجھے نہیں معلوم کہ اس دوران میں کوئی باہر سے آیا یا چلا گیا ہو۔“

مائیک اوپر آیا جہاں مارشا نے ہومی سائڈ کو اطلاع کر دی تھی۔ اس نے مائیک سے کہا۔ ”طبی عملہ اور دوسرے لوگ آ رہے ہیں۔“

بونی کی لاش اس کے بیڈ روم میں عریاں حالت میں پڑی تھی اور قاتل نے اس پر چاقو سے کوئی چار وار کیے تھے۔ ایک اس کی بغل میں دل کے مقام پر اور باقی تین وار اس کے سینے اور پشت پر تھے۔ بونی کے کپڑے اس کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ دن کا وقت تھا اور قاتل کو اتنا وقت نہیں ملا تھا اس لیے اس نے اپنی وحشت کی تسکین کے بجائے بونی کو صرف قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مائیک نے مارشا سے پوچھا۔ ”کوئی بریک اپ؟“

”نہیں، دروازہ ایسے ہی بند تھا۔ میں نے کئی بار دستک دی اور جب جواب نہیں ملا تو اندر آ گئی۔ یہاں اس کی لاش پڑی تھی۔“

مائیک نے لاش کا معائنہ کیا۔ خون بالکل تازہ تھا اور اسے مرے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ قاتل ان کے سامنے یا ان کی آمد سے ذرا پہلے عمارت سے نکل گیا تھا۔ مائیک کو یاد تھا، ان کے سامنے کوئی عمارت سے باہر نہیں گیا تھا، اس کا داخلی دروازہ ایک ہی تھا۔ یعنی قاتل خوش قسمت تھا کہ وہ ان کی آمد سے پہلے ہی عمارت سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر وہ نکلنے میں چند منٹ کی تاخیر کرتا تو ان سے سامنا ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر میں طبی عملہ اور لیب والے آ گئے۔ سب سے پہلے فوٹو گرافر نے اپنا کام کیا پھر ڈاکٹر، بونی کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

مائیک ذہن میں حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا کام مکمل کر کے ان کو بتایا۔ ”اسے مرے ہوئے پون گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔“

مائیک نے پولیس سرجن کارن لیگ کو غور سے دیکھا۔ ”تمہیں یقین ہے؟“

اس سوال پر کارن خفا ہو گیا۔ ”کیا میں پہلی بار کسی لاش کا معائنہ کر رہا ہوں؟ جتنی تمہاری عمر ہے، اتنا میرا تجربہ ہے۔“

”میں تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کر رہا ہوں۔“ مائیک نے تحمل سے کہا۔ ”میں صرف تصدیق کر رہا ہوں۔“

”میں سو فی صد ذمے داری سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔“

مائیک نیچے آیا اور اس نے باب سے ایک بار پھر کچھ سوالات کیے۔ اس دوران میں مارشا نے بونی کی لاش اٹھوا دی تھی۔ اتفاق سے بونی کے قتل کے وقت اس کے فلور پر کوئی نہیں تھا۔ کیتھی پہلے ہی ماری جا چکی تھی اور اس کی ساتھی لڑکی فلیٹ بند



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونے کی وجہ سے کہیں اور رکی تھی اور اس فلور کے باقی دو فلیٹس کی مکین عورتیں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ یعنی بونی اس وقت بالکل اکیلی تھی اور کوئی گواہ نہیں تھا جس نے قاتل کو آتے یا جاتے دیکھا ہو یا کسی قسم کی آواز سنی ہو۔ جب وہ باہر آئے تو مارشا نے کہا۔

"یہ ایک اور اندھا قتل ہے۔"

"کوئی قتل اندھا نہیں ہوتا ہے۔ بس حقائق علم میں نہیں ہوتے ہیں۔" مائیک نے اس کی تردید کی۔

"مجھے امید نہیں ہے کہ قاتل پکڑا جائے گا۔" مارشا بولی۔

"پھر بھی ہمیں کوشش تو کرنا ہوگی۔"

"اب تم کہاں جاؤ گے؟" مارشا نے پوچھا

"میں دفتر جاؤں گا، مجھے رپورٹ بھی کرنی ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں گھر جاؤں گی۔" مارشا بولی اور اس نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور مائیک کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں، اپنی نیند پوری کروں گی۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

ٹیکسی آ کر رکی اور مارشا اس میں بیٹھ گئی، اس نے مائیک کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ مائیک نے گہری سانس لی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر میں وہ دفتر میں تھا اور اس نے کارلائل کو اس تیسرے قتل کی رپورٹ دی۔ وہ پریشانی سے بولا۔ "لگتا ہے میرا برا وقت آ گیا ہے۔"

"کیپٹن! اتنا پریشان مت ہو۔ یہ معمول کا حصہ ہے جو میڈیا آج ہمیں تنقید کا نشانہ بناتا ہے وہی کل ہماری کامیابیوں پر تحسین بھی کرتا ہے۔ ہمیں نہ ان کی تنقید کا اثر لینا چاہیے اور نہ تحسین کا۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن اوپر والے تو یہ بات نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اس سے زیادہ ضروری بات اور کوئی نہیں ہے کہ میڈیا کے سامنے اپنا امیج درست رکھا جائے۔"

"تب اوپر والوں سے کہو کہ وہ محکمہ خود سنبھال لیں۔" کارلائل مسکرایا۔ "اگر انہیں کچھ کرنا آتا تو اوپر کیوں بیٹھے ہوتے۔"

مائیک اپنی میز پر آیا اور اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا۔ وہ دو گھنٹے کمپیوٹر کے ساتھ لگا رہا۔ اسے کچھ معلومات درکار تھیں۔ جب اسے مطلوبہ معلومات مل گئیں تو دفتر سے نکلا اور باب کے پاس پہنچا۔ وہ دفتر بند کر کے جانے والا تھا۔ مائیک کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "خیریت... کہیں پھر تو کوئی قتل نہیں ہوگیا؟"

"نہیں اور اب امکان ہے کہ مزید کوئی قتل نہیں ہوگا لیکن پہلے مجھے تم سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔"

"پوچھو۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ویسے اب تک کوئی ایک درجن کرائے دار فلیٹ چھوڑنے کا نوٹس دے چکے ہیں۔"

مائیک نے سر ہلایا۔ "ظاہر ہے، تین عورتوں کے قتل کے بعد یہاں کون رکنا پسند کرے گا؟"

"باقی بھی خوف و ہراس کے عالم میں ہیں اور اب کوئی واقعہ ہوا تو یہ عمارت خالی ہوجائے گی۔"

"تم فکر مت کرو۔" مائیک نے کہا اور اس سے سوالات شروع کیے۔ باب کے پاس کچھ سوالوں کے جوابات تھے اور کچھ کے لیے اسے اپنا پرانا ریکارڈ دیکھنا پڑا تھا۔ بہرحال اسے اپنی مطلوبہ معلومات مل گئی تھیں۔ وہ باب کے پاس سے نکلا اور نے کار کا رخ سینٹرل پارک کی طرف موڑ دیا۔ راستے میں اس نے ایک کال کی تھی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے گھر کے سامنے کار روکی اور اتر کر کال بیل بجائی۔ کوئی ایک منٹ بعد مارشا نے دروازہ کھولا۔ وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مائیک کی طرف دیکھا۔

"مائیک! تم... اس وقت؟"

"ہاں میں... کیا مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟"

مائیک نے کہا تو اس نے بادل ناخواستہ اسے راستہ دیا۔ اس وقت وہ کہیں سے وہ عورت نہیں لگ رہی تھی جس نے آج صبح ہی اس کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ مارشا نے گاؤن پہن رکھا تھا جو اس کے جسم پر تناسب سے ڈھلک رہا تھا۔ وہ اسے لیونگ روم میں لائی اور صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا لینا پسند کرو گے؟"

"کچھ بھی نہیں... میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔" مائیک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مارشا اس کے سامنے صوفے پر ٹک گئی۔

"کہو۔"

"تم نے بتایا کہ تم اس وقت یہاں سے چلی گئی تھیں جب تم پندرہ سال کی تھیں؟"

"یہ درست ہے۔"

"اس سے پہلے تم نیویارک میں کہاں رہتی تھیں؟"

"سترھویں اسٹریٹ پر۔" جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ بالکل سپاٹ ہوگیا تھا۔

"سترھویں اسٹریٹ پر کہاں؟"

مارشا نے گہری سانس لی۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"میرے سوال کا جواب دو؟"

"میں اسی عمارت میں رہتی تھی۔" مارشا کا لہجہ تلخ ہوگیا۔



"شاید تم جان گئے ہو؟"

مائیک نے سر ہلایا۔ "ہاں، مجھے معلوم ہوگیا ہے۔"

مارشا خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر بولی۔

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ میری ماں ایک طوائف تھی اور میں پندرہ سال تک اس کے ساتھ رہی۔"

"نہیں، اس سے کم سے کم مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن دوسرے کچھ معاملات ہیں جن سے فرق پڑتا ہے۔"

"مثلاً کیسے معاملات؟"

"تم اپنی ماں کے ساتھ یہاں سے گئی تھیں لیکن ریکارڈ بتاتا ہے کہ تم نے کالج کی تعلیم ایک سرکاری ہاسٹل میں رہ کر حاصل کی۔"

"یہ درست ہے۔ میں نے ماں کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ یہ پیشہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔"

"پھر وہ کہاں گئی؟"

"مجھے نہیں معلوم... میں نے اس سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھا تھا۔"

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد تم نے پولیس فورس جوائن کر لی؟"

مارشا نے سر ہلایا۔ "یہ دو سال پہلے کی بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟"

"مارشا! تم نے نیویارک تبادلے کی درخواست کیوں دی؟"

"میں اس کی وجہ تمہیں بتا چکی ہوں۔" وہ بولی۔

"یہاں سے تمہاری کوئی خوشگوار یاد وابستہ نہیں تھی پھر تم نے نیویارک واپسی کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"کیونکہ یہ میرا پسندیدہ شہر ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"پسندیدہ شہر۔" مائیک کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ "جہاں تم نے زندگی کے پندرہ سال اس طرح گزارے کہ تمہیں اپنی ماں کے ساتھ روزانہ ایک نئے مرد کو دیکھنا پڑتا تھا؟"

مارشا کا چہرہ سفید ہوگیا۔ "مجھے اس کے کردار سے نفرت تھی لیکن اس شہر سے نہیں۔"

"تم کس تاریخ کو یہاں آئیں؟"

"آٹھ دن پہلے۔"

"مجھے افسوس ہے، تم نے بالکل غلط کہا ہے۔ تم ملواکی سے امریکن ائرلائن کی ایک پرواز سے آج سے بتیس دن پہلے یہاں آئی تھیں۔ ریکارڈ اس کا گواہ ہے لیکن دو دن بعد واپس چلی گئیں۔"

"وہ... میں یہاں کسی رہائش کی تلاش میں آئی تھی۔"

"اتفاق سے انہی دنوں شون کا قتل ہوا تھا۔" مائیک نے عام سے انداز میں کہا۔ "تم نے ٹی وی یا اخبار پر دیکھ لیا ہوگا؟"

"ہاں، میں نے دیکھ لیا تھا۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

"مائیک! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"پھر تم نے دو دن پہلے یہاں جوائن کیا اور اس سے ایک رات بعد یہاں ایک اور کال گرل کا قتل ہوگیا۔ اس کی تفتیش بھی ہمارے سپرد ہوئی۔ کیتھی کی پڑوسن بونی نے قاتل کو دیکھا اور آج شام دن دہاڑے اس کا بھی قتل ہوگیا جبکہ اس سے پہلے دونوں قتل رات کے وقت ہوئے تھے۔ قاتل نے اس وقت بونی کو نشانہ بنایا جب ہم اس عمارت میں آئے یا آنے والے تھے۔"

"یہ درست ہے۔ جب میں بونی کے فلیٹ میں داخل ہوئی تو قاتل اپنا کام کر کے چند منٹ پہلے ہی رخصت ہوا تھا۔" مارشا نے سر ہلایا۔

"ڈاکٹر کارن نے مجھے بتایا کہ بونی کو پون گھنٹے پہلے قتل کیا گیا تھا۔ اس پر میں نے اس سے تصدیق چاہی اور اس نے یقین سے تصدیق کی۔ میں ڈاکٹر کارن کو جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ ماہر پولیس سرجن اس پورے ملک میں کوئی نہیں ہوگا۔ تم شاید جانتی نہیں ہو کہ میں وقت کا حساب کرتا رہتا ہوں، یہ میری لاشعوری عادت ہے۔ ہم شام پانچ بج کر پانچ منٹ پر عمارت میں داخل ہوئے۔ تم فوراً اوپر چلی گئیں۔ زیادہ سے زیادہ تم پانچ بج کر دس منٹ پر بونی کے فلیٹ میں داخل ہوگئی ہوگی۔"

"مجھے کچھ وقت لگا تھا۔" مارشا نے دفاعی انداز میں کہا۔

"اوکے... کتنا وقت؟ پانچ منٹ مزید لگے ہوں گے۔ یعنی تم سوا پانچ پر بونی کے فلیٹ میں داخل ہوئیں اور تم نے اسے مردہ حالت میں پایا۔ ہیڈ کوارٹر کے مطابق تمہاری کال وہاں پانچ بج کر بتیس منٹ پر موصول ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کارن اپنے عملے کے ہمراہ پانچ بج کر چھپن منٹ پر بونی کے اپارٹمنٹ پہنچا اور اس نے چار منٹ میں اس کا معائنہ کر کے ٹھیک چھ بجے تصدیق کر دی کہ بونی کی موت پون گھنٹا پہلے یعنی سوا پانچ بجے ہوئی تھی۔ اس وقت تم بونی کے فلیٹ میں داخل ہوئی تھیں۔"

"اس سے اندازے کی غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔" مارشا کا لہجہ مرتعش ہوگیا۔

"میں نے کہا نا، اس سے زیادہ تجربہ کار سرجن پورے ملک میں نہیں ہے۔ خود میرا بھی اس کے بارے میں یہی اندازہ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ قاتل بس قتل کر کے نکلا تھا جب تم بونی کے فلیٹ میں داخل ہوئیں۔ تب بھی وہ کہاں غائب ہوگیا؟



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیونکہ اس دوران میں کوئی عمارت سے باہر نہیں گیا۔"

"ممکن ہے قاتل عمارت میں کہیں چھپ گیا ہو؟" مارشا نے کہا۔

"لیکن کہاں... جبکہ خالی فلیٹس مقفل تھے اور جن میں لوگ تھے، وہ سب یہاں برسوں سے رہ رہے ہیں۔ ان میں کوئی اجنبی نہیں تھا۔"

"تب میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جب میں نے تمہارے بارے میں تحقیق کی تو میرے علم میں کئی ایک باتیں آئیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ تم پولیس میں آنے سے پہلے ایک سال کی آرمی ٹریننگ پروگرام میں شامل رہی تھیں۔ تم نے کورس بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا لیکن تمہیں مخصوص نفسیاتی کیفیت کی بنا پر فوج میں شامل نہیں کیا گیا۔ تم میں تشدد کا شدید رجحان پایا گیا تھا... کیا یہ غلط ہے؟"

"درست ہے۔" اس بار مارشا نے سکون سے کہا۔

"لیکن اس سے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"مارشا! تم یہ قتل کیوں کر رہی ہو... کیا اس لیے کہ تمہاری ماں ایک طوائف تھی؟"

"میری ماں ایک طوائف تھی لیکن مجھے اس سے نفرت نہیں تھی۔" مارشا نے اقرار یا انکار کیے بغیر کہا۔

"یہ جھوٹ ہے، میں نے باب سے پوچھا ہے اور اسے یاد آ گیا۔ بارہ سال پہلے یہاں بریٹ نامی کال گرل تھی اور اس کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی۔ وہ لڑکی اپنی ماں سے اس کے پیشے کی بنا پر شدید نفرت کرتی تھی اور وہ اس کا اظہار بھی کرتی تھی۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے بارہ سال کی عمر میں اپنی ماں کے ایک گاہک کو چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا؟ کیونکہ کسی نے اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ نہیں کی اس لیے معاملہ دب گیا۔"

"اس کمینے نے مجھے بھی رجھانے کی کوشش کی تھی۔" مارشا بولی۔

"چلو اس نے تمہیں رجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے چند دن بعد تم نے اپنی ماں کو بھی چاقو سے مارنے کی کوشش کی تھی اور یہ منظر اس عمارت کی کئی عورتوں نے دیکھا تھا۔"

"اس نے مجھے طیش دلایا تھا، وہ میرے منع کرنے کے باوجود یہ پیشہ ترک کرنے کو تیار نہیں تھی۔"

"یعنی تم اعتراف کرتی ہو کہ اپنی ماں اور اس کے پیشے سے نفرت کرتی تھیں؟"

اس بار مارشا کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے چلّا کر کہا۔ "ہاں، میں اس سے اور اس کے پیشے سے نفرت کرتی تھی۔"

"پھر تم نے اسے یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ مارشا! جب وہ تمہاری بات مان گئی تھی تو تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"کیونکہ وہ یہ پیشہ ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے نیویارک چھوڑا تھا اپنا پیشہ..." یہ کہتے ہوئے مارشا کو احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔

"تم نے اس کی لاش کا کیا کیا؟" مائیک نے نرمی سے پوچھا۔

"وہ ملواکی سے نیویارک آنے والی ہائی وے کے ساتھ ایک جگہ دفن ہے لیکن کوئی اسے تلاش نہیں کر سکتا۔" مارشا نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔

"پھر تم نے خود کو بے سہارا ظاہر کر کے سرکاری ہاسٹل میں جگہ حاصل کی اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کی۔ طوائفوں کو قتل کرنے کا خیال تمہیں کب آیا؟"

"جب میں نے پولیس فورس جوائن کی۔ مجھے شروع سے اس طبقے سے نفرت تھی اور میرا بس چلتا تو میں ساری طوائفوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان پر ایٹم بم گرا دیتی۔ مجھے تم اچھے لگے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر چالاک نکلو گے اور مجھے پکڑ لو گے۔" مارشا نے کہتے ہوئے اچانک کشن کے نیچے سے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، تم دوسروں کو یہ سب بتانے کے لیے زندہ رہو گے؟"

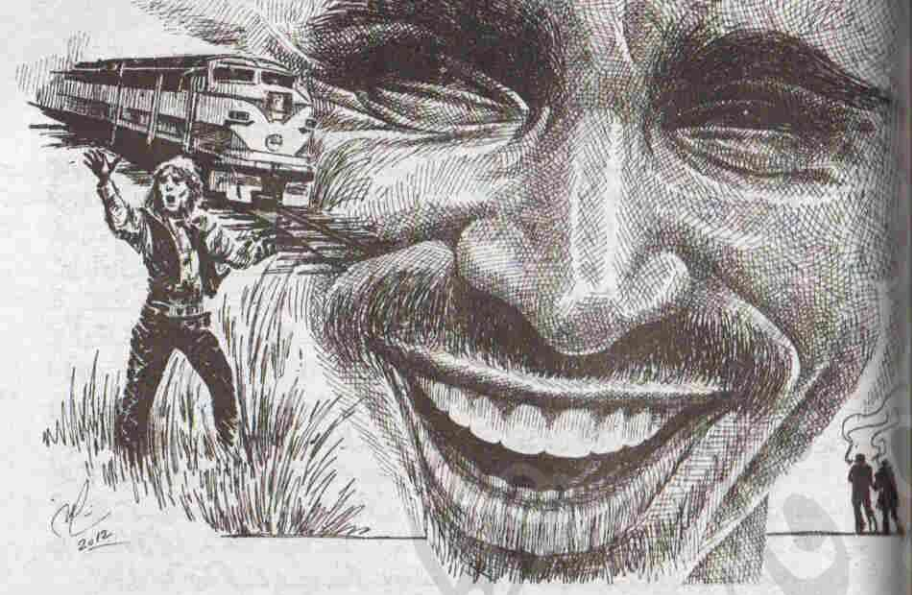
مائیک نے گہری سانس لی۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کا کالر ہٹایا اور مارشا کو اس کے نیچے لگا مائیک دکھایا۔ "یہ ساری باتیں باہر موجود پولیس وین میں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔"

یہ سنتے ہی مارشا کا ہاتھ جھک گیا پھر اس نے اٹھ کر باہر جھانکا اور شکست خوردہ انداز میں واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مائیک نے اٹھ کر اس سے پستول لے لیا۔ "اگر تم بونی کو عجلت میں قتل کرنے کی غلطی نہ کرتیں تو میرا دھیان ہرگز تمہاری طرف نہیں جاتا۔ تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"مجھے خطرہ تھا کہ وہ سمجھ نہ جائے کہ اپر پوش اصل میں عورت تھی اس لیے میں نے اسے فوری قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔" مارشا بولی اور اس کی طرف دیکھا۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"میں کچھ نہیں کروں گا۔ جو کرنا ہے، وہ باہر موجود لوگ کریں گے۔" مائیک نے کہا اور کالر اٹھا کر بولا۔ "اندر آ جاؤ۔"





# نائیو فیکٹری

سیریز ناراض

عرصہ دراز پہلے قصہ گو مشہور ہوا کرتے تھے ... لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کے داستان گو کے گرد جمع ہو کے کہانیاں سن کے محظوظ ہوا کرتے تھے ... لیکن یہ گئے دنوں کی باتیں ہیں ... بیتے وقت کی یاد تازہ کر دینے والی ایک ایسی سنسنی خیز کہانی ... جس کی ہر سطر کے ساتھ آپ خود کو اس ماحول کا حصہ سمجھیں گے ...

**جرم اور فن کے خوبصورت ملاپ سے جنم لیتی کہانی در کہانیاں**

یہ سن اُنیس سو چالیس کی بات ہے۔

اس وقت میں لڑکپن کی عمر سے گزر رہا تھا۔ ہم میکسیکو کے قریب ایک قصبے میں رہتے تھے جس کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ میرا سب سے پیارا دوست سلیری تھا۔ وہ دور آج کی طرح ہنگامہ پروری کا نہیں تھا۔ لوگ سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ فرصت بہت تھی۔ میں اور سلیری اپنا فارغ وقت آوارہ گردی کرتے صرف کرتے تھے۔ جن دنوں اسکول میں سردیوں یا گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں،



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرصت اور بھی زیادہ میسر آجاتی۔

اُن دنوں اسکول میں سردیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں اور سلیری دن بھر آوارہ گردی میں وقت گزار کر اندھیرا چھا جانے پر گھر لوٹے تھے۔ ہم جب بھی تابوت فیکٹری کے قریب سے گزرتے، سلیری مجھے وہی کہانی سنانا شروع کر دیتا۔ یہ کہانی اُن مُردوں کے بارے میں ہرگز نہیں ہوتی تھی، جن کی لاشیں رکھنے کے لیے اُس فیکٹری میں تابوت بنا کرتے تھے بلکہ یہ ایک قتل کے بارے میں تھی۔ یہ اُس آدمی کا قتل تھا جسے حادثاتی طور پر یا پھر جان بوجھ کر بروئیل اسٹاکوس نے قتل کیا اور لاش کو ایک ایسی جگہ... دفن کر دیا تھا جہاں سے سلیری کے کہنے کے مطابق صرف خدا ہی اُس کی باقیات کو دریافت کروا سکتا تھا۔ بروئیل اسٹاکوس اس تابوت فیکٹری کا مالک تھا جس کے قریب سے ہم دونوں اکثر گزرتے تھے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے مجھے تقریباً ہر بار یہ کہانی سننے کو ملتی تھی۔

''بروئیل اسٹاکوس تو گٹر کے چوہے سے بھی زیادہ گندہ اور پاگل ہے۔'' سلیری نے اُس کا ذکر کرتے ہی بُرا سا منہ بنایا۔ ''اس نے اُس سورج مکھی جیسے قیدی کو قتل کیا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ اُس کے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نے تو اتنے زیادہ خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھ کبھی ہنری میسک کے بھی نہیں دیکھے ہیں۔'' ہنری میسک ہمارے قصبے کا مشہور قصاب تھا۔ ''ٹوٹاپ! یہ حقیقت ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش کی۔ شاید اس کے دل میں یہ بات موجود تھی کہ قریب ترین دوست ہونے کے باوجود بھی میں اُس کو دوسروں کی طرح جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

ٹوٹاپ... یہ سُن کر آپ کو بھی بڑی حیرت ہوئی ہوگی۔ خیر... میرا نام جو بھی سُنتا ہے، اُس کے چہرے پر پہلا تاثر حیرت کا ہی اُبھرتا ہے۔ یہ میرا اصل نام نہیں بلکہ پیار سے رکھا گیا بڑا ہی مضحکہ خیز نام ہے جو اب میری پہچان بن چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ لقب میرے دو چچاؤں میں سے ایک کا تھا جسے پیار سے اُن کے باپ نے عطا کیا تھا۔ جب میں پیدا ہوا تو اُن کے باپ اور میرے دادا نے مجھے بھی یہ لقب عطا کر دیا۔ کیونکہ بچپن میں میرے سر کے بال بہت بڑے اور بالکل سیدھے کھڑے رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بال نہیں، سر پر بانس کے پودے اُگ آئے ہوں۔ بڑا ہو جانے پر میں نے اسی وجہ سے چھوٹے چھوٹے بال رکھنا شروع کر دیے تھے کہ وہ کھڑے ہوئے نظر نہ آئیں لیکن اس کے باوجود 'ٹوٹاپ' کا لقب اس بُری طرح مجھ سے چمٹ چکا تھا۔

اُس دن بھی ہم دونوں دوست اپنی آوارہ گردی میں مگن پٹری پر سے گزر رہے تھے کہ سلیری کی نظر فیکٹری پر پڑ گئی اور یوں اُس نے ایک بار پھر وہی پرانی کہانی سنانا شروع کر دی۔ جیسے ہی اس نے یہ قصہ شروع کیا، میں نے زور کا ہنکارا بھرا اور اسے پیچھے کی طرف دھکیلا مگر وہ کم بخت بہت ہی ڈھیٹ تھا۔ اس نے قطعی برا نہیں منایا بلکہ اپنا جھوٹا سچا قصہ سنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

سلیری پورے قصبے کا بدنام ترین لڑکا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شاید ہی کبھی سچ بولتا ہو۔ قصبے میں وہ جھوٹا مشہور تھا لیکن ایک بات سچ ہے کہ وہ غضب کا قصہ گو تھا۔ ایسی کہانی گھڑتا کہ اس کی باتوں سے لمحہ بھر کے لیے توجہ ہٹانا بھی مشکل ہو جاتا۔

ہم نے تابوت فیکٹری کو ہمیشہ دور سے ہی دیکھا تھا۔ یہ فیکٹری ریل کی اُن پٹریوں کے پار بنی ہوئی تھی جس پر چلتے چلتے ہم دونوں اکثر اپنے گھروں کو جاتے تھے۔

اس راستے کے انتخاب کی ایک اور اہم وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ پٹری کے دونوں طرف قدِ آدم جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ان کے بیچ سے گزر کر قصبے کے کسی فرد کا اس طرف آنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہم دونوں پٹری پر چلتے چلتے نہایت سکون سے سگریٹ پینے کے مزے اٹھایا کرتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ کم عمر ہونے کی وجہ سے ہم سب کے سامنے سگریٹ پیتے ہوئے ڈرتے تھے مگر یہاں کسی کے دیکھ لیے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ سلیری کا بڑا بھائی سگریٹ پیتا تھا اور وہ اُس کے سگریٹ چُرا کر میرے اور اپنے لیے عیاشی کا سامان کر لیا کرتا۔ خوش قسمتی سے اب تک، نہ تو اس کی چوری پکڑی گئی تھی اور نہ ہی ہم۔

فیکٹری کی عمارت دور دور تک پھیلے ہوئے ویرانے میں واقع تھی۔ دور سے دیکھنے پر یہ عمارت ایک بہت بڑے تابوت کی طرح نظر آتی تھی۔ ایسا تابوت جو زمین پر رکھا ہوا تھا لیکن اُس کے اِرد گرد کی جھاڑیوں نے عمارت کی بنیادوں کو اپنے اندر چھپا لیا تھا جس کی وجہ سے ایسا دکھائی دیتا جیسے کسی پرانے قبرستان میں واقع کسی قبر کے چاروں طرف سے مٹی ہٹا دی گئی ہو۔ یوں دفن کیا ہوا تابوت، زمین میں اُدھ دھنسا ہوا نظر آنے لگا ہو۔ اس عمارت کا رنگ بھی بہت ہی منفرد تھا... یعنی کتھئی رنگ جس میں وارنش ملا دی گئی ہو۔ عمارت کی چھت بھی خاصی نیچی اور ہموار نظر آتی تھی۔ اُس عمارت کے اگلے حصے میں دونوں جانب سے اس طرح کا خم



پیدا کیا گیا تھا جیسے تابوت کا وہ حصہ ہو جہاں سے ہم مُردے کے چہرے کا آخری دیدار کرتے ہیں۔

اس خوف زدہ کر دینے والی عمارت کے قریب، پہاڑی تلے ایک پُن چکی لگی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کافی پہلے اس کے ذریعے اس تابوتی عمارت کو روشن رکھنے کے لیے بجلی پیدا کی جاتی ہو مگر اب وہ بالکل خاموش تھی۔ نہ تو وہ چشمہ بہتا ہے جس کے پانیوں سے کبھی یہ چلتی ہوگی۔ اب ہر طرف سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔ میں اور سلیری بچپن سے اس عمارت کو دیکھتے آرہے تھے لیکن اس کے باوجود کم از کم میری نظر جب بھی اس پر پڑتی، لمحہ بھر کے لیے پورے جسم میں خوف کی ہلکی سی لہر ضرور دوڑ جاتی تھی۔

اُس دن بھی سلیری بدستور بروئیل اسٹاکوس کے بارے میں ہی باتیں کر رہا تھا۔ اچانک ہمیں ایک خیال آیا اور ہم پٹری سے اُتر کر جھاڑیوں کے اندر گھستے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد انکل تھامس کے گنّوں کا کھیت ہمارے سامنے تھا۔ سلیری نے اپنی پتلون کا پائنچا پلٹا اور پنڈلی سے بندھے شکاری چاقو کو نکال کر موٹے تازے گنّے کاٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں پٹری پر بیٹھے میٹھے رسیلے گنّے چوس رہے تھے۔ وہ تابوتی عمارت ہماری نظروں کے عین سامنے تھی۔

''کیا خیال ہے؟'' اُس نے چاقو سے گنا چھیلتے ہوئے کہا۔ ''چلتے ہیں، بروئیل سے اعتراف کرواتے ہیں کہ اس نے قیدی کو قتل کیا ہے۔''

''کیا... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تابوتی عمارت میں جانے کا سُن کر ہی میرا خون خشک ہو گیا۔

''ہاں...''

''تمہارا کیا خیال ہے... وہ دو کمزور سے لڑکوں کے سامنے اتنا بے بس ہو جائے گا کہ ہمارے حکم پر فَر فَر کہنا شروع کر دے گا کہ ہاں میں نے اُسے مارا ہے؟'' میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے اپنا چاقو لہراتے ہوئے کہا۔ ''اس چاقو کے ہاتھ میں ہونے کے بعد کم از کم میں تو خود کو ہرگز کمزور نہیں سمجھتا۔''

ہاتھی دانت کی طرح مُڑا ہوا وہ چاقو واقعی کافی لمبا، چوڑا اور چمکتا ہوا تھا۔ اس کی تیز دھار کا اندازہ اسی بات سے لگا لیں کہ کھیت میں کھڑا گنّا ایک ہی وار میں کٹ جاتا تھا۔

''مجھے تو نہیں لگتا کہ بروئیل اسٹاکوس کے بارے میں جو کچھ تم کہتے ہو، وہ سچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ قصہ تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔'' تابوتی عمارت کے اندر داخل ہونے سے خود کو بچانے کے لیے میں نے دلیل کا سہارا لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سیدھے سادے انداز میں انکار کر کے اُس کے منہ سے بزدلی کا طعنہ سنوں۔

میں نے بروئیل اسٹاکوس کو کئی بار دیکھا تھا۔ وہ بڑی عمر کا شخص تھا۔ وہ کافی موٹا تھا۔ اس کا چہرہ نہایت سرخ تھا۔ دھوپ میں اس کی سرخ رنگت تمتماتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اکثر میں نے اُسے کوٹ کی آستین سے ناک پونچھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس حرکت کی وجہ سے مجھے اس سے گھن آتی تھی۔ لوگوں سے سنا تھا کہ اس کی ایک بیوی اور بیٹی بھی ہے لیکن وہ دونوں اس کے ساتھ نہیں بلکہ کہیں اور رہتے ہیں۔ قصبے کے بڑے کہتے تھے کہ وہ دونوں ماں بیٹی اپنے کسی قریبی عزیز کی تیمارداری کے لیے یہاں سے چلی گئی تھیں جو کہ اُن کے خیال میں قریب المرگ تھا... مگر یا تو وہ اب تک مر انہیں تھا یا پھر اُن دونوں نے ہی بروئیل کے گھر میں واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے کئی برسوں سے وہ تنہا ہی رہ رہا تھا۔

''ہم اُس پر قابو پا کر اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیں گے...'' سلیری نے اعتراف کروانے کے لیے منصوبہ بیان کرنا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے قطع کلامی کی۔

''جیسا کہ فلموں میں بینک لوٹنے والے ڈاکو کرتے ہیں؟''

''بالکل ٹھیک...'' اس نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر بات شروع کر دی۔

ہم دونوں اپنی باتوں میں مگن تھے کہ سامنے سے ایک ٹرک آتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھا لیکن اس کے انجن کی گڑگڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ ٹرک تابوتی عمارت کے سامنے پہنچ کر رکا اور ایک دو بار زوردار گڑگڑاہٹ کے بعد اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ یہ ٹرک جس سمت سے آتا ہوا نظر آیا تھا وہاں 'مونٹروز آرا مشین' واقع تھی جہاں پر لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں کو کاٹ کر تختوں میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ٹرک نئے تابوتوں کی تیاری کے لیے لکڑی لے کر ہی پہنچا ہوگا۔

''بہت برسوں پہلے کی بات ہے...'' سلیری نے کافی دیر تک ٹرک کو گھورنے کے بعد ماہر قصہ گو کی طرح کہنا شروع کیا۔

''کیا بات ہے وہ؟'' میں نے فوراً قطع کلامی کی۔

''چپ کر کے سنو۔'' اس نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ کافی پہلے کا ذکر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ یہاں پر ایک جیل ہوا کرتی تھی جس میں مختلف جرائم میں ملوث قیدی اپنی سزا کاٹا کرتے تھے۔'' اس نے سامنے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا مگر وہاں مجھے ویرانے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی دانست میں اشارے کے ذریعے سمت بتا رہا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ اس بار اُس نے بالکل نئی کہانی تیار کی ہے۔ اس لیے میں نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا کر اُس کی تائید کی۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اُس جیل کے زیادہ تر قیدی سیاہ فام تھے۔'' اس نے ایک بار پھر کہانی شروع کی۔ ''اکثر ایسے قیدی جو اپنی سزا تو پوری کر چکے تھے مگر جرمانے کی عدم ادائیگی کی بنا پر خوامخواہ قید میں تھے۔ کاؤنٹی کی عدالت کے حکم پر ایسے قیدی جو جرمانے کی عدم ادائیگی کے سبب قید میں تھے، وہ قصبے میں محنت مزدوری کر کے اپنا جرمانہ ادا کر سکتے تھے لیکن ایک شرط تھی...''

''وہ شرط کیا تھی؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''قصبے کا کوئی فرد خود اُن کی خدمات لینے کے لیے جیل آئے، ورنہ از خود اُن قیدیوں کو باہر جا کر کام ڈھونڈنے کی اجازت نہیں تھی۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اکثر ہمارے قصبے اور کاؤنٹی کے دیگر قصبوں سے لوگ جیل آتے تھے اور اپنی پسند کے مطابق قیدیوں کا انتخاب کر کے انہیں محنت مزدوری کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ سفید فام لوگ ان سیاہ فام قیدیوں سے وہ کام کرواتے تھے جس کا کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ مثلاً سڑکوں کی تعمیر، کھدائی، بیت الخلاؤں کے لیے سیپٹک ٹینک بنوانا وغیرہ۔ یوں انہیں مزدوری کی شکل میں کچھ پیسے مل جاتے تھے جس سے وہ اپنا جرمانہ ادا کر کے قید سے رہائی پا لیتے تھے۔ قیدیوں کی خدمات حاصل کرنے والے کو مزدوری کے علاوہ کچھ رقم کاؤنٹی کو بھی بطور ٹیکس ادا کرنا ہوتی تھی۔''

''اچھا...'' جب وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو میں نے حیرت سے کہا۔ میری بات سُن کر اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔

''آگے سنو...'' مختصر سے وقفے کے بعد اُس نے پھر کہانی سنانا شروع کر دی۔ ''بروئیل اُس وقت کاؤنٹی کا ملازم تھا اور وہ...''

''یہ کیا بکواس ہے، پھر وہی بروئیل...'' میں سلیری کے قصے کو بالکل نئی کہانی کی طرح سُن رہا تھا مگر اُس نے ایک بار پھر اُس کے بیچ میں بروئیل کو ڈال دیا تھا۔ اس لیے میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''چپ کر کے سنو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ بہت دلچسپ اور حقیقی قصہ ہے۔'' اس نے مجھے پچکار کر کہا۔

''اچھا، بکنا شروع کرو۔'' میں نے ناگواری سے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ بروئیل کاؤنٹی کی جیل میں قیدیوں کو ذمے داریاں عائد کرنے کے کام پر متعین تھا۔ وہ ڈپٹی انچارج کے عہدے پر فائز تھا۔'' اس نے ایک بار پھر میری ناراضی کو نظر انداز کر کے نہایت دلجمعی سے اپنا قصہ سنانا شروع کیا تھا۔ ''اکثر وہ قیدی جو کام کے لیے باہر لے جائے جاتے تھے، شیرف کے کئی ذاتی کام کاج بھی کیا کرتے تھے۔ شیرف قیدیوں سے جو خدمات لیتا تھا، وہ غیر قانونی تھی۔ یہ بات بروئیل جانتا تھا۔ اس لیے اُس نے شیرف کی ملی بھگت سے اپنے فائدے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ جن قیدیوں کو کاؤنٹی کے دفتر میں فیس ادا کر کے لوگ مزدوری کروانے کے لیے لے جاتے تھے، شیرف کاغذات میں تھوڑی سی ہیرا پھیری کر کے اُن میں سے ایک، دو کو بروئیل کے ذاتی کاج کے لیے اس کے گھر اور فیکٹری پر بھیج دیا کرتا تھا۔ شیرف تو خود ہیرا پھیری کر رہا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ بروئیل کو یہ غیر قانونی سہولت استعمال کرنے سے کبھی روک سکتا۔ یوں وہ خوش تھے کہ اس طرح ان دونوں کا کام بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔'' یہ کہہ کر سلیری رکا اور اپنے چاقو سے چھلے ہوئے گنے کی گنڈیریاں بنانے لگا۔

''پھر کیا ہوا؟'' کافی دیر تک جب وہ گنڈیریاں چوستا رہا تو میں نے کہا۔ واقعی اب مجھے اس قصے میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''بتاتا ہوں...'' اس نے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بروئیل بہت چاپلوس آدمی تھا اور شیرف لالچی۔ بروئیل بھی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر وقت اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتا رہتا تھا۔ اُس دن وہ شہر کی منڈی سے شیرف کے لیے کھانے پینے کی ڈھیر ساری چیزیں لے کر آیا تھا۔ شیرف جیل کے احاطے میں بنے سرکاری گھر میں رہتا تھا۔ ابھی وہ گاڑی سے اُتر کر سامان نکال ہی رہا تھا کہ شیرف بھی آ گیا۔ اس نے حریصانہ نظروں سے سامان کی طرف دیکھا اور کہا... یہ سب میرے لیے ہے؟''

''یقیناً...'' بروئیل نے مسکرا کر جواب دیا۔

اچانک بروئیل کی نظر سامنے احاطے پر پڑی۔ وہاں شیرف کی مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ ایک..... نوجوان مرغیوں کے بڑے سے دڑبے کی صفائی کر کے باہر نکلا تھا۔ اس



کے جسم پر صرف پاجامہ تھا۔ اس کا جسم کسرتی اور مضبوط تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ گوروں سے بھی زیادہ گورا تھا۔ دراصل وہ سورج مکھی آدمی تھا۔ اس کا جسم اور سارے بال سنہری تھے۔ ایسے لوگوں کو سورج کی روشنی میں بہت ہی کم دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ دڑبے سے باہر نکل کر پلکیں جھپکا رہا تھا۔ بروئیل نے اس سے پہلے اسے یہاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' بروئیل نے شیرف سے پوچھا۔

''نیا جانور ہے، کل ہی آیا ہے... چاہیے تو لے جاؤ۔'' کھانے پینے کا سامان دیکھ کر تو شیرف کی باچھیں پہلے ہی کھلی ہوئی تھیں۔ بروئیل نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو وہ اس کا مطلب سمجھ گیا اور فوراً پیشکش کر دی۔

''یہ لڑائی بھڑائی والا تو نہیں ہے؟'' اس نے شیرف سے پوچھا۔

''ہوتا ہے تو ہو، تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟'' شیرف نے خباثت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہاں کب تک کے لیے آیا ہے؟'' بروئیل نے پھر سوال کر ڈالا۔

''تو ّے دن... اس دوران میں تم اس سے خوب جی بھر کے کام لے سکتے ہو۔'' شیرف کے ہونٹوں پر بدستور خباثت بھری مسکراہٹ طاری تھی۔

''اسے بڑھئی کا کام آتا ہے؟''

''یہ مجھے نہیں پتا، نہیں بھی آتا ہے تو تم سکھا دو۔'' شیرف نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی تمہیں اپنی تابوت فیکٹری کے لیے ہر وقت مزدوروں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، لے جاؤ اسے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بروئیل کے لائے ہوئے سامان کو بھی باہر نکال کر دیکھتا جا رہا تھا۔

''آگے کیا ہوا؟'' سلیری دم لینے کو رکا تو میں نے بے چینی سے کہا۔

''بروئیل اُس نوجوان لڑکے کو لے کر اپنی تابوت فیکٹری میں آ گیا۔'' سلیری نے ایک بار پھر قصہ سنانا شروع کر دیا۔ ''خوش قسمتی سے اُسے بڑھئی کے کام میں تھوڑی بہت مہارت حاصل تھی۔ جب اس نے قیدی کا ٹیسٹ لیا تو فوراً فیصلہ کر لیا کہ جب تک وہ قید میں ہے، یہ اس سے بھرپور کام لے گا۔ اس طرح اس کو کافی پیسوں کی بچت ہو جائے گی۔ یوں وہ قیدی اس کے ملازم کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ بروئیل اس پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ کہیں وہ موقع دیکھ کر فرار نہ ہو جائے۔ کام ختم کر کے جب وہ اپنی کوٹھڑی میں سونے کے لیے جاتا، تب بھی وہ باہر سے تالا لگا دیتا تھا۔ چند روز کے دوران ہی اُس قیدی نے اپنے کام اور کم گوئی کے سبب بروئیل کا دل جیت لیا۔''

''اچھا...'' میں نے ہنکارا بھرا۔

''سننا ہے تو خاموش رہ کر سنو، اب اگر تم بولے تو میں کچھ نہیں سناؤں گا۔'' اس کے لہجے سے ناراضی عیاں تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''خاموش طبع قیدی واقعی بے ضرر تھا۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ بروئیل اور اس کے سارے دوست شرابی تھے۔ اکثر ہفتے کی رات وہ سارے لوگ اُس کے گھر پر جمع ہوتے اور رات گئے تک شراب پیتے۔ ایک دن بروئیل نے سوچا کہ وہ اپنے دوستوں سے ایک چھوٹا سا مذاق کرے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قیدی کو حکم دے گا کہ جب اُس کے دوست گھر آئیں تو وہ واش روم میں جا کر چھپ جائے۔ جونہی اس کا کوئی دوست شراب کے نشے میں دھت وہاں پہنچے، یہ اچانک اس کے سامنے خاموشی سے آ کر کھڑا ہو جائے۔ واش روم میں ویسے بھی روشنی بہت کم ہوتی تھی۔ ایسے میں چمکتے دمکتے شخص کو اچانک سامنے پا کر کوئی بھی خوف زدہ ہو سکتا ہے۔ بروئیل کا خیال تھا کہ اس کا جو دوست سب سے زیادہ خوف زدہ ہوگا، سب مل کر اس کا خوب مذاق اڑائیں گے۔ بظاہر یہ ایک بے ضرر مذاق تھا۔ قیدی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہفتے کی رات میں دو دن باقی تھے مگر جمعے کی شام کو ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

''قیدی فیکٹری میں کام کر رہا تھا، جب بروئیل واش روم گیا۔ اُسے وہاں کافی ناگوار بُو محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل شام تو اُس کے دوست آنے والے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ کل دن میں ہی سیپٹک ٹینک کی صفائی کروالی جائے۔ اُس کے ذہن میں فوراً قیدی کا خیال آیا۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔

''میرا کام ختم ہو گیا ہے۔'' قیدی نے آ کر بروئیل سے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے، اب کل صبح تک آرام کرو۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ یہ سن کر وہ اپنی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا۔ اچانک بروئیل کو کچھ یاد آیا۔ ''سنو... ذرا اِدھر آؤ۔'' اس نے قیدی کو پکارا۔

''جی سر!'' قیدی جاتے جاتے پلٹ کر آیا۔

''تمہارے لیے کل کا کام سوچ لیا ہے۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت بہتر۔" کم گو قیدی نے سپاٹ لہجے میں مختصر سا جواب دیا۔

"وہ ذرا مختلف سا کام ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں پسند آئے گا۔" بروبل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر قیدی کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے۔ وہ یہاں پر گدھوں کی طرح کام کرتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ آخر ایسا کیا مختلف کام ہے۔

"میرا خیال ہے کہ سیپٹک ٹینک بھر گیا ہے۔" بروبل نے قیدی کی طرف دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ "واش روم میں بہت... بو ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل تم اس کی صفائی کر ڈالو۔ ویسے بھی کل شام میرے دوست آنے والے ہیں۔"

"کیا..." قیدی نے حیرت سے کہا۔ "نہیں نہیں، میں یہ کام نہیں کرسکتا۔" اس نے ضدی بچوں کی طرح نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا ہے، اس کے لیے تم کسی اور کو ڈھونڈ لو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم یہ کام کرو... ایک اور نیا کام سیکھ لو گے۔" بروبل نے اس کے انکار کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس کی ہی کہی بات کو دلیل بنا کر کہا۔

"میں تو یہ کام ہرگز نہیں کرسکتا۔ تم یہ کام کرنے والے کسی اور شخص کو دیکھ لو۔" اس نے صاف انکار کیا اور اپنی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا۔

"رکو..." اسے جاتا دیکھ کر بروبل غصے کی حالت میں کرسی سے اٹھا۔ اس کی آواز سن کر قیدی جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ وہ اس کے قریب پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ اس نے نال اس کی طرف کی۔ "اب بولو..." اس نے فاتح .... لہجے میں قیدی سے پوچھا۔ اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ انکار نہیں کرسکے گا اور فوراً ہاں کردے گا۔

قیدی چند لمحوں تک کبھی پستول اور کبھی بروبل کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت جھلک رہی تھی۔ "نہیں کروں گا۔" اس نے ایک بار پھر انکار کردیا۔

قیدی کے انکار پر بروبل کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اس کا سرخ چہرہ غصے کے باعث اور زیادہ تمتمانے لگا۔ "یاد رکھو... میں جیل کا ڈپٹی بھی ہوں، شیرف کو یہ بتایا تو وہ تمہاری کھال ادھیڑ دے گا۔"

"مجھے پروا نہیں۔" قیدی نے بے پروائی سے کہا۔ "اتنا زیادہ گندہ کام..." یہ کہتے ہوئے اس نے زمین پر تھوک دیا۔

یہ دیکھ کر تو بروبل کے صبر کا پیمانہ ہی لبریز ہوگیا۔ قیدی اس کے سامنے بالکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ وہ صرف ایک پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ بروبل آگے بڑھا اور پستول کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔ "اب بھی نہیں؟" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں..." اس نے پستول اور بروبل کی دھمکی، دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تیری یہ مجال..." بروبل نے کہا اور ٹریگر دبا دیا۔ نال اس کے سینے پر گڑی ہوئی تھی۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں اتر گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرتا چلا گیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا۔ اس کے گرتے ہی بروبل بھی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ قیدی کی آنکھوں میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔

"دیکھ لیا اپنی ضد کا انجام۔" بروبل نے نفرت سے کہا۔

یہ سن کر قیدی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنا خون آلود ہاتھ نہایت دقت سے اوپر اٹھایا اور ہلکے سے اس کی ناک پر لگا دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مر نہیں رہا بلکہ ایک ضدی بچے کی طرح، جس کے ساتھ اس کے بڑے نے کوئی مذاق کیا تھا، ضد بھول کر کھیلنے کی کوشش کررہا تھا۔

"قیدی نے بروبل کی ناک پر ہاتھ لگایا تو خون اس کے چہرے پر بھی لگ گیا۔ بروبل کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اس نے ایک بار پھر پستول کی نال زمین پر گرے قیدی کے سینے پر ٹکائی۔ گولی چلنے کی دبی دبی سی آواز آئی۔ ایک اور گولی قیدی کے جسم میں اتر گئی۔ اس کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اس کے جسم میں دوسری گولی سے بننے والے سوراخ سے، جسم کا باقی ماندہ خون تیزی سے بہنے لگا۔

"بروبل کھڑا ہوا تو اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھ بُری طرح خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ چند لمحوں پہلے جیتے جاگتے سانس لینے والے قیدی کی لاش اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں میں ڈوبے تابوت فیکٹری کے ویران احاطے کا وہ منظر بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا۔

"بروبل واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کرسی کے ہتھے پر رکھا ہوا سگار اٹھا کر جلانے لگا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بار بار اس کی نظریں قیدی کی لاش کی جانب اٹھ رہی تھیں۔



سگار پیتے ہوئے وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"اگرچہ مرنے والا ایک قیدی تھا جسے کاؤنٹی کی عدالت نے صرف توے دن کے لیے قید کی سزا سنائی تھی۔ وہ جیل سے اسے غیر قانونی طور پر اپنی تابوت فیکٹری میں لاکر کام کروا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹی کا باقاعدہ ملازم بھی تھا۔ اب اسے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ جب اس قتل کا بھانڈا پھوٹے گا تو نہ صرف اس کی بلکہ شیرف کی بھی نوکری جائے گی۔ شیرف کو اس کے علاوہ بھی سزا مل سکتی ہے مگر اسے جو سزا ملے گی، اس کا خیال آتے ہی خوف اس کے چہرے پر جھلک آیا۔ اسے سزائے موت یا عمر قید بھی مل سکتی ہے۔ "میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔" سزا کا سوچتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"بروبل نہایت بے چینی سے اِدھر... اُدھر ٹہل رہا تھا۔ لاش اُسی جگہ پڑی ہوئی تھی۔ بہنے والا خون جمنے لگا تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ آخر کافی دیر تک سوچنے کے بعد بروبل نے اپنا پورا منصوبہ تیار کرلیا۔

"اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ قیدی کی لاش کو آدھی رات میں دفنا دے تو کوئی بھی شخص یہ بات نہیں جان پائے گا کہ قیدی کے ساتھ حقیقت میں ہوا کیا تھا۔ جہاں تک شیرف کی بات ہے، وہ اسے یہ کہہ کر مطمئن کردے گا کہ سہ پہر کے وقت وہ جب کچن میں چائے بنانے کے لیے گیا تو وہ موقع پا کر فرار ہوگیا۔ جاتے جاتے وہ اس کی قیمتی گھڑی، بٹوا اور کچھ دوسری قیمتی چیزیں بھی ساتھ لے گیا ہے۔ اس طرح شیرف اُس کی بات پر یقین کرلے گا۔ پھر وہ دونوں مل کر ایک رپورٹ تیار کرکے پولیس اور کاؤنٹی عدالت میں پیش کردیں گے۔ معمولی سی انکوائری ہوگی اور پھر پولیس مفرور قیدی کو تلاش کرتی رہے گی۔ یوں وہ اس معاملے سے صاف بچ نکلے گا۔"

یہاں تک سنانے کے بعد سلیری خاموش ہوگیا اور اپنی گود میں پڑا ہوا گٹار اٹھا کر چھیڑنے لگا۔ وہ بظاہر میری طرف سے بالکل لاتعلق تھا۔ میں بھی کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولا تو میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "ایک بات تو ہے کہ ہمیں کسی شخص کی اس طرح جان لینا نہیں چاہیے۔" یہ سن کر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "اس قیدی کی لاش کا کیا ہوا؟" میں نے اب براہِ راست سوال کیا۔

یہ سن کر اس نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا مگر کچھ نہ بولا اور خاموشی سے گٹار چھیلتا رہا۔ کافی دیر گزر گئی۔ جب اس کا دل گٹھڑیاں چوسنے سے بھر گیا تو اس نے آسٹین سے منہ صاف کیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "آدھی رات کا وقت ہوگا، جب بروبل اپنی فیکٹری سے نکلا۔ وہ سیدھا سینٹ لوئیس قبرستان پہنچا۔ اُس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سامنے واقع چرچ میں بھی مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک چادر میں لپٹی ہوئی قیدی کی لاش تھی جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں بیلچہ تھا۔

"چند روز پہلے اس قبرستان میں قصبے کے لاوارث بوڑھے انکل سمپسن کو دفنایا گیا تھا۔ اس کی میت کے لیے تابوت بروبل کی فیکٹری کا تیار کردہ تھا۔ اس نے بوڑھے کی تدفین میں بھی شرکت کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی قبر بالکل تازہ اور کچی ہے جسے کھودنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ قبر کہاں ہے، اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا سمپسن کی قبر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اپنے ہی تیار کردہ تابوت کا ڈھکن اٹھا کر قیدی کی لاش کو سمپسن کی میت کے اوپر لٹا رہا تھا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر ہی وہ کام سے فارغ ہو کر واپس فیکٹری پہنچ چکا تھا۔ اسے نہ تو قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے کسی نے دیکھا اور نہ ہی باہر نکلتے ہوئے اُس پر کسی کی نظر پڑی۔ سرِ شام اس کے ہاتھوں سرزد ہونے والا جرم اپنے تمام تر ثبوتوں کے ساتھ رات کی تاریکی میں منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگیا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ اب کوئی بھی شخص چاہے لاکھ جتن کرلے، قیدی کی لاش کو کبھی دریافت نہیں کرسکے گا اور نہ ہی کبھی وہ اس جرم کی سزا بھگتے گا۔"

سلیری خاموش تھا اور میں اُس کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کررہا تھا۔ کئی بار اُس سے بروبل اسٹاکوس کی کہانی سن چکا تھا لیکن اس بار اُس نے پرانی کہانی ایک نئے انداز سے سنائی تھی۔ اس میں کرداروں کا بھی اضافہ کردیا تھا۔ مثلاً اس سے پہلے شیرف اس کی کہانی میں نہیں تھا۔ اس بار اس نے قیدی کی تدفین کا واقعہ بھی شامل کردیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بالکل نئی تھی کہ بروبل نے سینٹ لوئیس قبرستان میں اُس قیدی کی لاش کو انکل سمپسن کی قبر کھود کر اُن کے تابوت میں رکھ کر دفن کیا ہے۔ "سلیری... تم نہایت ہی اعلیٰ درجے کے جھوٹے لڑکے ہو۔" کافی دیر تک غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے، وہ صرف اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ "تمہیں قبرستان کو اپنی جھوٹی کہانی میں گھسیٹنا نہیں چاہیے تھا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں نہیں ٹو ٹاپ... میں بالکل جھوٹ نہیں بول رہا۔" میری بات سنتے ہی وہ تلملا کر بولا۔ "جو کچھ تمہیں بتایا ہے، یہ بالکل سچ ہے۔ دیکھ لینا کسی دن قیدی کی روح انکل سمپسن کی قبر سے نکل کر بروبل سے ضرور انتقام لے گی۔"

"معاف کرو۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اب ایک نیا مگر بالکل جھوٹا قصہ سنانا شروع نہ کر دینا۔ میں تمہاری بکواس سن سن کر تھک چکا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اپنا سر دبانے لگا جیسے بہت درد ہو رہا ہو۔

میری بات سن کر وہ خاموش رہا۔ شاید اس وقت وہ کوئی اور کہانی گھڑ رہا ہوگا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک بیٹھے رہے۔ تابوت فیکٹری ہماری نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہم خاموشی سے اسے تک رہے تھے۔ اچانک تابوت فیکٹری کے اندر سے تین آدمی باہر نکلے۔ وہ ٹرک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ٹرک شاید فیکٹری کے لیے لکڑی لے کر آیا ہوگا مگر ان تین آدمیوں کو ٹرک میں بیٹھتا دیکھ کر میری رائے بدل چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بروبل کے مزدور تھے اور ٹرک ڈرائیور ان میں سے کسی کا رشتے دار تھا جو کام ختم ہونے پر انہیں لینے کے لیے آیا تھا۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد ٹرک اسٹارٹ ہوا اور اسی راستے پر واپس چل دیا جس طرف سے آیا تھا۔

"کیا خیال ہے؟" اس نے میرا... بازو ہلاتے ہوئے کہا۔ "قریب چل کر نہ دیکھا جائے کہ وہاں کیا کچھ ہوتا ہے؟" ٹرک کو جاتا دیکھ کر اسے نیا خیال سوجھا۔ "اب تو سب جا چکے ہیں، دیکھتے ہیں وہاں کیا کچھ ہے۔"

"میں لکڑی کا برادہ کئی بار دیکھ چکا ہوں اور تابوت بھی۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "اس وقت مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے اور میں کہیں اور جانے کے بجائے سیدھا اپنے گھر جانے کا سوچ رہا ہوں۔" مجھے امید تھی کہ وہ سمجھ جائے گا کہ میں تابوت فیکٹری کا جائزہ لینے کے حق میں نہیں ہوں، کم از کم اس وقت تو وہاں ہرگز نہیں جانا چاہتا۔ میں اسے یہ کہنا بھی چاہتا تھا کہ اگر اسے فیکٹری میں جانے کا شوق ہے تو خود چلا جائے مگر مجھے معاف رکھے لیکن میں ایسا کہہ نہ سکا۔ ویسے بھی میں نے جو کچھ کہا، وہ رائگاں ہی گیا۔

سلیری ایک بار جو اپنے دل میں ٹھان لیتا تھا، وہ کر کے ہی چھوڑتا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے میری بات سنی مگر کیا وہی جو اس کے من میں تھا۔ اس نے جواب میں ایک لفظ کہے بنا، مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کھڑا کیا اور فیکٹری کی طرف چلنے لگا۔ میں اس کے ساتھ گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔

ہم دونوں جاسوسوں کے انداز میں چھپتے چھپاتے فیکٹری تک پہنچے۔ گرد آلود شیشوں والی کھڑکیوں سے منہ لگا کر اندر جھانکتے رہے لیکن ہمیں کسی بھی کمرے کے اندر کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ لکڑی کے تختے، آریاں اور اسی طرح کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے کئی کمروں کے اندر جھانک لیا لیکن کہیں بھی کوئی تابوت نظر نہیں آیا۔ نہ تو مکمل اور نہ ہی ادھورا۔ "بڑی عجیب بات ہے۔ یہ تابوت بنوا کر کہاں رکھتا ہے۔" یہ دیکھ کر میں نے سلیری سے کہا۔

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ ممکن ہے کہ تابوت بن جانے کے بعد وہ اسے تہ خانے میں منتقل کر دیتا ہو۔" سلیری نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

ہم دونوں کچھ دیر تک فیکٹری کا باہر سے جائزہ لینے کے بعد اندر کی طرف بڑھے لیکن داخلی دروازہ بند تھا۔ تالا دروازے کے اندر نصب تھا۔ سلیری نے لٹو پکر کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ نہ کھلا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر اس نے دروازے پر زوردار لات ماری مگر وہ نہ کھلا۔ اس نے لگاتار دو تین بار زوردار لاتیں ماریں آخر دروازے کا لاک ٹوٹ گیا یا پھر شاید پرانا ہونے کی وجہ سے لاتوں کی مار سے کھل گیا۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ وہ بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ اندر کا ماحول نیم تاریک تھا۔ کمرے کے اندر وارنش، لکڑی اور پالش میں استعمال ہونے والی دوسری چیزوں کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ ہم دونوں چند قدم آگے بڑھے۔ وہاں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تین بڑی بڑی میزیں رکھی ہوئی تھیں جن پر نیم تیار تابوت رکھے ہوئے تھے۔

اگرچہ کمرے میں لائٹ تھی لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ بلب نہیں جلائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ روشنی دیکھ کر کسی کو شک ہو جائے مگر کمرے کی نیم تاریکی میں ہم وہاں کا اچھی طرح جائزہ نہیں لے پا رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک میز پر سلیری کو موم بتی اور ماچس نظر آ گئی۔ اس نے موم بتی جلائی اور وہاں رکھے تابوتوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر ان کے اندر جھانکنے لگا۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ویسے بھی مجھے یہاں خاصا ڈر لگ رہا تھا۔

موم بتی کی زرد روشنی میں ماحول نہایت بھیانک لگ رہا تھا لیکن سلیری کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہر طرح کے خوف سے عاری ہے۔ ایک تابوت ایسا تھا جو بظاہر مکمل تھا



لیکن اس کی فنشنگ ابھی باقی تھی۔ وہ پائن کی لکڑی کا بنا ہوا تھا جس کی مہک اب تک آ رہی تھی۔

"ٹو ٹاپ... اِدھر آؤ۔" سلیری نے نیم تیار تابوت کا ڈھکن اٹھا کر موم بتی کی روشنی اس کے اندر ڈالتے ہوئے مجھے پکارا۔

"کیا ہے؟" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"اس کے اندر لیٹ کر دیکھو اور پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے بڑی سادگی سے اپنا نیا آئیڈیا مجھ پر ظاہر کیا۔

"کیا...؟" اس کی بات سنتے ہی میں خوف سے کانپ اٹھا۔ "نہیں نہیں... میں ایسا نہیں کروں گا۔"

"تم ایسا کر سکتے ہو۔" اس نے مجھے پچکارتے ہوئے کہا۔ یہ بات تو میں جانتا ہی تھا کہ وہ جو کہتا ہے، کر کے دکھاتا ہے مگر میں اس کی یہ بات ماننے والا نہیں تھا۔ یہ سوچتے ہی میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی کہ اُس تابوت میں زندہ لیٹ جاؤں۔

"کیا سوچ رہے ہو، ذرا سی ہمت کرو۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔" سلیری نے میری خاموش تشویش بھانپ لی تھی۔ اس لیے ایک بار پھر نرم لہجے میں اپنا مدعا دہرایا۔

"یہ کچا ہے، اس میں برادہ موجود ہے۔ لکڑی کی مہک بھی بہت تیز ہے۔" میں نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے گرد اور پائن کی مہک سے سخت الرجی ہے۔ مجھے چھینکیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔"

"تم سانس روک کر سیدھے لیٹ جانا۔ ایک دو منٹ کی ہی تو بات ہے۔ مان جاؤ نا۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔" اس بار اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم مجھے جھوٹا کہتے ہو مگر خود مجھ سے بڑے جھوٹے ہو۔ تمہیں کوئی الرجی نہیں پائن کی مہک سے۔ پورے کمرے میں لکڑی کا برادہ پھیلا ہوا ہے۔ پائن کی تیز بو مہک رہی ہے اور ہم پچھلے دس منٹ سے یہاں ہیں مگر اب تک تمہیں ایک چھینک بھی نہیں آئی ہے۔" اس کی دلیل نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا۔

"مجھے اس میں لیٹنے سے ڈر لگ رہا ہے۔" آخر میں نے سچ کہہ دیا۔

"تو یوں کہو نا کہ تم بزدل ہو۔"

"میں ہرگز بزدل نہیں ہوں۔" اس کا طعنہ سن کر میں تلملا گیا۔

"تو پھر کیا ہوا؟ اگر بہادر ہو تو لیٹ کر دکھاؤ۔"

"اس میں لیٹنا کون سا بہادری کا کام ہے۔ تم جو چاہے کہہ لو، میں اس میں نہیں لیٹوں گا۔"

"دیکھو... اگر تم اس میں کچھ دیر تک لیٹ کر دکھاؤ گے تو پھر میں تمہیں اس کے بدلے میں کچھ دوں گا۔" اس نے میرا صاف انکار سن کر پینترا بدلا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے تابوت میں لٹا کر ہی دم لے گا۔

"ویسے... اگر میں تمہاری بات مان لوں تو تم مجھے کیا دو گے؟" میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کی پیشکش کے بارے میں پوچھا۔

"تمہیں میرا شکاری چاقو پسند ہے نا؟"

"ہاں... وہ تو ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"میں یہ چاقو تمہیں ایک ہفتے کے لیے دے دوں گا۔"

"واقعی..." میرے لہجے میں حیرت تھی۔ کہاں تو سلیری مجھے اسے ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا اور اب اسے ہفتہ بھر کے لیے دینے پر تیار ہو گیا۔

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟" چاقو کا سن کر میں دل ہی دل میں یہ کام کرنے پر خود کو تیار کر چکا تھا تاہم اب تک مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا۔

"نہیں بالکل سچ۔" تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو پھر تم کبھی بھی میری گھر کی بنی ہوئی چکن فرائیڈ اسٹیک نہیں کھا سکو گے۔" میں نے بھی اسے دھمکی دی کہ وعدہ خلافی کی صورت میں وہ کیا کھو سکتا ہے۔

"بالکل ٹھیک۔" اس نے لمحہ بھر کی تاخیر کیے بنا کہا۔

مجھے یقین آ گیا کہ وہ جو وعدہ کر رہا ہے، ہر صورت اسے پورا کرے گا۔ میں فوراً میز کے اوپر چڑھا اور تابوت میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھوں کو ڈریکولا کی طرح سینے پر باندھ لیا۔

"شاباش... جب تک میں نہ کہوں یونہی لیٹے رہو۔"

مجھے تابوت میں لیٹے ہوئے بمشکل دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن کان کھلے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے کمرے کے باہر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہ صورتِ حال



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غیر متوقع تھی۔ تابوت نامکمل تھا اور اس کے دائیں جانب کی لکڑی میں ایک سوراخ تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور گردن موڑ کر سوراخ سے باہر کی طرف دیکھا۔

سلیری نے موم بتی بجھادی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے پیچھے کی جانب قدم اٹھاتا ہوا زیادہ اندھیرے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اس طرح اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا جیسے طوفانی آندھی اس کی طرف بڑھ رہی ہے یا پھر وہ کسی شے کو دیکھنے سے کترا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ میرا دل چاہا کہ فوراً اٹھ کر یہاں سے نکل بھاگوں مگر یہ سوچ کر وہیں پڑا رہا کہ یہاں سے باہر نکلنے پر نہ جانے کس نئی مصیبت کا سامنا ہو جائے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ جہاں ہوں، وہیں پڑا رہوں۔ یہ سوچ کر میں کچھ اور سمٹ گیا۔ میں نے سوراخ سے باہر کی طرف نظر ڈالی۔ سلیری کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ کمرے کی تاریکی نے اسے اپنے اندر مکمل طور پر چھپا لیا ہے۔

قدموں کی چاپ رفتہ رفتہ قریب آنے لگی۔ کچھ دیر بعد مزید قریب سے سنائی دینے لگی۔ لگتا تھا کہ کوئی دروازے کے باہر ٹہل رہا ہے۔ میں بدستور دم سادھے لیٹا ہوا، تابوت کے سوراخ سے باہر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک دروازہ چرچرایا اور پھر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ بروبل اسٹاکوس کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''کمبخت جاتے ہوئے دروازہ بھی لاک کر کے نہیں جاتے۔'' یہ کہتا ہوا بروبل اندر داخل ہوا اور برابر کی دیوار پر لگے بٹن کو دبا کر بلب روشن کر دیا۔ زرد روشنی والا بلب جلنے سے کمرے میں روشنی تو ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود اتنے بڑے ہال کے لیے یہ ناکافی تھی۔ اب وہ کمرے میں رکھی اُس کرسی کی طرف بڑھنے لگا جو مجھے تابوت کے سوراخ سے صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے بارے میں پورے قصبے میں مشہور تھا کہ وہ غضب کا مے نوش ہے۔ اس وقت بھی وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا۔ بڑی سی بوتل اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی ایک بار پھر اس کا شغلِ مے نوشی جاری ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سگار بھی سلگا لیا تھا۔ کمرے میں جیسے ہی سگار کا دھواں پھیلا، وہاں آرام فرما مچھر بھی بے تاب ہو گئے۔ کچھ تو تابوت کے اندر گھس آئے اور میرے کانوں میں بانسری بجانے لگے۔ ایک دو نے میرے گالوں پر بھی کاٹا۔ اس وقت میں خود کو جہنم میں محسوس کر رہا تھا اور سامنے کا دروازہ مجھے آزادی کا دَر نظر آرہا تھا، جس کے پار میری جنت تھی۔ میں نے ایک دو بار سلیری کو بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایسی جگہ دُبکا ہوا تھا جہاں سے مجھے تو کیا خود بروبل کو بھی نظر نہیں آرہا ہوگا۔ تبھی تو وہ سکون سے اپنے شغل میں مصروف تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور دل طرح طرح کے وسوسوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں بروبل نے کرسی کی پشت پر سر ٹکایا اور خراٹے لینے لگا۔ میں بدستور اسی کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک کرسی کی پشت کے پیچھے سے سلیری نمودار ہوا۔ خراٹوں کے باوجود اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ بروبل سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اس نے ماچس کی تیلی جلائی اور پھر بجھا دی۔ سلیری اسکول کے اسکاؤٹس میں شامل رہا ہے اسی لیے وہ اشارے سے کوئی خاص پیغام دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں کبھی بھی اچھا اسکاؤٹ نہیں بن سکا تھا، شاید اسی لیے اُس کا اشارہ بھی نہیں سمجھ سکا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک اور تیلی جلائی اور بجھا دی مگر میں اس بار بھی اس کا اشارہ نہیں سمجھ سکا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح یہاں سے نکلا جائے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ بروبل اتنی زیادہ پی لے کہ جب میں یہاں سے دوڑ لگاؤں تو وہ میرا پیچھا کرنے کے قابل نہ ہو یا پھر وہ سردی سے تنگ آکر خود ہی یہاں سے اٹھ کر سونے کے لیے چلا جائے۔ مجھے کرسی کی پشت پر اس کا ڈھلکا ہوا سر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کے خراٹوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں چاہتا تو اس وقت ہی تابوت سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ میری یہ کوشش کامیاب بھی ہو سکتی تھی لیکن میں ڈرا ہوا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ جاگ نہ رہا ہو۔

میں تابوت میں ڈریکولا کی طرح لیٹا ہوا تھا۔ خوف سے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور چہرے پر تناؤ تھا۔ میں نے بالآخر یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ میری نظریں تابوت کے سوراخ سے بروبل پر جمی ہوئی تھیں کہ اس نے خراٹے مارنا بند کیے اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر انگڑائی لی۔ میں نے فوراً ارادہ بدل دیا۔ تو بہ شکن انگڑائی کے بعد وہ ایک بار پھر کرسی پر ڈھے گیا۔

چند لمحوں بعد بروبل کی کرسی کے پیچھے سلیری پھر نظر آیا۔ اس بار اس نے ماچس کی تیلی نہیں جلائی بلکہ انگلی اٹھا کر پہلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس نے بند مٹھی سے ایک کے بعد ایک کر کے تین انگلیاں کھولیں۔ اس بار میں اس کا اشارہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ جیسے ہی وہ تیسری انگلی کھولے، مجھے تابوت سے نکل کر دروازے کی



طرف دوڑ لگانی ہوگی۔ میں نے سوراخ سے بروبل کی طرف دیکھا، وہ کرسی پر آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ میں نے اپنا داہنا ہاتھ اوپر اٹھا کر اسے ''سمجھ گیا'' کا اشارہ کیا۔ اس بار سلیری شاید مطمئن ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر کرسی کے پیچھے دُبک گیا۔ میں سوراخ سے بدستور اسی جانب نظریں جمائے ہوئے تھا اور اشارہ ملتے ہی چھلانگ مار کر باہر نکلنے کے لیے تیار تھا۔ اب مجھے صرف سلیری کے سگنل کا انتظار تھا۔

سلیری گھٹنوں کے بل کھسکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بروبل کی گردن دوسری جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اسے دیکھ سکتا ہے۔ بوتل اس کی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور انگلی سے 'ایک، دو، تین' کا اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے دروازہ کھولا اور پلک جھپکتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جس سے بروبل کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ جاگ چکا ہے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کُن لمحہ تھا۔ وہ باہر نکل چکا تھا اور اب مجھے بھی جانا تھا۔ میں تابوت میں کھڑا ہوا اور اگلے ہی لمحے باہر چھلانگ دی۔ میرے فرش پر پاؤں پڑے تو دھپ کی آواز آئی۔ نظریں سامنے اٹھیں تو چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا بروبل مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

''تم کمینے۔'' بروبل چلّایا۔

میں کھڑے کھڑے پتھر کا بت بن چکا تھا۔ پاؤں من من بھر وزنی ہو رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اس نے بغلی ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا اور اب میرے لیے یہاں سے بھاگنا محال تھا۔ پستول دیکھ کر تو میری آنکھوں کے سامنے تارے جھلملانے لگے۔ وہ نال میری طرف کیے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ پورا جسم ٹھنڈے پسینے میں نہا چکا تھا۔

''میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں، قتل کر دوں گا۔'' میرے قریب پہنچ کر وہ غصے سے دہاڑا۔ اسی دوران میں کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میری اور بروبل کی نظریں بیک وقت کھڑکی کی طرف پلٹیں۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں کھڑکی میں لگا شیشہ ٹوٹنے کی وجہ سمجھ پاتے، اس میں سے ایک چاقو اڑتا ہوا آیا۔ چشمِ زدن میں وہ بروبل کی پنڈلی میں پیوست ہو چکا تھا۔ میں پہچان گیا۔ یہ سلیری کا وہ چاقو تھا جسے اس نے تابوت میں لیٹنے کے عوض بطور معاوضہ ایک ہفتے تک کے لیے مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

بروبل درد سے کراہتے ہوئے نیچے جھک کر اپنی پنڈلی کو دیکھنے لگا۔ چاقو بہت زیادہ اندر تک پیوست نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی زخم کافی گہرا آیا ہوگا۔ تبھی تو بہتا ہوا خون اس کے جوتے کو سرخ کیے جا رہا تھا۔ پستول والا ہاتھ بھی نیچے تھا۔ اب نال کا رخ میرے سینے کے بجائے زمین کی طرف تھا۔

وہ اپنے زخم کو دیکھنے کے لیے نیچے جھکا۔ اس کی پشت میری طرف ہو گئی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظریں مجھ پر سے ہٹیں، میں نیچے جھکا اور نہایت برق رفتاری سے چاقو کھینچا۔ چاقو کھینچتے ہوئے میں نے بروبل کی نہایت دردناک چیخ سنی تھی لیکن اس وقت اس کی چیخ کے بارے میں غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے فوراً تابوت فیکٹری کے اس جہنم سے نکلنا تھا۔ چاقو ہاتھ میں آتے ہی میں دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔ مجھے دو سو فیصد یقین تھا کہ سلیری باہر کھڑا میرا منتظر ہے۔ یقیناً وہ لمحوں میں ہونے والی اس واردات کو بھی کھڑکی سے دیکھ چکا ہوگا۔

میں جیسے ہی باہر نکلا، عقب سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ خوش قسمتی سے گولی مجھے نہیں لگی تھی البتہ میں یہ ضرور سمجھا کہ سلیری بروبل کی گولی کا نشانہ بن گیا ہوگا مگر اُس وقت مجھے سلیری کی نہیں خود اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ میں گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے بروبل بھی گالیاں دیتا ہوا آرہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کی پنڈلی میں زخم ہے، وہ بوڑھا ہے اور نشے میں بھی، وہ مجھے کہاں پکڑ پائے گا۔ اسی دوران میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں اس بار بھی اس کا نشانہ بننے سے بچ گیا۔ وہ مجھے دوبارہ پکڑ سکتا تھا اور پکڑے بنا بھی مار سکتا تھا۔ اس کے پاس پستول تھا۔ پستول کا خیال آتے ہی میں ایک بار پھر پوری قوت سے دوڑنے لگا۔

''اس مرتبہ میں تمہیں ہرگز نہیں بخشوں گا سفید خچر۔'' لنگڑا کر بھاگنے والے موٹے بروبل نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے اس کی بات سن لی مگر لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رکا۔ ''یہ تمہیں قتل کرنے کا بہتر موقع ہے سفید کتے۔'' وہ پھر دہاڑا مگر میں بھاگتا چلا گیا۔

بھاگتے ہوئے بھی میرا ذہن کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھے ''سفید کتا'' اور ''اس مرتبہ'' کیوں کہا۔ کہیں سلیری کی کہانی سچی تو نہیں تھی؟ سورج مکھی آدمی کو اس نے حقیقت میں قتل کر کے انکل سیمسن کی قبر میں دفن کر دیا ہو اور اب وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا بھوت قبر سے نکل کر آگیا ہے۔ اسی لیے وہ سخت خوف زدہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سورج مکھی قیدی کا حلیہ مجھ سے ملتا جلتا ہو اور تابوت سے نکلتا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھ کر وہ مجھے وہی سمجھ بیٹھا ہو۔ خیر حقیقت جو بھی ہو... اُس وقت میرے لیے سب سے بڑی بات جان بچانا تھی، سو یہ کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں ہلکا سا مڑا۔ اب میرا رخ ریلوے لائن کی طرف تھا۔

''ایک مرتبہ میرے ہاتھ آجاؤ، اس بار میں تمہیں جلا کر راکھ کر ڈالوں گا ذلیل کتے۔'' وہ ایک بار پھر چلایا لیکن میں اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ ایک بار بھی گردن موڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ میرے کتنا قریب پہنچ چکا ہے۔ اسی دوران میں دو بار پھر گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی طرح دوڑتے دوڑتے ریلوے لائن عبور کروں اور پھر اس کے برابر لگی جالی کو پار کر کے دوسری طرف نکل جاؤں۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اُس پار جھاڑیاں تھیں جس کے بیچوں بیچ ہوتے ہوئے میں گھر پہنچ سکتا تھا۔

میں ہلکی سے چڑھائی پر دوڑتا ہوا ریلوے لائن تک پہنچ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے پار کرتا، ایک زوردار ٹھوکر لگی اور میں چیختا ہوا نیچے گرا۔ گرتے ہوئے میرا گھٹنا پٹری سے ٹکرا گیا۔ چوٹ لگنے سے اتنی شدت کے ساتھ درد کی ٹیسیں اٹھیں کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے فوراً... خود کو سنبھالا اور اٹھنے..... کی کوشش کی لیکن درد بہت شدید تھا۔ اسی دوران مجھے سامنے کی طرف روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی ریل گاڑی کے انجن کی تھی جو میرے عقب سے آرہی تھی۔ ''اوہ میرے خدا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس وقت میں نہایت سنگین خطرے سے دوچار تھا۔ ایک طرف ریل گاڑی سے کچل کر ہلاک ہو جانے کا خطرہ تھا اور اس سے بچ جاتا تو بروبل کی گولی کا نشانہ بن جانے کا یقین تھا۔ مجھے لگا کہ موت اب صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ میں نے ایک بار پھر اپنی پوری قوت مجتمع کی اور اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بروبل ریلوے لائن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ روشنی بھی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں بروبل بھی پٹری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ انجن کی زوردار سیٹی گونجی۔ میں سمجھ گیا کہ اب موت یقینی ہے۔ میں نے آخری بار اٹھنے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر میں پٹری پر سے نہیں اٹھا تو دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔ میری نظر بدستور بروبل پر تھی۔

اچانک بروبل پٹریوں پر گر پڑا۔ گاڑی بھی بہت قریب پہنچ چکی تھی اور پھر پتا نہیں کس نے مجھے دھکیلا۔ میں پٹری سے اچھلا اور ڈھلوان پر لڑھکتا ہوا جھاڑیوں کی طرف گرتا چلا گیا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جس لمحے میں نیچے کی طرف گر رہا تھا، میری ناک میں ڈیزل کا دھواں گھس گیا تھا اور کانوں .... میں ریل کے گزرنے کی دھمک گونج رہی تھی۔

''ہے اٹھو... اٹھو۔'' میں نیچے گرتے ہوئے شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسی عالم غفلت میں مجھے ایسا لگا کہ کوئی میرا کالر پکڑ کر مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ ''اٹھو... اٹھو، اٹھ بھی جاؤ۔''

میں نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں۔ اندھیرا خاصا ہو چکا تھا۔ میں نے خود پر ایک سایہ جھکا ہوا دیکھا۔ ''کون ہو تم...؟'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ شاید اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

''میں ہوں سلیری...'' اس نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ اسی دوران میں گھٹنے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ ''تم بچ گئے۔''

''ہم دونوں بچ گئے۔'' اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے بٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔

''اور بروبل...؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''اُسے دفع کرو۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''اوہ میرے خدا...'' اسی دوران درد کی ایک اور شدید لہر اٹھی۔

''تمہارا گھٹنا سوج رہا ہے۔ جلدی سے اٹھو، گھر چلتے ہیں۔''

''چلو...'' میں نے اس کے سہارے.... اٹھتے ہوئے کہا۔

کافی دیر بعد ہم قصبے تک پہنچے۔ میری وجہ سے وہ بھی دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ میں نے راستے میں کئی بار بروبل کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہا۔ وہ مجھے گھر کے قریب چھوڑ کر چلا گیا۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔

جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو پاپا کا ٹرک کھڑا ہوا تھا اور اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ مما بھی وہیں کھڑی تھیں اور بڑا بھائی بھی۔ وہ تینوں باتیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ پاپا اسی وقت گھر لوٹے تھے۔

''پتا چلا ہے کہ پہلے تو تابوت فیکٹری کے قریب گولیاں چلی تھیں۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔'' جب میں پاپا



کے قریب پہنچا تو وہ کہہ رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے میری موجودگی کا نوٹس نہیں لیا۔ اسی دوران میں میرا سب سے بڑا بھائی بھی پہنچ گیا۔

''کچھ اور پتا چلا؟'' اسے دیکھتے ہی ڈیڈی نے کہا۔

''پولیس نے لاش کے ٹکڑے اسپتال پہنچا دیے ہیں۔ شیرف بتا رہا ہے کہ مال گاڑی کا ڈرائیور کہتا ہے کہ اس نے لائن پر ایک بڑے سے وجود کو دیکھا۔ وہ سمجھا کہ شاید کوئی جنگلی جانور ہو گا۔ اس نے ہنگامی بریک لگائے مگر پھر بھی انجن اس پر سے گزر گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تو کوئی انسان تھا۔''

''نشے میں نکلا ہو گا اور پٹری پر آ کر سو گیا۔ تبھی تو مارا گیا۔''

''شیرف بھی یہی کہہ رہا ہے کہ وہ نشے کی حالت میں پٹری پر آ کر سو گیا ہو گا، ورنہ انجن ڈرائیور کو جنگلی جانور اور انسان کے درمیان فرق معلوم نہیں ہے کیا۔'' بھائی نے مما کی بات سن کر کہا۔

''چلو جی... قصہ تمام ہوا۔ ویسے بھی کون سا اچھا انسان تھا وہ۔'' پاپا نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''مما! کیا ہوا؟'' میں نے پہلی بار اپنے لب کھولے۔

''بروبل اسٹاکوس مال گاڑی کے نیچے آ کر کٹ گیا۔'' انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ویسے تم کب آئے، چلو سیدھے اندر۔'' مما کا حکم سن کر میں لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''فٹ بال کھیل رہے تھے، گر گیا۔ گھٹنے میں چوٹ لگ گئی ہے۔'' میں نے نہایت صفائی سے جھوٹ بولا۔ شاید سلیری کی صحبت کا اثر تھا کہ میرا سو فیصد جھوٹ مما کو سو فیصد سچ لگا۔ کپڑے بری طرح مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے کوٹ اتار کر نیچے پھینکا تو دبی دبی سی چھن کی آواز سنائی دی۔ اچانک مجھے چاقو کا خیال آ گیا جسے بھاگتے ہوئے میں نے ریلوے لائن پر چڑھنے سے پہلے ہی کوٹ کے اندر کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے چاقو نکالا۔ وہ بروبل کے خون سے آلودہ تھا۔ خون جم چکا تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب اندر سے دیکھی۔ خوش قسمتی سے وہاں پر خون کا کوئی دھبا نہیں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میرے بھاگنے کے دوران ہی اس پر لگا ہوا خون سوکھ چکا تھا۔ ''اب یہ میرے پاس ایک ہفتے تک رہے گا۔'' میرے لیے یہ خیال ہی خوشی کا سبب تھا کہ عارضی طور پر ہی سہی مگر میں سلیری کے شکاری چاقو کا مالک بن گیا ہوں۔ میں نے گھٹنے کی طرف دیکھا۔ وہاں

## خوشی

ڈاکٹر نے اپنی پرانی مریضہ کے شوہر سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کن الفاظ میں آپ کو اپنی بات سمجھاؤں۔۔۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ آپ کی بیوی اگلا ہفتہ بھی مشکل سے گزار سکے گی۔''

''یع۔۔۔ یعنی وہ اگلے ہفتے مر جائے گی!'' شوہر نے ہکلاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

ڈاکٹر کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ ''پھر تو میں بھی مر جاؤں گا!''

''وہ کیوں؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا نخساسا دل اتنی بڑی خوشی کیسے برداشت کر سکے گا ڈاکٹر!''

اورنگزیب کی خوشی، کراچی سے

کھال چھل چکی تھی۔

اگلے دو دن تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ گھر میں ہونے والی باتوں سے پتا چلا کہ بروبل کی لاش کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ لاش بری طرح مسخ ہو گئی تھی کہ اس کا چہرہ بھی سلامت نہیں بچا تھا۔ بروبل کی تدفین میں قصبے کے کسی شخص نے بھی شرکت نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیرف نے کسی نہ کسی طرح اس کی بیوی کا پتا حاصل کر کے اسے ٹیلی گرام بھیج دیا تھا جس کے جواب میں اس نے لکھا کہ لاش کو دفنانے کے بجائے جلا دیا جائے اور راکھ کو پیک کر کے اس کے مسوری ریاست کے پتے پر بھیج دیا جائے۔ شیرف نے ایسا ہی کیا۔ اگلے چار روز تک میں گھٹنے پر لگی چوٹ کے باعث نہ تو گھر سے نکل سکا اور نہ ہی سلیری مجھ سے ملنے کے لیے پہنچا۔ اس دوران میں، میں گھر والوں کی نظر بچا کر چاقو کو اچھی طرح دھو کر چمکا چکا تھا۔

پانچویں دن میں سو کر اٹھا تو درد میں خاصی کمی تھی۔ سوزش غائب ہو چکی تھی۔ البتہ چلتے ہوئے پاؤں میں ہلکی سی لنگڑاہٹ باقی تھی۔ ناشتے کے کافی دیر بعد میں گھر سے نکلا۔ مجھے سلیری کی تلاش تھی۔ میں اس کے کئی ٹھکانوں پر گیا مگر وہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ ملا۔ آخر مجھے یقین ہوگیا کہ اب ایک ہی جگہ ایسی بچی ہے جہاں وہ مل سکتا ہے۔ میں قصبے کے چھوٹے سے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اسٹیشن آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا اور پورے دن میں ایک دو مسافر گاڑیاں ہی یہاں رکتی تھیں۔ اس لیے وہاں کا عملہ اکثر غیر موجود ہوتا تھا۔ ایسے میں اسٹیشن کا پلیٹ فارم قصبے کے آوارہ گرد لڑکوں کا اڈا بن جاتا تھا۔

میں اسٹیشن پر پہنچا تو وہ ٹکٹ گھر کے سامنے ایک بینچ پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ ''ہائے۔''

کافی دیر تک ہم دونوں اکیلے بیٹھے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ''یہ بتاؤ، اس دن تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔

''بروبل اسی قابل تھا۔'' یہ کہتے ہوئے سلیری کے لہجے سے نفرت کا بھرپور اظہار ہو رہا تھا۔

''مگر وہ گولیاں...''

''وہ گولیاں اس نے تم پر نہیں، مجھ پر چلائی تھیں۔''

''کیا...'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اگر تم مڑ کر دیکھ لیتے تو خود ہی سمجھ جاتے اور مجھ سے یہ سوال نہیں کرتے۔''

''وہ جو بار بار کہہ رہا تھا کہ اس بار...''

''وہ بھی مجھے ہی کہہ رہا تھا۔'' سلیری نے قطع کلامی کی۔ میں نے کئی بار اس کو مارنے کی کوشش کی اور اس نے مجھے پکڑنے کی مگر..... آخر جیت میری ہی ہوئی۔''

''کیا مطلب... وہ سورج مکھی آدمی؟''

''سب کہانی تھی۔''

''تو سچ کیا ہے؟''

''یہ چاقو۔'' اس نے میری پنڈلی کو چھوتے ہوئے کہا۔

''مگر اب تو یہ میرا ہے۔ ابھی ڈیڑھ دن باقی ہیں۔''

''ذرا دکھاؤ تو... کیسا ہے میرا چاقو۔'' اس نے میری پتلون کا پائنچہ الٹتے ہوئے کہا۔ چاقو موزے میں اُڑسا ہوا تھا۔

''تم مجھے جھوٹا کہتے ہو نا...'' اس نے چاقو کے پھل پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''مگر اب نہیں۔''

''نہیں... میں جھوٹا ہوں۔ اس لیے وعدہ توڑتے ہوئے اسے واپس لے رہا ہوں۔'' وہ چاقو کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ تمہاری بروبل سے کیا دشمنی تھی؟''

''وہ میرے باپ کا قاتل تھا۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''برسوں پہلے جب میں صرف چار سال کا تھا، تب میرا باپ اس کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ ایک دن اس کمینے نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور پھر کہا کہ گولی اتفاقی طور پر چل گئی تھی۔ یوں سزا سے صاف بچ نکلا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے عبرت ناک موت ماروں گا اور میں نے ایسا کر دکھایا۔''

''اوہ... وہ سورج مکھی والا قیدی۔''

''جھوٹی کہانی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ''آخر کو میں جھوٹا ہوں نا۔''

''مگر وہ ریل کی پٹری پر گرا کیسے...''

''دراصل وہ تمہارا نہیں میرا پیچھا کر رہا تھا۔'' سلیری نے کہنا شروع کیا۔ ''جب ہم پٹری کے قریب پہنچے تو اس وقت اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور آڑ میں ہو گیا۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکا۔ جب میں نے انجن کی آواز سنی تو مجھے یہ بدلے کا بہترین موقع لگا۔ میں نے پیچھے سے اسے دھکا دیا۔ اچانک میری نظر تم پر پڑی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اگر تم مرتے تو میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں بچانے کا فیصلہ کیا۔ ٹرین سر پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے تمہیں نیچے دھکیلا اور خود بھی پٹری پر سے چھلانگ لگا دی۔ کمینے بروبل کو جان بچانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ویسے وہ سانڈ اتنا بھاری تھا کہ اتنی جلد اٹھ بھی نہیں پاتا۔''

''کیا دماغ ہے تمہارا جھوٹے۔''

''شکریہ... ویسے میں جھوٹا ہوں مگر جو کچھ تمہیں بتایا...''

''وہ سو فیصد سچ ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

''شکر ہے کہ قصبے کا کوئی فرد تو مجھے سچا سمجھتا ہے۔''

''ہاں... مگر تمہارے ساتھ رہ رہ کر اب لوگ مجھے بھی جھوٹا سمجھنے لگے ہیں۔''

''چلو... دو جھوٹے تو ایک دوسرے کا سچ جانتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص کی جیب سے دو مُڑی تُڑی سگریٹیں نکالیں۔ ''یہ لو اور عیش کرو۔''

کچھ دیر بعد ہم دونوں پٹریوں پر چلتے ہوئے اپنے منہ سے سگریٹ کا دھواں اُگل رہے تھے... ریل کے انجن کی طرح۔

☆☆





پہلی کہانی



# اعتراف

ایم اے راحت

بیس سال کا طویل عرصہ کسی بھی واقعے کو بھلا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے... لیکن زندگی کی رنگارنگی... جذبات کی نیرنگی کے باوجود کچھ کھو دینے کا احساسِ دل میں جاگزیں رہتا ہے... یہی احساسِ جرم... احساسِ تشنگی بے سکون و بے قرار رکھتا ہے... اور کھو دینے والوں کو ایک بار پھر پالینے اور کھوج لینے پر اکساتا ہے... اس کی زندگی بھی کھوئے ہوؤں کی تلاش میں سرگرداں تھی...

**ان گم گشتہ لوگوں کی تلاش کا سلسلہ جو برسوں کے لیے لاحاصل تھے.....**

پاشا نے کار روک دی اور قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک بھدی اور سال خوردہ عمارت تھی۔ ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کار سے اتر کر وہ ایک دکان پر گیا اور اس نے ہمدانی کا پتا پوچھا تو دکان دار نے نہ صرف اسے پتا بتایا بلکہ خود اسے ہمدانی کے پاس لے گیا۔

پاشا کو ایک ہی نگاہ میں ہمدانی کی شخصیت پسند آئی تھی۔ اس نے پاشا سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے ساتھ لے کر اپنے فلیٹ کی طرف چل پڑا۔

''آپ کے پڑوسی بہت اچھے ہیں ہمدانی صاحب! اس دکان دار کو ہی لے لیجیے۔ میں نے صرف آپ کا نام لیا اور وہ مجھے آپ کے پاس لے آیا۔''

''آپ کو حیرت ہوئی ہوگی۔ اصل میں وکیل صاحب، یہ انوکھی بستی ہے۔ ایک دوسرے سے محبتوں کی حامل۔ یہاں سے وہاں تک کہیں بھی چلے جایئے، آپ کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔''

عادل پاشا، ہمدانی کے ہمراہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو ہر طرف کوڑا کرکٹ، سگریٹوں کے خالی ڈبے اور ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ نادر ہمدانی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ یہاں ہے اس پر تبصرہ بیکار ہوگا۔ تشریف رکھیے۔'' پاشا ہنستے ہوئے بیٹھ گیا۔

''میں نہ وقت ضائع کرنے کا عادی ہوں نہ لمبی تمہید کا۔ آپ کو آپ کے آرٹیکلز اور اخبار کی وجہ سے جانتا ہوں۔ دل سے آپ کا قدرداں بھی ہوں۔'' پاشا کی بات پر نادر ہمدانی ہنسنے لگا پھر اس نے کہا۔

''وہ ان کا کام ہے، وہ کرتے ہیں۔ جو میرا کام ہے، میں کرتا ہوں۔ زندگی بڑی معمولی سی چیز ہے۔ جینا تو ہر شخص چاہتا ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں لیکن جینے کے علاوہ بھی تو انسان کے اور بہت سے کام ہوتے ہیں۔''

''میں آپ سے اپنا مکمل تعارف کرا دوں۔'' پاشا نے کہا۔

''شرمندہ کر رہے ہیں پاشا صاحب، آپ کے بارے میں بھی مجھے یہ بات معلوم ہے کہ آپ وہ سچے اور پُرجوش وکیل ہیں جو بڑی چھان بین کے بعد کیس لیتے ہیں اور اکثر کیسوں میں آپ نے خود اپنے مؤکلوں کو ہرایا ہے اور سچ کا بول بالا کیا ہے۔ آپ بھی میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔''

''تو پھر ملایئے ہاتھ... اگر دو دیوانے مل جائیں تو۔''

''میں تو ویسے بھی آپ سے ہاتھ ملائے ہوئے ہوں۔ ملاقات نہیں ہوئی بھی تو کیا ہوا۔ خیر، میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھ سے واقف ہیں تو میں بھی آپ سے واقف ہوں۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بس اتنا سا نظریہ ہے میرا کہ وکیل کا لفظ معمولی نہیں ہے۔ یہ ایک مقدس نام ہے جس پر بڑی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ صرف فیس لے کر اپنے مؤکل پر یہ یقین کر لینا کہ وہ سب کچھ سچ کہہ رہا ہے، میرا مسلک نہیں ہے۔ میں تھوڑی سی چھان بین کے بعد کیس لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج تک میرا ریکارڈ ہے کہ کوئی کیس نہیں ہارا۔ خیر، تو میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ کرائم رپورٹر ہیں اور اپنے آپ کو خبروں کے لیے کھپائے رکھتے ہیں اور وہ دور کی کوڑی لاتے ہیں جو بڑے بڑے چہرے بے نقاب کر دیتی ہے۔ میں آپ کے پاس ایک کام سے حاضر ہوا ہوں، نادر ہمدانی صاحب! اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے خفیہ ہاتھ بن جائیے۔"

"خفیہ ہاتھ؟"

"ہاں... میرے پاس اگر ایسا کوئی کیس آتا ہے جو مجھے دلچسپی کا حامل محسوس ہوتا ہے تو میں آپ سے رابطہ کروں گا اور یہ چاہوں گا کہ آپ ان حقائق کی تفتیش کریں جو اس کیس میں پوشیدہ ہیں۔ اس طرح مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ خود مجھے وہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ جو رپورٹ پیش کریں گے میں اسی کی روشنی میں اپنا کیس لڑوں گا۔"

"دلچسپ، ڈن۔" ایک دم سے جواب ملا اور خود عادل پاشا بھی حیران رہ گیا۔ "حیران نہ ہوں، بات ہی ایسی ہے جو میرے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ میں اپنا کام بے شک کرتا ہوں لیکن بہت سے معاملات میں میرے لیے بھی دشواریاں پیش آجاتی ہیں۔ میں ایک رپورٹ دیتا ہوں جو میرے ایڈیٹر صاحب بڑی مشکل سے قبول کرتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ عذاب، ثواب کرائم رپورٹر کی گردن پر۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی وہی سب کچھ ہو جاتا ہے جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ یہ سن لیجیے کہ اس کے نتیجے میں آپ کو معاوضہ بھی ملا کرے گا۔ بڑی باقاعدگی کے ساتھ۔"

"آپ ضرور دے دیا کریں۔ چونکہ میرے ساتھ میرے مسائل... نہیں ہیں بلکہ میں نے زندگی میں کچھ اور لوگ بھی شامل کیے ہوئے ہیں جن کے بارے میں، میں تفصیل نہیں بتاؤں گا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں اور میں بھی۔ میں مطمئن ہوں لیکن میرا اطمینان اس وقت مکمل ہوتا ہے جب میں ان کی کچھ خدمت کر لیتا ہوں۔"

"تو پھر ملائیے ہاتھ۔ میں آپ کو بتاتا رہوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ موبائل فون ہے آپ کے پاس؟"

"ہاں۔" نادر ہمدانی نے ایک طرف رکھا ہوا موبائل اٹھا کر سامنے رکھ لیا۔ یہ گھسا پٹا اور سستا سا موبائل تھا۔ اس نے اپنے نمبر عادل پاشا کو بتائے اور عادل پاشا کے نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لیے۔

"کیا میں آپ کو ایک موبائل پیش کر سکتا ہوں؟" عادل پاشا نے کہا۔

"نہیں۔" نادر ہمدانی نے جواب دیا۔

☆☆☆

نادرہ آباد سرسبز و شاداب درختوں، لہلہاتے کھیتوں اور پھلوں سے لدے باغوں کا شہر تھا۔ سبزہ جیسے یہاں بھرا پڑا تھا، اس کے اطراف میں ایک معروف دریا بہتا تھا اور شاید اسی کی وجہ سے یہ علاقہ اس قدر شاداب تھا۔ ڈاکٹر شیراز گل نے یہاں اپنا کلینک کھول کر بڑا نام کمایا تھا۔ انہیں انتہائی کامیاب فزیشن اور سرجن سمجھا جاتا تھا مگر اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ جس قدر کامیاب تھے، ان کی گھریلو اور ازدواجی زندگی اتنی ہی تلخ اور ناکام تھی۔

ان کی بیگم صدف حسین خدوخال اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ بظاہر بے حد خوش اخلاق، ملنسار اور سوشل۔ گو کہ اس کی شناخت ڈاکٹر شیراز کی وجہ سے تھی لیکن کچھ ہی عرصے میں اعلیٰ سوسائٹی میں اس نے اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا جبکہ اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس کے بہت ہی بے تکلف دوستوں میں عورتوں کی تعداد تو برائے نام ہی تھی۔ اپنے دوستوں سے ملنے جلنے کے معاملے میں وہ اس قدر بے تکلف اور بے باک تھی کہ شک کی حدود میں داخل ہو جاتی تھی اور یہی شک ڈاکٹر شیراز کی زندگی کو تلخ کر رہا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کچھ اختلافات شدید نوعیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

یہاں تک کہ ایک دن ایک ہلکی سی جھڑپ کے دوران ڈاکٹر شیراز گل نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے صدف کہ ہم لوگوں کے تعلقات کا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میں تمہیں طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نکاح نامے میں کیا کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔ صرف مہر ہی نہیں، اس کے علاوہ بھی آپ کو اتنی ادائیگیاں کرنی پڑیں گی جن کے بارے میں مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ نہیں کر سکیں گے۔"





"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟ میں اب باز نہیں رہ سکتا۔ بحالت مجبوری مجھے عدالت کا سہارا لینا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے حلقۂ احباب میں بہت بڑے بڑے نام شامل کر لیے ہیں لیکن میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، میرا چیلنج قبول کر لیجیے۔ آپ مجھے طلاق دیجیے۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ اس کے نتیجے میں کیا کرنا پڑے گا آپ کو..." ڈاکٹر شیراز گل نے آخر کار عدالت میں درخواست دے دی کہ عدالت یا تو ان کی بیوی کو اپنے گھریلو فرائض کی ادائیگی پر مجبور کرے یا انہیں اختیار دے دے کہ وہ اسے طلاق دے دیں۔ اس درخواست نے ان کے تعلقات میں مزید تلخی پیدا کر دی۔ حالانکہ ایک ہی گھر میں قیام تھا لیکن دونوں کے درمیان تعلقات تقریباً ختم ہو گئے تھے۔

اس دن بھی ڈاکٹر شیراز کلینک جانے کے لیے تیار تھے اور چائے پی رہے تھے کہ دروازے کی بیل بجی اور کچھ لمحوں کے بعد ملازمہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ یہ عدالت کا اہل کار تھا جو سمن لے کر آیا تھا۔

سمن وصول کر کے وہ اسے پڑھتے ہوئے اندر آئے تو سامنے صدف کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"کون تھا؟" اس نے بناوٹی لہجے میں پوچھا۔

"ہوں... گڈ... تمہیں معلوم ہے کون تھا؟ واقعی تم باکمال شخصیت ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے آگے کی چیز ہو۔"

"ضرورت انسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ میرے بعض حقوق ہیں اور مجھے ان کا تحفظ تو کرنا ہی تھا۔"

"لیکن جھگڑا تو میرے اور تمہارے درمیان ہے، کسی اور کو اس میں ملوث کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس... آگئے ہوش ٹھکانے ڈاکٹر صاحب! دنیا صرف ایک کلینک تک محدود نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں، دنیا کو اس کی خبر نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ڈاکٹر شیراز گل نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

"مطلب صاف ہے۔ اس نوٹس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ آپ کے اپنے کلینک کی ایک نرس سے گہرے تعلقات ہیں اور انہی تعلقات کی وجہ سے آپ مجھے طلاق دینا چاہتے ہیں۔"

"شرم نہیں آتی تمہیں، کچھ شرم کرو... صدف! میری بیوی ہو تم۔ تمہارے بارے میں دنیا کچھ بھی کہے، مجھے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا کرتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا ہے تم نے۔ میں نے اپنی درخواست میں کوئی نام نہیں لیا۔ حالانکہ میں چاہتا تو بہت سے نام گنوا سکتا تھا اور وہ سب سچ ہوتا۔"

"اور میں نے اپنی درخواست میں جو تحریر کیا ہے، وہ جھوٹ ہے۔ فرمائیں گے آپ ڈاکٹر صاحب کہ زرمین سے... بلکہ نرس زرمین سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے؟"

"تم جانتی ہو کہ وہ میری کزن ہے، میری پھوپی کی بیٹی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس کا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔"

"شوہر کے انتقال سے پہلے بھی اس کا آپ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس بات سے آپ انکار کریں گے؟"

"تمہیں یہی کہنا چاہیے صدف کیونکہ تم جس قدر بگڑ چکی ہو، اس کے بعد تمہاری زبان سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔"

"جھوٹ تو نہیں بولا میں نے۔ آپ اور زرمین ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ کی پھوپی نے مرنے سے قبل اس کی شادی ایک گھٹیا آدمی سے کر دی تھی اور تم اس وقت اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے اور اس کے لیے تمہیں ایک لمبا وقت درکار تھا۔ کیونکہ تمہاری پھوپی بستر مرگ پر تھیں اور ہر قیمت پر اپنی بیٹی کی شادی کر دینا چاہتی تھیں، چنانچہ انہیں جو بھی ملا، انہوں نے اس سے اس کی شادی کر دی۔ لیکن اس نے کبھی شوہر کو شوہر نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ اس غریب کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ یہ تو بظاہر کہا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب! ورنہ زرمین سے آپ جس قدر قریب تھے اور وہ جس طرح کسی اور کی امانت بن گئی تھی، آپ سے بھلا کہاں برداشت ہو سکتا تھا۔ اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ سچ مچ حادثے میں مرا تھا یا... خیر، میں کیا کہوں... آپ جیسے اس کی موت کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے زرمین کو فوراً بلا لیا۔ پہلے اسے نرسنگ اسکول کے ہاسٹل میں رکھا، نرسنگ کی تعلیم دلوائی کیونکہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد آپ اسے بھی صرف ایک نرس کے بھیس میں ہی اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے۔"

ڈاکٹر شیراز گل کے اندر غصے کی جو بھی کیفیت ہو... لیکن غصے کی اس کیفیت پر حیرت شدت سے غالب تھی۔ وہ حیرت بھرے انداز میں صدف کو دیکھ رہے تھے پھر انہوں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''صدف! تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟''

صدف کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''میں نے عرض کیا نا، کسی کو اتنا کمزور سمجھ لینا بے وقوفی کی علامت ہوتی ہے اور پھر آپ کا اعتراف میری کاوشوں کی ضمانت ہے۔''

''میں کوئی اقرار یا اعتراف نہیں کر رہا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سارے حالات تمہارے علم میں کیسے آئے اور جہاں تک میرے اور زرمین کے درمیان تعلقات کا سوال ہے تو میں ہر طرح کی قسم کھا سکتا ہوں کہ ہمارے جذبے ہر گناہ سے پاک ہیں۔''

''یہ قسمیں تو آپ عدالت کے سامنے کھایئے گا۔ میرا مقصد یہ درخواست دینے سے صرف اتنا تھا کہ اگر آپ مجھے میرے حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کریں گے اور میرے لیے الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کریں گے تو پھر آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! غور فرمایئے... غور فرمایئے۔'' صدف یہ کہہ کر کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر دیر تک کمرے کے اس دروازے کو دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار تھے۔ انہوں نے دہن تہ کر کے جیب میں رکھا اور میز پر سے اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

☆☆☆

کلینک میں ابھی نرس زرمین کے سوا اور کوئی نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر شیراز گل وقت سے کچھ پہلے ہی آجاتے تھے اور پہلا مریض ان کے پہنچنے کے بعد ہی پہنچتا تھا۔ آج بھی وہ جلد ہی پہنچے تھے۔ ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ عدالتی سمن ملتے ہی وہ انتہائی پریشان ہو گئے تھے۔ وہ اس سلسلے میں زرمین سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ کلینک کے عملے کے دوسرے افراد تھوڑا سا پہلے ہی آجاتے تھے۔ انہی میں زرمین بھی ہوا کرتی تھی اور آج بھی وہ پہلے سے موجود تھی۔

زرمین بھی کچھ دنوں سے ڈاکٹر شیراز گل کو معمول سے زیادہ پریشان اور فکرمند دیکھ رہی تھی لیکن آج وہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک گئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی نئی فکر نے ڈاکٹر کے اضطراب میں شدت پیدا کر دی ہے۔ وہ ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے ان کے آفس میں چلی آئی۔

''خیریت ہے سر؟'' اس نے ادب سے پوچھا۔

''نہیں زرمین! خیریت نہیں ہے۔ ذرا مجھے ایک گلاس پانی پلاؤ۔'' انہوں نے کہا۔ زرمین تیزی سے الیکٹرک کولر کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اپنے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھتی تھی اور اس نے اس وقت بھی ڈاکٹر شیراز گل کو بڑے احترام سے پانی کا گلاس پیش کیا۔ اس کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔ ڈاکٹر نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر بولے۔

''صدف نے عدالت میں ایک جوابی درخواست دی ہے جس میں بدکرداری کا الزام عائد کرتے ہوئے عدالت سے گزارش کی ہے کہ اسے خلع کی ڈگری دی جائے اور میری تمام جائداد اور زرِ نقد اس کی ملکیت قرار دیے جائیں اور سب سے بُری بات یہ ہے زرمین کہ اس نے تمہارا نام بھی اس درخواست میں شامل کیا ہے۔''

''مم... میرا؟ مم... مگر کیوں؟ اوہ... میرے خدا۔'' زرمین کی آواز میں شدید گھبراہٹ تھی۔

''وہ جس قدر شاطر عورت ہے، تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ پتا نہیں میری تقدیر کے ستارے اس وقت کس گردش میں تھے جب میری اس سے شادی ہوئی۔''

''مگر اب کیا ہوگا؟''

''ظاہر ہے، میں تمہیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کی اجازت تو نہیں دے سکتا۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے؟''

''کیا؟'' زرمین نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا اور ڈاکٹر شیراز گل اسے مدھم لہجے میں کچھ سمجھانے لگے۔

☆☆☆

صدف کی درخواست کی ابتدائی سماعت کے لیے فیملی کورٹ کا پہلا سیشن ہوا تو معزز عدالت کو بتایا گیا کہ... اہم گواہ جس کے بیان پر مدعیہ کی درخواست کا دارومدار ہے، پراسرار طریقے سے غائب کر دیا گیا ہے۔ اسے ڈاکٹر شیراز گل نے دانستہ کہیں غائب کیا ہے۔ اس لیے اس پر سمن کی تعمیل نہیں کرائی جا سکی چنانچہ یہ عدالت گواہ کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری کرنے کی اجازت دے اور مدعا علیہ کو حکم دے کہ وہ اگلی پیشی پر گواہ کو عدالت کے سامنے پیش کرے۔

دونوں جانب سے وکلا نے اس نکتے کے حق میں اور اس کی مخالفت میں بحث کی۔ عدالت نے مزید سماعت کے لیے دوسری تاریخ دی اور مدعا علیہ کو اشارتاً ہدایت کی کہ اگر اسے گواہ کے بارے میں کوئی علم ہے تو اس سمن پر تعمیل کرانے میں تعاون کرے۔

ابھی تک مقامی پریس کو اس نئی درخواست کا علم نہیں تھا۔ سماعت کے بعد جب اس بارے میں ایک مقامی اخباری رپورٹر نے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو لینا چاہا تو انہوں نے





اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ کل اس بارے میں ایک پریس کانفرنس کریں گے اور تمام واقعات عوام کے سامنے پیش کریں گے۔ مگر وہ کل کبھی نہیں آیا کیونکہ دوسرے دن نادرہ آباد کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ ڈاکٹر شیراز گل پُراسرار طور پر کہیں غائب ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

زیرِ سماعت مقدمے کی کئی پیشیوں کے بعد آخر عدالت نے وکیل استغاثہ کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے مدعا علیہ کی مسلسل غیر حاضری کے باعث مدعیہ کی درخواست اپنے شوہر کی جائداد اور جملہ املاک پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں منظور کر لی اور خلع یا طلاق کے بارے میں کوئی فیصلہ اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جب تک کہ پولیس مدعیہ کے شوہر ڈاکٹر شیراز گل کو تلاش کر کے عدالت کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ کوئی اپیل کرنے والا یا جوابی کارروائی کرنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ صدف نے مکان، کلینک اور بینک بیلنس بغیر کسی دشواری کے حاصل کر لیے اور اس کے فوراً بعد اس نے کلینک اپنے ایک شناسا ڈاکٹر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بینک سے تمام بیلنس نکلوا کر اکاؤنٹ کلوز کر دیا۔ کچھ ہفتوں تک وہ نادرہ آباد میں دیکھی جاتی رہی اور اس کے دوست ہمیشہ اس کے ساتھ نظر آتے رہے۔ انہی دوستوں میں سے ایک دوست ڈاکٹر زمان خان نے وہ کلینک خریدا تھا۔ پھر اس کے بعد خاموشی سے وہ مکان بھی فروخت کر دیا گیا اور ایک رات اچانک وہ بھی نادرہ آباد سے غائب ہو گئی۔ کہاں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ کچھ عرصے تک اس کا نام مختلف افواہوں کے ساتھ شہر کی فضاؤں میں گونجتا رہا اور آخر کار معمول کے مطابق اسے فراموش کر دیا گیا۔

☆☆☆

اس دن نادر ہمدانی، عادل پاشا کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ عادل پاشا نے اسے فون کر کے بلایا تھا اور کہا کہ دوپہر کا کھانا وہ اس کے ساتھ کھائے۔ اس وقت کھانے سے فراغت حاصل کر کے وہ دونوں چائے پی رہے تھے کہ پاشا کے چپراسی نے اسے کسی کلائنٹ کی آمد کی خبر دی اور دونوں مستعد ہو گئے۔ آنے والا ایک خوش شکل آدمی تھا۔ اس نے سادہ لباس پہنا ہوا تھا اور چہرے ہی سے پڑھا لکھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اندر آ کر اس نے سلام کیا تو عادل پاشا اور نادر ہمدانی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''میرا نام فیروز ہے۔ ایک خاص سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ وکیل صاحب! میری پہلے تو آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ ہی عادل پاشا ہیں۔'' اس نے عادل پاشا سے کہا۔

''شکریہ فیروز صاحب! تشریف رکھیے۔''

''ایک ذاتی مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو تھوڑی سی تنہائی عنایت فرما دیں۔''

''آپ یوں سمجھیے کہ ہم تنہا ہی ہیں، یہ میرے دستِ راست ہیں۔''

''نہیں، ایک کلائنٹ اور وکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو میں مداخلت غیر مناسب ہے۔ میں اپنی چائے لے کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔'' نادر ہمدانی نے کہا اور چائے کا کپ اٹھا کر دوسرے کمرے کی جانب چل پڑا۔ عادل پاشا نے کہا۔

''جی جناب فرمایئے فیروز صاحب، کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی۔ ویسے میں نے آپ سے غلط نہیں کہا تھا۔ کتنے ہی کانفیڈینشل کیس ہوں، ہمدانی ہی میرے دستِ راست ہوتے ہیں۔''

''بعد میں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر آپ مناسب سمجھیں گے اور میرا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ اصل میں، میں نے آپ کے بارے میں یہی سنا ہے بلکہ یوں سمجھیے مجھے ایسے ہی کسی وکیل کی تلاش تھی جو صرف دفتر اور عدالت میں میرا ساتھی نہ ہو بلکہ میرا کیس لینے سے پہلے تھوڑا سا کام اور کرے...

''مجھے ایک بہت ہی اہم اور نجی نوعیت کے کام میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ عدالتی کیس ہو لیکن اس سے پہلے میں آپ کو صورتِ حال بتا دینا چاہتا ہوں۔ میرا اصل کام صدف نامی ایک خاتون کی تلاش ہے۔ یہ خاتون آج سے بیس بائیس سال قبل دارالحکومت کے ایک کلب میں موسیقی کے پروگرام پیش کرتی تھی۔ پھر اس نے نادرہ آباد کے ایک ڈاکٹر شیراز گل سے شادی کر لی مگر یہ رشتہ ایک سال سے زیادہ برقرار نہیں رہ سکا۔ ڈاکٹر شیراز گل ایک انتہائی نفیس انسان تھے اور نہ جانے کس طرح صدف کے جال میں گرفتار ہو گئے تھے۔ بہرحال، ڈاکٹر اس کی آزاد مزاجی اور بے راہ روی سے تنگ آ کر اسے چھوڑ کر چلے گئے اور صدف نے ڈاکٹر کی تمام املاک اور بینک بیلنس پر قبضہ کر لیا اور کچھ دنوں کے بعد اس طرح غائب ہوئی کہ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے... اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

"میں اس عورت کو تلاش کر کے عدالت کے کٹہرے میں لانا چاہتا ہوں۔ چونکہ آپ ذرا منفرد قسم کے وکیل ہیں، اس لیے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔"

"آپ اسے کیوں تلاش کر کے عدالت تک لانا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ ڈاکٹر شیراز گل میرے بچپن کے دوست ہیں۔"

"گویا آپ اپنے دوست کے لیے یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ خود ڈاکٹر شیراز آج کل کہاں ہیں؟"

"افسوس، میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو پہلے اس شاطر عورت کو تلاش کر لیں۔ بعد میں آپ سے میں دوسری ذے داری لینے کی کوشش کروں گا۔ پہلے مرحلے کے لیے آپ جو بھی فیس مقرر کریں گے، میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اور ایک اور درخواست ہے کہ جب تک ہم صدف کو تلاش نہ کر لیں، آپ ڈاکٹر شیراز کے بارے میں کوئی تحقیقات نہیں کریں گے۔" عادل پاشا سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

"حالانکہ بیس بائیس سال تو ایک لمبی مدت ہوتی ہے۔ اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ یہ خاتون مر چکی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ صدف۔"

"اگر ایسا ہے تو آپ کو اس کی موت کا کوئی ثبوت حاصل کرنا ہوگا۔"

"ڈاکٹر شیراز گل سے اس کی کوئی اولاد ہوئی تھی؟"

"نہیں۔"

"آپ نے بتایا ہے کہ صدف شادی سے پہلے دارالحکومت کے ایک کلب میں اسٹیج پر گاتی تھی۔ اس کلب کا نام کیا تھا؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس کا نام گرین اسٹار تھا۔"

"صدف کی کوئی تصویر ہے آپ کے پاس؟"

"تصویر تو نہیں ہے لیکن وہ بہت خوب صورت تھی۔ کتابی چہرہ، شہابی رنگت، سرخی مائل بال، بھوری آنکھیں، دلکش اور متناسب جسم۔"

"یہ حلیہ تو بہت سی خوب صورت خواتین کا ہو سکتا ہے۔ مزید کوئی اور تفصیل اس کے بارے میں؟"

"نہیں جانتا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں معلوم۔"

"یہ تو بتا سکتے ہیں آپ کہ نادرہ آباد میں وہ کہاں رہتی تھی؟"

"ڈاکٹر شیراز کا کلینک ایک مشہور شاہراہ پر تھا اور ان کا مکان وہاں سے کافی دور تھا۔ میں آپ کو دونوں پتے دے دیتا ہوں لیکن اس وقت جب آپ اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کا وعدہ کریں۔"

"ٹھیک ہے لیکن ڈاکٹر شیراز گل کے حوالے سے صدف کے بارے میں تو معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔"

"ہاں... یہ ضروری ہوگا۔"

"وہ شخص جو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا دوست راست ہے اور میرے کیسز کی تحقیقات کے سلسلے میں معلومات وہی کرتا ہے، اس کا نام نادر ہمدانی ہے۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اگر آپ یہ ذے داری اپنے شانوں پر لینے کا وعدہ کریں۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کا یہ کام ضرور کروں گا۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کروں؟"

"وہ بعد میں طے کر لیا جائے گا لیکن ایک بات بتائیے۔ آپ سے رابطے کا کیا ذریعہ ہے؟"

"پلیز! آپ مجھ سے میرا پتا نہ پوچھیں۔ میں آپ کو خود ہی فون کرتا رہوں گا لیکن آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اس سلسلے میں تمام... معاملات خفیہ رہیں گے۔ اور اگر آپ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ احسان نہ صرف مجھ پر بلکہ میرے دوست پر بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کا یہ کیس میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔" اس شخص کے جانے کے بعد عادل پاشا نے ہمدانی کو طلب کیا اور اسے فیروز سے ہونے والی ساری گفتگو بتانے لگا۔

☆☆☆

نادرہ آباد دارالحکومت سے کوئی تین سو میل کے فاصلے پر... ایک خوب صورت شہر کی شکل میں ابھرا تھا۔ پہلے اسے ایک شہر نما قصبہ یا قصبہ نما شہر کہا جا سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا پھیلاؤ بڑھنے لگا اور پھر وہ بڑا شہر بننے لگا۔ وقت کے ساتھ ترقی کرتا ہوا یہ شہر اب خاصی اچھی حالت میں تھا۔

پاشا نے ہمدانی کو اپنی کار دے کر یہاں بھیجا تھا۔





ہوٹل نورا نادرہ آباد کا سب سے پرانا اور اچھا ہوٹل تھا۔ اس کا منیجر ایک زندہ دل اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کا نام شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ عام طور سے لوگ اسے ڈیوڈ صاحب کہتے تھے، حالانکہ وہ عیسائی نہیں تھا۔ پتا نہیں، اس کا یہ نام کیوں پڑ گیا تھا۔ بہرحال یہاں قیام کے بعد نادر ہمدانی نے سب سے پہلے ڈیوڈ..... سے ہی رابطہ قائم کیا۔

"نادرہ آباد میرے لیے ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ہے جو جوان ہو گیا ہو۔ میں نے اس کا بچپن بھی دیکھا ہے اور جوانی بھی..." ڈیوڈ صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کہا جیسے درحقیقت کوئی کسی کو اپنی اولاد کے بارے میں بتا رہا ہو۔

"مجھے تھوڑی بہت معلومات درکار ہیں ڈیوڈ صاحب۔"

"کہو... کیا نادرہ آباد کے بارے میں؟"

"ہاں، کچھ عرصے پہلے یہاں.... ڈاکٹر شیراز گل نے کلینک کھولا تھا اور اس کے بعد کچھ عجیب و غریب واقعات ہوئے کہ کلینک بھی بند ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب بھی لاپتا ہو گئے۔"

"لو، مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے اس بارے میں۔ اور میں تمہیں سچ بتاؤں، میں نے تو اپنی آنکھوں سے اس عورت کو بھی دیکھا ہے جس کا نام صدف تھا۔ بہت سی ایسی باتیں مجھے اس کے بارے میں معلوم ہیں جو شاید کسی اور کو نہیں معلوم ہوں۔" ڈیوڈ صاحب نے اعتماد سے کہا۔

"لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ کہاں چلی گئی اور اب کہاں ہے؟"

"صرف ایک آدمی بتا سکتا ہے تمہیں اس کے بارے میں۔"

"کون؟"

"ڈاکٹر زمان خان جنہوں نے یہ کلینک خریدا تھا اور وہ اس کے بہت قریبی دوست تھے۔ اب بھی وہ کلینک چلا رہے ہیں جس میں کبھی ڈاکٹر شیراز بیٹھا کرتے تھے۔"

"اچھا، بہت بہت شکریہ ڈیوڈ صاحب۔"

"لیکن تم اس کے بارے میں کیوں معلوم کر رہے ہو؟"

"بس کچھ ایسے ہی معاملات ہیں کہ میں ان واقعات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

آخر کار نادر ہمدانی اس پتے پر پہنچا جو اسے ڈیوڈ سے معلوم ہوا تھا اور یہاں اس کی ملاقات ایک خوب صورت لڑکی سے ہوئی، اس کا نام نورالعین تھا۔

"ہم نے اس کلینک کے پچھلے حصے میں تھوڑی سی زمین خرید کر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ وہ وہیں پر رہتے ہیں لیکن عام طور سے کسی سے نہیں ملتے۔" نورالعین نے بتایا۔

"کیا مطلب؟ کلینک تو قائم ہے، کیا یہاں کوئی مریض نہیں آتا؟"

"کہاں آتے ہیں، یہ کلینک اب نہیں چلتا۔ نزلہ، زکام، کھانسی، بخار کے مریض بھی کبھی آ جاتے ہیں تو میں ہی انہیں دوا دیتی ہوں۔ ویسے آپ مجھے بتائیے آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

"نہیں، مجھے کچھ ذاتی کام ہے۔" ہمدانی نے کہا۔

"بتائیے، شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔"

نادر ہمدانی نے اس لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر بولا۔ "تقریباً بیس سال پہلے اس جگہ ڈاکٹر شیراز گل پریکٹس کیا کرتے تھے۔"

"اوہو... کہیں آپ ان کی بیگم صدف کے بارے میں معلوم کرنے تو نہیں آئے؟"

"اوہ... بڑی باکمال شخصیت ہیں آپ مس نورالعین۔ یہ اندازہ آپ نے کس طرح لگا لیا؟"

"اس لیے کہ پہلے دو افراد اور بھی اس سلسلے میں آ چکے ہیں۔" نورالعین نے بتایا۔ "اس زمانے میں، میں بہت چھوٹی تھی مگر مجھے اب بھی تھوڑا بہت یاد ہے کہ لوگ صدف کے بارے بہت باتیں بنایا کرتے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی، وہ یہ کہ ان واقعات کو تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں۔ اب اچانک یہ سلسلہ پھر سے کیوں جاگ اٹھا ہے؟"

"وہ دو افراد کون تھے جو مجھ سے پہلے صدف کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟"

"آیئے بیٹھیے، آپ کو کوئی کام تو نہیں ہے یہاں۔ میں بھی بس اپنی زندگی بیکار گزار رہی ہوں۔ دراصل جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں ڈاکٹر زمان خان کی بھتیجی ہوں۔ میرے والدین مر چکے ہیں اور میں زمان انکل کے ساتھ رہتی ہوں۔ نہ ان کے پاس کوئی مریض آتا ہے، نہ ہی ہمارے حالات میں کوئی بہتری پیدا ہوتی ہے۔ میں ہر شخص سے اچھے اخلاق کے ساتھ ملتی ہوں کہ ہو سکتا ہے کوئی میرے لیے نوکری وغیرہ کا بندوبست کر دے۔ آیئے، میں آپ کو چائے پلاؤں۔ تھوڑا سا مکھن آپ کو بھی لگا دیتی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ ہی میرے بارے میں کسی اچھے انداز میں سوچ لیں۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نورالعین بے تکلف سی لڑکی تھی۔ اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے نادر ہمدانی نے اس کی چائے کی دعوت قبول کرلی اور نورالعین نے ایک معمولی سے کمرے میں قدیم طرز کے صوفے پر اسے بٹھایا اور بولی۔

''بس چائے لانے میں ذرا دیر لگے گی، میں ابھی آئی۔''

نادر ہمدانی اس دلچسپ صورتِ حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ واقعی یہ بات قابلِ غور تھی کہ اگر ڈاکٹر شیراز اور صدف کے معاملات کو اتنا عرصہ ہوگیا ہے تو اس کے بعد یہ صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی ہے۔ وہ شخص جو فیروز خان کے نام سے عادل پاشا سے ملا، کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ یہ واقعات خاصے تشنی خیز تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کرائم رپورٹر کی حیثیت سے نادر ہمدانی بہت سے معاملات کی اسی انداز میں تحقیقات کر چکا تھا لیکن یہ کیس اسے کافی دلچسپ لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نورالعین چائے لے کر آگئی۔ چائے واقعی بہت عمدہ تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اتنی اچھی چائے کے بدلے میں آپ کی کیا خدمت کرسکوں گا۔'' نادر ہمدانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے۔ میرا نام نورالعین ہے۔ ڈاکٹر زمان خان صاحب کی بھتیجی ہوں جن کا کلینک بالکل نہیں چلتا۔ ایک طرح سے اس کلینک میں ڈاکٹر اور نرس دونوں کے فرائض سرانجام دیتی ہوں۔ تھوڑی بہت دواؤں کے بارے میں معلومات ہیں جو نزلہ، زکام اور بخار کے سلسلے میں دی جاتی ہیں۔ اب چونکہ مریض ہی نہیں آتے اور یہاں نادرہ آباد میں ملازمت کے زیادہ مواقع ہیں نہیں، اس لیے کسی اہلِ دل کی تلاش میں ہوں جو دارالحکومت میں میرے لیے کسی نوکری کا بندوبست کردے۔ کہنے میں کیا حرج ہے۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اب پتا نہیں آپ کے سینے میں دل کی کیا کیفیت ہے۔ میرا مطلب ہے، وہ اہلِ دل آپ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔'' نورالعین نے دلچسپی سے باتیں کرتے ہوئے کہا اور چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

''مس نورالعین! بڑی توقع ہوگئی ہے مجھے آپ سے کہ آپ میری معلومات میں اضافہ کریں گی۔''

''اصولی طور پر مجھے یہ پوچھنا چاہیے جناب کہ بیس سال کے بعد اچانک زندہ ہو جانے والے یہ مُردے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور اچانک ان میں جان کیسے پڑ گئی؟ اگر بتانا پسند کریں تو بتا دیں..... البتہ نام ضرور بتا دینا چاہیے تھا آپ کو اپنا۔''

''میرا نام نادر ہمدانی ہے۔'' نادر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔'' عینی بھی جواباً ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''آپ پوچھ رہے تھے کہ وہ دونوں کون تھے جو یہاں پہلے آئے تھے، انہوں نے اپنا نام احمد یار بتایا تھا۔ دبلے پتلے اور لمبے قد کے مالک تھے، رنگ سانولا تھا۔ ضرورت سے زیادہ چالاک ظاہر کررہے تھے اپنے آپ کو... اور مجھے تو یوں لگا جیسے انہوں نے اپنا نام بھی غلط بتایا ہو۔ بہرحال کچھ ایسی شخصیت تھی ان کی جس سے بلاوجہ چڑ ہو جاتی ہے۔ میں انہیں کوئی خاص بات نہیں بتا سکی تھی۔ انہوں نے جس طرح کے سوالات کیے تھے، اس کے بعد میرے دل میں بھی ذرا تجسس سا جاگ اٹھا اور میں نے مختلف ذرائع سے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ خود میرے انکل یعنی زمان خان صاحب تھے۔

''میں نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ زمان خان بھی صدف کے چاہنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ میرے اور انکل کے درمیان احترام کا رشتہ ہے لیکن میں نے دبے الفاظ میں ان سے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔'' نورالعین مسکرا کر بولی۔

''اور مس عینی! آپ نے ایک دوسری شخصیت کا بھی ذکر کیا تھا، وہ کون تھا؟''

''وہ تھا نہیں بلکہ تھی۔ ایک خاصی خوب صورت عورت جس نے اپنا نام فرزانہ بتایا تھا۔ ویسے وہ بھی نوجوان تھی اور اس کی عمر تقریباً پچیس سال کی تھی لیکن ایک نگاہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میرے پاس آنے سے پہلے وہ بہت سے لوگوں سے ملاقات کر چکی تھی اور وہ اپنے آپ کو صدف کی بھانجی بتاتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی والدہ جو صدف کی بڑی بہن تھیں، کچھ عرصے قبل انتقال کر گئی تھیں اور انہوں نے اپنی وصیت میں اپنی بہن کے لیے کچھ جائداد اور روپیا چھوڑا ہے۔ وہ حق دار کو اس کا حق پہنچانے کے لیے اپنی خالہ کو تلاش کررہی ہے اور چونکہ اسے اپنی خالہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم اور نہ ہی ان کی کوئی تصویر اس کے پاس ہے، اس لیے جو کوئی... ان کے بارے میں معلومات فراہم کرے گا یا اگر کسی کے پاس صدف کی کوئی تصویر بھی ہے تو وہ معقول معاوضے پر اس سے خریدنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے جب یہ بات سنی تو اس سے رابطے کی کوشش کرنے لگی اور جب





وہ کچھ اشارے ملنے پر میرے پاس آئی تو سب سے پہلے اس نے انکل زمان سے ملنے پر اصرار کیا۔ کچھ ملنے والوں نے اسے بتایا تھا کہ زمان صاحب سے صدف کے گہرے تعلقات رہ چکے ہیں۔

''جب میں نے انکل کو اس کی آمد کی خبر دی تو انہوں نے انتہائی سختی سے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ فرزانہ کوشش کرتی رہی۔ اس نے مجھے بھی کریدنا چاہا۔ میں نے اسے چائے پینے کی دعوت دی جو اس نے قبول کرلی لیکن بہرحال میں نے موقع نکال لیا اور تھوڑی سی دیر کے لیے جب وہ واش روم گئی تو میں نے اس کے ہینڈ بیگ کی تلاشی لی اور کئی کارآمد باتیں معلوم کرلیں۔'' نورالعین نے بچوں کی طرح بتایا تو نادر ہمدانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ عینی کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

''ویری گڈ... آپ تو بہت ذہین خاتون ہیں، مس عینی۔''

''وہی تو میں کہہ رہی تھی کہ یہاں نادرہ آباد میں میری شخصیت ضائع ہو رہی ہے۔ بحالتِ مجبوری انکل کے کلینک میں پڑی ہوئی ہوں جہاں نہ کوئی مریض آتا ہے، نہ کوئی اور۔ بس مکھیوں کی تعداد یہاں کافی ہے جن میں سے بہت سی مکھیوں کو میں نے کم کردیا ہے۔ اب بتائیے نا... خالی بیٹھا ہوا انسان کیا کرے۔'' وہ بولی اور ہنس پڑی۔ نادر ہمدانی اس کے آگے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر جب وہ دوسرے معاملات میں کھو گئی تو اس نے کہا۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ ہینڈ بیگ سے ایسی کون سی چیز برآمد ہوئی جس سے آپ کو کچھ کارآمد باتیں معلوم ہوئیں؟''

''ہاں... سب سے پہلی بات یہ کہ فرزانہ بیگم کا پورا نام فرزانہ اسلام ہے اور وہ دارالحکومت کے ایک کلب میں ملازمت کرتی ہے۔ یہ باتیں مجھے اس کے ہینڈ بیگ سے ملنے والے وزیٹنگ کارڈ سے معلوم ہوئیں۔ ان میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ بھی تھا جس میں بڑی خراب انگریزی میں کسی پولیس انسپکٹر کا نام اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔''

''پولیس انسپکٹر؟'' نادر ہمدانی نے چونک کر کہا۔

''ہاں... مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی اور اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ صدف کی تلاش کے پیچھے ضرور کوئی خاص راز پوشیدہ ہے، ورنہ پولیس کو اس سے اتنی دلچسپی نہ ہوتی۔ میرا تو خیال تھا کہ پولیس انسپکٹر نے ہی فرزانہ کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ضرور کوئی ایسا گہرا معاملہ تھا جس میں پولیس براہِ راست سامنے نہیں آنا چاہتی تھی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرزانہ یہ وزیٹنگ کارڈ خود کسی کو دھوکا دینے کے لیے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتی ہو اور خود اس کا تعلق پولیس سے ہو۔''

''ویری گڈ... آپ واقعی بہت ذہین ہیں عینی۔ اب مجھے اس بات کا بھرپور طریقے سے یقین ہوگیا ہے۔'' عینی انکساری سے ہنسنے لگی۔ نادر ہمدانی نے کہا۔

''آپ نے مجھے اس پولیس انسپکٹر کا نام نہیں بتایا؟''

''جی ہاں... وہ ذرا ایسا ہی مٹا مٹا سا تھا۔ پھر بھی شاید اس کا نام ایل اور این سے ہو، ایسے ہی کچھ پڑھنے میں آرہا تھا۔''

''اور آپ کو بیگ میں فرزانہ کا پتا نہیں ملا؟''

''ہاں... ملا تھا۔ کارڈ میں اس کے گھر کا پتا بھی لکھا تھا۔ وہ نیو گیریژن ٹاؤن کے فلیٹ نمبر اٹھائیس میں رہتی ہے۔ یہی پتا لکھا ہوا تھا۔''

چند رسمی باتیں کرنے کے بعد ہمدانی وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے جو معلومات عینی سے حاصل ہوئی تھیں، وہ خاصی دلچسپ تھیں اور وہ ان کے بارے میں غور کررہا تھا۔ زمان خان جو اس کے لیے ایک کارآمد شخصیت ثابت ہوسکتا تھا، کیا ہی دلچسپ بات تھی کہ بیس سال کے بعد ایک ایسا کیس اچانک نمودار ہوگیا جس میں بہت سے لوگ ملوث تھے۔ اب پتا نہیں کون کس چکر میں تھا۔ اس کا اندازہ تو فوری طور پر نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ بہرحال، وہ اپنی کار تک پہنچا تھا کہ اچانک ہی عقب سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کا کالر پکڑ لیا۔ نادر ہمدانی ایک دم پلٹا تو اس شخص نے اس کی گردن اپنے چوڑے ہاتھوں میں جکڑ لی۔

''جو کچھ تم کر رہے ہو وہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا کررہے ہو۔ سنو... جان کی سلامتی چاہتے ہو تو فوراً نادرہ آباد چھوڑ کر چلے جاؤ۔'' نادر ہمدانی نے بمشکل تمام اس کی کلائی سے اپنی گردن چھڑائی۔ وہ شخص ڈیل ڈول میں ہمدانی سے دگنا تھا اور چہرے ہی سے بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے اور اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو تم کیا کرلو گے؟'' ہمدانی یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس شخص نے ہاتھ میں تانبے کا کلپ پہن رکھا ہے۔

''میں جو کچھ کروں گا، اس کا نمونہ دیکھ لو... اس کے بعد غور کرنا۔''

یہ کہہ کر اس نے پیچھے ہٹ کر ہمدانی پر وار کیا۔ ہمدانی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ضرب اس قدر شدید ہوگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور کچھ ہی لمحوں بعد وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل نیچے آرہا۔ اس کے ہوش و حواس گہری تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

نہ جانے کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ اس وقت وہ کار کے اندر سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے ایک سسکاری سی لی اور بدن کو تھوڑا سا کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے سر کی چوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ شکر ہے، خون نہیں نکلا تھا البتہ چوٹ کی جگہ ایک گومڑا ابھرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس نے اس طرح چوٹ نہیں کھائی تھی۔ اجنبی نے جو کچھ کیا تھا، غیر متوقع طور پر کیا تھا مگر کیوں؟ وہ اس کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ ونڈ اسکرین کے اس پار دیکھ رہا تھا۔ کوئی بہت ہی خاص بات تھی جس نے اس کی یہ کیفیت کر دی تھی۔

شاید سر پر پڑنے والی چوٹ نے یادداشت کے کسی خانے کو کھول دیا تھا۔ حالانکہ وہ شخص جب سامنے آیا تھا، اس وقت اس کے ذہن میں اس سے شناسائی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا لیکن اب اسے یاد آیا کہ اس نے دارالحکومت میں اس شخص کو پولیس آفس میں دیکھا تھا اور اس کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ یہ بات اسے اسی وقت یاد آئی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اس شخص کا تعلق پولیس ہی سے ہے لیکن پولیس کے کسی فرد کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس سے کہے کہ وہ اپنی تحقیقات بند کر کے واپس چلا جائے؟ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

بہرحال، وہ کرائم رپورٹر تھا۔ جرائم کی کوریج کرنا اس کا کام تھا اور اس سلسلے میں اس کا واسطہ کافی خطرناک لوگوں سے پڑ چکا تھا۔ اسے جس طرح مجرموں کے عادات و اطوار کا پتا تھا، اسی طرح اسے پولیس والوں کے ہتھکنڈوں کا بھی پتا تھا۔ وہ کسی کے کہنے سے اس طرح تو واپس جا نہیں سکتا تھا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس شخص نے اس معاملے میں مداخلت کر کے اس کے ذہن کے بہت سے خانے کھول دیے تھے اور وہ اب زیادہ بہتر طریقے سے کام کرنا چاہتا تھا چنانچہ اچھی طرح اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے کار اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔

ہوٹل کے کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایک لمحے میں اس کو احساس ہو گیا کہ اس کے سامان کی تلاشی لی گئی ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان چیک کیا لیکن اس میں سے کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا۔ کوئی ہے جو اسے اس کے کام سے روکنا چاہتا ہے۔ ابھی تو کئی کام اسے کرنے تھے۔ ڈاکٹر زمان خان سے ملنا تھا اور خصوصی طور پر یہاں کے پولیس اسٹیشن کا بھی جائزہ لینا تھا۔

اپنے طور پر اس نے جو معلومات حاصل کیں، وہ بہت ہی دلچسپ تھیں۔ اسے اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ کسی نے اسے یہاں سے جانے کے لیے کہا ہے اور اس پر حملہ بھی کیا ہے۔ بہرحال، اسے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ تقریباً پچیس سال پہلے ڈاکٹر شیراز گل نے ایک فزیشن اور سرجن کی حیثیت سے اپنا رجسٹریشن کرایا تھا۔ اس کے سات سال بعد انہوں نے درخواست دی کہ ان کا اصل نام جوان کے والدین نے رکھا تھا اور جس کے ثبوت میں وہ اپنا برتھ سرٹیفکیٹ بھی پیش کر رہے ہیں، اصل میں عثمان شاہ ہے لیکن والد کے انتقال کے بعد جب وہ آٹھویں کلاس میں تھے، انہوں نے اپنا نام تبدیل کیا تھا اور اس کی اطلاع اخبار میں بھی دی تھی۔

انہوں نے اپنا نام شیراز گل رکھا اور یہی نام بعد میں میٹرک کی سند اور ایم بی بی ایس کی ڈگری پر درج کیا گیا لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے والد نے کچھ جائداد چھوڑی ہے جو ان کی وصیت کے مطابق ان کے بیٹے عثمان شاہ کو ملنی تھی چونکہ ڈاکٹر شیراز گل نے اپنا نام تبدیل کر لیا تھا، اس لیے اس جائداد پر دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس خیال سے کہ انہیں والدین کا رکھا ہوا نام ہی برقرار رکھنا چاہیے، وہ اپنی اس غلطی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں میٹرک اور ایم بی بی ایس کی سند میں تصحیح کرانے کے بعد ڈاکٹر شیراز گل کی یہ درخواست منظور ہو گئی۔ چنانچہ سرکاری کاغذات میں ڈاکٹر شیراز کا نام عثمان شاہ ہی تھا۔ گویا ڈاکٹر شیراز گل، نادرہ آباد چھوڑ کر اگر چلا گیا ہے تو بڑے اطمینان سے ایک نئے نام سے اپنی پریکٹس جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ تمام معلومات لے کر وہ عادل پاشا کے پاس پہنچا۔

''کافی چاق و چوبند نظر آرہے ہو۔ کیا رپورٹ ہے؟'' جواب میں ہمدانی نے اسے پوری تفصیل بتائی اور عادل پاشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کمال ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں کوئی مقدمے بازی ہوگی اور کیس میرے پاس آئے گا۔ یہ تو اصل میں تمہارا ہی کام تھا جو تم نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا





ہے۔ بہرحال، فیروز خان نے مجھ سے رابطہ قائم کیا ہے، میرا خیال ہے میں اسے یقینی طور پر ایک بہترین رپورٹ پیش کر سکوں گا۔ چنانچہ اب دو پوائنٹ ہیں ہمارے پاس۔ نمبر ایک یہ کہ کیا عثمان شاہ یا سابقہ ڈاکٹر شیراز گل زندہ ہے اور اس نے اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اور روپوش ہونے کے بعد کہیں اور رہائش اختیار کر لی ہے یا پھر صدف نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ اصل کام تو صدف کی تلاش تھا اور میرا خیال ہے کہ تم خاصی محنت سے آگے بڑھ رہے ہو۔ اب کیا ارادہ ہے؟''

''میری نادرہ آباد واپسی بہت ضروری ہے۔ ابھی اس لیے آ گیا تھا کہ آپ کو کار کی ضرورت ہو گی اگر آپ چاہیں...''

''نہیں... نہیں، تم اپنی تفتیش جاری رکھو... کم از کم اس کیس میں میری ٹانگ یا پھر میری کار پھنسی رہے گی۔'' عادل پاشا نے ہنس کر کہا اور ہمدانی نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی قیمتی کار اسے دے رکھی ہے۔

ایک بار پھر نادر ہمدانی کو نادرہ آباد واپس آنا پڑا۔ قیام کے لیے وہی ایک ہوٹل تھا جو اب نادرہ آباد میں رہنے کے قابل رہ گیا تھا۔ چھوٹے موٹے کئی ہوٹل وہاں موجود تھے لیکن جو اچھے اور صاحبِ حیثیت لوگ تھے، وہ اسی ہوٹل میں آ کر قیام کیا کرتے تھے اور دوسری بار بھی ہمدانی نے اسی ہوٹل میں کمرا حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈیوڈ صاحب بھی اس کے لیے دلچسپی کا باعث تھے کیونکہ ڈیوڈ صاحب نے اسے خاصی معلومات فراہم کی تھیں۔ ہوٹل میں آنے کے بعد اس نے ڈیوڈ صاحب سے ملنے کی کوشش کی تو کاؤنٹر کلرک نے اسے بتایا کہ پرسوں رات ڈیوڈ صاحب تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہوٹل سے پیدل اپنے گھر واپس جا رہے تھے کہ کچھ غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں اچھی طرح مار پیٹ کر فرار ہو گئے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت ڈیوڈ صاحب کی جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی مگر انہوں نے رقم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ڈیوڈ صاحب کے کافی چوٹیں آئی تھیں اور وہ اسپتال میں تھے۔ ہمدانی سیدھا اسپتال پہنچا اور اس نے ڈیوڈ صاحب سے بات کی۔

''آپ کی تو میرے خیال میں کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں۔''

''میں خود حیران ہوں۔ میری زندگی میں یہ پہلا تجربہ ہے کہ مجھ پر اس طرح حملہ کیا گیا اور میں نہیں جانتا کہ وہ غنڈے کون تھے۔ تم یقین کرو، یہاں نادرہ آباد میں تقریباً چالیس سال سے رہتا ہوں اور میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

''کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ درج کرا دی ہے؟''

''ہاں... ظاہر ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مجھے کسی پر شبہ ہے مگر مجھے کس پر شبہ ہو سکتا تھا اور میں اندھیرے میں کسی کو پہچان بھی نہیں سکا تھا۔''

کافی دیر تک وہ ڈیوڈ صاحب کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا لیکن کوئی ایسی بات پتا نہ چل سکی جس سے معاملات پر کچھ روشنی پڑتی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈاکٹر زمان خان سے ملاقات کرے۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو اور اس کے ہر قدم سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جب وہ ڈاکٹر زمان خان کے کلینک پہنچا تو اس کی ملاقات عینی سے ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ... اور اگر گئے ہی تھے تو مجھے بتا کر کیوں نہیں گئے؟''

''بس کچھ ضرورت پیش آ گئی تھی اس لیے چلا گیا۔''

''آپ کو معلوم ہے، کیا ہوا ہے؟'' عینی نے بچوں کے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت، کیا ہوا ہے؟''

''گڈ... اس کا مطلب ہے کہ اتنی بڑی اطلاع میں ہی آپ کو دوں گی۔''

''کتنی بڑی اطلاع ہے عینی! آپ تو مجھے پہیلیاں بجھوا رہی ہیں۔''

''جنابِ عالی! محترمہ صدف صاحبہ نادرہ آباد پہنچ چکی ہیں۔''

''کیا؟'' ہمدانی حیرت سے اچھل پڑا۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''بس... ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں... کیا سمجھے آپ؟''

''وہ تو خیر میں مانتا ہوں اس بات کو لیکن خاتون کہاں ہیں؟''

''ہوٹل میں ٹھہری ہیں۔'' عینی نے اسی ہوٹل کے بارے میں بتایا جس میں خود ہمدانی کا قیام تھا۔ یہ مزید حیرانی کی بات تھی، ہمدانی تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔

''واقعی آپ کسی سے کم نہیں ہیں... مس عینی! کیا آپ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو پتا چلا کہ محترمہ یہاں دوبارہ کیوں آئی ہیں اور اتنے عرصے کے بعد۔"

"جی جناب، بڑی معلومات حاصل کی ہیں میں نے۔ اور چالاکی میں تو میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ میں نے بڑے طریقے سے معلومات حاصل کی ہیں۔ بہت سے ذرائع ہیں میرے پاس اور ویسے بھی صدف صاحبہ نے اپنی آمد کو راز نہیں رکھا۔ کچھ لوگوں نے ان سے سوالات کیے تو انہوں نے بتایا کہ بیس سال پہلے انہوں نے اپنے شوہر ڈاکٹر شیراز گل کے خلاف خلع کی جو درخواست دی تھی، وہ اسے واپس لینے آئی ہیں۔ انہوں نے واپس آتے ہی نادرہ آباد کا ایک مشہور وکیل کر لیا ہے۔ وکیل صاحب نے کل ہی فیملی کورٹ میں مقدمہ واپس لینے کی درخواست دی ہے۔ عام خیال ہے کہ کیونکہ معاملہ بیس برس سے التوا میں پڑا ہوا تھا اس لیے عدالت خوشی سے اسے ختم کرنے کی اجازت دے دے گی۔ ویسے بھی ان کاغذات کا اب کوئی پتا نہیں ہوگا... ہوں گے کسی فائل کیبنٹ میں۔"

"ویری گڈ... ویری گڈ... اچھا، ایک بات بتایئے! کیا ڈاکٹر زمان کو بھی اس بارے میں علم ہو چکا ہے؟"

"میں نے ہی بتایا تھا۔" عینی نے کہا تو نادر ہمدانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یہ عینی واقعی کمال کی لڑکی تھی۔

"پھر ان کا کیا ردعمل ہوا؟"

"حیرت انگیز... وہ بہت ہی کم اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہیں لیکن وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بیٹا... میں دو چار دن کے لیے باہر جا رہا ہوں اور اس کے بعد چلے گئے اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ کوئی سامان وغیرہ بھی لے کر نہیں گئے۔"

"ایک بات بتایئے مس عینی! کیا آپ نے محترمہ صدف سے ملاقات کی ہے؟"

"لیجیے... جان نہ پہچان، بڑی خالہ سلام۔ میں کیسے ملاقات کرتی؟ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے وہ بہت بدل گئی ہیں۔ پہلے... دبلی پتلی ہوا کرتی تھیں۔ اب بے حد موٹی ہو گئی ہیں۔ چہرہ پھول گیا ہے۔ کمر تک لمبی چوٹی کی جگہ کٹے ہوئے بال اور نظر کمزور ہو گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا تھا میرے مخبر نے کہ جس دن وہ آئی تھیں، اسی دن ان کا چشمہ گر گیا تھا۔ چنانچہ آنکھوں کی تکلیف سے بچنے کے لیے ہر وقت گہرے سبز رنگ کے شیشوں کی عینک لگائے رکھتی ہیں۔ ان کے ایک دو جاننے والے گئے تھے تو بہت اخلاق سے پیش آئیں۔"

"بھئی آپ کا مخبر تو کمال کا ہے۔ بڑی دلچسپ باتیں بتائی ہیں اس نے۔"

"اچھا چلیے چھوڑیے۔ ہمیں کیا لینا دینا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ اپنا وعدہ پورا کرنے کی کوشش کریں گے؟ اب دیکھیے نا، میں آپ کے لیے کتنی محنت کر رہی ہوں۔"

"میرا وعدہ؟"

"آپ نے کہا تھا نا کہ مجھے دارالحکومت میں کوئی نوکری دلا دیں گے۔"

"ہاں... یہ میرا وعدہ ہے، ذرا اس مسئلے کو حل ہو جانے دیجیے۔ شکر یہ عینی! مجھے امید نہیں تھی کہ تم میرے لیے اس قدر کارآمد ثابت ہو گی۔" نادر ہمدانی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

ہوٹل تک سفر کے دوران اس کا ذہن مختلف خیالات کا شکار رہا۔ عینی کا مخبر کون ہو سکتا تھا؟ وہ جس قدر معصوم نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے، اتنی معصوم بھی ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹر زمان خان، صدف کی آمد کے بارے میں سنتے ہی کہاں غائب ہو گیا؟ بہت سی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

کار ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کر کے اس نے صدف کے کمرے کے بارے میں معلوم کیا اور پھر اس کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔

"آؤ... کون ہے؟" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے صوفے پر ایک پختہ عمر کی عورت جس کے جسم کو موٹاپے نے بھدا کر دیا تھا، سبز رنگ کا چشمہ لگائے بیٹھی تھی۔ کٹے ہوئے بال... جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی، شانوں تک آ رہے تھے۔ اس نے سفید ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر گوشت کی مقدار زیادہ تھی لیکن چہرے کے نقوش اب بھی یہی بتا رہے تھے کہ ماضی میں وہ کافی خوب صورت رہی ہو گی۔ عورت نے کسی قدر تند نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

"تم کون ہو؟ میں تو سمجھی تھی کہ ویٹر آیا ہے۔"

"وہ دراصل میڈم... میں ایک اخبار کا نمائندہ ہوں۔ آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ آپ صدف شیراز گل ہیں نا؟"

"ہاں... میں وہی ہوں لیکن تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں تمہیں کوئی انٹرویو دوں گی؟ اور کسی اخبار کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"آپ معمولی خاتون تو نہیں ہیں میڈم۔ ایک زمانے میں آپ ایک انتہائی ممتاز فنکارہ رہ چکی ہیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر شیراز سے شادی کرنے کے بعد آپ یہاں کی





اعلیٰ سوسائٹی کی روح رواں تھیں۔ پھر جن حالات میں آپ نے ڈاکٹر صاحب سے خلع حاصل کرنے کے لیے عدالتی چارہ جوئی کی اور اس کے بعد جس طرح آپ اور ڈاکٹر صاحب خود عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو فطری طور پر آپ کی شخصیت نے بہت بڑی حیثیت اختیار کر لی۔ اصل میں آپ کو پتا ہے کہ لوگ حقیقی زندگی کی کہانیوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ میڈم! آپ نیوز ویلیو رکھتی ہیں۔"

"سوری... میں معذرت خواہ ہوں۔" وہ بولی۔ "اور اب تو میں بالکل ہی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوں کیونکہ میری نظر کا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے تو تمہاری صورت تک صاف نظر نہیں آ رہی۔"

"ایسی باتیں کر کے آپ میرا دل دکھا رہی ہیں کیونکہ میں اس طرح کے لوگوں کی بہت قدر کرتا ہوں جو اس قدر ویلیور کھتے ہوں۔" ہمدانی نے کچھ اس انداز میں کہا کہ عورت کے چہرے کے نقوش متاثر ہونے لگے اور اس نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جو سوالات کرنا چاہتے ہو جلدی کر لو۔ میں نے اپنے وکیل کو بلایا ہے، وہ آتے ہی ہوں گے۔ مجھے ان کے ساتھ جانا ہے۔"

"میرا سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے اچانک نادرہ آباد کیوں چھوڑ دیا؟"

"وجہ تو صاف ہے۔ اختلافات کے باوجود مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی اور اب بھی ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو بھی سلوک کیا، وہ ایک الگ بات ہے لیکن ان کے بغیر میری زندگی زخم بن گئی تھی اور ان کے جانے کے بعد میرا دل بھی اس شہر میں نہیں لگا۔"

"یہ طویل عرصہ یعنی بیس برس آپ نے کہاں گزارے؟"

"بس مختلف شہروں میں... اور حقیقت یہ ہے کہ میں بھی جگہ جگہ ڈاکٹر شیراز کو تلاش کر رہی تھی۔ جہاں بھی ان کی موجودگی کی اطلاع ملتی، میں وہاں پہنچ جاتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ ڈاکٹر شیراز گل کے بغیر میں اس ادھوری زندگی کو مکمل نہیں کر سکتی۔"

"تو کیا وہ آپ کو ملے؟"

"نہیں، میں آج تک ان کی تلاش میں ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور کبھی نہ کبھی انہیں ضرور پا لوں گی۔"

"اتنے عرصے کے بعد آپ نے نادرہ آباد کا رخ کیوں کیا؟"

"دونوں ہی باتیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید ڈاکٹر شیراز کو کبھی نادرہ آباد یاد آ جائے اور وہ یہاں واپس آ جائیں۔ اس کے علاوہ وہ درخواست بھی واپس لینی تھی جو میں نے غصے میں محض ایک جوابی کارروائی کی حیثیت سے دی تھی۔ ورنہ سچ مچ میں اپنے شوہر سے خلع نہیں چاہتی تھی۔"

"طلاق کی ایک درخواست ڈاکٹر شیراز نے بھی تو دی تھی؟"

"ہاں مگر وہ درخواست بہت پہلے ہی عدالت نے عدم پیروی کی وجہ سے خارج کر دی تھی۔"

"گستاخی معاف محترمہ! آپ کو یہ درخواست واپس لینے کا خیال اتنے عرصے بعد کیوں آیا؟"

"دیکھیے، میں نے آپ کے ہر سوال کا جواب بڑی فراخ دلی سے دیا ہے لیکن بہت سے معاملات نجی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں اس بارے میں آپ کو کوئی جواب نہیں دینا چاہتی۔ اور پلیز! میں نے آپ سے کہا ہے کہ میرے وکیل آنے والے ہیں، میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو ان سے ملاقات کے لیے تیار کر رہی ہوں۔ آپ ان سوالات پر اکتفا کیجیے اور مجھے اجازت دے دیجیے۔"

"آخری سوال اور..." ہمدانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پوچھیے۔"

"کیا مقدمہ واپس لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اب بھی خود کو ڈاکٹر شیراز کی جائز اور قانونی بیوی خیال کرتی ہیں؟"

"قطعی... صرف میں ہی ان کی جائز بیوی ہوں اور کوئی مجھ سے میرا یہ مقام نہیں چھین سکتا۔ پلیز! اب آپ جایئے۔" اس نے خاصی ناگواری سے کہا تو ہمدانی واپسی کے لیے اٹھ گیا۔

بہرحال، ابھی نادرہ آباد میں کافی وقت گزارنا تھا اور نادر ہمدانی بڑے اہتمام سے اس کی چھان بین کر رہا تھا۔ اس نے اس مقدمے کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے کورٹ کا رخ بھی کیا تھا اور اس کے بعد یہ پتا چلا تھا کہ عدالت نے کسی باقاعدہ اجلاس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ صدف یا اس کے وکیل کو اپنے چیمبر میں بلوایا اور ان سے دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد مدعیہ کو اپنی درخواست واپس لینے کی اجازت دے دی۔

بہرحال، صدف بہت خوش خوش باہر آئی تھی اور اپنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وکیل کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی۔ یہ سارے واقعات بڑی تیزی سے ہوئے تھے اور ایک طرح سے بظاہر ان کا خاتمہ ہی نظر آرہا تھا کیونکہ صدف کے انداز سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ نادرہ آباد نہیں چھوڑے گی۔ پھر ہمدانی نے دوبارہ عینی سے ملاقات کی۔ وہ دارالحکومت واپس جارہا تھا۔ اس نے عینی کے چہرے پر غم کے تاثرات دیکھے۔

''میں نہیں جانتی کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے لیکن میں بڑی بدنصیب ہوں۔ ہمدانی صاحب! کیا آپ واقعی مجھے دارالحکومت بلوالیں گے۔ دیکھیے میں آپ سے کوئی ضد نہیں کر رہی لیکن میرے بارے میں ہمدردی سے غور کیجیے۔ مجھے کم از کم اپنا فون نمبر تو دیتے جائیے... اگر میں دوبارہ آپ سے ملاقات کرنا چاہوں تو کوئی مشکل نہ ہو۔ ویسے یہ بھی آپ کی مرضی پر منحصر ہے، اس میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔''

ہمدانی نے اسے اپنا فون نمبر دے دیا۔ عینی کے لیے وہ بھی دل میں ہمدردی کے جذبات لیے واپس لوٹا۔ ڈاکٹر زمان خان کے گم ہونے کے بعد سے واقعی عینی کا چہرہ اترا اترا ہی سا نظر آتا تھا ورنہ وہ ایک شگفتہ لڑکی تھی۔ عادل پاشا نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور ہنستے ہوئے کہا۔

''بڑا دلچسپ مسئلہ رہا ہے لیکن بہرحال ان دلچسپیوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ مجھے صرف ایک بات کی تشویش ہے۔ فیروز خان نے مجھ سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا جبکہ اسے مجھ سے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیے تھیں۔ وہ کردار ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر، میرے تمہارے معاملات جس انداز میں چل رہے ہیں، وہ چلتے رہیں گے۔ مجھے جگہ جگہ تمہاری ضرورت پیش آئے گی۔''

''میں حاضر ہوں پاشا صاحب۔''

''اور وہ آپ کا معاوضہ؟''

''وہ بھی لے لیں گے... جلدی کیا ہے؟''

''اگر تم فیروز خان کا انتظار کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو۔ وہ جب بھی آیا اور جو بھی سلسلہ ہو...''

''آپ پلیز اس طرح کی باتیں نہ کریں۔'' نادر ہمدانی نے کہا اور پھر وہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگیا لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے عینی کا فون موصول ہوا، عینی نے کہا۔

''نادر صاحب! معافی چاہتی ہوں، ایک اطلاع ہے آپ کے لیے اور مجھے آپ کی ضرورت ہے۔''

''ہاں... ہاں... بتایئے۔''

''انکل کی لاش پائی گئی ہے، ایک پہاڑی ٹیلے کے پاس۔ انہوں نے خودکشی کرلی ہے۔ آپ بتایئے آپ...''

''میں آرہا ہوں عینی۔'' یہ اطلاع بھی ہمدانی نے پاشا کو دی اور پاشا نے فوراً ہی کہا۔

''میں جانتا تھا کہ یہ کیس ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کیس کا مرکزی کردار یعنی صدف نادرہ آباد میں موجود ہے تو کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ اور پھر جو واقعات تم نے بتائے تھے، اس کے بعد یہ فیصلہ کرلینا کہ کیس ختم ہوگیا ہے، کم از کم میرا ذہن تو اسے قبول نہیں کرتا۔ تم میری گاڑی لے جاؤ۔ کوئی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔''

نادر ہمدانی جب ڈاکٹر زمان خان کے کلینک... پہنچا تو اس نے باہر ہی پولیس کی گاڑی کھڑی دیکھی۔ اندر ایک پولیس آفیسر عینی سے سوالات کررہا تھا۔ جب ہمدانی اندر داخل ہوا تو عینی کے چہرے پر اسے دیکھ کر رونق سی آگئی۔

''آپ نے بہت اچھا کیا جو اس وقت آگئے ہیں۔ میں خود کو بڑا تنہا محسوس کررہی تھی۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں عینی... بےفکر رہو۔''

''آپ کے آجانے سے مجھے اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ میں اب تنہا نہیں ہوں۔''

''کون صاحب ہیں آپ؟'' پولیس آفیسر نے سرد لہجے میں کہا۔

''میں اس خاندان کا ایک دوست اور بہی خواہ ہوں۔ میرا نام نادر ہمدانی ہے۔''

''میں انسپکٹر ثناءاللہ ہوں اور ڈاکٹر زمان خان صاحب کے خودکشی کیس کی تحقیقات کررہا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب کی موت ایک المناک سانحہ ہے، انسپکٹر صاحب! کیا تعاون کے طور پر آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے کہ انہوں نے کس انداز میں خودکشی کی؟''

''پچھلے دن دوپہر کے ایک بجے کے قریب ایک مقامی باشندے نے اطلاع دی کہ... ٹیلے کے پاس ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ میں جب تحقیقات کے لیے گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ لاش ڈاکٹر زمان خان کی ہے۔ ڈاکٹر زمان خان بہرحال ایک معروف شخصیت تھے اور نادرہ آباد کے قدیم باسی بھی... بہرحال ان کی لاش اسپتال پہنچائی گئی اور معائنہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ان کی موت کو تقریباً دو دن گزر چکے ہیں اور ان کی لاش ایک ایسی جگہ پڑی ہوئی تھی جو عام گزرگاہ نہیں تھی۔ لاش کے پاس ایک ریوالور بھی پایا گیا ہے اور بائیں کنپٹی پر گولی کا نشان بھی تھا۔ ان کی جیب سے



## اعتراف

ایک کاغذ بھی نکلا ہے جس پر تحریر تھا کہ وہ مختلف وجوہات کی بنا پر دلبرداشتہ ہوکر اپنے ہاتھوں زندگی ختم کررہے ہیں اور کسی کو ان کی موت کا ذمے دار نہ سمجھا جائے۔''

اپنے تجربے کی بنیاد پر نادر ہمدانی نے اندازہ لگایا کہ انسپکٹر ثناءاللہ سیدھا سادہ آدمی ہے، زیادہ الجھنوں میں نہیں پڑتا۔ اس کے نزدیک سو فیصدی یہ خودکشی کا کیس تھا۔ ڈاکٹر زمان خان کی بھتیجی سے وہ صرف رسمی سوالات کرنے آگیا تھا تاکہ وہ اپنی یہ رپورٹ مکمل کرسکے۔ اگر انسپکٹر ذہین ہوتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ خط کی تحریر ڈاکٹر زمان خان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے بھی یا نہیں۔ لیکن نادر ہمدانی اس خیال کو بھی پی گیا۔ ریوالور کے بارے میں البتہ اس نے کچھ سوالات کیے۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ ریوالور زمان خان صاحب ہی کا ہے؟'' انسپکٹر چونکا پھر اس نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

''یہ معلوم کرنا کون سی مشکل بات ہے؟ پولیس اپنا کام کرنا جانتی ہے۔''

ہمدانی نے اپنے آپ کو اس خاندان کا بہی خواہ بتایا تھا۔ چنانچہ اس نے باقی معاملات میں پورا پورا حصہ لیا اور ضروری کارروائیوں کے بعد ڈاکٹر زمان خان کی تدفین کردی گئی۔ انسپکٹر ثناءاللہ نے تو ابھی تک ریوالور کے بارے میں کوئی تحقیقات نہیں کی تھی لیکن موقع ملتے ہی نادر ہمدانی نے اس بارے میں عینی سے پوچھا۔

''نہیں... پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم چچا بھتیجی کے درمیان زیادہ روابط نہیں تھے۔ کچھ ہی معاملات ایسے ہوا کرتے تھے جن میں، میں انکل زمان سے کچھ سوالات کرلیا کرتی تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے کھل کر گفتگو نہیں کی۔ اس ریوالور کے بارے میں... میں کچھ بھی نہیں جانتی کہ یہ ان کا ہے بھی یا نہیں۔ ویسے ایک ذاتی بات میں آپ کو بتاؤں ہمدانی صاحب! وہ گوشہ نشین ضرور ہوگئے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں افسردہ یا غمگین نہیں دیکھا۔ نہ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔''

''ہوں۔''

''لیکن ہمدانی صاحب! انکل کی موت کے بعد تو میں بالکل ہی تنہا ہوگئی ہوں۔ کلینک میں تالا ڈالنا پڑے گا کیونکہ میں تو نزلہ زکام کا علاج بھی نہیں کرسکتی۔ صرف اس لیے کلینک میں نظر آتی رہی ہوں کہ ایک ڈاکٹر کی بھتیجی ہوں۔ دیکھیے میرا آپ پر کوئی حق تو نہیں ہے لیکن انسان چھوٹے چھوٹے سہارے تلاش کرتا ہے۔ خدارا میرے بارے میں کچھ سوچیے۔''

''میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، تم بےفکر رہو... میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' ہمدانی نے جواب دیا۔

بہرحال، فی الحال کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کے لیے ہمدانی کو یہاں رکنا پڑتا۔ البتہ ہوٹل سے روانگی سے پہلے اس نے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ کوئی صدف سے ملنے آیا تھا اور اس کے جانے کے بعد صدف نے ہوٹل کا بل ادا کیا، ٹیکسی منگوائی اور ریلوے اسٹیشن روانہ ہوگئی۔

''جو شخص اس سے ملنے آیا تھا کیا تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟'' ہمدانی نے سوال کیا اور کلرک نے اسے جو حلیہ بتایا وہ سو فیصد اسی شخص کا تھا جس نے ہمدانی پر حملہ کیا تھا۔ بہرحال، اس نے وہاں سے واپسی کا فیصلہ کیا پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ ڈاکٹر شیراز گل نے اپنا نام بدل لیا تھا اور اپنے بچپن کا نام استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ اگر وہ زندہ تھا تو ہوسکتا ہے کہیں آس پاس ہی عثمان شاہ کے نام سے پریکٹس کر رہا ہو۔ چنانچہ اس نے قرب و جوار کے علاقوں میں اس کی تلاش شروع کردی۔ آخرکار ڈاکٹر عثمان شاہ کے کلینک کا سراغ لگا ہی لیا جو دارالحکومت سے کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک درمیانے سے قصبے میں تھا۔

آخرکار وہ سابق شیراز گل اور موجودہ عثمان شاہ کے کلینک پہنچ گیا۔ اس نے ڈاکٹر عثمان شاہ سے ملاقات کی اور جب وہ عثمان شاہ کے سامنے پہنچا تو اس نے اس کی جگہ فیروز کو سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔

فیروز، شیراز گل، عثمان شاہ... تینوں ایک ہی شخصیت کے نام تھے اور چونکہ جب فیروز، عادل پاشا کے پاس آیا تھا تو ہمدانی بھی اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اس لیے صرف ہمدانی نے ہی فیروز یا عثمان شاہ کو پہچان نہیں لیا تھا بلکہ عثمان شاہ نے بھی ہمدانی کو پہچان لیا تھا اور اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے زردی دوڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ڈاکٹر شیراز گل یا عثمان شاہ نے مستحمل کر کہا۔

''تشریف رکھیے۔ میں تو یہ بالکل نہیں کہوں گا کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔'' یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہمدانی نے بھی اس سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اور ایسا کہنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ بہرحال



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ نے بے شک دوبارہ عادل پاشا سے ملاقات نہیں کی لیکن پھر بھی ہم نے آپ کا کیس اپنے پاس ہی رکھا ہے۔"

"آپ یقین کیجیے اس میں، میں کسی بددیانتی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ بددیانتی سے میری مراد یہ ہے کہ میں نے وعدے کے باوجود عادل پاشا صاحب سے ملاقات نہیں کی اور ان کی کاوشوں کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا لیکن آپ اس بات پر یقین کر لیجیے کہ میں نے ان سے اسی وقت پوچھا تھا کہ اس کارروائی کے صلے میں مجھے کیا نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ اس کے لیے انہوں نے کہا تھا کہ یہ تمام باتیں بعد میں طے کرلیں گے۔" عثمان شاہ کے ان الفاظ پر ہمدانی مسکرا دیا پھر بولا۔

"تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے عادل پاشا کا معاوضہ وصول کرنے آیا ہوں؟"

"بخدا نہیں... آپ اس پائے کے لوگ نہیں ہیں لیکن پھر بھی اصل میں کچھ مشکوک حالات میرے سامنے آگئے تھے اور مجھے خدشہ ہوگیا تھا کہ کہیں میری شخصیت منظرِ عام پر نہ آجائے اسی لیے میں نے عادل پاشا سے نہ تو فون پر بات چیت کی اور نہ ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں مسلسل اس کھوج میں رہا ہوں کہ جیسے ہی مجھے موقع ملے، میں ان کے آفس میں نہ سہی، ان کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کروں۔ آپ کا نام نادر ہمدانی ہے نا؟"

"جی... جی۔"

"پاشا صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ اصل میں میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں عادل پاشا صاحب کی قانونی خدمات حاصل کروں۔ لیکن میرا مقدمہ اسی وقت بنتا تھا جب تک صدف مجھے نظر نہ آجاتی یا مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہ ہوجاتا۔ میں اپنی چھان بین میں لگا ہوا تھا اور..."

"آپ اتنی وضاحتیں نہ کیجیے عثمان صاحب! آپ یقین کریں آپ کے نہ آنے پر ہمیں حیرت ضرور تھی لیکن ہم آپ کے بارے میں کسی ایسے احساس کا شکار نہیں ہوئے تھے کہ آپ جان بوجھ کر گم ہوگئے ہیں... کیونکہ بہرحال، آپ نے ہمیں باقاعدگی کے ساتھ محترمہ صدف کی تلاش کے لیے مخصوص کیا تھا۔"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی شبہے سے بالاتر ہوکر مجھ سے بات کریں... کیا میں یہ سوال کرسکتا ہوں کہ آپ کو میرا پتا کس طرح چلا؟"

"وزارتِ صحت کے ذریعے۔" نادر ہمدانی نے جواب دیا اور عثمان شاہ اپنی کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمدانی کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ظاہر ہے، اتنی ذہانت آپ ہی کے پاس ہوسکتی ہے کیونکہ آپ یہ کام باقاعدہ کرتے ہیں۔ میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا اور شاید میری تقدیر ہی میرا ساتھ دیتی رہی ہے کہ کسی اور کو اس ذریعے سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا خیال نہیں آیا۔"

"خیر، اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اگر آپ عادل پاشا صاحب کو اپنے بارے میں تفصیل بتا دیتے تو اب تک بہت سا کام ہو چکا ہوتا۔ آپ کو یہ سن کر شاید خوشی ہو یا ہو سکتا ہے، یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہو کہ محترمہ صدف کل رات تک نادرہ آباد میں موجود تھیں۔" عثمان شاہ کے چہرے کے تاثرات سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اسے اس بات کا علم نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک نادر ہمدانی کی صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔

"کیا آپ نے اسے اپنے قبضے میں کرلیا ہے؟"

"یہ کیسے ممکن تھا؟ ہم لوگ قانونی معاملات کی نگرانی ضرور کرتے ہیں، کوئی غیر قانونی حرکت کبھی نہیں کرتے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ڈاکٹر عثمان شاہ نے نڈھال لہجے میں کہا پھر بولا۔

"جب آپ اس قدر معلومات حاصل کر رہے ہیں تو یقیناً آپ نادرہ آباد بھی گئے ہوں گے اور وہاں سے بہت سی باتیں آپ کے علم میں آچکی ہوں گی۔ تاہم تھوڑی سی وضاحت کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔" ڈاکٹر عثمان شاہ نے کہا۔

"صدف سے شادی کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔" عثمان نے قدرے توقف کے بعد بتانا شروع کیا۔ "حالانکہ میں بچپن ہی سے زرمین کو پسند کرتا تھا مگر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ میری پھوپی صاحبہ اس کی شادی کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ اس وقت جب میں صدف سے شادی کر چکا تھا، مجھے زرمین کے حالات کا پتا چلا اور اسے انتہائی مشکلات کا شکار پا کر میں نے اسے نادرہ آباد بلا لیا۔

"پھر میں نے اسے نرسنگ کی ٹریننگ دلوائی اور اپنے کلینک میں رکھ لیا۔ اگر میری اور صدف کی گھریلو زندگی خوشگوار ہوتی تو شاید میں دوبارہ زرمین کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن میرے پریشان کن ازدواجی حالات نے ایک بار پھر مجھے زرمین کے قریب کر دیا۔ میں صدف کو طلاق دے کر



زرمین سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن صدف نے مکاری اور چالاکی سے کام لے کر مجھے نادرہ آباد میں رسوا کر دیا اور حالات یہاں تک پہنچا دیے کہ مجبوراً وہ شہر چھوڑنا پڑا۔ میں زرمین کے ساتھ مختلف شہروں میں تھوڑی تھوڑی مدت قیام کرتے ہوئے آخرکار یہاں پہنچ گیا اور یہ کام میں نے اس لیے کیا تھا کہ صدف مجھے تلاش نہ کرسکے۔ یہاں میں نے زرمین سے شادی کرلی جبکہ موجودہ قوانین کے مطابق میں دوسری شادی اس وقت تک نہیں کرسکتا تھا جب تک صدف کو طلاق نہ دے دیتا یا اس سے دوسری شادی کی اجازت نہ حاصل کرلیتا۔ نکاح کے فارم پر میں اس سلسلے میں کیے جانے والے سوالات کے صحیح جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے نکاح تو کرلیا مگر اس کی رجسٹریشن نہیں کرائی۔ حالانکہ قانوناً یہ جرم ہے۔ اگر آج یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے تو عوام کی نظروں میں اپنی شخصیت کے احترام کو مجروح کرنے کے علاوہ مجھے شاید کچھ سزا بھی ہوجائے۔ لیکن خیر، اس وقت مجھے ان باتوں کی زیادہ پروا نہیں تھی اور نہ میں نے یہ سوچا تھا کہ آئندہ ایسا کوئی وقت بھی آسکتا ہے کہ مجھے عوام کو غلط فہمی سے بچانے کے لیے ان حالات کو پھر سے کریدنا پڑے گا۔

"بہرحال میں نے اپنا نام تبدیل کرلیا اور اس کے بعد میں سکون سے پریکٹس کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ نادرہ آباد کی طرح مجھے یہاں بھی عزت اور ہر طرح کے عیش و آرام میں کوئی کمی پیش نہ آئی۔ گزشتہ دنوں ملکی حالات بہت تبدیل ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ انسان دشمن عناصر ابھر کر اوپر آئے اور بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں۔ یہاں اس جگہ بھی جہاں میں پریکٹس کر رہا ہوں ایسے مفاد پرستوں کی کمی نہیں۔ بہرحال، میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا کہ کچھ لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں مقامی طور پر الیکشن میں حصہ لوں۔ چنانچہ میں نے پہلے تو بڑی معذرت کی لیکن ایک حلقہ ایسا بن گیا جو بضد ہے کہ... میں انتخاب میں حصہ لوں۔ مجھے تیار ہونے کے بعد اس تشویش کا سامنا کرنا پڑا کہ اگر انہیں میرے ماضی کے بارے میں معلوم ہوا تو یہ میری نااہلی تصور ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ میرے مخالف افراد اور ان کے ساتھ شامل سماج دشمن عناصر میری اس حیثیت کو قبول نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دینے کے علاوہ انہوں نے میرے ماضی کی کوئی ایسی بات تلاش کرنا شروع کردی جو مجھے عوام کی نگاہوں میں گرا دے اور ان کے اعتماد سے محروم کردے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا یہاں بڑا احترام کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ مجھے الیکشن لڑنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔

"بہرحال، میری پوری زندگی میں صدف کے سوا کوئی اور سیاہ دھبا نہیں ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ میں اسے تلاش کر کے اس کو کسی طرح مفاہمت پر رضامند کرلوں، اس سے نجات حاصل کرلوں۔ باقاعدہ تلاش کے بعد دشمن مجھے ذلیل نہیں کرسکتے اسی لیے میں نے عادل پاشا سے رابطہ قائم کیا۔ الیکشن کی تاریخ میں ابھی کچھ وقت ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب بھی اگر کسی طرح سے صدف مل جائے اور آپ اسے اس بات کے لیے تیار کرلیں تو میرے مخالفین کا یہ حربہ بھی بے اثر ہوسکتا ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ آگے کی صورتِ حال کیا ہو؟"

نادر ہمدانی اس داستان کو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس نے بہت سے پیچیدہ مسائل حل کیے تھے اور ان کے بارے میں رپورٹ بنا کر ان کی شاندار کوریج کی تھی لیکن یہ کیس کافی دلچسپ تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایسی بات ہے تو مقدمہ کس قسم کا بنتا ہے؟ ہوسکتا ہے مقدمے والی بات صرف ایک کہانی ہو اور ڈاکٹر عثمان شاہ کسی ایسے وکیل کو ہم راز بنا کر اپنے لیے قانونی بہتری چاہتا ہو یا پھر اس کے ذہن میں صرف اتنا ہی خیال ہو کہ پاشا کے ذریعے صدف کو تلاش کر کے وہ اپنے اور صدف کے درمیان مفاہمت کرا سکے۔

"دیکھیے نادر ہمدانی صاحب! ایک بہت ہی گھٹیا بات کر رہا ہوں، آپ اسے محسوس نہ کریں، پلیز۔"

"ہاں بتائیے؟"

"عادل پاشا سے بے شک میری دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی اور اس کی وجہ کچھ ایسے ہنگامے تھے جو درمیان میں پیش آگئے ہیں اور جن کی تھوڑی بہت وضاحت میں کر چکا ہوں لیکن میرے اور ان کے درمیان جو مالی معاملات..."

"میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات، وہ ہم بعد میں طے کرلیں گے۔ جیسا کہ عادل صاحب نے کہا، میں آپ کو مکمل تفصیل بتائے دیتا ہوں، اس کے بعد غور کیجیے گا کہ یہ سارا قصہ کیا ہے۔"

ہمدانی نے اس دوران میں پیش آنے والے تمام واقعات عثمان شاہ کو بتا دیے اور اس نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"سو فیصدی... سو فیصدی... وہ لوگ میرا مطلب ہے، میرے مخالف ہدف تک پہنچ چکے ہیں اور اس نے یقیناً خلع کی درخواست اسی لیے واپس لے لی ہے کہ خود کو میری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قانونی بیوی ثابت کر کے زرمین سے میری شادی کو ناجائز قرار دلوا سکے اور مجھے عوام کی نگاہوں میں بدنام کر سکے۔ اوہ... میرے خدا! یہ تو بڑی مشکل پیش آ گئی۔"

"ایک بات بتایئے، آپ نے پاشا صاحب کے علاوہ کسی اور سے بھی صدف کی تلاش کے لیے رابطہ کیا ہے؟"

"ہرگز نہیں لیکن آپ نے ابھی فرزانہ نامی ایک لڑکی کا ذکر کیا ہے اور کسی اور شخص کا بھی۔ میں یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون ہو سکتے ہیں جو صدف کا پتا لگانے کے بارے میں کام کر رہے ہیں۔ خاص طور سے وہ لڑکی فرزانہ کیونکہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ صدف کی کوئی بھانجی یا بھتیجی نہیں ہے۔ ایک بات بتایئے، کیا فرزانہ نے اپنا کوئی پتا وغیرہ بھی بتایا تھا؟"

"ہاں..." ہمدانی نے کہا۔

"مجھے بتانا پسند کریں گے؟"

"کیوں نہیں..." ہمدانی نے کہا اور اس نے وہ پتا دہرایا پھر ہمدانی نے سوال کیا۔

"ویسے ایک بات بتایئے، آپ ان حالات کا شکار تھے لیکن آپ نے اس کے باوجود الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا... کیا آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ بات آپ کے لیے مشکل کا باعث بن سکتی ہے؟"

"میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا، میرا اصل نام واقعی عثمان شاہ ہی ہے اور میں اسی نام سے الیکشن لڑنا چاہتا تھا اور مجھے امید تھی کہ اگر کوئی اسکینڈل نہیں کھڑا ہوا تو میں سو فیصدی الیکشن جیت جاؤں گا۔ ایک دشمن ہے میرا، نام اس کا گلزار ہے اور وہ خاصا بااثر آدمی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فیئر الیکشن میں وہ مجھ سے نہیں جیت سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے بدنام کرنے کی مہم اسی نے شروع کر رکھی ہے۔ اس کا ایک اخبار پر بھی اثر ہے اور اس اخبار کے ذریعے وہ میرے خلاف خبریں اور افواہیں شائع کراتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی پولیس کے افراد بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ایک دو اعلیٰ افسروں کو اس نے ٹرانس میں لے رکھا ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا لیکن اگر انہوں نے صدف کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور اس سے یہ بیان دلوا دیا کہ وہ میری جائز بیوی ہے اور زرمین سے میں نے جو شادی کی ہے وہ غلط اور ناجائز ہے تو مجھے کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"محترمہ صدف ابھی کچھ دنوں پہلے نادرہ آباد سے غائب ہو گئی ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر میری ڈیوٹی ہے کہ میں ان کا پتا چلاؤں اور انہیں مجبور کروں کہ وہ آپ کے خلاف کام کرنا چھوڑ دیں۔"

"بڑے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑے گا مجھے ہمدانی صاحب۔ بار بار کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن میں آپ لوگوں کے معاوضے کا مقروض ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ صدف ایک آدھ دن میں یہاں تک پہنچ جائے گی..." عثمان شاہ نے افسردگی سے کہا۔

"دیکھیے جو کچھ بھی بہتر ہو سکتا ہے، میں کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اجازت دیجیے۔" ڈاکٹر عثمان شاہ نے بڑی نیازمندی سے ہمدانی کو رخصت کیا۔

ڈاکٹر عثمان شاہ کے کلینک سے نکلنے کے بعد ہمدانی کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے۔ اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اس کا دوست جو محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھا، ایک زمانے میں ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس کا نام نعمان غزالی تھا اگر وہ اس وقت بھی یہیں موجود ہے کیونکہ یہاں آنے کے بعد اس سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا تو وہ اس سے بہت سے معاملات میں مدد لے سکتا ہے۔ اس نے نعمان سے ملاقات کی لیکن نعمان غزالی نے زیادہ پُرجوش انداز کا مظاہرہ نہیں کیا جس پر نادر ہمدانی کو بڑی حیرت ہوئی۔

"کیا بات ہے، اس دوران ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے تم شاید کچھ الجھ گئے ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے، تمہیں معلوم نہیں کہ آج کل یہاں محکمۂ پولیس میں بڑی سیاست چل رہی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رپورٹ ہو جاتی ہے اور ایس پی صاحب سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ سروس معطل کرا دیتے ہیں۔ انکوائری کے بہانے مہینوں پریشان کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے کیس ہو چکے ہیں اور تم ایک بدنام کرائم رپورٹر ہو۔ معاف کرنا، بدنام اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم ہر ایک کے خلاف ہر بات سچ لکھ دیتے ہو۔ یہ بات میرے لیے خطرناک ہے۔ پہلے ہی تمہاری یہاں آمد میرے لیے الجھن کا باعث ہے۔"

اچانک ہی ہمدانی چونک پڑا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ سامنے والی دیوار پر ایک گروپ فوٹو لگا ہوا تھا جو شاید ڈی آئی جی صاحب کی یہاں آمد کے موقع پر اسٹاف کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ گروپ فوٹو نے ہمدانی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ وہ چونک کر اٹھا اور تصویر کے پاس جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ وہی طویل قامت آدمی جس کے بارے میں ہمدانی کو بعد میں یاد آیا تھا اور جس نے اس پر حملہ کیا تھا، یونیفارم پہنے کھڑا تھا۔ نعمان غزالی اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟"

"کیا تم مجھے اس شخص کے بارے میں بتا سکتے ہو...؟" ہمدانی نے اس شخص کے چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"شاید تم اسے بھول گئے، دارالحکومت ہی سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے، بہت خطرناک آدمی ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک بار ایک ایس پی نے اس کا تبادلہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں کر دیا تھا تو اس نے ایس پی کو گولی مارنے کی دھمکی دی تھی۔ عام طور سے محکمے کے عتاب کا شکار رہتا ہے مگر باز نہیں آتا۔ تم یوں سمجھ لو کہ بدنام ترین پولیس آفیسرز میں سے ہے۔ تمہیں گلاب خان کے بارے میں تو معلوم ہوگا؟ گلاب خان جس کی دھاک پورے دارالحکومت میں بیٹھی ہوئی ہے، یہ اس کا شاگرد ہے۔"

"کیا ان دنوں یہ یہاں تعینات ہے؟"

"ہاں، انسپکٹر کی حیثیت سے۔"

"گڈ..."

"کیوں، کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں بس جانی پہچانی شکل تھی۔ اس لیے میں نے اس بارے میں سوال کر لیا۔" نادر ہمدانی نے بات کو ٹال دیا پھر بولا۔

"چلو، اگر تمہیں میری یہاں آمد سے کچھ الجھنیں درپیش آ سکتی ہیں تو میرا خیال ہے مجھے تمہارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔"

"نہیں یار... ایسی بات نہیں ہے، بس دیکھو ناہر شخص نوکری بچانے کے چکر میں رہتا ہے اور ہمارے افسر اعلیٰ صاحب باہر کے لوگوں سے زیادہ اندر کے لوگوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اصل میں بس ایک سیٹ اپ بنایا ہوا ہے انہوں نے کہ یہاں محکمۂ پولیس میں بھی جو کچھ ہو، وہ صرف ان کی مرضی کے مطابق ہو۔" ہمدانی کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"اور ان کی مرضی؟ چلو خیر چھوڑو... اچھا اب اجازت..."

نعمان غزالی سے اس کے اچھے تعلقات تھے لیکن اس وقت نعمان غزالی کی جو کیفیت تھی، اس کے بعد اس کے پاس مزید رکنا خود اپنی بے عزتی کے مترادف تھا بہرحال ہمدانی محسوس کر رہا تھا کہ یہاں آنا بالکل ہی بے مقصد نہیں رہا ہے۔ کم از کم اس شبہے کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ شخص جس نے حملہ کیا تھا وہی تھا جسے اس نے دارالحکومت کے پولیس ہیڈ آفس میں دیکھا تھا اور جس کا نام شہروز خان تھا۔ نادر ہمدانی کو یہ اندازہ تھا کیس بڑی خوش اسلوبی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نئے نئے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردار سامنے آرہے ہیں۔

بہت سی باتیں غور طلب تھیں۔ عثمان شاہ نے اسے بتایا تھا کہ صدف کی اس سے ملاقات دارالحکومت ہی میں ہوئی تھی اور اس وقت وہ ایک کلب میں موسیقی کے پروگرام پیش کرتی تھی۔ بہرحال صدف نادرہ آباد سے غائب ہوگئی تھی۔ کیا وہ دارالحکومت کے کسی حصے میں اسے مل سکتی ہے؟

وہ واپس چل پڑا۔ عادل پاشا سے فوری ملاقات کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کام جاری تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عثمان شاہ اسے دستیاب ہوگیا تھا اور عادل پاشا کے لیے یہ خبر کافی دلچسپ ہوتی۔ البتہ اس نے سب سے پہلے وہ کلب تلاش کیا جہاں بیس برس پہلے صدف موسیقی کا پروگرام پیش کیا کرتی تھی اور وہاں کی روح رواں تھی۔ محتاط انداز میں وہ کلب کے نچلے درجے کے اسٹاف کو تلاش کرنے لگا تاکہ ان سے معلومات حاصل کرے۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات ایک بوڑھے چوکیدار سے ہوئی اور ہمدانی نے اسے اپنی باتوں میں الجھالیا۔ اسے پتا چلا کہ چوکیدار کم از کم پچیس سال سے یہاں چوکیداری کرتا رہا ہے، اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

اس نے چوکیدار کو تھوڑی سی رقم دے دی تو وہ خوش ہوگیا اور پھر ہمدانی نے اس سے معلومات حاصل کیں جس کا لب لباب یہ تھا کہ جن دنوں وہ نیا نیا آیا تھا، کلب میں صدف نامی ایک لڑکی جو بہت خوب صورت تھی اور بہت اچھا گاتی تھی، اس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کرلی اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ کچھ عرصے بعد وہ واپس لوٹ آئی اور دوبارہ کلب میں ملازم ہوگئی۔

اس دوران میں اسٹیج کے ایک اور اداکار سے اس کی دوستی ہوگئی اور صدف نے ایک مقامی عدالت میں درخواست دے کر اپنے ڈاکٹر شوہر سے خلع حاصل کی اور اس اداکار سے شادی کرلی لیکن کچھ عرصے بعد اداکار کو بیرونِ ملک کوئی ملازمت مل گئی اور وہ صدف کو لے کر چلا گیا۔ جب سے اب تک وہ واپس نہیں آئی ہے یا پھر اسے اس بوڑھے چوکیدار نے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

نادر ہمدانی کے ایک اور سوال کے جواب میں چوکیدار نے بتایا کہ صدف کی سب سے قریبی اور گہری دوست راحیلہ تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ کلب میں کام کرتی تھیں اور ساتھ ہی رہتی تھیں۔ صدف نے شادی کرلی، تب بھی راحیلہ اسی مکان میں رہتی اور کلب میں کام کرتی رہی اور پھر جب صدف آئی تو سیدھی راحیلہ کے پاس ہی پہنچی اور پھر جب واپس بیرونِ ملک گئی تو راحیلہ کو ساتھ لے گئی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد راحیلہ واپس آکر دوبارہ کلب میں کام کرنے لگی۔ البتہ وہ بہت ہی موٹی اور بھدی ہوگئی تھیں یہی وجہ تھی کہ کلب کے مالک نے اسے کام دینے سے منع کردیا۔ اب اس کے بعد راحیلہ اسٹیج اور فلموں میں ایکسٹرا کا کام کرتی ہے اور کبھی کبھی پرانے وقتوں کو یاد کرنے کے لیے کلب بھی آجاتی ہے۔

چوکیدار نے اس کے گھر کا پتا بھی بتایا لیکن اس نے کہا کہ وہ پچھلے ہفتے اس سے ملنے گیا تھا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے باہر گئی ہے۔ پتا نہیں ابھی واپس آئی ہے یا نہیں۔

ہمدانی ابھی یہ معلومات حاصل کررہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ اٹھی۔ پولیس کی ایک جیپ تھوڑے فاصلے پر آکر رکی تھی اور اس میں سے شہروز خان نیچے اتر رہا تھا۔ پتا نہیں شہروز خان نے نادر کو دیکھا تھا یا نہیں لیکن ہمدانی نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ شہروز خان اسی کلب کی جانب آرہا تھا لیکن وہ بُری طرح چونک پڑا۔

واقعات کے ڈانڈے مل رہے تھے۔ شہروز خان کلب میں کیوں آیا ہے؟ یہ بعد میں معلوم کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت شہروز خان کی نگاہوں سے محفوظ رہنا تھا۔ چوکیدار کے پاس دوبارہ جانا یا اس کلب کا چکر لگانا خطرناک ہوسکتا تھا کیونکہ اگر شہروز خان اسے وہاں دیکھ لیتا تو وہ ضرور بوڑھے چوکیدار سے معلومات حاصل کرتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بے چارے بوڑھے چوکیدار کو اس کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچ جاتا چنانچہ اب اس کے بعد ایک اور فیصلہ کرکے وہ ایک اور نام کوٹرائی کرنا چاہتا تھا۔ نیو گیریژن ٹاؤن فلیٹ نمبر اٹھائیس جہاں فرزانہ رہتی تھی۔

تیسری منزل پر اس نے مطلوبہ فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور غور سے ہمدانی کو دیکھا جو خود بھی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی کی عمر پچیس سال سے کچھ زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ رنگت گندمی تھی، نقوش میں ایک کشش تھی مگر چہرے پر معصومیت کے بجائے مکاری اور چالاکی کا تاثر حاوی تھا۔

”جی فرمایئے...؟“

”میں فرزانہ صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں...؟“ وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

”کیا آپ فرزانہ ہیں؟ کچھ ضروری باتیں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں آپ کو نادرہ آباد کا حوالہ دوں



یا آپ سے یہ کہوں کہ آپ کسی کے کہنے پر صدف کے بارے میں معلومات حاصل کررہی ہیں اور آپ نے... چلیے چھوڑیئے یوں سمجھ لیجیے کہ میں آپ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دیتا ہوں۔“

”جی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر نادر ہمدانی صاحب... لیکن پولیس اسٹیشن آپ اکیلے نہیں جائیں گے، میں آپ کو پولیس اسٹیشن لے چلوں گا۔“ اس آواز پر چونک کر ہمدانی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے شہروز خان نظر آیا۔ وہ کڑی نگاہوں سے ہمدانی کو دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی۔

”تم یہاں کیا کررہے ہو؟“ ہمدانی نے شہروز خان سے پوچھا۔ پہلے کی بات اور تھی جب شہروز خان تیزی سے اپنا کام دکھا کر نکل گیا تھا لیکن اب ہمدانی پوری طرح ہوشیار تھا۔

”میں کیا کررہا ہوں اور کیا نہیں، اس کو چھوڑیئے اور فرمایئے میرے پاس ایک رپورٹ ہے کہ نادرہ آباد میں ایک عورت کار کے حادثے میں ہلاک ہوئی تھی اور جس کار نے اس بوڑھی عورت کو کچلا تھا، وہ آپ کی تھی۔ میں آپ کو اس بوڑھی عورت کو کچل کر فرار ہونے کے شبہے میں گرفتار کررہا ہوں۔“

”غور کرلو... شہروز خان، میرا نام ہمدانی ہے۔“

”اور میرا نام شہروز خان ہے، آیئے حوالات آپ کا انتظار کررہی ہے حالانکہ میں نے نادرہ آباد میں آپ کو سمجھایا تھا لیکن آپ باز نہیں آئے۔ ویسے میرا استاد کہتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو بہت زیادہ اسمارٹ سمجھتے ہیں اور بڑی چھان بین کرتے رہتے ہیں۔ گلاب خان نے بھی براہِ راست آپ پر ہاتھ نہیں ڈالا لیکن میرا خیال ہے کہ اب آپ نے اسے موقع دے دیا ہے۔“

”جتنا بے وقوف وہ ہے شہروز خان، تم اس سے کہیں زیادہ بے وقوف معلوم ہوتے ہو۔ ایک بے وقوف کا شاگرد بے وقوف ہی ہوسکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا تم اتنے ہی طاقتور ہو کہ مجھ جیسے آدمی پر آسانی سے ہاتھ ڈال سکو؟ میں بھی کچے کام نہیں کرتا۔ سینٹرل انٹیلی جنس کا نام سنا ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”ملک گیر ادارہ ہے اور اس کا تعلق ہر معاملے سے ہے۔ تم بے شک محکمۂ پولیس سے تعلق رکھتے ہو لیکن بہرحال اتنے ذہین نہیں ہو، جتنا عام طور پر پولیس والوں کو ہونا چاہیے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے نادرہ آباد میں مجھے زخمی کرکے مجھے میری ہی کار میں ڈال دیا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے تم نے اپنی انگلیوں کے نشانات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تمہاری انگلیوں کے کتنے ہی نشانات میری کار پر رہ گئے تھے اور میں نے اس پورے واقعے کی رپورٹ انٹیلی جنس کو دے دی تھی اور ساتھ ہی تمہارے وہ نشانات بھی...“ ہمدانی نے ایک لمحے کے اندر شہروز خان کے چہرے کے پھیکے پن کو محسوس کرلیا تھا۔ البتہ فرزانہ دلچسپی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ شہروز خان تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

”بہت چالاک ہو تم لیکن میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں کہ زندگی میں کبھی دوبارہ شہروز خان کے سامنے آنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو یہ سمجھ لو کہ میرے لیے کہیں سے تمہاری لاش برآمد کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ کیا سمجھے؟ اور تم فرزانہ! تم اس شخص کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ تمہاری قسمت اچھی تھی ورنہ میں تمہیں پولیس لاک اپ میں لے جا کر الٹا لٹکاتا اور تمہاری کھال ادھیڑ کر تمہارے پیروں میں پھینک دیتا۔ چلو فرزانہ! اندر چلو۔“ اس نے کہا اور فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر فرزانہ کو اندر دھکیلا اور دروازہ اندر سے بند کردیا۔

بہرحال یہ فرزانہ کا فلیٹ تھا اور شہروز خان کے فرزانہ سے کس طرح کے تعلقات تھے، اس کا اندازہ تو کچھ لمحوں میں ہی ہوگیا تھا لیکن اس وقت یہاں کوئی ہنگامہ آرائی بے مقصد تھی۔ چنانچہ ہمدانی ایک گہری سانس لے کر وہاں سے پلٹ آیا۔ اسی دوران میں اسے ڈاکٹر عثمان کا فون موصول ہوا۔ ڈاکٹر عثمان شاہ بہت پُرجوش نظر آرہا تھا۔ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”اب جبکہ تم میری زندگی کے اہم واقعات میں شریک ہوچکے ہو، ڈیئر ہمدانی... میں تم سے یہ درخواست کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ تم میری مدد کرو۔“

”جی فرمایئے...؟“

”میں نے تمہیں گلزار کے بارے میں بتایا تھا، یہ لوگ پرسوں ایک پریس کانفرنس کررہے ہیں جس میں میرے بارے میں تمام حالات بیان کردیے جائیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے کیریئر کا اختتام ہوگا، مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“

”آپ بے فکر رہیں، میں حالات کا جائزہ لے کر آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔“ ہمدانی نے جواب دیا لیکن اس وقت وہ کافی الجھ گیا تھا۔ حالات پیچیدہ ہوتے جارہے تھے، اس دن جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا اور کار کھڑی کرکے کار سے نیچے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اترا تو گوشت فروش خلیفہ جی نے مسکراتے ہوئے آنکھ ماری اور بولے۔

''اماں ادھر تو آؤ چندا، بڑے اونچے اڑ رہے ہو آج کل۔ یہ بہترین کار اور لونڈیا۔ جاؤ تمہارے فلیٹ میں بٹھا دیا ہے اسے۔''

''لونڈیا... لڑکی؟''

''اماں تو اور کیا؟ جاؤ پیارے جاؤ۔ جوانی کا ٹیم ہے، اس وقت کچھ نہ کرو گے تو پھر کیا بوڑھے ہو کر کرو گے...'' جاؤ۔'' یہاں کا سسٹم ذرا الگ تھا۔ گھروں کی چابیاں ایک دوسرے کے پاس رہا کرتی تھیں۔ خلیفہ جی گوشت والے یہاں کی یونین کے صدر بھی تھے۔ چھڑے چھانٹ لوگوں کے گھروں کی چابیاں بھی ان کے پاس رہا کرتی تھیں۔ اس لیے فلیٹ کھل گیا تھا مگر یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ نادر ہانپتا کانپتا جب اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو اس نے عینی کو دیکھا، وہ حیران پریشان بیٹھی تھی۔ چہرہ اترا ہوا تھا۔

''خدا کا شکر ہے نادر تم آ گئے۔ میں تو بے موت ماری گئی۔''

''کیا ہوا عینی... خیریت تو ہے؟''

''اللہ جانتا ہے کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ نادر! میرے پاس فرزانہ کا پیغام آیا تھا۔ میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا فلیٹ نیو گیریژن ٹاؤن میں ہے اور وہ فلیٹ نمبر اٹھائیس میں رہتی ہے۔ فرزانہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ انکل زمان کی موت کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ میں اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں انکل زمان کے مسئلے میں، جس قدر غم زدہ ہوں، شاید تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ فرزانہ کی طلبی پر میں وہاں پہنچ گئی۔ میں تقریباً تین بجے اس کے فلیٹ پر پہنچی تو میں نے فرزانہ کے فلیٹ سے ایک شخص کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چہرے مہرے سے وہ شریف آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ بہرحال، میں نے فرزانہ کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے پٹ کو تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ اندر ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے آواز دی لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ تب میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو فرزانہ پلنگ پر دراز تھی۔ میں نے اسے کئی آوازیں دیں تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سو نہیں رہی بلکہ حقیقت میں وہ مر چکی تھی۔ میری حالت خراب ہو گئی۔ اگر کوئی آ جاتا تو مجھے اس کا قاتل تصور کر سکتا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکل آئی اور دروازے کے باہر آ کر یہ سوچتی رہی کہ اب ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں بہت دیر تک پریشان ہو کر سوچتی رہی۔ تم نے مجھے اپنا پتا بتایا تھا۔ اتفاق سے میرے پاس موبائل فون نہیں تھا لیکن تمہارا پتا مجھے یاد تھا تو میں یہاں چلی آئی۔ یہاں کے رہنے والے تو بہت اچھے لوگ ہیں۔ گوشت والے صاحب نے مجھ سے بڑی محبت سے بات کی، ان کے پاس تمہارے فلیٹ کی چابی بھی تھی اور پھر وہ مجھے یہاں بٹھا کر چلے گئے۔''

''اوہ میرے خدا! تو فرزانہ قتل کر دی گئی۔''

''سو فیصد... میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ یقیناً اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔''

''اور وہ شخص... کیا تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتی ہو جسے تم نے فرزانہ کے فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟''

فرزانہ نے جو حلیہ بتایا، وہ سو فیصد ڈاکٹر عثمان شاہ کا تھا۔ عثمان شاہ نے اپنا موجودہ حلیہ تھوڑا سا تبدیل کر لیا تھا۔ فرنچ کٹ داڑھی، خاص قسم کی گول عینک نے اسے یقینی طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ بہرحال، عینی تو اسے ویسے بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔

''اب مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں پولیس میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیے۔ پہلے ہی تم نے بہت دیر کر دی ہے اگر اس دوران میں پولیس وہاں پہنچ گئی تو تمہارے لیے بڑی پریشانی ہو سکتی ہے۔ جاؤ تم سیدھی پولیس ہیڈ کوارٹر جاؤ۔ اپنا کوئی خیال ظاہر مت کرنا۔ بس تم یہی کہنا کہ فرزانہ تمہارے پاس آئی تھی۔ اس کی تم سے ملاقات ہوئی تو تم نے اس سے اپنی ملازمت کی بات کی اور اس نے اپنا پتا تمہیں دے دیا تھا۔ چونکہ تمہارے انکل مر چکے ہیں اس لیے نادرہ آباد تمہیں کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ جب تم فرزانہ کے فلیٹ میں پہنچیں تو وہ اپنے فلیٹ میں مُردہ پڑی ہوئی تھی۔ کسی آدمی کے وہاں سے نکلنے کے بارے میں کچھ مت بتانا۔''

''لیکن نادر، وہ شخص قاتل بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''وہ جو کوئی بھی ہوگا، ہمیں پتا چل جائے گا لیکن تم اس چکر میں مت پڑنا۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بات کا خاص طور سے خیال رکھنا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تم بتانا کہ جب تم فرزانہ کے فلیٹ کے سامنے پہنچیں تو





تم نے کوریڈور میں ایک شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر سختی اور بے رحمی کے تاثرات تھے۔ تم اس کا حلیہ جو بتاؤ گی اسے نوٹ کر لو۔ تمہیں دیکھ کر وہ چھپنے کی کوشش کرنے لگا جس سے تمہیں اس پر شک ہوا اور اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔''

''مم... مگر میں نے تو...''

''عینی! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اگر مناسب سمجھو تو وہی کرو اور فکر مت کرو۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔''

''پولیس ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ درج کرانے کے بعد میں تمہارے پاس آ جاؤں؟''

''ہرگز نہیں، تمہیں واپس نادرہ آباد ہی جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' عینی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

عادل پاشا کا فون موصول ہوا تھا۔ چنانچہ وہ کچھ دیر کے بعد ہمدانی کے آفس پہنچ گیا۔

''چائے کی سخت طلب ہو رہی تھی لیکن میں تمہارے ساتھ چائے پینا چاہ رہا تھا۔''

''شکریہ۔'' ہمدانی نے کہا۔ چائے کے کچھ گھونٹ لینے کے بعد عادل پاشا نے کہا۔

''ڈاکٹر عثمان شاہ یا فیروز میرے پاس آیا تھا۔ تفصیل تو تم سے معلوم ہو ہی چکی تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ خود اس نے اپنی زبان سے بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ایکشن لڑ رہا ہے اور اس کا واحد مدِمقابل گلزار اس کے خلاف مواد حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے علاوہ گلزار کو کچھ قانونی لوگوں کی بھی ہر طرح کی مدد حاصل ہے اس لیے وہ اپنی ضمانت قبل از گرفتاری بھی چاہتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اپنا کام کر لیا ہے۔ اس تمام سلسلے میں ایک اہم ترین بات بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' نادر ہمدانی نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، اس نے بھی اپنے پاس کچھ ذرائع رکھے ہوں گے۔ انہی ذرائع نے اسے بتایا کہ صدف پہلے نادرہ آباد میں نظر آئی پھر وہاں سے غائب ہو گئی۔ اس وقت وہ دارالحکومت کے ہوٹل نور کے روم نمبر چالیس میں مقیم ہے۔''

''زبردست۔'' ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔

''ماضی کے کچھ فوٹو گراف دے کر گیا ہے جن میں وہ صدف کے ساتھ ہے۔'' عادل پاشا نے کچھ فوٹو گراف نکال کر ہمدانی کو دیے تو ہمدانی انہیں دیکھ کر اچھل پڑا۔ اب وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ چھ سات تصویریں تھیں۔ انہی میں کچھ تصویریں ایسی بھی تھیں جس میں اس کے چند دوست احباب بھی تھے۔

''کوئی خاص بات؟'' عادل پاشا نے پوچھا۔

''ہاں... بہت خاص۔''

''مجھے بھی بتاؤ۔''

''وہ عورت جو کچھ دن پہلے نادرہ آباد پہنچی تھی اور جس نے وکیل کی مدد سے خلع کی درخواست واپس لی تھی، وہ صدف نہیں تھی۔''

''کیا؟'' عادل پاشا نے حیرت سے کہا۔

''ہر چند کہ یہ تصویریں بیس سال پرانی ہیں لیکن... اوہ میرے خدا... اتنا بڑا فراڈ۔''

''تو پھر وہ کون تھی؟''

''راحیلہ... ایک اسٹیج آرٹسٹ۔ ان دونوں کی دوست اور یہ اس کی خود کی تصویر ہے۔'' نادر ہمدانی نے گروپ فوٹو میں سے اسے ایک کا چہرہ دکھایا۔

''اب تم کیا کرو گے؟'' عادل پاشا نے کہا۔

''کام۔'' نادر ہمدانی مسکرا کر بولا۔ اس کے بعد دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ دونوں ہی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عادل پاشا نے کہا۔

''اب تو میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کیس کے سلسلے میں شدید تجسس کا شکار ہیں۔ چنانچہ میں یہ درخواست کروں گا کہ صورتِ حال سے مجھے بھی آگاہ کرتے رہنا۔''

''یقیناً۔''

''اور پلیز یہ لفافہ رکھو۔ اور ڈاکٹر عثمان شاہ یا ہمارے محترم کلائنٹ فیروز صاحب فیس دے گئے ہیں اور اس میں ایمانداری کا حصہ آپ کی نذر۔'' ہمدانی نے ہنستے ہوئے لفافہ لے کر جیب میں رکھ لیا اور پھر اس کے بعد وہ اجازت لے کر وہاں سے چل پڑا۔ درحقیقت اس اطلاع نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں کہ صدف کے بھیس میں راحیلہ نادرہ آباد پہنچی تھی۔ اس بات کا فائدہ اٹھا کر کہ واقعات بیس سال پرانے تھے اور اب اتنے لوگ موجود نہیں ہوں گے جو راحیلہ کو پہچان سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز اس کے ذہن میں ابھری تھی۔ یہ ایک خیال تھا۔ ڈاکٹر زمان خان جو صدف کو پسند بھی کرتا تھا، عینی نے یہ بات اسے بتائی تھی اور ڈاکٹر زمان کی لاش مل چکی تھی۔ دوسری فرزانہ تھی جو صدف کی تلاش میں نادرہ آباد پہنچی تھی۔ یقیناً اسے بھی کچھ سن گن ملی ہو گی جس کی وجہ سے وہ موت کا شکار ہو گئی۔

بہرحال ہمدانی جانتا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے۔ چنانچہ وہ کلب پہنچا۔ اس سلسلے میں وہ چوکیدار بھی اہم تھا اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوکیدار نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ راحیلہ ہی تھی جس کی جوانی کی تصویر عثمان شاہ اور صدف کے ساتھ ہے۔ چوکیدار کو تھوڑا بہت انعام دینے کے بعد اس نے راحیلہ کے گھر کا پتا بھی معلوم کیا اور اب اس کے بعد اس کا رخ راحیلہ کے گھر کی جانب ہی تھا۔ بہت سے معاملات میں ذرا غلط ہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے لیکن تفتیش کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس رات ایک بجے کے قریب وہ راحیلہ کے گھر میں داخل ہوا جس کا دروازہ باہر سے بدستور بند تھا اور اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے راحیلہ کے پورے گھر کی تلاشی لی اور اسے یہاں آکر خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ راحیلہ کا گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ہمدانی نے دو کمروں کی تلاشی لی اور پھر تیسرے کمرے میں داخل ہو گیا جو خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا لیکن ان دنوں چونکہ راحیلہ اپنے گھر میں نہیں رہ رہی تھی، اس لیے وہ اجڑا سا پڑا تھا۔ ہمدانی پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ ایک ایک چیز کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ پھر اسے ایک ایسی چیز نظر آگئی جو بے مثال تھی۔ یہ ایک بڑا سا پیکٹ تھا جس میں کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کاغذ اٹھا کر اس کی تہ کھولی۔ یہ ایک عدالتی کاغذ تھا جس میں تنسیخِ نکاح کی ڈگری فیملی کورٹ کی طرف سے تھی۔

فیملی کورٹ نے صدف کی درخواست منظور کرتے ہوئے خلع کا فیصلہ دے دیا تھا۔ دوسرا اور تیسرا کاغذ نکاح کے فارم کی نقلیں تھیں جو رجسٹریشن کے بعد دولہا دلہن کو واپس کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کاغذ صدف کی شادی کا تھا لیکن ڈاکٹر شیراز گل کے ساتھ نہیں بلکہ اس اداکار کے ساتھ جس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ صدف نے اس سے شادی کر لی ہے۔ ہمدانی کا دل خوشی سے بھر گیا۔ یہ تمام چیزیں اس نے اپنی تحویل میں لیں اور اس کے بعد خاموشی سے اس مکان سے باہر نکل آیا۔

لیکن اس کے بعد اسے عینی کا خیال آیا۔ عینی نادرہ آباد پہنچ چکی ہوگی اور جس طرح شیطانی ذہن اس سارے کیس کے سلسلے میں اپنے جال بنتے پھر رہے تھے، اس طرح عینی کی خبر گیری ضروری تھی کیونکہ وہ اچانک ہی خطرے میں گھر گئی تھی۔

وہ دن کی روشنی میں ڈاکٹر زمان کے کلینک پہنچا جو اب بند ہو گیا تھا اور اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ صرف پچھلا باقی حصہ ..... کھلا ہوا تھا لیکن وہاں پولیس کی جیپ موجود تھی۔ ہمدانی کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

یقیناً، شہروز خان عینی کو پریشان کر رہا ہوگا۔ وہ غصے میں ڈوبا اندر گھستا چلا گیا۔ اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ شہروز خان کے ساتھ ساتھ اس کا استاد گلاب خان بھی موجود تھا اور انسپکٹر غزالی بھی۔ عینی سہمی سہمی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر ہمدانی کو دیکھ کر اس کے اندر زندگی پیدا ہوئی اور وہ بے اختیار اٹھ کر ہمدانی کی طرف دوڑی اور اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ شہروز خان کی تالیاں گونج اٹھیں۔ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''واقعی، فلمی سچویشن چل رہی ہے۔ جب بھی ہیروئن پر کوئی مشکل آتی ہے، ہیرو فوراً نازل ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا ہے۔ نادر ہمدانی صاحب! آپ کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے؟''

''آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟ اور جناب چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں بھی موجود ہیں۔ کہیے گلاب خان صاحب! بڑی ہنگامہ آرائیاں ہو رہی ہیں آج کل آپ کی طرف سے۔ دارالحکومت چھوڑ کر یہاں نادرہ آباد میں اپنے ہنگامے کر رہے ہیں۔''

''اور تم کرائم رپورٹر، تم بھی اپنی پہنچ سے زیادہ اونچے نہیں اڑ رہے ہو؟'' گلاب خان نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

''اصل میں غلطی آپ لوگوں کی ہے۔ میری پرواز کا تعین آپ نے غلط کیا ہے۔'' اس نے کچھ توقف کیا پھر بولا... ..... ''میرا خیال ہے بات غلط ہو رہی ہے گلاب خان صاحب! اور شہروز خان، بجائے یہ طنزیہ گفتگو کرنے کے اصل گفتگو کیوں نہ کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ مجھے اپنی ڈیوٹی کرنے دیں گے۔''

''ہاں... ہاں... ضرور...'' گلاب خان نے کہا۔

''اچھا ہوا، آپ آگئے ہمدانی صاحب! ذرا ان خاتون کی طرف سے دیے گئے بیان پر آپ بھی غور کر لیجیے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسی خاتون سے ملازمت کی درخواست کرنے گئی تھیں جن کی لاش انہیں ان کے فلیٹ میں پڑی ہوئی ملی۔ انہوں نے اس لاش کو دیکھنے کے بعد پولیس میں رپورٹ کی لیکن شہروز کا کہنا ہے کہ پولیس میں جانے سے پہلے یہ آپ سے ملیں اور اس کے بعد ان کا بیان مختلف نکلا۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کا حوالہ دیا جسے انہوں نے اس راہداری میں دیکھا تھا۔ یہ صحیح طور سے انہیں دیکھ نہیں سکی تھیں لیکن جو حلیہ انہوں نے اس شخص کا بتایا، وہ شہروز خان کا حلیہ تھا۔ حالانکہ یہ پہلے بھی شہروز خان سے مل چکی تھیں لیکن ان کا





بیان ٹوٹا پھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ خاص طور سے گلاب خان صاحب کو۔''

''اصل میں گلاب خان صاحب، ان دنوں الیکشن کے سلسلے میں اپنی پسندیدہ شخصیت کے لیے جو کام کر رہے ہیں۔ ان کے تحت ان کی سرگرمیاں دارالحکومت میں ڈیوٹی انجام دینے کے بجائے نادرہ آباد میں زیادہ دیکھی جا رہی ہیں۔ اور شہروز خان... شہروز خان کے بارے میں تو کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ خاص طور سے بہت زیادہ معروف ہیں اور میری ان سے دو تین ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ان ملاقاتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے جبکہ ہمارے پاس پولیس کی ایک رپورٹ ہے جس میں کار کے حادثے میں ایک بوڑھی عورت کو کچل کر مار دیا گیا تھا اور موقع کے گواہوں نے جس کار کو دیکھا تھا، وہ تمہاری کار تھی۔ تمہیں اس سلسلے میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''میں شہروز خان صاحب کو بتا چکا ہوں کہ جو کارروائیاں وہ کرتے رہے ہیں، وہ بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اگر ایسا ہی کوئی سلسلہ ہے تو چلیے ٹھیک ٹھاک کام شروع ہو جائے گا۔ اصل میں مسٹر غزالی، یہ سارا سلسلہ آپ جانتے ہیں کہ صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ یہ محض فرزانہ کے قتل کا معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں جو سیاسی جنگ ہو رہی ہے اس کا ایک حصہ گلزار صاحب ہیں جو اپنے مخالف ڈاکٹر کے خلاف الیکشن لڑ رہے ہیں۔ اس کے لیے گلزار صاحب نے ڈاکٹر عثمان شاہ کے ماضی کا ایک ایسا باب کھولنے کا فیصلہ کیا ہے جو ووٹروں کی رائے کو متاثر کر سکتا ہے۔ آدمی، آدمی ہے، فرشتہ نہیں۔ چھوٹی بڑی غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ کم و بیش ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جسے وہ سب کے سامنے لانا نہیں چاہتا۔ بہرحال، میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ فرزانہ، صدف، شہروز خان نہ جانے کتنے افراد اسی سیاسی بساط کے مہرے ہیں۔ بہرحال میں دوسری طرف کام کر رہا ہوں۔ میں یہ گورکھ دھندا بڑی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ چند گھنٹوں کی مہلت درکار ہے۔ مسٹر شہروز خان، گلاب خان اور نعمان غزالی صاحب! میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سلسلے کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے۔ پھر اس کے بعد باقی تفصیلات بہت جلد سامنے آجائیں گی۔''

''گویا تم دھمکی دے رہے ہو؟''

''یہ دھمکی نہیں قانون ہے... آپ کا قانون۔ آپ فوری طور پر اس لڑکی کو تنگ کرنا چھوڑ دیجیے۔ اس پر الزامات لگانا بالکل بیکار ہے۔ یہ بے چاری تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں آپ کے سامنے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دوں گا۔ آپ اگر دس منٹ کے اندر یہاں سے باہر نہ آئے اور آپ نے اسے تنگ کرنا نہ چھوڑا تو پھر میری مشینری حرکت میں آجائے گی اور آپ جانتے ہیں کہ اخبار کی طاقت کم نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے عینی! میں چلتا ہوں۔ دس منٹ کے بعد اگر یہ لوگ باہر نہ نکلے پھر تم نادر ہمدانی کی کارروائیاں دیکھنا۔'' یہ کہہ کر ہمدانی دروازے کی طرف بڑھا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

وہ ایک ایسی جگہ کھڑے ہو کر اندر کا جائزہ لینے لگا جہاں سے وہ ڈاکٹر زمان خان کے کلینک کا نظارہ کر سکتا تھا اور کچھ ہی لمحوں بعد نعمان غزالی، گلاب خان اور شہروز خان باہر نکل آئے اور جیپ میں بیٹھ کر چل دیے۔ ہمدانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اس وقت عینی سے ملنا مناسب نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ بھی بہرحال پولیس سے تعلق رکھتے ہیں اور یقینی طور پر کوئی ایسا چکر چلا سکتے ہیں جس سے ہمدانی ان کے جال میں پھنس جائے۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے واپس چل پڑا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ انہوں نے عینی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہوگا کیونکہ وہ انہیں وارننگ دے آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی منزل ہوٹل نور تھی جہاں ایک اہم ہستی مقیم تھی اور اس وقت وہ اس کیس کا سب سے اہم کردار تھی۔ نور ہوٹل کے کمرا نمبر چالیس کا دروازہ بند نہیں تھا اور یہ اچھا موقع تھا۔ وہ ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی موٹی عورت صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جو اسے دیکھ کر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے... تم۔'' وہ چیخی۔

''اب تم مجھے اخلاقیات کا سبق مت دو۔ شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا راحیلہ بیگم۔''

''میں... ابھی۔'' وہ غرائی۔

''کچھ نہیں کرو گی تم۔ اب بھی تمہیں اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟''

''کتنا بڑا فراڈ کیا ہے تم نے جو تمہاری اس موٹی گردن کو پھانسی کے پھندے میں پھنسا سکتا ہے۔ میں تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی اپنا۔ چند الفاظ میں تمہاری اصلیت بتاتا ہوں۔ صدف تمہاری دوست تھی اور تم اس کے تمام حالات سے واقف تھیں۔ تم جانتی تھیں کہ اس نے نادرہ آباد میں ڈاکٹر شیراز گل یا عثمان شاہ سے خلع حاصل کر کے اپنے پسندیدہ اداکار سے شادی کر لی تھی اور پھر وہ دونوں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیرونِ ملک چلے گئے تھے۔ تم نے نادرہ آباد کے ایک خطرناک بدمعاش سے گٹھ جوڑ کیا۔ ایک پولیس آفیسر کے کہنے پر خود کو صدف کی حیثیت سے پیش کیا۔ وہاں تم نے صدف کے فوٹوگراف بھی خریدنے کی کوشش کی۔ یہ کام تمہارے ساتھیوں نے کیے تاکہ جب تم صدف کی حیثیت سے وہاں پہنچو تو تمہیں جھٹلانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن دو افراد ایسے بھی تھے جو تصویر کے بغیر تمہیں شناخت کر سکتے تھے۔ ایک نادرہ آباد کے مقامی ہوٹل کے منیجر ڈیوڈ صاحب جنہیں شہروز خان نے غنڈوں کے ذریعے اتنا پٹوایا کہ وہ تمہارے ہوٹل میں قیام کے دوران وہاں آنے کے قابل ہی نہ رہے اور دوسرے ڈاکٹر زیان خان جنہیں تم نے گلزار خان اور شہروز خان کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔ تم نے صدف کی حیثیت سے عدالت جا کر خلع کی درخواست واپس لی اور یہاں آ گئیں تاکہ خود کو ڈاکٹر شیراز گل کی جائز بیوی کی حیثیت سے پریس اور پبلک کے سامنے پیش کر کے عوام کی رائے ڈاکٹر شیراز گل یا عثمان شاہ کے خلاف کر دو اور الیکشن میں گلزار کو کامیاب کراؤ۔ لیکن یہاں تم لوگوں کے لیے ایک نئی پریشانی شروع ہو گئی... یعنی فرزانہ جو تمہاری کافی باتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ اور اس کے بعد تم نے فرزانہ کو بھی قتل کرا دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

''لیکن افسوس تم نے اپنے فلیٹ میں وہ کاغذات مناسب طریقے سے نہیں چھپائے جن میں اس گھناؤنی سازش کا انکشاف موجود تھا۔ میں تمہیں پیشکش کرتا ہوں کہ اگر اب بھی چاہو تو خود کو بچا سکتی ہو۔ میں تمہیں اعلیٰ پولیس افسران کے سامنے پیش کر دوں گا تاکہ ان کے سامنے اپنا بیان دے کر ساری اصلیت سامنے لے آؤ۔''

راحیلہ کے چہرے کا جیسے سارا خون خشک ہو گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کہا۔

''تم مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔''

''ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا۔ میں چلتا ہوں اور دوبارہ تم سے رابطہ قائم کروں گا۔''

ہمدانی وہاں سے نکل آیا لیکن اب اسے ذرا تیزی سے کام کرنا تھا کیونکہ اگر پریس کانفرنس میں ڈاکٹر عثمان شاہ کے خلاف کچھ غلط باتیں ہو جاتیں تو اسے نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ اپنے منصوبے کے تحت اس نے نعمان غزالی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ جسے اب تک صدف سمجھا جاتا رہا ہے، حقیقت میں وہ اس کی دوست راحیلہ ہے اور اس کی اس کیس میں بنیادی حیثیت ہے۔ وہ اس وقت قانون سے تعاون کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔'' میں چاہتا ہوں کہ جب تک وہ پولیس کو اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہو جائے، اس کی حفاظت کا معقول انتظام کر دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔'' غزالی جب چند پولیس افسران کو لے کر دارالحکومت پہنچا تو انہیں نور کے کرا نمبر چالیس کے دروازے پر شہروز خان نظر آیا اور اسے دیکھ کر نعمان غزالی چونک پڑا۔ شہروز خان کرا نمبر چالیس سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''خوب... وقت پر پہنچے انسپکٹر غزالی! اندر راحیلہ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ دراصل میں بھی ان تمام واقعات کی تفتیش کر رہا تھا۔ مجھے اپنی تفتیش سے معلوم ہوا کہ صدف اصل میں صدف نہیں بلکہ اس کی دوست راحیلہ ہے اور وہ کسی سازش کے تحت خود کو صدف ظاہر کر رہی ہے۔ میں اسے گرفتار کرنے یہاں آیا تھا مگر کمرے کے اندر اس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔'' غزالی کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ جب پولیس افسران کے ساتھ اندر پہنچا تو یہاں واقعی راحیلہ خون میں نہائی ہوئی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ کے قریب ایک سائیلنسر لگا ہوا ریوالور نظر آ رہا تھا۔

بہرحال، اس کے بعد موقع کی کارروائی کرنی تھی جس کے لیے غزالی نے انسپکٹر گلاب خان کو فون کر دیا تھا اور گلاب خان فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔ ضروری کارروائیوں کے بعد راحیلہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔ اس دوران میں شہروز خان ان لوگوں کے ساتھ ہی لگا رہا۔ گلاب خان البتہ اب کچھ متاثر نظر آ رہا تھا اور اس کے ذہن میں شاید کوئی احساس جنم لے رہا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہمدانی کو بھی فون کر دیا اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں اس سے ملاقات ہوئی۔ ہمدانی کو پوری تفصیل معلوم ہوئی تو اس نے شہروز خان سے کہا۔

''تو تم راحیلہ کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے؟''

''ہاں... کیوں؟''

''مگر تمہیں اس سے کیا دلچسپی تھی؟ بظاہر وہ کسی فوجداری جرم میں ملوث نہیں تھی۔ تمہیں کس نے اس کے بارے میں تحقیقات کرنے کا حکم دیا تھا؟''

''کیا بکواس کر رہا ہے یہ پریس رپورٹر؟ کیا میں اس شخص کو جواب دینے کا پابند ہوں؟''

''انسپکٹر نعمان غزالی! میں یہ کیس تقریباً حل کر چکا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں مگر شہروز خان سے یہ سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میں نے کبھی مجرموں کا ساتھ نہیں دیا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ اس کیس میں تمہاری پوزیشن بہت مشکوک ہے۔ شہروز خان! نادرہ آباد پولیس کی طرف سے میں اس کیس کا انچارج ہوں۔ تمہیں ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ میں تمہیں حراست میں لینے کا حکم بھی دے سکتا ہوں۔" غزالی کے لہجے پر شہروز خان نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"مجھے میرے افسرِ اعلیٰ نے صدف کے بارے میں تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ صدف نہیں بلکہ راحیلہ ہے۔"

"اس تحقیقات کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟" ہمدانی نے سوال کیا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ نادرہ آباد میں ایک اہم الیکشن ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر عثمان شاہ شہر کی بہت نمایاں اور محترم شخصیت ہیں۔ ان کے مخالف امیدوار انہیں بدنام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم حکومت کے کارندے ہیں جو فیئر الیکشن چاہتی ہے۔ چنانچہ میرے افسر نے دوراندیشی کے تحت مجھے اس معاملے میں تحقیقات کی ہدایت کی تھی۔ مجھے فوراً ہی پتا چل گیا کہ ڈاکٹر عثمان شاہ پہلے ڈاکٹر شیراز گل کہلاتے تھے اور بیس سال قبل نادرہ آباد میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ یہ تمام باتیں تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اچھی کہانی سنا رہے ہو۔ مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا تم نے؟"

"تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ تم اپنے آپ کو خواہ کچھ بھی سمجھو مگر پولیس کسی شخص کو اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔"

"اور فرزانہ سے دوستی بھی اسی تحقیقات کے لیے ہو گی؟"

"ہاں... وہ مخالف امیدواروں کی آلۂ کار تھی۔"

"تمہیں اس کے قتل کے دن اس بلڈنگ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس بارے میں کیا کہتے ہو؟" اس بار غزالی نے سوال کیا تھا۔

"یہ صرف ہمدانی کا الزام ہے۔ اس کا مقصد محض پولیس کو الجھانا نہیں بلکہ مجھ سے اس کارروائی کا انتقام بھی لینا تھا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" گلاب خان نے سر ہلایا۔ "تم کہاں تھے؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ آپ اس شخص کو منع کریں کہ مجھ سے اس طرح کے سوالات نہ کرے۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ لیکن مجھے کیا کرنا ہے جناب نعمان صاحب، آپ اس کے لیے تیار رہیے۔" یہ کہہ کر ہمدانی وہاں سے چلا آیا۔ پھر اس کے بعد ظاہر ہے، عادل پاشا ہی سے رجوع کرنا تھا کیونکہ اس کیس کا سارا کچا چٹھا اس کے پاس آچکا تھا۔ جب اس نے عادل شاہ کے سامنے صدف کے وہ کاغذات پیش کیے تو عادل پاشا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ دیر تک وہ اسی طرح سر تھامے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

"یار! میں اور تم مل کر تو قیامت برپا کر دیں گے۔ قسم خدا کی مجھے اس بات کی ذرّہ برابر خوشی نہیں ہے کہ ہمیں ہمارے کیس کا مناسب معاوضہ ملا ہے بلکہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ کتنی بڑی سازش پکڑی ہے اور کیسے عجیب مجرم نگاہوں کے سامنے آئے ہیں۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کرنا ہے؟"

"میں تم سے یہ نہیں کہوں گا ہمدانی کہ تمہارا کام ختم ہو گیا اور اب میرے کام کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم تو لحہ لحہ ساتھ چلیں گے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ تم ہی دوڑتے رہے ہو۔ میں تو بس آفس میں بیٹھا رہا ہوں۔"

"لیکن یہ بات بھی میں سمجھتا ہوں مسٹر پاشا کہ اب آپ کا کام شروع ہوا ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ تجاویز اور دینا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، ہاں... بولو۔"

"ہمیں جتنا جلد ممکن ہو، ڈیوڈ صاحب کو نادرہ آباد کے اسپتال سے دارالحکومت کے کسی پرائیویٹ کلینک میں منتقل کر لینا چاہیے جہاں ان کا علاج بھی ہو سکے۔ اس وقت ہمارے پاس وہ ایک ایسے گواہ کی حیثیت سے موجود ہیں جو اس کیس میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔" عادل پاشا پُرخیال انداز میں گال کھجانے لگا پھر اس نے کہا۔

"ڈاکٹر سہیل میرے بہترین دوست ہیں۔ مسئلہ صرف ڈیوڈ صاحب کو وہاں سے یہاں تک لانے کا ہے اور یہ بات تم نے بالکل صحیح وقت پر کہی کہ ڈیوڈ صاحب کو وہاں سے یہاں منتقل کر دینا چاہیے۔ پتا نہیں شہروز خان سے یہ حماقت کیسے ہوئی۔ ڈاکٹر زمان خان کو تو اس نے قتل کرا دیا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ڈیوڈ صاحب کو صرف مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ ہو سکتا ہے انہیں دھمکی دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا ہو کہ وہ زبان بند رکھیں۔"



"جو کچھ بھی ہے، اس وقت صورتِ حال بدل چکی ہے۔ چنانچہ ڈیوڈ صاحب کو وہاں سے لانا ہے۔"

اس کے لیے عادل پاشا نے اپنے وسائل سے کام لیا۔ رات کو تین بجے وہ نادر ہمدانی اور چند افراد کے ساتھ نادرہ آباد پہنچا تھا۔ ان لوگوں کو ڈر تھا کہ یہ بات کہیں شہروز خان کے ذہن میں آگئی تو ڈیوڈ صاحب کا خاتمہ یقینی تھا لیکن ڈیوڈ صاحب کو وہاں زندہ سلامت دیکھ کر انہیں بڑی خوشی ہوئی تھی۔ پھر بہت ہی جدوجہد کے بعد ڈیوڈ صاحب ان کے ساتھ آنے پر رضامند ہوئے۔ نہ جانے کیا کیا کہانیاں سنا کر انہیں لایا گیا تھا۔ ویسے اس وقت ان کی حالت کافی بہتر تھی لیکن پھر بھی کلینک میں انہیں داخل کر کے ڈاکٹر سہیل کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ ڈیوڈ صاحب کی حفاظت کرنی ہے۔ اس کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دوسرے ہی دن ڈاکٹر عثمان شاہ سے ملاقات کی گئی اور ڈاکٹر عثمان شاہ فوراً ہی طلبی پر عادل پاشا کے آفس پہنچ گئے۔

"جی فیروز خان صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" عادل پاشا نے کہا تو ڈاکٹر عثمان شاہ مسکرا دیا اور پھر اس نے کہا۔

"یارو، کتنے نام بدلوں۔ مجھے خود شرم آتی ہے۔ عثمان شاہ میرا اصل نام ہی ہے۔ بس ڈاکٹر شیراز گل کا نام میں نے مصلحتاً اختیار کیا تھا اور فیروز خان بھی۔"

"وہ پریس کانفرنس ملتوی کرا دی جائے گی جس میں آپ کے سلسلے میں کارروائی ہو رہی ہے۔ ہم اس کیس کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

"کیا آپ فرزانہ سے ملنے گئے تھے؟"

"ہاں... فرزانہ سے میری کافی سلام دعا تھی اور میں اس سے صدف کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور سے جب مجھے یہ علم ہوا تھا کہ صدف کسی طرح نادرہ آباد پہنچی ہے۔ فرزانہ کو اس بارے میں خاصی تفصیلات معلوم تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ہم اس سلسلے میں ساری کارروائی عدالت کو پیش کر رہے ہیں اور یہ کیس آپ کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔ میں نے کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ آپ کو ان کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔"

کیس گلزار خان کے خلاف پیش کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں عادل پاشا کے خصوصی مراسم کام آئے تھے جس کی وجہ سے فوراً اس کی ہیئرنگ شروع ہو گئی تھی۔ عادل پاشا نے اس کیس کے بخیے ادھیڑ دیے۔ گلزار خان کے وکیل کو بالآخر منہ چھپا کر خاموش ہونا پڑا۔ عادل پاشا نے تفصیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب والا! یہ مقدمہ اس لیے خصوصی توجہ اور فوری کارروائی کا مستحق ہے کیونکہ تھوڑے عرصے میں الیکشن ہونے والے ہیں اور دونوں فریق ایک دوسرے کو الیکشن میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دینا چاہتے ہیں۔ میرے مؤکل ڈاکٹر عثمان شاہ ایک شریف النفس انسان ہیں۔ جب انہوں نے اپنے حلقے میں اپنی مقبولیت دیکھی اور ان کے شناساؤں نے انہیں انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا تو وہاں کے بدعنوان عناصر پریشان ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ڈاکٹر صاحب جیت گئے تو ان کا یوم حساب آجائے گا اور ان کی بدعنوانیوں کا کچا چٹھا کھل جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک خطرناک شخص گلزار خان کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔

"انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ماضی کا سہارا لیا جس میں انہوں نے ایک گلوکارہ سے شادی کر لی تھی اور پھر اس کی بے باکی اور غلط فطرت کی بنا پر اس سے طلاق اور دوسری طرف سے خلع کی کارروائی کے مراحل برداشت کیے پھر ان حالات سے دلبرداشتہ ہو کر انہوں نے نادرہ آباد چھوڑ دیا اور اپنے اصل نام ڈاکٹر عثمان شاہ سے ایک دوسرے شہر میں پریکٹس کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی کزن زرمین سے شادی کر لی۔ ان کی سابقہ بیوی صدف نے ان کے خلاف خلع کی درخواست میں یہی الزام لگایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کزن زرمین سے عشق کرتے ہیں جو ان کے کلینک میں نرس ہے۔ مخالفوں نے اس کہانی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا لیکن انہیں صدف نہیں مل سکی۔ تب انہوں نے اسی کلب میں کام کرنے والی راحیلہ کو دریافت کیا اور چونکہ بات بیس برس پرانی تھی، اس لیے انہوں نے راحیلہ کو صدف بنا کر نادرہ آباد پہنچایا اور خلع کی درخواست واپس لے لی تاکہ ڈاکٹر صاحب کو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کا مجرم قرار دلوایا جا سکے۔ اس دوران میں صدف کے شناسا مر کھپ گئے تھے۔ صرف دو ایسے افراد تھے جو اصل صدف کو پہچان سکتے تھے۔ ایک ڈاکٹر زمان اور دوسرے ایک ہوٹل کے مالک ڈیوڈ صاحب۔

"چنانچہ انہوں نے ایک پولیس آفیسر شہروز خان کے ذریعے ڈاکٹر زمان خان کو قتل کرایا۔ اسی شہروز خان نے ڈیوڈ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب پر حملہ کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا اور اس شرط پر انہیں زندگی دی کہ وہ اپنی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر لیں گے۔ راحیلہ نے صدف کی حیثیت سے خلع کی درخواست واپس لی اور طے یہ ہوا کہ ایک دو دن میں پریس کانفرنس بلوا کر ڈاکٹر عثمان شاہ کو نااہل قرار دلوا دیا جائے۔ لیکن ایک تیسرا کردار بیچ میں آیا۔ یہ فرزانہ تھی جو صدف اور راحیلہ کو پہچانتی تھی۔ اس نے راحیلہ کو بلیک میل کیا تو راحیلہ نے شہروز خان کے ذریعے اسے بھی قتل کرا دیا۔ راحیلہ کے بارے میں چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ وہ صدف نہیں ہے۔ کرائم رپورٹر ہمدانی نے راحیلہ سے ملاقات کی اور ظاہر کر دیا کہ اس کی شناخت ہو گئی ہے۔ بے وقوف راحیلہ نے فوراً ہی یہ اطلاع شہروز خان کو دے دی۔

''شہروز خان جو ایک اعلیٰ افسر کی زیرِ ہدایت کام کر رہا تھا، راحیلہ کو بھی قتل کرنے نکل پڑا اور اس نے راحیلہ کو بھی زندگی سے محروم کر دیا۔ ان تمام واقعات کے جامع ثبوت پیش کیے جائیں گے۔ خاص طور سے وہی بات آجاتی ہے جنابِ والا کہ مجرم اگر چھوٹی چھوٹی غلطیاں نہ کرتا رہے تو پھر اسے گرفتار کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہی اسے قانون کے شکنجے میں لاتی ہیں۔ مثلاً ایک ایسی تحریر جو راحیلہ نے نہ جانے کس خیال کے تحت چھوڑی تھی۔ اس میں اس نے شہروز خان کی تمام تر کارروائیوں کی تفصیل لکھی تھی کیونکہ اسے یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ شہروز خان کہیں اسے بھی قتل نہ کر دے کیونکہ وہ ایک خوں خوار قاتل ہے۔ دوسری بات یہ جنابِ والا کہ شہروز خان نے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے نادرہ آباد کے ایک انتہائی معزز اور شریف آدمی ڈیوڈ کو شدید زخمی کر دیا کیونکہ وہ صدف کو پہچانتے تھے۔ وہ انہیں بھی قتل کر دیتا لیکن انہوں نے زبان بند کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ڈیوڈ صاحب زندہ ہیں اور عدالت میں گواہی دینے کے لیے حاضر ہیں۔'' پہلی بار شہروز خان کا چہرہ پھیکا نظر آیا۔

عدالت نے حکم دیا کہ ڈیوڈ صاحب کو پیش کیا جائے اور ڈیوڈ صاحب دو افراد کے سہارے وہیل چیئر پر عدالت کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی عادل پاشا نے ایک سفید لفافہ راحیلہ کے بیان کی حیثیت سے جیب سے نکال کر عدالت کی طرف بڑھایا تو شہروز خان کے حواس جواب دے گئے۔ اس نے گلاب خان اور نعمان غزالی کو دھکا دیا اور عدالت کے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی لیکن اسے فوراً ہی میں پکڑ لیا گیا۔

شہروز خان کا اس طرح سے فرار ہونے کی کوشش کرنا اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تھا۔ اس کی موجودگی میں ہی ڈیوڈ صاحب نے اپنا بیان دیا اور پھر باقی کسی ثبوت کی ضرورت نہ رہی جبکہ ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ وہ لفافہ جو راحیلہ کے اعتراف نامے کی شکل میں عدالت کو پیش کیا گیا تھا، بالکل خالی تھا۔ اس میں سادہ کاغذ تھا۔ عادل پاشا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ والا! یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ مجرم کے حواس معطل کرنے کے لیے۔ ڈیوڈ صاحب تو بے شک ہماری تحویل میں تھے اور ہم نے اس لیے انہیں رات کو ان کے اسپتال سے نکال کے یہاں ایک پرائیویٹ کلینک میں رکھا تھا کیونکہ انہیں عدالت میں پیش کرنا تھا لیکن یہ لفافہ صرف ایک نفسیاتی حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔''

شہروز خان کو گرفتار کر لیا گیا اور عدالتی کارروائی دوسری پیشی کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ تمام تر ثبوت حاصل ہو گئے تھے۔ گلاب خان نے سب سے پہلے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''بے شک وہ میرا اہم پیشہ تھا لیکن مجھے اس کے جرائم کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس سلسلے میں، میں اس کے بارے میں خود اپنی یادداشتیں پیش کروں گا۔'' یہ اپنی جان بچانے کی ایک دلچسپ کوشش تھی۔ ڈاکٹر عثمان شاہ تمام الزامات سے بری ہو چکے تھے۔ صدف کا کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ شخص کے ساتھ دنیا کے کون سے حصے میں ہے۔ چنانچہ یہ کیس اس انداز میں ختم ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ شہروز خان پر مقدمہ چل رہا تھا اور اس کے ساتھ جن جن لوگوں کی اس نے نشاندہی کی تھی، انہیں خود نعمان غزالی نے پوری جدوجہد اور محنت کے ساتھ گرفتار کیا تھا۔ شہروز خان نے اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات قبول کر لیے۔ اس نے اس دوران یہی چند قتل نہیں کیے تھے بلکہ ماضی میں بھی کچھ ایسے واقعات سامنے آئے جن میں وہ قاتل ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں بہت ساری معلومات بمع ثبوت عدالت کو دی گئیں۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں۔ الیکشن ہوئے، ڈاکٹر عثمان شاہ نے شان دار کامیابی حاصل کی۔

لیکن اچھے انسان اچھے ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک معقول رقم مزید معاوضے کی شکل میں عادل پاشا کو دی اور دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ مس عینی کو عادل پاشا ہی کے دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی تھی۔



دوسری کہانی

# مات

سلیم فاروقی

ہر جرم کرنے والے شخص کے طرزِ عمل کے پیچھے ایک کہانی ضرور ہوتی ہے ... کسی کی کہانی اس قدر دردو آلام سے بھری ہوتی ہے کہ ... لوگ اسے اس جرم کے لیے حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں ... لیکن جرم کسی بھی نوعیت کا ہو ... یا کسی سے بھی سرزد ہوا ہو ... ہر صورت ناقابلِ معافی ہی رہتا ہے ... ایک ایسے ہی جرم کے مرتکب شخص کا احوال ... جس نے کہاں ٹھوکر کھائی ... اور کس سے ٹکرایا ... اور کیسے کیسے تعلقات کی دلدل میں پھنس کے اپنا اور دوسروں کے زیاں کا موجب بنا ...

**جدائی ..... انتظار ..... اور اداسی کے پلیٹ فارم پر بیٹھے یاس انگیزوں کا سحر آفریں ماجرا**

میرے ایف ایس سی کے پیپرز ہو رہے تھے اور گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا۔ اور شادی بھی کس کی؟ جی ہاں، میری شادی ہو رہی تھی۔ میری منگنی تین سال پہلے میرے پھوپی زاد سجاد سے ہو چکی تھی۔ پھوپی جان تو چاہتی تھیں کہ فوراً ہی بیٹے کے چہرے پر سہرا سجا دیں لیکن میں نے امی کی منت سماجت کر کے ایف ایس سی مکمل کرنے کی اجازت لے لی تھی۔

اس دن میں ناشتا کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ پھوپی جان آگئیں۔ میرے امتحانات شروع ہو چکے تھے اور میں نے دن رات محنت کی تھی۔ مجھے امید تھی کہ میرے اتنے نمبرز آجائیں گے کہ مجھے میڈیکل کالج میں آسانی سے داخلہ مل جائے گا۔ چار پیپرز ہو چکے تھے اور بقیہ دو پیپرز میں دو دو دن کا گیپ تھا۔

امی، پھوپی جان کو اتنے سویرے دیکھ کر کچھ گھبرا گئیں اور بولیں۔ ''خیریت تو ہے باجی! آپ اس وقت؟''

''ہاں بھئی، اللہ رکھے سب خیریت ہے۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔ ''بس ایک پریشانی ہے۔''

''کیسی پریشانی باجی؟'' امی نے تشویش سے پوچھا۔

''سجاد کمپنی کی طرف سے تین سال کے لیے امریکا جا رہا ہے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا کہ جب تک سجاد واپس آئیں گے، میں آدھے سے زیادہ ایم بی بی ایس مکمل کر لوں گی۔

''نسیمہ! میں چاہتی ہوں کہ سجاد کے جانے سے پہلے ہی اس کی شادی کر دوں۔''

ان کی بات سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں شادی کا ذکر سن کر اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن کان باہر کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے باجی؟'' امی نے کہا۔ ''خیر سے سجاد میاں واپس آئیں گے تو...''

''نہ بی بی نہ۔'' پھوپی جان نے کہا۔ ''میں اس کے جانے سے پہلے ہی اس کے پاؤں میں شادی کی زنجیر ڈالنا چاہتی ہوں۔ کل کلاں کو اللہ نہ کرے وہ کوئی فرنگن لے آیا تو؟''

''سجاد ایسا لڑکا نہیں ہے باجی۔'' امی نے کہا۔



''ارے، تم کیا جانو ان موئی فرنگنوں کو۔'' پھوپی جان نے کہا۔ ''یہ تو اچھے اچھوں پر جادو کر دیتی ہیں۔''

دونوں بھائیوں نے بھی دبے لفظوں میں فوری طور پر شادی کی مخالفت کی

**سرورق کی کہانی**



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن بابا کے لیے تو پھوپی جان کی بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ انہوں نے فوراً ہامی بھر لی۔

"کب جا رہا ہے سجاد؟" انور بھائی نے پوچھا۔

"بس، ایک ہفتے بعد اس کی روانگی ہے۔"

"لیکن باجی! اتنی جلدی..."

"ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے نسیمہ۔" پھوپی جان نے کہا۔ "ویسے بھی سجاد نے سختی سے کہہ دیا ہے کہ مجھے جہیز بالکل نہیں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے پھر جمعے کو نکاح کر دیتے ہیں۔" بابا نے کہا۔

"بابا! جمعے کو تو افشین کا آخری پرچہ ہے۔" اکبر بھائی نے کہا۔ میں ان کی بہت لاڈلی تھی۔ انور بھائی بھی مجھے بہت چاہتے تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ اکبر بھائی کو غصہ نہ آجائے پھر تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ میں سجاد کو دیوانوں کی طرح چاہتی تھی۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتے تھے۔

"ارے میاں! بہت پڑھ لیا افشین نے۔" پھوپی جان نے کہا۔ "بس اب اسے مایوں بٹھا دو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں پھوپی جان؟" اکبر بھائی کا لہجہ کچھ ترش ہو گیا۔ "افشین نے رات رات بھر جاگ کر پڑھائی کی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ اس کی محنت یونہی رائگاں چلی جائے؟"

"ایسا کریں باجی۔" بابا نے جلدی سے کہا کہ کہیں پھوپی جان ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ "یہ مایوں، مہندی تو سب غیر اسلامی رسمیں ہیں۔ افشین کا آخری پرچہ جمعے کو ہے۔ وہ پرچہ دے کر آئے گی تو اس کا نکاح ہو جائے گا۔"

"چلو بھئی، یوں ہی سہی۔" پھوپی جان نے کہا۔ "تو بس پھر طے ہو گیا، میں جمعے کو برات لے کر آرہی ہوں۔" پھوپی جان نے سرشاری سے کہا۔

یوں بیٹھے بٹھائے مجھے امتحانات کی ٹینشن کے ساتھ ایک اور ٹینشن ہو گئی۔

شام تک گھر میں میری تمام کزنز اور دوسرے رشتے دار اکٹھے ہو گئے۔ لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھ گئیں اور ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔

یہ صورتِ حال میرے لیے بھی ایک چیلنج تھی۔ میں نے امتحان میں پاس ہونے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ اب اپنی محنت کو یوں رائگاں کیسے جانے دیتی؟ اس لیے میں اوپر بھائی کے کمرے میں بند ہو گئی اور امتحان کی تیاری کرنے لگی۔

اس دن بھی میں پیپر دینے نکلی تو وہ حسبِ معمول بس اسٹاپ کے نزدیک ہی موجود تھا۔

وہ لڑکا مجھے گزشتہ دو مہینے سے نظر آرہا تھا۔ وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتا تھا کہ میرا دل چاہتا، اس کی آنکھیں نوچ لوں لیکن وہ صرف مجھے گھورنے پر اکتفا کرتا تھا۔ کبھی اس نے مجھ سے بات کرنے کی یا مجھ پر آواز کسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے ایک آدھ دفعہ تو سوچا کہ انور بھائی یا دونوں بھائیوں کو اس کے بارے میں بتا دوں لیکن پھر اس خوف سے نہیں بتایا کہ انور بھائی تو اسے جان سے مار دیں گے۔

وہ لڑکا اپنے لباس اور چال ڈھال سے لفنگا یا بدمعاش بھی نہیں لگتا تھا۔ سلیقے کا لباس پہنتا تھا اور دیکھا جائے تو خاصا وجیہہ بھی تھا لیکن اس کم بخت کی آنکھیں... مجھے ان نظروں پر غصہ آتا تھا۔

اسے دیکھ کر حسبِ معمول میرا موڈ خراب ہو گیا۔ اس کم بخت کی نظریں اس وقت تک میرا پیچھا کرتی تھیں جب تک میں بس میں سوار ہو کر چلی نہ جاتی تھی۔

اس دن میرے ہاتھوں میں مہندی بھی تھی اس لیے اس کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔ میں نے سوچا، آج یہ آخری بار اپنی حسرت پوری کر لے پھر میں کہاں اور وہ کہاں؟ اسی شام کو میرا نکاح تھا۔

میں کالج پہنچی تو میری کلاس فیلوز پوچھنے لگیں... "بھئی یہ مہندی کس خوشی میں؟"

"آج شام میرا نکاح ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہو؟" زرین نے کہا۔ "اب ہم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہیں۔"

"افشین ٹھیک کہہ رہی ہے۔" شاہینہ نے کہا۔ "واقعی آج شام کو اس کا نکاح ہے۔"

پھر تو سب لڑکیاں میرے پیچھے پڑ گئیں کہ تم نے شادی میں ہمیں کیوں نہیں بلایا؟

"یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" نائلہ نے فلمی ولن والے مخصوص انداز میں کہا۔ "جب تک ہم شریک نہ ہوں۔"

"بھئی، آج رخصتی تو ہے نہیں۔" میں نے انہیں ٹالا۔ "میں رخصتی کے موقع پر تم سب کو بلاؤں گی۔"

وہ تو میرا مزید دماغ چاٹتیں لیکن شکر ہے کہ اسی وقت پرچہ شروع ہونے کا گھنٹا بج گیا۔





شادی کے ہنگاموں کے باوجود میرا یہ پرچہ بھی خلافِ توقع بہت اچھا ہوا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میرے اتنے نمبرز آجائیں گے کہ مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا۔

وقت ختم ہونے سے دس منٹ پہلے ہی میں نے پورا پرچہ کر لیا تھا۔ پھر اپنی کلاس فیلوز کی بک بک سے بچنے کے لیے میں دس منٹ پہلے ہی باہر آگئی۔

بس بھی فوراً ہی مل گئی۔ میں جانتی تھی کہ بس سے اترنے کے بعد اسٹاپ پر مجھے پھر اسی منحوس لڑکے کا چہرہ دیکھنا پڑے گا۔ یہ بھی اس کے معمولات میں سے ایک تھا۔ وہ اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر الیکٹرک پول سے ٹیک لگائے کھڑا ہوتا اور مجھے اس وقت تک دیکھتا جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔

میں بس سے اتری تو وہ حسبِ معمول اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں نے جھنجلا کر سوچا، اس منحوس کو کوئی کام نہیں ہے؟ چہرے اور حلیے سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک سوزوکی ہائی روف عین میرے سامنے رک گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی، سوزوکی میں بیٹھے ہوئے دو بدمعاش قسم کے آدمیوں نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔ ہائی روف کا سلائڈنگ دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔

میں نے چیخنا چاہا تو ان میں سے ایک نے میرے منہ اور ناک پر رومال رکھ دیا۔ میری آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

اس رومال میں کلوروفارم کی بُو تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کچھ دیر تک تو یہ سمجھ ہی نہیں آسکا کہ میں کہاں ہوں۔

کمرے میں اس وقت نیم تاریکی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی کہ یہ میں کس کے کمرے میں آگئی۔ وہ میرا بیڈروم.... تو نہیں تھا۔

ذہن سے دھند کچھ صاف ہوئی تو میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میں پیپر دے کر گھر واپس.... آرہی تھی تو کچھ لوگوں نے زبردستی گاڑی میں گھسیٹ لیا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھنے کی کوشش کی تو اس نیم تاریکی میں مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی آراستہ بیڈروم تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ دروازے کے نزدیک ہی مجھے سوئچ بورڈ نظر آیا۔ میں نے اس پر لگے ہوئے سوئچ دبائے تو تیسرے سوئچ پر کمرا روشنی میں نہا گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اس میں چھ بج رہے تھے۔ میں دہل کر رہ گئی۔ نہ جانے بابا کا کیا حال ہو گا؟ انور بھائی اور اکبر بھائی تو پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ سجاد میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا؟ ان سب کے بارے میں سوچ کر میں بلک بلک کر رونے لگی۔

نہ جانے کن ظالموں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا؟ میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ ڈالا اور پوری قوت سے چیخی۔ "دروازہ کھولو... دروازہ کھولو... کوئی ہے یہاں؟" باہر سناٹا تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

جب رونے سے دل کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سوچا، یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرنا چاہیے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کسی کی آراستہ خواب گاہ تھی۔ فرش پر دبیز اور قیمتی قالین تھا۔ انتہائی بیش قیمت بیڈ اور بہت آرام دہ میٹرس تھا۔ کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی جس پر مردانہ استعمال کی اشیا رکھی تھیں۔ گویا وہ بیڈروم کسی مرد کا تھا۔ کمرے میں نہایت خوب صورت وال کلاک آویزاں تھا... اس کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جس پر انتہائی قیمتی..... پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہاں واقعی کھڑکی تھی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھولی تاکہ اس سے کود کر فرار ہو جاؤں لیکن اس پر لگی ہوئی گرل دیکھ کر میں پھر مایوس ہو گئی۔ کمرے میں ایک دروازہ اور بھی تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھول کر دیکھا، وہ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ باتھ روم بھی انتہائی صاف ستھرا تھا اور اس کے ٹائلز جھلملا رہے تھے۔ وہاں خاصی بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ اس میں بھی ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ میں مایوس ہو کر پھر کمرے میں آگئی۔ کمرے میں اسپلٹ کی خوش گوار خنکی پھیلی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔

میں ایک دفعہ پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے اور مجھ سے کس چیز کا بدلہ لے رہے تھے؟

میں نے دہشت زدہ ہو کر پھر دروازہ پیٹ ڈالا۔ اس مرتبہ میں نے دروازہ پیٹنے کے لیے ماربل کی ایش ٹرے سے کام لیا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ساتھ میں وحشت زدہ انداز میں چیخ بھی رہی تھی۔ ”دروازہ کھولو۔“

کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھول کر وہی آدمی اندر آگیا جس نے مجھے گھسیٹ کر گاڑی میں بٹھایا تھا۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”کیوں چیخ رہی ہو؟ تم حلق پھاڑ کے مر بھی جاؤ تو کوئی تمہاری چیخ پکار نہیں سنے گا۔“

”لیکن تم لوگ ہو کون اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”اس کا جواب تو سردار صاحب خود ہی دیں گے۔“ اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ”اور اب فضول میں گلا مت پھاڑنا ورنہ میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“

اس کی نظر دروازے پر پڑی۔ ماربل کی ایش ٹرے سے اس کا سفید رنگ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور اس میں چھوٹے چھوٹے بہت سے گڑھے پڑ گئے تھے۔

”تم نے اتنے قیمتی دروازے کا ستیاناس کر دیا۔ اگر سردار صاحب کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں اس قابل ہی نہ چھوڑتا کہ تم دوبارہ دروازہ پیٹ سکو۔“

میں نے اچانک ماربل کی بھاری ایش ٹرے اس کے سر پر دے ماری۔

وہ بروقت ایک طرف جھک گیا۔ اس کے باوجود ایش ٹرے اس کے سر پر اچٹتی ہوئی لگی اور دیوار سے ٹکرا کر گر گئی۔

اس سے بھی اس کے سر میں اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

لمحہ بھر کو وہ گڑبڑا گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

موقع ملتے ہی میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلنا چاہتی تھی کہ اس نے جھپٹ کر میری چوٹی پکڑ لی اور انتہائی بے رحمی سے کمرے میں کھینچ لیا۔ اس نے لات مار کے دروازہ بند کیا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے تھپڑ مارنے کی کوشش کی پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور انتہائی تلخ لہجے میں بولا۔ ”آج تک کسی مرد کی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ وہ ارباب خان پر ہاتھ اٹھا سکے۔ میں ابھی تیرے سارے کس بل نکال دیتا لیکن سردار صاحب کی وجہ سے مجبور ہوں۔ ہاں، اگر اب تو نے چیخ پکار کی تو میں تیرے کپڑے اتار لوں گا۔“

اس کی بات سن کر میں کانپ کر رہ گئی۔ وہ اگر ایسا کرنا چاہتا تو اسے بھلا کون روک سکتا تھا؟

”دیکھو، تمہاری بھی بہنیں ہوں گی۔ تم میرے ساتھ ایسا ظلم کیوں کر رہے ہو؟ میرے گھر والے تو پاگل ہو رہے ہوں گے۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ تو پہلے ہی دل کی مریض ہیں۔ تمہیں اللہ کا واسطہ! مجھے جانے دو۔“ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بلک بلک کر رونے لگی۔

”میں نے کہا تھا کہ اب شور شرابا مت کرنا۔ مجھے مجبور مت کر کہ میں تیرے ساتھ بدسلوکی کروں۔“ وہ درشت لہجے میں بولا۔

”میں تمہارے پیر پکڑتی ہوں۔ مجھے جانے دو، اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔“

”دیکھ لڑکی! میں اگر تجھے جانے دوں گا تو سردار صاحب مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بس خاموشی سے بیٹھی رہ اور سردار صاحب کا انتظار کر۔“

”وہ... کب تک... آئیں گے؟“ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی آجائیں یا ایک دو گھنٹے بعد آئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صبح آئیں۔“

”صبح؟“ میں نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔ ”اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی... میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ تم... سردار صاحب کو ابھی نہیں بلا سکتے؟“ میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں ان کا نوکر ہوں، مالک نہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”میں باہر ہی بیٹھا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”تم تو صبح سے بھوکی ہو۔ میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔“

”مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔“ میں نے کہا۔

”پانی تو یہاں اس بیڈ روم میں فریج میں بھی موجود ہے۔“ اس کے کہنے پر میں نے پہلی دفعہ چھوٹا سا بیڈ روم فریج دیکھا۔

ارباب خان نے باہر نکل کر ایک مرتبہ پھر دروازہ مقفل کر دیا۔ میں نے فریج سے پانی کی بوتل نکال لی اور گلاس میں انڈیلنے کے بجائے بوتل ہی سے پانی پینے لگی۔ چیخ چیخ کر میری آواز بیٹھ گئی تھی۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ ٹھنڈے یخ پانی کی آدھی سے زیادہ بوتل پینے کے بعد میری جان میں جان آئی۔

میں ہارے ہوئے انداز میں بیڈ پر گر گئی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر بابا جان، امی اور بھائیوں کا خیال آیا۔ وہ تو رسوائی اور بدنامی کے خوف سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں





گے۔ امی کہتی تھیں کہ عورت کی عصمت تو کانچ سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ وہ اگر ایک رات بھی گھر سے باہر گزار لے تو پھر اس کے باپ اور بھائی بھی اسے قبول نہیں کرتے۔

برسوں پہلے ہمارے دور کے ایک رشتے دار کی بیٹی راشدہ کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ خاصے دولت مند لوگ تھے اور راشدہ کو تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ راشدہ کے باپ نے تاوان کی رقم دے کر اسے چھڑا تو لیا تھا لیکن ہر شخص اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اس نے رو رو کر مجھے بتایا تھا۔ ”افشین! میں حلفیہ کہتی ہوں کہ میں اب بھی پہلے کی طرح باعصمت ہوں لیکن کوئی میری بات پر یقین ہی نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ ناصر جو مجھے اپنی زندگی کہتا تھا، اس نے بھی مجھ سے منہ پھیر لیا ہے۔“

راشدہ کا خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آیا کہ بابا اور بھائی بھی کوئی کنگال تو نہیں ہیں۔ ممکن ہے ان لوگوں نے بھی مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہو۔ لیکن نہ تو بابا جان اور دونوں بھائی راشدہ کے والد کی طرح تنگ نظر ہیں، نہ سجاد مجھ سے منہ موڑ سکتا ہے۔ میں بہت دیر تک اسی قسم کی امید و بیم میں مبتلا رہی۔

وقت دبے پاؤں گزرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔ بھلا مجھ سی بدنصیب بھی کوئی لڑکی ہو گی جسے عین شادی والے دن اغوا کر لیا گیا۔ المیہ یہ تھا کہ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مجھے کس نے اغوا کیا ہے اور کیوں اغوا کیا ہے؟

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ارباب خان کمرے میں داخل ہوا۔ اس منحوس کی شکل ہی سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے وہ ٹرے تپائی پر رکھی اور اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”تم صبح سے بھوکی ہو، کھانا کھا لو۔“

”مجھے نہیں کھانا۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ پھر میں خوشامد بھرے لہجے میں بولی۔ ”پلیز! مجھے گھر جانے دو، میرے گھر میں ایک کہرام بپا ہو گا۔“ میں پھر رونے لگی۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہاری قسمت کا فیصلہ سردار صاحب کریں گے۔“ وہ جانے کے لیے مڑا اور جاتے جاتے بولا۔ ”کھانا کھا لینا اور چائے یا کافی پینا ہو تو مجھے بتا دینا۔“

”میں یہاں پکنک منانے نہیں آئی ہوں کہ...“

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی دروازہ بند ہو چکا تھا۔

میں ایک دفعہ پھر اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔

مجھے یقین تھا کہ بابا نے اب تک پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہو گی اور پولیس جلد ہی مجھے تلاش کر لے گی۔ مجھے پولیس کے سلسلے میں کوئی خوش فہمی ہرگز نہیں تھی لیکن ایس ایس پی ظفر بھائی، اکبر بھائی کے کلاس فیلو تھے اور ان کے بہترین دوست بھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ پھر... پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ مزید کچھ سوچتے ہوئے میرا دماغ ماؤف ہو جاتا۔

میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی اس لیے اس نرم و گداز بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

میں نے صبح صرف چائے کے ساتھ دو سلائس کھائے تھے۔ بھوک سے میرے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہے۔ یوں رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔

میں باتھ روم میں گئی، منہ ہاتھ دھو کر اور بال سنوار کر باہر نکلی تو مجھ میں خاصی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ کھانے کی ٹرے ابھی تک تپائی پر رکھی تھی۔ ارباب خان شاید وہ کھانا کسی اچھے ریسٹورنٹ سے لایا تھا۔ کھانے میں چکن بروسٹ، قورمہ اور تندوری نان تھے۔ کولڈ رنک کا ایک ٹن بھی تھا۔

میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے سے میرے جسم میں گویا پھر سے جان پڑ گئی۔

میں نے کھانے کے بعد اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

جو کچھ ہونا تھا، اب تو ہو چکا تھا۔ میری عزت کا جنازہ نکل چکا تھا اور میں بابا اور بھائیوں کے لیے کلنک کا ٹیکا بن کر رہ گئی تھی۔

تین بجے کے قریب باہر قدموں کی آہٹیں گونجیں۔ اس مرتبہ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ کمرے کا قفل کھلنے کی آواز آئی تو میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

دروازہ کھلا اور کاٹن کے بے داغ، کلف دار شلوار سوٹ میں ملبوس ایک وجیہہ نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کا قد دراز اور جسم کسرتی تھا۔ آنکھوں اور بالوں کا رنگ براؤن تھا اور وہ مجھے کسی بھی طرح بدکردار یا بدمعاش نہیں لگ رہا تھا۔

اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ بُری طرح چونک اٹھا اور چیخ کر بولا۔ ”ارباب خان!“

”جی سائیں!“ ارباب خان فوراً کمرے میں داخل ہوا اور سہم کر کھڑا ہو گیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ تم کسے اٹھا لائے ہو؟"

"سائیں! آپ نے کہا تھا کہ..."

"بکواس بند کرو۔ تم پہچانتے ہو اس لڑکی کو... کون ہے یہ؟"

"سائیں! میں تو نہیں پہچانتا، بخشل اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اسی کے کہنے پر ہم نے اسے اٹھایا ہے۔"

"بخشل کو بلاؤ۔" نوجوان گرج کر بولا۔ "تم لوگوں سے ایک بھی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا، بس پڑے پڑے کھاتے رہتے ہو۔"

ارباب خان تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص اور تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جی سائیں! حکم۔"

"حکم کے بچے... یہ تو کسے اٹھا لایا ہے؟"

"سائیں! یہی تو ماروی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر خاصی قوت سے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔

"سائیں... اسے میں نے اسی اسٹریٹ سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کے بال، قد اور جسم سب کچھ ماروی جیسا ہے۔"

"الو کے پٹھے! تجھے ماروی جیسی کوئی لڑکی بھی نظر آئے گی تو اسے اٹھا لائے گا؟" پھر وہ ارباب خان سے مخاطب ہوا۔ "ارباب خان! ہنٹر لاؤ۔"

ارباب خان فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ بخشل اچانک سردار کے پیروں سے چمٹ گیا اور بولا۔ "سائیں! غلطی ہوگئی، معاف کردیں مجھے۔"

ارباب خان چمڑے کا ہنٹر لے آیا تھا۔ اس وقت سردار کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا تھا، غصے سے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ اس حالت میں اس کی پوری شخصیت ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے چمڑے کا ہنٹر گھمایا تو وہ شائیں کی آواز کے ساتھ بخشل کی پیٹھ پر پڑا۔ بخشل کراہ کر رہ گیا۔

وہ دوسرا وار کرنے والا تھا کہ میں چیخ کر بولی۔ "سردار صاحب! آپ نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ میری زندگی برباد کردی آپ نے۔" میرے آنسو بہنے لگے پھر میں بلک بلک کر رونے لگی۔

"غلطی میرے ملازم سے ہوئی ہے بی بی!" سردار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور میں اسے اس کی سزا بھی دے رہا ہوں۔"

"آپ اگر اس کے جسم کی کھال بھی اتار دیں، اسے ذبح بھی کردیں تو کیا میری کھوئی ہوئی عزت لوٹا سکتے ہیں؟"

"سردار جہانگیر کے کسی بھی ملازم کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے گھر میں کسی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالے۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اور اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو میں اس شخص کو اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا اور بولا۔ "بتائیں... کس نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے؟" پھر وہ گرج کر بولا۔ "ارباب خان! تو نے کوئی بھی ایسی حرکت تو نہیں کی؟"

"میری کیا جرأت سائیں!" ارباب خان نے کہا۔

"میں نے تو اسے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا۔ ہاں، اس نے فرار کی کوشش کی تھی تو میں نے اس کے بال پکڑ کر بیڈ پر دھکا ضرور دیا تھا۔"

"تو میری ہدایات بھول گیا تھا؟" سردار جہانگیر گرج کر بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ تم میں سے کوئی اس لڑکی کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے شائیں سے ہنٹر گھمایا اور ارباب خان کے جسم پر رسید کردیا۔

وہ بلبلا کر رہ گیا اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سردار جہانگیر صاحب!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آپ کی یہ مار پیٹ یا خون خرابا میرے خاندان کی رسوائی کا مداوا نہیں کرسکتا۔"

"بتایئے، میں اس غلطی کا مداوا کیسے کروں؟" پھر وہ ارباب خان سے بولا۔ "ارباب خان! انہیں عزت سے ان کے گھر چھوڑ آؤ۔"

"عزت سے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "سردار جہانگیر صاحب! کس عزت کی بات کررہے ہیں آپ؟"

"تو کیا آپ ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہیں؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ پڑھی لکھی اور اچھے خاندان کی لگ رہی ہیں۔ آپ کے گھر والے بھی اتنے دقیانوسی تو نہیں ہوں گے کہ وہ آپ کی بات پر یقین نہ کریں۔" پھر وہ ارباب خان سے بولا۔ "ارباب خان! انہیں ابھی گھر چھوڑ کر آؤ۔"

میں نے گھڑی دیکھی، چار بج رہے تھے۔ ارباب خان نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا پھر اس نے میرا ہینڈ بیگ میرے حوالے کردیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے بیگ جھپٹ کر اس میں سے سیل فون نکالا تو ارباب خان نے کہا۔ "اس کا کوئی فائدہ





نہیں ہے۔ میں نے اس کی بیٹری نکال لی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم فوری طور پر اپنے گھر والوں سے بات کرو اور وہ کہیں گھات لگا کر میرے انتظار میں بیٹھ جائیں۔"

سردار جہانگیر تیزی سے پورچ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ارباب خان! ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں سے لے جانا تاکہ یہ اس جگہ کی نشاندہی نہ کرسکیں۔ بخشل ابھی ایک دو دن تک کام نہیں کرسکے گا اس لیے تمہیں تنہا ہی جانا ہوگا۔"

"میں لے جاؤں گا سائیں۔" ارباب خان نے سر جھکا کر کہا۔ پھر اس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا مفلر نکالا اور اس سے میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگا۔

سردار جہانگیر عجلت میں ہم سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔

ارباب خان مجھے اندھوں کی طرح سہارا دے کر گاڑی کی طرف لے چلا۔ اسی وقت کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"اسے یوں ہی چھوڑ دے گا ارباب خان؟" پشت سے بخشل کی آواز آئی۔ "اب تو سائیں کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"پھر تو کیا چاہتا ہے؟" ارباب خان نے پوچھا۔

"اس کی وجہ سے مجھے مار پڑی ہے اور تجھے بھی۔ اس نے تو تجھے زخمی بھی کردیا ہے۔ کم سے کم ہم اپنا غم تو غلط کرلیں۔ پھر اسے جہاں مرضی آئے پھینک آنا۔"

"بات تو تیری سولہ آنے صحیح ہے۔" ارباب خان کے لہجے میں بھی ہوس تھی۔ "سائیں تو اب اس کے بارے میں کچھ پوچھے گا نہیں۔"

"تو پھر اسے اندر لے آ۔" بخشل نے بھی ہوس زدہ لہجے میں کہا۔

"پاگل ہوا ہے؟" ارباب خان نے کہا۔ "یہاں تو کسی بھی وقت سردار سائیں یا اس کا کوئی آدمی آسکتا ہے۔ اسے میں اپنے ٹھکانے پر لے چلتا ہوں۔ چل تو بھی گھر کو تالا لگا اور گاڑی میں بیٹھ جا۔"

ان کی باتیں سن کر میں بُری طرح لرز گئی اور چیخ کر بولی۔ "تمہیں اللہ کا واسطہ! مجھ پر یہ ظلم مت کرو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ارباب خان کو دھکا دیا اور اس کی گرفت سے آزاد ہو کر اندھوں کی طرح ایک طرف بھاگی لیکن کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔

ارباب خان نے فوراً ہی مجھے دبوچ لیا اور بخشل سے بولا۔ "تُو اندر جا کر رسّی لے آ۔ اور سن، سردار سائیں کے کمرے میں شراب کی بوتلیں بھی رکھی ہیں، ان میں سے ایک بوتل بھی لے آنا۔"

پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ بُری طرح جکڑ لیے۔ میں نے اس کے پیٹ میں لاتیں مارنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ میری پشت پر یا دائیں بائیں کہیں کھڑا تھا۔

بخشل کو اندر گئے تقریباً دس منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میں ہاتھ پیر چلا چلا کر میں ہلکان ہو چکی تھی۔

"بخشل!" ارباب خان جھنجلا کر چیخا۔ "کیا مر گیا اندر جا کر؟"

بخشل کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

اس نے چند منٹ انتظار کیا پھر پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں بولا۔ "بخشل! کیا تو سو گیا ہے اندر جا کر یا پھر واقعی تیری موت واقع ہوگئی ہے؟"

اب بھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

ارباب خان نے مجھے بازو سے تھاما اور پشت سے میری گردن پکڑ کر اندر کی طرف دھکیلا۔

تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس گینڈے کی گرفت اتنی ہی مضبوط تھی۔

اس دھینگا مشتی میں میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی بھی کھل گئی لیکن ارباب خان شاید اتنے غصے میں تھا کہ اس نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

ہم کسی کوریڈور میں تھے۔ وہاں ایک سرے پر انرجی سیور لگا ہوا تھا۔

ارباب خان جونہی مزید آگے بڑھا، مجھے اچانک کوئی آواز سنائی دی۔ پھر ارباب خان کی اذیت ناک کراہ سن کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ارباب خان کھڑا ہوا آگے پیچھے ڈول رہا تھا، پھر وہ دھپ سے فرش پر گر گیا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے پیچھے وہی لڑکا کھڑا تھا جو روزانہ مجھے آتے جاتے گھورتا تھا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں مضبوط سا ایک ڈنڈا تھا۔

"تم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم بھی ان لوگوں کے ساتھی ہو؟"

"میں ان لوگوں کا ساتھی ہوتا تو انہیں ٹھکانے نہ لگاتا۔ اب آپ دیر مت کریں، نکلیں یہاں سے... ورنہ یہاں کوئی اور بھی آسکتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ وہ گاڑی میں وہاں سے جائے گا لیکن



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب وہ کھلے ہوئے گیٹ کی طرف سے پیدل ہی ایک طرف دوڑا تو مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ میرے پاؤں میں تو چپلیں بھی نہیں تھیں۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ بھی گر گئی تھیں۔

باہر کی زمین کچی تھی۔ کنکر اور پتھر کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی میرے پیروں میں چبھ رہے تھے۔

"تم جا کہاں رہے ہو؟" میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ "میرے پیر زخمی ہو چکے ہیں۔"

"بس تھوڑی ہمت کر لیں۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر میری بائک موجود ہے یا پھر آپ یہیں ٹھہریں، میں بائک لے کر آتا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔

وہ ویران علاقہ تھا اور دور تک کسی دوسرے مکان کا نام و نشان نہیں تھا۔ مجھے اس سناٹے اور تنہائی سے خوف آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "نہیں، میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ چلو کہاں چلنا ہے؟"

میں ایک مرتبہ پھر لنگڑاتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔

مزید تقریباً پانچ منٹ چلنے کے بعد لڑکے نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "ان گھنی جھاڑیوں میں میری بائک کھڑی ہے۔ آپ ٹھہریں، میں بائک نکالتا ہوں۔"

وہ تیزی سے جھاڑیوں میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد جھاڑیوں کے ہلنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بائک لے کر آ رہا ہے۔

وہ عام موٹر سائیکل کے مقابلے میں خاصی بڑی اور بھاری تھی۔

اس نے سیلف دبا کر انجن اسٹارٹ کیا اور مجھ سے بولا۔ "چلیے بیٹھیے۔"

میں جھجکتی ہوئی بائک پر بیٹھ گئی۔

وہ اس کچے راستے میں بھی بائک اتنی تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا کہ خوف کے مارے میری جان نکلی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم پختہ سڑک پر پہنچے تو وہ اس ہیوی بائک کو جیٹ فائٹر کی طرح اڑانے لگا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔ بائک کی رفتار اتنی تیز تھی کہ تیز ہوا سے میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ میں نے سوچا، اس عالم میں اگر خدانخواستہ بائک پھسل جائے یا اس لڑکے کے قابو سے نکل جائے تو ہم دونوں کی لاشیں شناخت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

"تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" میں چیخ کر بولی کیونکہ تیز ہوا اور بائک کے شور میں میری آواز دب کر رہ گئی تھی۔

"آپ کچھ کہہ رہی ہیں؟"

"ہاں اور تمہارے علاوہ یہاں کون ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں آپ کو اپنے ایک دوست کے گھر لے جا رہا ہوں۔" اس نے چیخ کر جواب دیا۔

"کیوں... اپنے گھر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے گھر نہیں، اپنے دوست کے گھر۔" اس نے جواب دیا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"بائک روکو۔" اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ "روکو ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

ہم اس وقت قائد آباد کے علاقے سے گزر کر پل پر چڑھ چکے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سردار جہانگیر نے مجھے کسی دور دراز کے فارم ہاؤس میں رکھا تھا۔ اب جس راستے پر ہم جا رہے تھے، وہ جانا پہچانا تھا۔

اس نے اچانک بائک روک دی اور جھنجلا کر بولا۔ "ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ارباب خان اور بخشل ہمارے پیچھے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ٹیلی فون پر اپنے کسی آدمی کو اطلاع دے دی ہو اور وہ کسی جگہ ہماری گھات میں بیٹھا ہو۔"

"لیکن تم مجھے میرے گھر کیوں نہیں چھوڑتے؟" میں نے کہا۔

"وہاں اس وقت پولیس موجود ہو گی۔ میں فوری طور پر پولیس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی اَب وہاں جانے کیا صورتِ حال ہو۔ پھر آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ جن لوگوں نے آپ کو اغوا کیا ہے، وہ آپ کے گھر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، میں فضول میں مارا جاؤں گا۔" پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ "چلیں بیٹھیں بائک پر۔ میں اتنا بُرا آدمی نہیں ہوں، جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔"

میں خالی الذہنی کے عالم میں دوبارہ بائک پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے اپنا مفلر دیا کہ کانوں پر لپیٹ لیں۔ اس وقت خاصی خنکی ہو رہی تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر موٹر سائیکل کو جیٹ فائٹر کی رفتار سے دوڑانا شروع کر دیا۔

مزید آدھ گھنٹے بعد وہ چھوٹے سے ایک بنگلے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس بنگلے سمیت اردگرد کے تمام بنگلے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسٹریٹ کے سرے پر الیکٹرک پول





کے بلب کی ناکافی روشنی میں واضح طور پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے ڈور بیل بجائی اور انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اندر آہٹ سنائی دی اور کسی نے گیٹ کے پاس آ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"یار یاسر! میں عمران ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکے کا نام عمران ہے۔

یاسر شاید اندر لگا ہوا تالا کھول رہا تھا کیونکہ چابیوں کی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پورچ میں روشنی بھی کر دی تھی۔

یاسر نے دروازہ کھولا اور بولا۔ "تُو..." اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"اب راستے سے ہٹے گا یا یونہی ہونق بنا کھڑا رہے گا۔" عمران نے کہا۔ "شکر ہے تو نے اپنی زبان کو قابو میں رکھا۔"

یاسر نے ایک طرف ہٹ کر ہمیں راستہ دیا۔ اندر داخل ہو کر عمران نے کہا۔ "یار! بڑا گیٹ کھول، مجھے اپنی بائک بھی اندر لانا ہے۔"

یاسر نے بغیر کوئی سوال کیے مین گیٹ کا تالا کھول دیا۔ عمران دوبارہ بائک لینے باہر چلا گیا۔ اس دوران میں یاسر گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی کہ یاسر نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا؟

بائک اندر کھڑی کرنے کے بعد یاسر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم خوب آراستہ تھا۔

یاسر نے کہا۔ "آپ لوگ بیٹھیں، میں آپ کے لیے کافی لاتا ہوں۔ موسم خاصا خنک ہو گیا ہے اور آپ لوگ بائک پر آئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

"آپ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اپنا نام بتا دیں۔"

"میرا نام افشین تھا عمران صاحب۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "اب تو میں افشین کی چلتی پھرتی لاش ہوں۔ نہ جانے میرے گھر والوں کا کیا حال ہو گا؟"

"آپ فکر مت کریں۔ میں صبح جا کر حالات معلوم کر لوں گا۔ یوں بھی جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا ہے۔ ویسے بھی صبح ہونے والی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یاسر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کافی کے ساتھ ساتھ فرائی انڈے، ڈبل روٹی، مکھن اور جام وغیرہ بھی تھا۔

"آپ لوگ بھوکے ہوں گے۔" یاسر نے کہا۔ "یوں بھی اب صبح ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا کہ ناشتا ہی تیار کر لوں۔"

کچھ کھانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے الٹا سیدھا ناشتا زہر مار کیا اور عمران سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں، اب بتا عمران! تو آج کل کہاں ہے اور کن چکروں میں ہے؟"

"کوئی خاص چکر نہیں ہے۔" عمران نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"اور تُو نے شادی کب کی؟" یاسر نے اچانک پوچھا۔ "مجھے کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔"

"شادی؟" عمران نے کہا۔ "میں نے کب شادی کر لی؟"

"تو پھر یہ کون ہیں؟" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرے ایک بہت ہی عزیز دوست کی بہن ہیں۔" عمران نے کہا۔ "یہ ایک بہت بڑے پرابلم میں پھنس گئی تھیں۔ میں نے انہیں وہاں سے نکالا ہے اور اب انہیں گھر چھوڑنا ہے۔"

"خاتون! آپ چاہیں تو بیڈ روم میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیں۔ آپ کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی ہے۔"

میں نے بھی سوچا کہ جتنی دیر یاسر کے سامنے بیٹھی رہوں گی، وہ میرے ہی بارے میں بات کرتا رہے گا۔ اس نے جس کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا، میں اٹھ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے ساتھ ہی غالباً یاسر کا بیڈ روم تھا۔ دونوں کمروں کے اٹیچ باتھ بھی متصل تھے، دیوار کے اوپر کی رخ پر چھوٹا سا ایک روشن دان چھوڑا گیا تھا تاکہ دوسرے باتھ روم سے تازہ ہوا اندر آ سکے کیونکہ وہ باتھ روم ہوا کے رخ پر تھا۔

میں باتھ روم میں گئی تو مجھے عمران اور یاسر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں شاید ان کے باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"سچ سچ بتا عمران!" یاسر کی آواز آئی۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

"میں نے تجھے بتایا تو ہے کہ یہ میرے ایک دوست کی بہن ہے۔" عمران نے کہا۔ "اسے کل دوپہر سردار جہانگیر کے آدمیوں نے اغوا کر لیا تھا۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سردار جہانگیر کے آدمیوں نے!'' یاسر نے حیرت سے کہا۔ ''تو اسے سردار جہانگیر کی قید سے نکال کر لایا ہے؟'' یاسر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''یار! جب اس لڑکی کو اغوا کیا جا رہا تھا تو میں بھی وہیں موجود تھا۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ اغوا کرنے والے سردار جہانگیر کے آدمی ہیں۔ میں نے ان لوگوں کا پیچھا کیا۔ تُو تو جانتا ہے کہ زمین پر چلنے والی کوئی بھی گاڑی تیز رفتاری میں میری بائک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

''جانتا ہوں یار!'' یاسر نے کہا۔ ''تُو نے اس کے انجن میں خاصی ترمیم کی ہے۔ پھر وہ بائک یوں بھی تیز رفتاری میں لاجواب ہے۔''

''میں ان کا پیچھا کرتا ہوا گھارو کے قریب ایک فارم ہاؤس میں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ فارم ہاؤس تو سردار جہانگیر کا ہے۔ اس وقت میرے پاس صرف ایک پسٹل تھا جس میں صرف نو گولیاں تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کتنے لوگ ہیں۔ میں وہیں جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گیا اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر میں نے وہاں ارباب خان اور بخشل کو دیکھا تو میری... روح فنا ہو گئی۔ تو جانتا ہے، وہ لوگ کتنے بے رحم اور سفاک ہیں۔ میں اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے تو میرے دل میں خیال آیا کہ پولیس کو انفارم کر دوں لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ بات پولیس تک پہنچی تو وہ تو بدنام ہو گی ہی، اس کا پورا خاندان رسوا ہو جائے گا۔ میں موقع کی تاک میں رہا لیکن وہ کم بخت بخشل دروازے پر ہی بیٹھا تھا۔ جس کمرے میں انہوں نے لڑکی کو قید کیا تھا وہاں سے لڑکی کی چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے اگر اندازہ ہوتا کہ اس فارم ہاؤس پر صرف بخشل اور ارباب خان ہیں تو شاید میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر اندر گھسنے کا رسک لے لیتا۔ ہاں، میں نے یہ ضرور فیصلہ کر لیا تھا کہ لڑکی کو ہر قیمت پر یہاں سے نکالوں گا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ ٹیلی فون کر کے تجھے اور بلال کو بلا لوں لیکن تم دونوں ہی کے سیل فون بند تھے۔

''جھاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے میں اکڑ کر رہ گیا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی نہ جانے کتنے گھنٹے گزر گئے۔ میں نے طے کر لیا کہ اب چاہے اندر دس آدمی ہوں، میں اندر گھس جاؤں گا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سردار جہانگیر خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ میں تیزی سے اس کمرے کی کھڑکی کے نیچے پہنچا جس میں افشین قید تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ افشین نے اس کمرے کی کھڑکی کھول دی تھی اس لیے اندر کی آوازیں باہر آ رہی تھیں۔

''سردار جہانگیر کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے آدمی غلط لڑکی کو اٹھا لائے ہیں تو اس نے اپنے آدمیوں کی خوب خبر لی اور ان سے کہا کہ اس لڑکی کو فوراً گھر چھوڑ کر آؤ۔ میں ارباب خان اور بخشل کی کمینی اور گھٹیا فطرت سے واقف ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اور باعزت طور پر افشین کو نہیں چھوڑیں گے۔ اس صورت میں کہ سردار جہانگیر بھی اس سے لاتعلق ہو گیا تھا۔''

پھر اس نے بتایا کہ کیسے اس نے مجھے وہاں سے نکالا۔

''لیکن عمران!'' یاسر نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ''ارباب خان نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تم جانتے ہو کہ سردار جہانگیر کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اب تو یہ لڑکی ان کی انا کا مسئلہ بن گئی ہے۔ وہ اسے دوبارہ اغوا کر لیں گے۔''

''تو تم کیا کہنا چاہتے ہو، میں اس لڑکی کی عزت کو پامال ہونے دیتا؟ ممکن ہے وہ اسے بے عزت کرنے کے بعد قتل ہی کر دیتے۔''

''اب تم نے کیا سوچا ہے؟'' یاسر نے پوچھا۔

''میں کل افشین کے گھر جاؤں گا۔ اس کے بھائیوں اور والد کو سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، آپ لوگ افشین کو کہیں اور شفٹ کر دیں۔ ایسی جگہ جہاں وہ ارباب خان اور بخشل کی پہنچ سے دور ہو۔''

میں باتھ روم میں کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ اب انہوں نے کاروباری باتیں شروع کر دی تھیں۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ عمران کی نیت خراب نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے، خلوصِ دل سے کر رہا ہے۔ لیکن ایک بات میرے ذہن میں چبھ رہی تھی کہ عمران کا ان لوگوں سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے اس لیے تو ارباب خان اسے پہچان گیا تھا۔ یاسر بھی ان لوگوں سے خوف زدہ تھا۔ گویا وہ بھی ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اس لیے فوری طور پر مجھے ان لوگوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں بھی کیسا نصیب لے کر آئی تھی۔ بچپن سے جس شخص کو اپنے دل میں بٹھایا جس کی پوجا کی لیکن جب اس سے ملن کا وقت آیا تو تقدیر نے ایسا وار کیا کہ سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے، پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی میرے کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک دے رہا تھا۔

میں لرز کر رہ گئی اور سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولیں افشین!" باہر سے عمران کی آواز آئی۔ "ہمارے دشمن یہاں تک آپہنچے ہیں۔ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

میں نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔

"یہ چادر لپیٹ لیں اور میرے ساتھ آئیں۔" عمران نے کہا۔

میں روبوٹ کی طرح اس کے کہنے پر عمل کر رہی تھی۔ باہر سے مین گیٹ دھڑدھڑانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

عمران مجھے لے کر عجلت میں مکان کی چھت پر چلا گیا۔ برابر والے مکان کی چھت وہاں سے بہ مشکل چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔

"یاسر، ون فائیو کو کال کر چکا ہے۔ پولیس والے ابھی کچھ ہی دیر میں پہنچنے والے ہوں گے۔ ہم احتیاطاً اس برابر والے مکان کی چھت پر چلے جائیں گے تاکہ پولیس سے پہلے وہ لوگ بنگلے میں گھس آئیں تو ہم محفوظ رہیں۔"

"تو کیا وہ لوگ اس چھت پر نہیں آسکتے؟" میں نے اپنے بہم کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "اور پھر میں اس چھت پر جاؤں گی کیسے؟"

"یہ تو بہت کم فاصلہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہ فاصلہ آسانی سے طے کرلیں گی۔" عمران نے کہا۔

پھر وہ بنگلے کی منڈیر پر کھڑا ہوا اور اچانک دوسری چھت پر چھلانگ لگادی۔

"آیئے، جلدی کیجیے... ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"میں نہیں کودسکتی۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"آپ ہمت تو کریں۔" عمران نے کہا۔ "اگر ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئیں تو وہ اس دفعہ بالکل بھی رعایت نہیں کریں گے۔ کم آن۔" اس نے میری ہمت بندھائی۔

"دیکھیے، ڈریں مت۔" عمران نے کہا۔ "اگر آپ ڈریں گی تو بہت مشکل ہوجائے گی۔"

میں لرزتے ہوئے قدموں سے دیوار کی منڈیر پر چڑھی۔

"شاباش!" عمران نے کہا۔ "اب آپ آنکھیں بند کریں اور چھلانگ لگادیں۔"

میں نے اللہ کا نام لے کر جسم کی پوری قوت مجتمع کی اور چھلانگ لگادی۔

ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے میں چھت سے نیچے گر گئی ہوں لیکن جب میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو میں دوسری چھت پر تھی اور عمران کے اوپر پڑی ہوئی تھی۔

میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ چھلانگ لگاتے وقت شاید میں عمران سے ٹکرا گئی تھی اور اسے لیتی ہوئی گر گئی تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں مس افشین؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا گھٹنے میں چوٹ آئی ہے لیکن وہ بھی معمولی ہے۔"

"اب اس زینے کے راستے نیچے آجائیں۔" اس نے دوسری چھت پر بنے ہوئے زینے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہ جانے یہ کس کا گھر ہے اور..."

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

زینے میں گھپ اندھیرا تھا۔ صرف دروازے کے پاس ایک بلب لگا ہوا تھا۔ وہ بھی اس وقت بند تھا۔ عمران نے وہ بلب بھی نکال لیا۔

ہم اس تاریک زینے کی لینڈنگ پر جا کر دبک گئے۔ اچانک مجھے عمران کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ فضا پولیس سائرن کی آواز سے مرتعش ہوگئی۔

ہم وہاں اسی طرح دبکے رہے۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ سردیاں شروع ہوچکی تھیں ورنہ اب تک ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا ہوتا۔

پھر مزید پندرہ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ بیٹھے بیٹھے میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ میں نے سوچا، اس وقت تو مجھے سجاد کی خواب گاہ میں ہونا چاہیے تھا اور میں کسی اجنبی مکان کے تاریک زینے میں دبکی ہوئی تھی۔

اچانک عمران نے چونک کر اپنا سیل فون جیب سے نکال لیا۔ یقیناً اس کا سیل فون وائبریشن پر تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "ہاں، یاسر! کیا صورتِ حال ہے؟ اچھا ٹھیک ہے... تم نے اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے نا... اوکے، ہم آرہے ہیں۔" اس نے سیل فون جیب میں رکھا اور مجھ سے بولا۔

"آیئے افشین! اب چلیں۔ خطرہ ٹل چکا ہے۔ پولیس بھی واپس جاچکی ہے اور ہمارے دشمن بھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے ایک مرتبہ پھر یہ دیوار





پھلانگنا پڑے گی؟" میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"نہیں، اس دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے چھت پر لکڑی کے تختے دیکھے تھے میں دونوں چھتوں کے درمیان ایک تختہ رکھ دوں گا۔ آپ بہت آسانی سے یاسر کی چھت پر پہنچ جائیں گی۔"

ہم زینے سے نکل کر دوبارہ دبے پاؤں چھت پر آئے۔ وہاں ایک طرف چند تختے، بجری کا ایک ڈھیر اور کچھ سریا پڑا تھا۔ مکان کی بالائی منزل غالباً زیرِ تعمیر تھی۔

عمران نے لمبا سا ایک تختہ اٹھایا اور اسے دونوں چھتوں کی منڈیر پر رکھ کر ایک پُل سا بنا دیا۔ میں تختے پر چڑھ تو گئی لیکن اس پر چلتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"جلدی کریں افشین صاحبہ!" عمران نے کہا۔ "صبح ہونے والی ہے۔ اس چھت پر کوئی بھی آسکتا ہے۔"

میں بہ مشکل تمام اس تختے کے ذریعے یاسر کی چھت پر پہنچی۔ اتنا سا سفر طے کرنے ہی میں مجھے پسینا آگیا۔ میرے دوسری طرف پہنچنے کے بعد عمران نے تختہ اٹھا کر دوبارہ وہیں پر رکھ دیا۔ اور خود چھلانگ لگا کر واپس آگیا۔ آنے سے پہلے اس نے چھت کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا کہ ہماری وہاں موجودگی کا کوئی نشان نہ رہ جائے۔

ہم زینے طے کر کے نیچے پہنچے تو یاسر باہر لان ہی میں کھڑا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ بولا۔ "شکر ہے خطرہ ٹل گیا لیکن اب تمہیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ وہ لوگ پولیس کی وجہ سے یہاں سے بھاگ تو گئے لیکن دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔"

"میری بائک کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو وہ بائک تمہارا ٹریڈ مارک ہے۔ میں نے اسے فی الحال گیراج میں بند کر دیا ہے۔ تم ایسا کرو، بائک یہیں چھوڑ دو۔"

"نہیں یار!" عمران نے کہا۔ "ہم پیدل تو زیادہ دور جا بھی نہیں سکیں گے۔ ممکن ہے تمہاری گلی کے نکڑ پر یا مین روڈ پر وہ لوگ اب بھی موجود ہوں۔ میں پیدل ہوا تو وہ مجھے بہت آسانی سے پکڑ لیں گے۔ بائک ہوئی تو وہ میری گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" یاسر نے کہا۔ "مجھ سے سیل فون پر رابطہ رکھنا۔" پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور عمران کو دے دیے۔ "رکھ لو، تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔"

"میرے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں یاسر!" عمران نے کہا۔ "میرے پاس چیک بک بھی ہے اور اے ٹی ایم کارڈ بھی۔"

"اس کے باوجود تم یہ رقم رکھ لو۔ کیا پتا فوری طور پر تمہیں رقم بینک سے نکالنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔"

عمران نے نوٹ اس سے لے کر اپنی جینز کی جیب میں ٹھونس لیے۔

یاسر نے گیراج سے اس کی بائک نکالی اور بولا۔ "میرے پاس پیٹرول کا ایک کین بھی ہے۔"

"ہاں، پیٹرول کی تو مجھے ضرورت پڑے گی۔"

بائک میں پیٹرول ڈالنے کے بعد عمران نے انجن کا جائزہ لیا۔ ہیلمٹ لگایا اور مجھ سے بولا۔ "افشین! آپ بھی مفلر کانوں پر اچھی طرح لپیٹ لیں اور ذرا جم کر بیٹھیے گا۔"

یاسر نے گیٹ کھولا۔ عمران نے سیلف لگا کر بائک اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹ روشن کیے بغیر باہر نکل آیا۔ پھر وہ مین روڈ پر جانے کے بجائے مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گزرتا ہوا راشد منہاس روڈ پر پہنچا اور وہاں سے نارتھ کراچی کی طرف مڑ گیا۔ پھر اس نے اتنی خوف ناک ڈرائیونگ کی کہ میں نے اپنی چیخیں بہت مشکل سے ضبط کیں۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھ لیا۔

ہم ناگن چورنگی پر پہنچے تو دائیں جانب سے ایک کار بھی بہت تیز رفتاری سے آرہی تھی۔ متوقع حادثے کے پیشِ نظر میں نے ایک مرتبہ پھر کلمہ پڑھا اور مرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

عمران نے بائک کی رفتار مزید بڑھا دی، بس چند انچ کے فاصلے سے تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔

گاڑی والے کے ایسے ہاتھ پاؤں پھولے کہ اس نے گاڑی بجری کے ایک ڈھیر میں گھسا دی۔ ان دنوں وہاں سڑک زیرِ تعمیر تھی۔

"عمران! اللہ کے واسطے آہستہ چلاؤ۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"اگر میں آہستہ چل رہا ہوتا تو اس گاڑی سے ٹکراؤ یقینی تھا افشین صاحبہ!" عمران نے کہا۔

وہ نارتھ کراچی میں یو پی موڑ سے آگے گزر کر بائیں جانب کی ایک سڑک پر مڑ گیا۔ پھر کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک ایسے مکان کے سامنے جا ٹھہرا جو پوری طرح تعمیر بھی نہیں ہوا تھا۔ اس مکان کے صرف ایک کمرے میں کھڑکیاں اور دروازے وغیرہ تھے۔ کمرے میں ایک اوسط درجے کا بیڈ بھی تھا اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔

اس نے پہلے تو مکان کا بے رنگ آہنی دروازہ کھولا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اپنی بائک کو ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔
جو کمرا قابلِ استعمال تھا، وہاں ایک انرجی سیور بھی تھا اور اٹیچ باتھ روم بھی تھا۔
''اب آپ کچھ دیر آرام کرلیں۔ یوں بھی صبح تو ہو ہی چکی ہے۔ میں آپ کے گھر کی طرف جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ اگر حالات موافق ہوئے تو میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں گا۔''
''جو لڑکی پوری رات گھر سے باہر رہی ہو، اس کے گھر میں حالات کیسے موافق ہو سکتے ہیں؟'' میں نے افسردگی سے کہا۔
''آپ پریشان مت ہوں۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''میں آپ کے لیے کچھ کھانے پینے کو لے آؤں، پھر آپ کے گھر جاؤں گا۔ ہاں، میری آواز سنے بغیر دروازہ مت کھولیے گا بلکہ اس کمرے سے باہر بھی مت نکلیے گا۔''
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں الجھی رہی۔ بابا نے نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا؟ دونوں بھائیوں نے مجھے کہاں کہاں تلاش کیا ہوگا؟ امی کے دل پر کیا گزری ہوگی اور سب سے بڑھ کر... سجاد میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا؟ گھر والے تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ افشین اس شادی پر راضی نہیں تھی اس لیے گھر سے بھاگ گئی۔ اس سے پہلے وہ پڑھائی کی آڑ لے کر شادی سے بچنا چاہ رہی تھی... لیکن سجاد کو تو میرے جذبات اور احساسات کا علم تھا۔ وہ تو جانتا تھا کہ میری ذات اس کے بغیر ادھوری رہے گی۔ میں بھلا اس شادی سے کیوں بھاگوں گی جس کا خواب میں برسوں سے دیکھتی آئی تھی۔
میں نہ جانے کتنی دیر تک اپنے خیالات میں گم رہتی کہ دروازے پر موٹر بائک کی آواز سن کر چونک اٹھی لیکن یہ وہ موٹر بائک تو نہیں تھی جو عمران لے گیا تھا پھر دروازے پر دستک ہوئی اور عمران کی آواز سنائی دی۔ ''افشین! دروازہ کھولیے۔''
اس کی آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھوں میں کئی شاپرز تھے۔ وہ شاپرز مجھے پکڑا کر بائک اندر لے آیا لیکن یہ تو عام سی ہنڈا 175 تھی۔ وہ ماڈل بھی بہت پرانا تھا۔
''میں نے اپنی بائک بیچ کر یہ بائک خریدی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''تاکہ فوری طور پر دشمنوں کی نظر میں نہ آسکوں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''آپ ناشتا کریں، پھر میں نکلتا ہوں۔''
مجھے اس کی کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میری بلا سے وہ بائک بیچے، خریدے یا پیدل گھومتا پھرے... مجھے تو اس وقت صرف اپنے گھر والوں کی فکر تھی۔ مجھ سے ناشتا بھی نہیں کیا گیا۔ کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے دو چار لقمے زہر مار کرنے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ عمران مجھے مختلف ہدایات دینے کے بعد روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر خدشات میں گھر گئی کہ نہ جانے وہاں کیا صورتِ حال ہو؟ عمران ان لوگوں سے کیسے ملاقات کرے گا اور کیسے معلومات کرے گا؟ میں اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہلتی رہی۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں وقت کیسے گزاروں۔ ایک ایک لمحہ مجھے ایک ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔
تقریباً دو گھنٹے بعد عمران کی آمد ہوئی۔ وہ خاصا تھکا تھکا اور نڈھال سا لگ رہا تھا۔
''کیا ہوا؟'' میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔
''بتاتا ہوں۔'' اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا اور موٹر سائیکل اندر لانے لگا۔
''تم بتاتے کیوں نہیں؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔
''بتا رہا ہوں۔'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن افشین پلیز! بہت حوصلے سے سنیے گا۔ میں...''
''ایسی کیا بات ہے؟'' میں نے وحشت میں اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہاں سب خیریت تو ہے؟''
''خیریت نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اس صدمے سے آپ کے والد کا... انتقال...''
''نہیں۔'' میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''
''مجھے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' عمران نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''میں وہاں پہنچا تو ان کا جنازہ تیار تھا اور...''
مجھے زور کا چکر آیا اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔
دوبارہ ہوش آیا تو مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا۔ عمران نزدیک ہی بیٹھا تھا اور میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پھر میں بلک بلک کر رونے لگی۔ میرے محبت کرنے والے شفیق بابا اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور میں ان کی شکل بھی نہ دیکھ سکی تھی۔
عمران نے مجھے کچھ دیر رونے دیا۔ جب میں رو رو کر ہلکان ہو گئی تو اس نے کہا۔ ''افشین! صبر کریں۔ اب آپ ان کے لیے دعائے مغفرت ہی کر سکتی ہیں۔ لیں پانی پی لیں۔'' اس نے پانی کا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔
میں نے دو چار گھونٹ پانی پیا اور عمران سے کہا۔ ''میں اپنے گھر جاؤں گی۔''
''کاش آپ اپنے گھر جا سکتیں۔'' عمران نے کہا۔
''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر کہا۔
''میں نے وہاں محلے والوں سے معلوم کیا ہے۔ آپ کے دونوں بھائی آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ سجاد کون ہے؟''
''کیوں؟'' میں بُری طرح چونک اٹھی۔
''اس نے تو آپ کے والد کے جنازے پر کھڑے ہو کر قسم کھائی ہے کہ وہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ کی وجہ سے نہ صرف آپ کے والد کی جان گئی بلکہ اس کی عزت کی دھجیاں بھی بکھر گئیں۔''
''کک... کیا... سجاد نے ایسا کہا ہے؟''
''ہاں... جس وقت میں وہاں پہنچا تھا، آپ کے والد کا جنازہ تیار تھا۔ میں نے بھی ان کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ یہ بات سجاد نے ان کی تدفین کے بعد کہی تھی۔ یہ... سجاد... ہے کون؟'' عمران جھجکتے ہوئے بولا۔
''اب تو وہ میرے خون کا پیاسا ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاں، کبھی وہ میرا منگیتر تھا۔ اسی دن میری شادی تھی جب اس منحوس سردار جہانگیر کے آدمیوں نے مجھے اغوا کیا۔''
''مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔'' عمران نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔ لیکن آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔ سردار جہانگیر تو شاید آپ کو بھول گیا ہوگا لیکن ارباب خان اور بخشل آپ کو نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ دونوں بہت ہی کینہ پرور ہیں۔ کسی بھی وقت آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''
میں نے سوچا، میں امی یا بھابی سے ٹیلی فون پر بات کرلوں گی۔ وہ ضرور میری بات سنیں گی۔
اچانک عمران کو کسی کا ٹیلی فون موصول ہوا اور وہ بولا۔ ''افشین! میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ واپس آکے اس موضوع پر بات کریں گے۔''
میں نے اس کے جانے کے بعد اس کے چار جر سے





اپنے سیل فون کی بیٹری چارج کی اور دھڑکتے دل کے ساتھ بڑی بھابی کا نمبر ملایا۔ میں امی سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن امی سیل فون رکھتی ہی نہیں تھیں۔
دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر جب میں مایوس ہو کر لائن کاٹنے والی تھی تو بھابی نے کال ریسیو کرلی اور بہت غصے میں بولیں۔ ''اب تم نے کیوں ٹیلی فون کیا ہے؟ کیا رشتہ ہے تمہارا اس گھر سے؟''
''بھابی... میری بات تو سنیں... میں...''
''پورے گھر کی عزت کو داؤ پر لگا دیا۔ دنیا بھر میں ہماری ناک کٹوا دی۔ اب بھی تمہارے پاس کہنے کو کچھ ہے؟ تمہارے بھائی تو تمہارا نام سننے کے بھی روادار نہیں ہیں۔''
''اچھا، آپ امی سے میری بات کرا دیں۔''
''اب کیا ان سے بات کر کے ان کی بھی جان لینے کا ارادہ ہے؟ اپنے بھائیوں کو تو تم جیتے جی مار ہی چکی ہو۔''
''بھابی... آپ میری بات تو سنیں... میں...''
''دیکھو افشین! اب بھی اس گھر کا رخ نہ کرنا ورنہ تمہارے بھائی تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر وہ خود بھی نہیں بچ سکیں گے۔ تم خود تو اپنی جان سے جاؤ گی ہی، مجھے بھی بیوہ کر جاؤ گی۔''
''اللہ نہ کرے بھابی! آپ...''
لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔
بھابی کے اس رویّے پر میں بلک بلک کر رونے لگی۔ اکبر بھائی اور انور بھائی تو مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی مجھے صفائی کا موقع نہیں دیا۔
میں رو رو کر نڈھال ہو گئی تو خود ہی اٹھ کر پانی پیا۔ وہاں مجھے تسلی اور دلاسا دینے والا کون تھا۔ ایک عمران تھا، وہ بھی سب کچھ انسانی ہمدردی کی بنا پر کر رہا تھا ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔
تھوڑی دیر بعد عمران آیا تو وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ میں نے اس کے کہنے پر دو چار لقمے لیے، پھر ہاتھ کھینچ لیا۔
''افشین! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ حادثات پیش آئے لیکن یوں کھانا پینا چھوڑنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ آپ کھانا کھالیں۔ میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔''
''گھر؟'' میں نے چونک کر کہا۔ ''کون سے گھر؟ میرا اب کوئی گھر نہیں ہے۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول دوبارہ کبھی شاخ پر نہیں لگ سکتا۔ میں اب گھر نہیں جاؤں گی۔''
''تو پھر آپ کہاں جائیں گی؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اللہ کی اتنی بڑی دنیا ہے۔ کہیں نہ کہیں تو چلی ہی جاؤں گی۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ مجرانہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟" اس نے کہا۔

"تمہارے تو مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ میں بُرا مان ہی نہیں سکتی۔" میں نے کہا۔

"میں لاہور جا رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہاں میرے لیے بھی زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ ہر وقت سردار جہانگیر اور اس کے آدمیوں کا خطرہ ہے۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میرے ساتھ لاہور چل سکتی ہیں۔ وہاں جا کر آپ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکتی ہیں۔"

"لاہور!" میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "وہاں میرا کون ہے؟"

"لوگوں کو اپنا بنانا پڑتا ہے مس افشین! میرے وہاں کچھ لوگوں سے تعلقات ہیں۔ وہاں آپ کو آسانی سے جاب مل جائے گی۔ آپ کسی بھی وومین ہاسٹل میں رہ سکتی ہیں۔ میرے پاس تو فی الحال اس کا یہی حل ہے۔ آپ کے ذہن میں اگر کوئی بہتر تجویز ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میری مانیں تو آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ گھر والے کچھ دن ناراض رہیں گے پھر سب کچھ بھول جائیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اکبر بھائی کو نہیں جانتے۔ وہ جس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور جس سے نفرت کرتے ہیں، وہ بھی انتہا پر ہوتی ہے۔ پھر میں تو ان کی نظروں میں ان کے باپ کی قاتل بھی ہوں۔ میری ہی وجہ سے تو بابا کی جان گئی ہے۔ وہ بابا کو بہت چاہتے تھے۔ یہی حال انور بھائی کا بھی ہے۔ وہ تو شاید مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے میرے کسی بھائی کو جیل کا منہ دیکھنا پڑے۔ پھر میں سجاد کی بے اعتنائی کیسے برداشت کروں گی؟"

"گویا آپ لاہور جانے پر راضی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر میں وہاں کے کچھ معزز لوگوں کے ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر دے دیتا ہوں۔ وہ آپ کی ہر طرح مدد کریں گے اور مجھے امید ہے کہ آپ کو ایک ہفتے کے اندر اندر جاب مل جائے گی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "ایڈریس دے دینا ہوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تم بھی تو لاہور جا رہے ہو۔"

"ہاں، میں بھی جا رہا ہوں لیکن میں نے سوچا، نہ جانے آپ مجھ پر اعتماد کریں یا نہ کریں۔"

"دیکھو عمران! میں اب تک تم پر اعتبار ہی کرتی آئی ہوں۔ میں اس اجنبی شہر میں کہاں بھٹکتی پھروں گی؟" پھر میں چونک کر بولی۔ "ایک بات بتاؤ، تمہاری سردار جہانگیر اور اس کے آدمیوں سے کیا دشمنی ہے؟ اور تم کرتے کیا ہو؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے افشین صاحبہ۔" عمران افسردگی سے بولا۔ "یہاں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ دوسرے کی بات سنے۔"

"میں سنوں گی۔" میں نے کہا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

میں چونک اٹھی۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ اس کا ذریعۂ معاش شریفانہ نہیں ہے اور اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

"سردار جہانگیر سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں سردار جہانگیر کے خون کا پیاسا ہوں اور ایک نہ ایک دن اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔

"کیسا انتقام؟" میں نے پوچھا۔

☆☆☆

"میرے والد ایک سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی سیٹ ایسی تھی کہ اگر وہ لوگوں کے ناجائز کام کراتے تو کروڑوں روپے کما سکتے تھے۔

"میں ان دنوں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ مجھ سے چھوٹی بہن عذرا انٹرمیڈیٹ میں تھی۔

اس دن شاید میں ایم اے فائنل کا آخری پرچہ دے کر آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاپا خاصے پریشان ہیں۔

"کیا بات ہے پاپا؟" میں نے پوچھا۔ "آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا!" انہوں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "کچھ دفتری معاملات ہیں۔"

"نہیں پاپا۔" میں نے کہا۔ "دفتری معاملات میں آپ کبھی اتنے ڈسٹرب نہیں ہوتے۔"

"بیٹا! تم نے سردار جہانگیر کا نام سنا ہے؟"



"سردار جہانگیر؟" میں نے پوچھا۔ "نام سنا ہوا تو لگ رہا ہے لیکن یاد نہیں آ رہا کہ یہ ہے کون؟"

"یہ سندھ کا ایک بااثر زمیندار ہے۔ سیاست میں بھی حصہ لیتا ہے لیکن وہاں اتنا کامیاب نہیں ہے، انتہائی بدمعاش آدمی ہے۔ ہر قسم کا ناجائز کام بہت دھڑلے سے کرتا ہے۔ ناجائز اسلحے کی تجارت، منشیات کی اسمگلنگ اور اغوا برائے تاوان کے لیے تو یہ مشہور ہے۔"

"لیکن آپ کو اس سے کیا غرض؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ دن پہلے اس کا ایک آدمی اپنا ایک کام لے کر میرے پاس آیا تھا۔ کام سراسر ناجائز تھا۔ اس سے حکومت کو لاکھوں روپے کا نقصان ہو سکتا تھا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں سردار جہانگیر کا آدمی ہوں۔ میں نے کہا، میری بلا سے تم صدر امریکا کے آدمی بھی ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج سردار جہانگیر خود آیا تھا۔ وہ دیکھنے میں انتہائی مہذب اور تعلیم یافتہ لگتا ہے اور ہے بھی۔ میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا اس لیے پہچانا نہیں اور اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ صدیقی صاحب! آپ تو انتہائی شریف اور معقول آدمی لگتے ہیں۔ میرے آدمی نے تو نہ جانے آپ کے بارے میں کیا کچھ کہا تھا؟ آپ کا آدمی کون؟ میں نے پوچھا۔ وہ ہنس کر بولا۔ صدیقی! صاحب پرسوں جو خادم حسین آپ کے پاس آیا تھا، وہ میرا ہی آدمی ہے۔ سمجھیں آپ میرا کام کریں گے تو میں بھی آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ سائیں! ہم تو دوستوں کے دوست ہیں۔ جو ہمارے کام آتا ہے ہم اس کے کام آتے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ سردار جہانگیر کون ہے اور اس کا کردار کیا ہے۔ میں نے بہت تحمل سے کہا۔ دیکھیے سردار صاحب! میں حکومت کا ایک ذمے دار افسر ہوں۔ میں...

"صدیقی صاحب اس نے میری بات کاٹ دی۔ آپ کو صرف ایک سائن ہی تو کرنا ہے۔ میں نے پھر تحمل سے کہا۔ سردار صاحب! آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن میرے اس دستخط سے حکومت کو لاکھوں بلکہ کروڑوں کا نقصان ہو گا۔ سردار جہانگیر مسکرایا اور بولا... لیکن آپ کو تو دس لاکھ کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بریف کیس میری میز پر رکھا۔ اسے کھول کر دکھایا، اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ یہ میری طرف سے حقیر سا نذرانہ ہے۔ میں نے وہ بریف کیس اٹھا کر اس کے منہ پر مار دیا اور ڈپٹ کر بولا۔ سردار جہانگیر! اپنا یہ حرام کا پیسا اور مکروہ صورت لے کر فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اس نے اپنا چہرہ اور گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ میں دیکھ لوں گا کہ تو کتنا بڑا افسر ہے۔"

"تو پاپا! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا! پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے اور میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔"

"دوسرے ہی دن پاپا کو اس سیٹ سے محروم ہونا پڑا۔ ان کی جگہ جو شخص آیا، اس نے فوراً ہی سردار جہانگیر کا کام کر دیا۔

"پاپا نے اس ناجائز کام کے خلاف ایک رپورٹ بنائی اور اس کی ایک ایک نقل چیف سیکریٹری، چیف منسٹر اور پرائم منسٹر کو بھیج دی۔ چیف سیکریٹری بھی ایمان دار آدمی تھا۔ اس نے کیس کی انکوائری کرائی اور سردار جہانگیر کی فائل کو مسترد کر دیا اور جس افسر نے اس پر دستخط کیے تھے، اس کے خلاف محکمانہ کارروائی شروع ہو گئی۔

"اس وقت تک میرا ایم اے کا رزلٹ آ چکا تھا اور میں ملازمت کی تلاش میں تھا۔

"ایک شام میں واپس آیا تو میرے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا گھر تک پہنچا۔

"محلے کے ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ تمہارے گھر میں ڈکیتی ہوئی ہے۔ ڈاکو نہ صرف گھر سے نقدی اور زیور لے کر فرار ہو گئے ہیں بلکہ وہ تمہاری بہن عذرا کو بھی لے گئے ہیں۔

"میں وحشت زدہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ محلے کی ایک خاتون سامنے ہی چوکی پر بیٹھی تھیں۔

"امی اور پاپا کہاں ہیں؟" میں نے وحشت بھرے انداز میں پوچھا۔

"بیٹا! ڈاکوؤں نے تمہارے بابا کو بہت زخمی کر دیا تھا۔ محلے کے کچھ لوگ انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔ تمہاری امی بھی ان کے ساتھ ہیں۔"

"میں الٹے قدموں اسپتال کی طرف بھاگا۔ امی مجھے دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگیں۔ وہ تو ویسے بھی دل کی مریضہ تھیں۔ وہ اتنا روئیں کہ رو رو کر میرے بازوؤں میں ڈھیر ہو گئیں۔ میں نے بمشکل تمام انہیں سنبھالا۔ ایک نرس نے انہیں طبی امداد دی اور انہیں کچھ دیر آرام کرنے کو کہا۔

"پاپا آئی سی یو میں تھے۔ ڈاکوؤں نے انہیں دو گولیاں ماری تھیں۔ ایک گولی ان کے پیٹ میں لگی تھی اور دوسری سینے میں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے پوچھا۔ "پاپا بچ تو جائیں گے نا؟"

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ ہم انہیں بلڈ دے رہے ہیں لیکن ابھی ان کی حالت خطرے میں ہے۔ پیٹ میں لگنے والی گولی سے ان کا کلیور بھی متاثر ہوا ہے۔ بس آپ دعا کریں۔"

"آپریشن سے پہلے ہی پاپا نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ امی کو یہ سن کر اتنا شدید صدمہ ہوا اور وہ اسے برداشت نہ کر سکیں۔

"دوسرے دن میرے ہنستے بستے گھر سے دو جنازے ایک ساتھ اٹھے۔ میری معصوم بہن کا جنازہ تو وہ دونوں پہلے ہی اٹھا چکے تھے۔

"میں کئی ہفتے تک گھر میں بند رہا لیکن آخر کب تک۔ مجھے ایک نہ ایک دن تو باہر نکلنا ہی تھا۔ میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

"ایک دن مجھے پاپا کے دفتر کے ایک ساتھی انکل عرفان سرِ راہ مل گئے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ "عمران بیٹا! مجھے تمہارے پاپا اور امی کی ناگہانی موت پر شدید افسوس ہوا ہے۔ میں نے صدیقی صاحب کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ وہ سردار جہانگیر سے نہ بگاڑیں۔"

"سردار جہانگیر؟" میں نے کہا۔

"ہاں، سردار جہانگیر۔" وہ بولے۔ "اس نے دفتر کے کئی افراد کے سامنے کہا تھا کہ وہ صدیقی صاحب سے انتقام لے گا۔ آپ میں سے جو بھی میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے بگاڑ لے۔"

"میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں ابھی تک عذرا کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں سرگرداں تھا۔ پولیس میں ایف آئی آر بھی درج تھی لیکن پولیس اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کر رہی تھی۔

"انکل!" میں نے ان سے پوچھا۔ "یہ سردار جہانگیر رہتا کہاں ہے؟"

"کیوں بیٹے!" وہ حیرت سے بولے۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم اس سے دور ہی رہو۔" انہوں نے کہا۔ "ویسے وہ معروف آدمی ہے۔ ڈیفنس میں رہتا ہے۔ کوئی بھی اس کے بارے میں بتا دے گا۔"

"اس شام مجھ پر ایک سانحہ اور گزرا۔ شام کو عذرا کی لاش ایک گٹر سے برآمد ہوئی۔ پولیس نے مجھے شناخت کے لیے بلایا تو اسے دیکھ کر میں بلک بلک کر رونے لگا۔ میری نازوں میں پلی بہن اس وقت اس حالت میں تھی کہ اسے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"پولیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے ساتھ کئی افراد نے زیادتی کی تھی۔ پھر اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔

"عذرا کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے بعد میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ انتقام اور صرف انتقام! میں سردار جہانگیر کو ایسی عبرت ناک موت مارنا چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی سردار جہانگیر کسی عزت دار شخص کی عزت سے کھیلنے کا تصور بھی نہ کر سکے۔

"میں نے ان جگہوں پر جانا شروع کر دیا جہاں جرائم پیشہ عناصر کا ڈیرا ہوتا ہے۔ وہاں جلد ہی میری ملاقات صمد سے ہوگئی۔ صمد ایک گینگ کے لیے کام کرتا تھا۔ میں نے اس سے تعلقات مزید بڑھائے تو معلوم ہوا کہ اس کا گینگ منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔ "یار صمد! تم سردار جہانگیر کو جانتے ہو؟"

اس نے مشتبہ انداز میں میری طرف دیکھا پھر بولا۔ "دیکھو عمران! اگر تم سردار جہانگیر کے آدمی ہو تو ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ علاقہ شہباز خان کا ہے اور سردار جہانگیر کا کوئی آدمی یہاں سے زندہ واپس نہیں جاتا ہے۔"

"میں تو خود سردار جہانگیر کے خون کا پیاسا ہوں۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میں اسے اپنے ہاتھوں سے کتے کی موت مارنا چاہتا ہوں۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ سردار جہانگیر نے کیسے میرا ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا۔ وہ میرے پاپا اور امی سمیت عذرا کا بھی قاتل تھا۔

"اگر ایسا ہے اور تم واقعی سچ کہہ رہے ہو تو میں تمہیں شہباز خان سے ملاؤں گا۔ وہ بھی سردار جہانگیر کا خون کا پیاسا ہے۔ لیکن برا مت ماننا، میں اس سے پہلے تمہاری بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کروں گا۔"

دو روز بعد اس نے کہا۔ "عمران! تمہاری ایک ایک بات سچ ہے۔ شہباز خان تم سے ملنے کے لیے تیار ہے۔ تم آج شام کو میرے ساتھ چلو۔"

"سردار جہانگیر کے برعکس شہباز خان شہر کے مضافات میں رہتا تھا۔ وہ بھرے بدن کا ایک دراز قامت آدمی تھا۔ اس کا تعلق آزاد علاقے سے تھا اس لیے اس کی رنگت سرخ و





سفید تھی اور شخصیت بارعب تھی۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ "بچے! اگر تم نے مجھ سے پہلے اس خنزیر سردار جہانگیر کو جہنم میں پہنچا دیا تو ہم تمہیں پچاس لاکھ روپے انعام دے گا۔"

"اس دن کے بعد سے میں نے شہباز خان کے لیے کام شروع کر دیا۔ اس دوران میں کئی بار ہمارا تصادم سردار جہانگیر کے آدمیوں سے ہوا۔ میں سردار جہانگیر کی تاک میں تھا لیکن اس تک پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ موقع مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے۔

"پھر شہباز خان اور سردار جہانگیر کا زبردست تصادم ہوا۔ اس تصادم میں شہباز خان مارا گیا۔ ہمارا گینگ منتشر ہو گیا اور سردار جہانگیر کے آدمی کتوں کی طرح پورے شہر میں ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔" پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "میں نے سب کچھ آپ کو صاف صاف بتا دیا ہے۔ اب آپ چاہیں تو مجھ پر اعتبار کریں، چاہے نہ کریں۔"

"ایک بات بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں بس اسٹاپ کے اردگرد دیکھتی تھی۔ میں کالج جاتی تھی تو تم موجود ہوتے تھے، واپس آتی تھی تب بھی تم موجود ہوتے تھے... کیوں؟"

"سچ سچ بتا دوں؟" عمران نے کہا۔

"ہاں، سچ سچ بتا دو۔"

"وہ... بات... دراصل... یہ ہے کہ... میں... آپ کو... پسند کرنے لگا تھا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور سنجیدگی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"بغیر یہ جانے بوجھے کہ میں کون ہوں، کہاں رہتی ہوں، میرا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟"

"میں یہ تو جانتا تھا کہ آپ کہاں رہتی ہیں، یہ بھی جانتا تھا کہ آپ کس کالج میں پڑھتی ہیں۔ آپ کے والد اور بھائیوں کے بارے میں بھی جانتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کی منگنی بھی ہو چکی ہے۔"

"یہ معلوم ہو جاتا تو تم کیا کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"پھر آپ کو میری شکل بھی نظر نہ آتی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کے گھر والے کبھی آپ کی شادی مجھ سے کرنے پر راضی نہیں ہوں گے لیکن انسان میں آخری دم تک ایک آس، ایک امید ہوتی ہے جو اسے جینے پر مجبور کرتی ہے۔ مجھے بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید آپ کے گھر والے راضی ہو بھی جائیں، شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں سردار جہانگیر سے انتقام لینے کے بعد زندہ رہا تو کوئی ملازمت کروں گا۔ پھر ممکن ہے آپ کے گھر والے مان جاتے لیکن میں نے کبھی آپ کو پریشان نہیں کیا، کبھی کوئی ناشائستہ جملہ نہیں کسا۔ میں جانتا تھا کہ آپ کو میری موجودگی سے بھی پریشانی ہوتی ہے لیکن میں اس معاملے میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ لیکن جب سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ کسی اور کی امانت ہیں، میں نے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ لیا۔"

اس دن عمران سے باتیں کر کے میرے دل کی وہ خلش بھی دور ہو گئی کہ عمران مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ اس نے تو سب کچھ کھول کر بیان کر دیا تھا۔ میری نظروں میں تو وہ مظلوم تھا۔

"تو پھر آپ لاہور چل رہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر اس سے پوچھا۔ "یہ مکان..."

"میرا ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں نے اپنا پرانا مکان بیچ کر سارا پیسا بینک میں جمع کرا دیا تھا۔ یہ مکان تو میں نے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے بہترین انداز میں تعمیر کرواؤں گا لیکن انسان جو کچھ سوچتا ہے، وہ اکثر اوقات پورا نہیں ہوتا۔ اب میں یہ مکان بھی بیچ دوں گا اور لاہور یا اسلام آباد میں مکان بناؤں گا۔ کراچی چھوڑتے ہوئے مجھے بہت افسوس ہے لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ میں نے کراچی کو نہ چھوڑا تو دنیا ہی چھوڑنا پڑے گی۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں سیٹیں کنفرم کرا لوں۔"

"عمران! تم بائی ائر لاہور جاؤ گے؟ تمہارے دشمن خاص طور پر ان جگہوں کی نگرانی کر رہے ہوں گے جہاں سے تم کراچی سے باہر نکل سکتے ہو۔ اب تمہارے ساتھ ساتھ وہ میرے دشمن بھی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن دشمنوں کے خوف سے میں گھر میں دبک کر تو بیٹھ نہیں سکتا۔ اگر وہ کراچی سے باہر جانے والے راستوں کی نگرانی کر رہے ہوں گے تو ان میں ہر راستہ شامل ہوگا۔ رہا آپ کا سوال تو میں آپ کے لیے ایک برقع لے آؤں گا۔ آپ مجھ سے کچھ فاصلے پر رہیے گا۔ میں بھی اپنے حلیے میں کچھ تبدیلی کر لوں گا۔"

اس نے کہیں جانے کے بجائے ٹیلی فون پر یاسر کے ذریعے لاہور کی دو سیٹیں مسٹر اور مسز اکرم کے نام سے بک کروائیں۔ ہماری فلائٹ رات کو گیارہ بجے کی تھی۔ اس دوران میں وہ اپنی پرانی بائک واپس لے آیا اور بولا۔ "میں نے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی بانک ٹرک کے ذریعے لاہور بھجوادی ہے۔ مجھے وہ بانک بہت عزیز ہے کیونکہ وہ پاپا نے میری ضد پر قرض لے کر دلوائی تھی۔''

☆☆☆

میں ائرپورٹ پہنچی تو مجھ سے برقع میں چلنا محال ہورہا تھا۔ عمران مجھ سے کافی فاصلے پر چل رہا تھا۔ اس نے سلک کا شلوار سوٹ، واسکٹ اور پیروں میں ملتانی کھسے پہن رکھے تھے۔ سر پر پگڑی بھی تھی اور چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں بھی۔

ہم بلا کسی پریشانی کے ہوائی جہاز میں سوار ہوگئے۔ ہماری سیٹیں بھی الگ الگ تھیں۔ پھر جب تک جہاز نے ٹیک نہیں کیا، مجھے یہی خدشہ رہا کہ کہیں ان لوگوں میں سے کوئی آ نہ جائے۔

دورانِ سفر میں اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی۔ نہ جانے میں کیسا نصیب لے کر پیدا ہوئی تھی؟ میں عمران سے یہ پوچھنا بھول گئی تھی کہ سردار جہانگیر نے آخر کس کے دھوکے میں مجھے اغوا کرایا تھا؟ وہ لڑکی کتنی خوش نصیب تھی جو سردار جہانگیر کے غنڈوں کے ہاتھوں سے بچ گئی تھی اور آج اپنے گھر میں خوش وخرم ہوگی۔

پھر مجھے سجاد کا خیال آیا تو میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ساری دنیا میری مخالف ہوسکتی تھی لیکن میں سمجھتی تھی کہ سجاد اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ تو کہتا تھا۔ ''افشین! اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں شاید زندہ ہی نہ رہ سکوں۔'' اب وہی سجاد یہ کہہ رہا تھا کہ افشین نے ہمارے خاندان کی ناک کٹادی، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کیسی محبت تھی؟ اس نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔

مجھے بھابی سے شکایت نہیں تھی۔ وہ تو شروع ہی سے مجھ سے خار کھاتی تھیں کیونکہ اکبر بھائی ہر معاملے میں مجھے ان پر ترجیح دیتے تھے۔ مجھے ان کے سلوک پر اتنا افسوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو اکبر بھائی اور انور بھائی کے رویّے پر صدمہ تھا۔ وہ ایک دفعہ مجھ سے بات تو کر لیتے۔ مجھے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید بھابی نے انہیں میرے بارے میں بتایا ہو اور وہ مجھے ٹیلی فون کرلیں لیکن یہ بھی میری بدقسمتی ہی تھی کہ کراچی سے روانگی کے وقت میں اپنا سیل فون بھی بھول گئی تھی۔ نہ جانے میں نے وہ کہاں رکھ دیا تھا جو چلتے وقت مجھے یاد نہیں آیا۔ بہرحال اب تو کراچی بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ تمام رشتے بھی جو میرے اپنے تھے۔ اب مجھے ایک نئے سفر کی شروعات کرنا تھی۔

اسی وقت اعلان ہونے لگا کہ خواتین وحضرات! اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لیں۔ ہم لاہور ائرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔

میں ائرپورٹ سے باہر آئی تو عمران مجھ سے پہلے ہی ایک ٹیکسی والے سے بات کرچکا تھا۔ اس نے مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ٹیکسی انجانی منزلوں کی طرف رواں دواں ہوگئی۔

ہماری ٹیکسی ایک بنگلے کے سامنے رکی۔ نہ جانے وہ کون سا علاقہ تھا؟ میں اس سے قبل دو چار مرتبہ لاہور آچکی تھی لیکن وہاں کے راستوں اور سڑکوں سے شناسا نہیں تھی۔

ٹیکسی والے کو رخصت کر کے عمران نے اپنا سوٹ کیس اٹھالیا۔ میرا ہینڈ بیگ تو میرے شانے پر تھا۔ وہ زیادہ مصروف سڑک نہیں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے بنگلے تھے۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ''افشین! اب آپ برقع اتار سکتی ہیں۔''

میں نے چلتے چلتے ہی برقع اتارا اور عمران کو دے دیا۔ عمران نے اس کا بنڈل بنا کر اپنے بیگ میں ٹھونس لیا۔

ایک بنگلے کے سامنے رک کر اس نے ڈور بیل کا بٹن دبایا تو ذیلی کھڑکی کھلی اور چوکیدار نما ایک شخص باہر نکل آیا۔

''جی صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے ملک صاحب سے ملنا ہے۔'' عمران نے باوقار انداز میں کہا۔ ''ان سے کہنا کہ کراچی سے عمران آیا ہے۔''

عمران بھی اپنی مونچھوں سے نجات حاصل کرچکا تھا۔

چوکیدار فوراً ہی واپس آیا اور بولا۔ ''آیئے صاحب! ملک صاحب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔''

ڈرائنگ روم میں ادھیڑ عمر کا باوقار سا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس نے پینٹ شرٹ پر بغیر آستین کا ہلکا پھلکا سویٹر پہن رکھا تھا۔ کراچی کے مقابلے میں یہاں زیادہ سردی تھی۔

وہ بہت پُرتپاک انداز میں عمران سے ملا اور مسکرا کر بولا۔ ''واہ میاں عمران! تم تو چھپے رستم نکلے۔ تم نے خاموشی سے شادی بھی کرلی اور...''

''ملک صاحب! یہ میرے ایک بہت عزیز دوست کی بہن ہیں۔ لاہور پہلی دفعہ آئی ہیں اس لیے میں ان کے ساتھ آیا ہوں۔ ان کے ماموں ماڈل کالونی میں رہتے ہیں۔ پہلے ہم وہیں گئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ دبئی گئے ہوئے ہیں۔ وہ تین چار دن میں لوٹ آئیں گے۔''

''سوری مس...''





کراچی سے آگئی تھی۔

میں صبح اٹھ کر نماز پڑھتی پھر اپنے اور عمران کے لیے ناشتا بناتی۔ عمران ناشتا کرنے کے بعد گھر سے نکل جاتا، پھر شام ہی کو گھر آتا۔ وہ کھانا کھا کے تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتا یا اخبار پڑھتا پھر اپنے بیڈروم میں جا کر سو جاتا۔ زندگی عجیب یکسانیت کا شکار ہوکر رہ گئی تھی۔ کبھی میرا موڈ ہوتا تو وہ مجھے آؤٹنگ کے لیے بھی لے جاتا۔

ایک دن اس نے مجھے ڈھیروں شاپنگ کرائی۔ میری پسند کے پرفیومز دلوائے، پھر لاہور کی ایک معروف بیکری سے خاصا بڑا ایک کیک خریدا اور ہم لوگ واپس آگئے۔ واپسی میں وہ اپنے ساتھ ایک ریسٹورنٹ سے کھانا بھی لے آیا تھا۔

گھر آکر اس نے کیک ڈائننگ ٹیبل پر رکھا، اس پر موم بتی لگائی اور مسکرا کر مجھے دیکھا۔

''کیا بات ہے عمران؟'' میں نے پوچھا۔ ''آج تم بہت خوش ہو۔ کیا کسی کی برتھ ڈے منا رہے ہو؟''

''ہاں، بہت ہی خاص ہستی کی برتھ ڈے ہے۔ آیئے کیک کاٹیں۔''

''مجھے معلوم تو ہو کہ کس کی برتھ ڈے ہے؟'' میں نے کہا۔

''حیرت کی بات ہے۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔ ''آپ ہی کو نہیں معلوم ہوا کہ آج کس کی برتھ ڈے ہے... لگتا ہے آپ کا حافظہ بالکل ہی جواب دے گیا ہے... یاد تو کریں... آج کیا تاریخ ہے؟''

''آج مارچ کی پندرہ تاریخ ہے اور... ارے... آج تو میری برتھ ڈے بھی ہے۔''

''یہ آپ ہی کی برتھ ڈے کا کیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''حیرت کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ آج میری برتھ ڈے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ ہی نے ایک دفعہ بتایا تھا۔'' عمران نے کہا۔ ''چلیے اب کیک کاٹیں، پھر آپ کے لیے ایک سرپرائز گفٹ بھی ہے۔''

مجھے وہ تمام مواقع یاد آگئے جب میرے بھائی اور پاپا میری سالگرہ منایا کرتے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ رونے کیوں لگیں؟'' عمران نے کہا۔ ''اگر آپ کو ناگوار گزرا ہے تو رہنے دیں اور اس کیک کو کھڑکی سے

''افشین!'' عمران نے جلدی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے غلط فہمی کی بنا پر ایسا کہہ دیا۔ ویسے یہ بھی آپ کا گھر ہے۔ جب تک آپ کے ماموں دبئی سے واپس نہ آجائیں، آپ یہاں پر رہیں۔''

''ملک صاحب! ان کی ایک کزن بھی یہاں رہتی ہیں۔ افشین کو ان کا ایڈریس معلوم نہیں ہے لیکن کل ہم ایڈریس ڈھونڈ لیں گے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''افشین تھک گئی ہوگی۔ اسے آرام کے لیے بھیج دوں پھر تم سے تفصیلی بات ہوگی۔'' ملک نے اپنی ایک ملازمہ کو بلایا اور مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا۔

شام کو ہم ملک کی گاڑی میں وہاں سے باہر نکلے تو عمران نے کہا۔ ''فوری طور پر رہنے کا ٹھکانا تو ہوگیا ہے۔ میں نے آپ کے ماموں اور کزن کے بارے میں صرف اس لیے جھوٹ بولا کہ ملک آپ کو کوئی ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھے۔''

ماڈل کالونی میں پرانی طرز کا ایک بنگلا تھا جو بقول عمران کے اس نے کرائے پر لیا تھا۔ بنگلا اندر سے بہت خوب صورت اور آراستہ تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''افشین!'' عمران نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ پسند کریں تو ودمین ہاسٹل کے بجائے یہیں قیام کریں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری ذات سے بھی آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ودمین ہاسٹل میں آپ کو ایسا آرام بھی نہیں ملے گا اور...''

''تم تو میری جاب کا بندوبست کررہے تھے؟'' میں نے کہا۔

''وہ بھی ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے لیے پہلے آپ کو اپنے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑے گی۔ یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ میں نے بھی سوچا کہ یہ مسئلہ تو ہوگا۔ میں اگر بورڈ یا اسکول سے براہِ راست بھی سرٹیفکیٹ منگواؤں تو اس میں بیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

☆☆☆

ماڈل ٹاؤن کے اس بنگلے میں رہتے ہوئے مجھے دو مہینے گزر گئے تھے۔ اس دوران میں عمران نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو مجھے ناگوار گزرتی۔ اس نے میری جاب کی بات بھی نہیں کی تھی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ عمران کیا کررہا ہے، کہاں جاتا ہے۔ بس وہ مجھے کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا۔ ہاں، اس کے پاس گاڑی بھی تھی اور اس کی موٹر بانک بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر پھینک دیں۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اس کے مجھ پر اتنے احسان تھے اور میں احسان فراموش ہرگز نہیں تھی۔

میں نے کیک کاٹا تو اس نے روایتی انداز میں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گنگنایا اور اپنے ہاتھ سے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھا کر مجھے کھلانے کی کوشش کی۔

یہ پہلا موقع تھا جب وہ مجھ سے اس حد تک بے تکلف ہوا تھا۔ میں نے اس کا دل رکھنے کو کیک کھا لیا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

"ہاں، وہ سرپرائز گفٹ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی ہے لیکن آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔"

"ہاں پوچھو۔"

"دیکھیے اگر بُرا لگے تو پلیز مجھے معاف کر دیجیے گا۔"

"بھئی، ایسی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی ہی بات ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "پہلے مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ میری بات کا بُرا نہیں مانیں گی۔"

"چلو، میں وعدہ کرتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"انشین!" عمران نے کہا پھر خاموش ہو گیا۔

"اب کہہ بھی چکو۔"

"میں... آپ سے... شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"دیکھیے، آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ بُرا نہیں مانیں گی۔"

"لیکن تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"دیکھیے... زندگی یوں تنہا تو نہیں گزر سکتی... میرا تو اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں اور آپ کے سب رشتے ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

"لیکن تم نے یہ کیسے سوچا کہ میں تم سے شادی کر لوں گی؟"

"میں نے آپ سے درخواست کی ہے۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔ آپ کو منظور نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں تو یوں بھی تنہا زندگی گزارنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ لیکن پلیز بُرا مت مانیے گا۔ ہم لوگ پہلے کی طرح رہتے رہیں گے۔"

وہ مزید کچھ کہے بنا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مجھے بھی ساری رات نیند نہیں آئی۔ میں یہی سوچ سوچ کر پیچ و تاب کھاتی رہی کہ عمران نے ایسی بات کیوں کی؟ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔

"کہاں جاؤ گی؟" میرے اندر سے آواز آئی۔ "تمہارے اپنے تمہیں ٹھکرا چکے ہیں۔ تمہیں ایک مخلص آدمی کا سہارا میسر ہے۔ اس نے کبھی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا، کبھی کوئی اخلاق سے گزری ہوئی حرکت نہیں کی۔ وہ چاہتا تو کیا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر لاہور میں تمہارا ہے بھی کون؟ عمران کے اکثر ملنے والے آتے رہتے ہیں۔ ان کی بیویاں اور وہ خود یہی سمجھتے ہیں کہ میں عمران کی بیوی ہوں۔ جب عمران اس بات کی تردید کرتا ہے تو ان کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ ایسا تاثر ہوتا ہے کہ میں شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہوں۔"

میں ساری رات جاگی تھی اس لیے میری آنکھ دیر سے کھلی۔ عمران تیار ہو کر باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

میں نے نارمل انداز میں کہا۔ "بھئی، صبح میری آنکھ نہیں کھل سکی، تم ہی مجھے اٹھا دیتے۔"

عمران نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر چلا گیا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک گئی۔ گھر میں اس نے ایک چوکیدار بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا۔ عمران نے بہت تیزی سے گاڑی ریورس کی اور اتنی تیز رفتاری سے روانہ ہوا کہ پہیوں کی تیز چرچراہٹ ہوئی۔

چوکیدار نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ! صاحب آج بہت غصے میں لگ رہے تھے۔"

"تم اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور واپس آ گئی۔ دوسروں کی طرح چوکیدار بھی یہی سمجھتا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔

میں حسب معمول گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ رات کو عمران آیا تو مجھ سے بات کیے بغیر سیدھا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

عجیب آدمی تھا۔ وعدہ مجھ سے لیا تھا کہ ناراض مت ہونا اور اب الٹا وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔

وہ اتنے عرصے سے میرے ساتھ تھا۔ میری ہر بات کا خیال رکھتا تھا لیکن میں اس کی یہ بات کیسے مان لیتی کہ میں اس کے ساتھ شادی کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ اس نے باہر کچھ بھی نہیں کھایا ہو گا اور اس وقت بھوکا ہو گا۔





میں اس دوران میں کبھی اس کے بیڈ روم میں نہیں گئی تھی لیکن اس وقت مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گئی۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس نے صرف اپنا کوٹ اتار کر کرسی پر پھینکا تھا، ٹائی ابھی تک لگا رکھی تھی۔

"عمران!" میں نے آہستہ سے آواز دی۔ "تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"میں نے باہر کھا لیا تھا۔" اس نے جواب دیا اور اٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگا پھر کچھ کہے بغیر باتھ روم میں چلا گیا۔ مجھے بھی وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ میں بھی اٹھ کر واپس آ گئی۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ وہ بغیر ناشتا کیے گھر سے نکل گیا۔ اس دن میں نے خاص طور پر اس کے لیے ناشتا تیار کیا تھا اور اس کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ وہ تیار ہو کر آئے گا تو ناشتا کروں گی۔

وہ تیار ہو کر بیڈ روم سے نکلا اور میری طرف دیکھے بغیر سیدھا باہر نکل گیا۔

اس کا یہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں دن بھر بے چین رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر مجھے اس کی ناراضی کی اتنی بے چینی کیوں ہے؟ کیا مجھے اس کی بات مان لینا چاہیے؟

شام کو وہ آیا تو میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس ماحول میں رہ ہی نہیں سکتی تھی، پھر عمران سے میرا رشتہ بھی کیا تھا؟

وہ کمرے میں جانے کے بجائے لاؤنج میں بیٹھ گیا اور اپنا بریف کیس کھول کر ایک فائل نکالی۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر بہت زیادہ سنجیدگی بلکہ افسردگی تھی۔

"انشین!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ اس بنگلے کی فائل ہے۔ میں نے یہ بنگلا تو آپ کے نام کر دیا ہے، آپ کے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھی منتقل کر دی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ کو ضرورت ہو گی۔" اس نے کہا۔ "میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں نے اپنے ایک دوست کی فرم میں آپ کی جاب کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ ہاں، یہ گاڑی بھی میں نے آپ کے نام کر دی ہے تاکہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔"

"یہ بہت غلط بات ہے عمران۔" میں نے کہا۔ "تم نے ناراض نہ ہونے کا وعدہ مجھ سے لیا تھا اور اب خود ناراض ہو گئے ہو۔"

"میں آپ سے ناراض کیسے ہو سکتا ہوں؟" اس نے کہا۔ "بس، مجھے ایک آس تھی، ایک امید تھی کہ شاید میں آپ کو کبھی پا سکوں۔ آپ نے میری امید بھی توڑ دی۔ ظاہر ہے میں آپ کے قابل ہی کب ہوں۔ آپ ایک اعلیٰ خاندان کی فرد ہیں۔ میں ایک جرائم پیشہ شخص ہوں۔ آپ کا اور میرا کیا جوڑ؟ بس اتنی گزارش ہے کہ مجھے کبھی غلط مت سمجھیے گا۔"

"لیکن تم کیوں جا رہے ہو؟ جانا تو مجھے چاہیے۔" میں نے کہا۔

"آپ کہاں جائیں گی اور کیوں جائیں گی؟ میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ جب تک میری زندگی ہے، میں ہمیشہ آپ کی حفاظت کروں گا۔ میں آج بھی اپنے اس عہد پر قائم ہوں۔ شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔" یہ کہہ کر وہ انتہائی دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

"اچھا پہلے فریش ہو کر کھانا کھاؤ پھر بات کریں گے۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میں نے کھانا لگایا اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

وہ کھانے کے لیے آیا، تب بھی افسردگی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "میری ایک بات غور سے سن لو عمران... نہ تم کہیں جا رہے ہو، نہ میں کہیں جاؤں گی۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"اچھا... کہاں ہے وہ تمہارا سرپرائز گفٹ؟"

"کک.... کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ.... کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"سب سے پہلے تو تم ان آپ جناب کے تکلفات کو چھوڑو۔"

"میں... تو..."

"میں نے وہ گفٹ مانگا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی لے کر آیا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک خوب صورت سا مخملی ڈبا تھا۔ اس نے وہ ڈبا کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں بہت خوب صورت سا ہار اور انگوٹھی تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"واؤ!" میں نے کہا۔ "یہ تو بہت خوب صورت ہے۔"

"آپ کو... میرا مطلب ہے تمہیں پسند آیا؟"

"بہت زیادہ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اب ایک زحمت اور کرو۔ یہ ہار اور انگوٹھی مجھے پہنا بھی دو۔"

"کک... کیا... مطلب... میں..."

"بھئی، تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو نا!" میں نے کہا۔ "تو پھر شرم کیسی؟"

وہ میری بات سن کر اتنا مسرور ہوا کہ مجھے لگا کہیں وہ خوشی سے پاگل نہ ہو جائے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میرے گلے میں وہ ہار پہنایا، پھر میری انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

"اور میری ایک بات سن لو۔ اب میں یہ ناراضی برداشت نہیں کروں گی۔"

"اب کون کافر تم سے ناراض ہو سکتا ہے افشین۔" اس نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں، کل ہم اپنی اس منگنی کو سیلیبریٹ کریں گے۔ کل کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔"

"لیکن ابھی شادی کی جلدی مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "میں ان تمام لوگوں کو انوائٹ کرنا چاہتی ہوں جو اب تک ہمیں میاں بیوی سمجھتے رہے ہیں۔"

"تم کہو تو میں پورے شہر کو مدعو کر لوں؟" وہ سرشاری کے عالم میں بولا۔

جب کھانا کے بعد ہم جانے لگے تو اس نے اچانک جھک کر میرے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بولا۔ "شب بخیر!" پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

پھر تو عمران کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ روز کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام رکھ لیتا۔ ہم یا تو اس کے کسی دوست کے گھر دعوت میں شریک ہوتے یا پھر لاہور میں گھومتے رہتے۔ اس نے مجھے لاہور کا چپا چپا دکھا دیا۔

ایک دن ہم تھکے ہارے واپس آئے تو میں نے عمران سے پوچھا۔ "اتنی فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے عمران؟ میرے پاس پہلے ہی اتنے کپڑے ہیں کہ انہیں پہننے کا موقع نہیں ملتا۔ اتنے زیورات ہیں کہ ان کا گھر میں رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"افشین ڈیئر! یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"عمران! مجھے ایک بات بتاؤ۔ اب تو میں تم سے پوچھنے کا حق رکھتی ہوں۔"

"پوچھو۔" اس نے کہا۔

"تم کرتے کیا ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کہیں جاب کرتے ہو یا کوئی کاروبار کرتے ہو۔ تمہاری ہونے والی بیوی ہونے کے ناتے میرا اتنا تو حق ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔"

"سچ سچ بتا دوں؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں سچ ہی سننا چاہتی ہوں۔"

"میں منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہوں، جعلی دستاویزات بناتا ہوں اور بھی بہت سے غیر قانونی کام کرتا ہوں۔"

میں سناٹے میں رہ گئی۔ "عمران! تم ابھی تک ان ہی راہوں پر چل رہے ہو جو کراچی میں چھوڑ آئے تھے؟"

"میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟" عمران نے کہا۔ "یہ ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت تنخواہ میں تو ممکن نہیں ہے۔"

"اب مجھے اپنے فیصلے پر افسوس ہو رہا ہے عمران۔" میں نے کہا۔ "اب جب تک تم یہ سب غیر قانونی کام چھوڑ کر کوئی شریفانہ ملازمت نہیں کرو گے میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

"اتنی کڑی شرط مت لگاؤ افشین!" عمران نے بے بسی سے کہا۔

"میرے باپ نے ہمارے پیٹ میں حرام کا ایک لقمہ بھی نہیں جانے دیا۔ تم اس حرام کی کمائی کو عیش و عشرت اور ٹھاٹ باٹ کہتے ہو۔ میں سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کر سکتی ہوں لیکن حرام نہیں کھا سکتی۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ان دو چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ یا تو مجھے چھوڑ دو یا پھر یہ تمام دھندے چھوڑ دو۔"

"اس کے لیے مجھے کچھ مہلت تو دو تاکہ میں کہیں ملازمت حاصل کر سکوں۔" اس نے کہا۔

"میں تمہیں صرف دو ماہ کی مہلت دے سکتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے چھ مہینے کی مہلت دے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سارے بُرے کام چھوڑ دوں گا۔ میں بھلا تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"ہاں، میرے پاس جو زیور بھی ہے، وہ بیچ کر اتنا تو مل جائے گا کہ ہم چھ مہینے تک روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیں گے۔"

"تم اپنا زیور کیوں بیچ رہی ہو؟ میں نے اپنا آبائی گھر بیچ کر جو رقم حاصل کی تھی، وہ ابھی تک بینک میں محفوظ ہے۔ وہ میرے باپ کی بہت محنت کی کمائی ہے۔ اس میں حرام کا





ایک پیسا بھی شامل نہیں ہے۔"

"ہاں، وہ رقم جائز ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اسی رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لوں۔" عمران نے کہا۔

"ابھی نہیں، ابھی تم صرف جاب تلاش کرو۔"

پھر واقعی وہ تندہی سے جاب تلاش کرنے لگا۔ اس نے کرائے کا وہ بنگلا چھوڑ دیا اور گلبرگ کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ ہمارے وہ ٹھاٹ باٹ بھی نہیں رہے۔ مجھے خوشی تھی کہ عمران راہِ راست پر آ گیا ہے۔ میں نے کم سے کم زندگی میں ایک نیکی تو کمائی تھی کہ ایک بھٹکے ہوئے شخص کو راہِ راست پر لے آئی تھی۔

اس دن عمران کے ایک دوست کی شادی تھی۔ وہ عمران کا بہت خاص دوست تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "افشین! میں چاہتا ہوں کہ تم اس تقریب میں سب سے زیادہ خوب صورت نظر آؤ۔ تم اپنی وہی ساڑی پہنو جس کے بارڈر پر بہت خوب صورت کام بنا ہوا ہے۔ جیولری پہننے میں بھی کنجوسی مت کرنا اور کسی اچھے بیوٹی پارلر سے میک اپ کرانا۔"

"شادی میری نہیں بلکہ تمہارے دوست کی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں سب سے منفرد، سب سے زیادہ خوب صورت نظر آؤ۔"

"اچھا بھئی، اگر تم کہتے ہو تو میں یہ بھی کر لوں گی۔ تم نے میری بات مانی ہے تو مجھے بھی تمہاری بات تو ماننا ہی پڑے گی۔"

میں نے اس دن خوب بناؤ سنگھار کیا۔ بہترین زیور پہنے۔ کالی ساڑی اور بلاؤز میرے سفید رنگ پر کچھ زیادہ ہی اچھے لگتے تھے۔

شام کو عمران آیا تو میں تیار ہی بیٹھی تھی۔

اس نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر اچانک اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

میں نے کسمسا کر کہا۔ "کیا کر رہے ہو، سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔"

اس دن عمران نے بھی خاصا اہتمام کیا تھا۔ وہ نیوی بلیو سوٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ خاصا وجیہہ لڑکا تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس کی تمنا کر سکتی تھی لیکن جو بات سجاد میں تھی، وہ اس میں نہیں تھی۔ سجاد کا خیال آتے ہی میرے دل پر گھونسا سا پڑا۔

ہم جلدی ہال پہنچ گئے تھے۔ دولہا عمران کا بہترین دوست تھا اس لیے بہت سے کام عمران کے ذمے بھی تھے۔ اس کے دوست عامر کی والدہ سے میری پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ عامر کی والدہ سے سامنا ہوا تو انہوں نے مجھے دیکھ کر دعائیں دیں اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ عمران کی بیوی اتنی خوب صورت ہے۔

عمران وہاں آتے ہی مختلف کاموں میں مصروف ہو گیا۔ عمران کے ساتھ عامر کے دو بھتیجے بھی شامل تھے۔

پھر کچھ دیر بعد مہمان آنے لگے۔ عامر کی والدہ نے مجھ سے کہا۔ "افشین بیٹی! تم ہال کے گیٹ پر کھڑی ہو جاؤ اور مہمانوں کا استقبال کرو۔"

میں ہال کے گیٹ پر آ گئی۔ وہاں عامر کے خاندان کی کچھ اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ برات کراچی سے آئی ہے۔ عمران نے اس کا تذکرہ مجھ سے نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کراچی سے آنے والی برات میں میرا کوئی جاننے والا نہ ہو۔ کراچی کوئی چھوٹا شہر تو ہے نہیں لیکن جب انسان کے دل میں چور ہو تو اسی قسم کے خدشات جنم لیتے ہیں۔

مجھ سے وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا۔

میں نے عامر کی والدہ سے کہا۔ "آنٹی! میرے سر میں بہت شدید درد ہو رہا ہے۔ مجھے چکر سے آ رہے ہیں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"ارے بیٹا! تو تم پہلے بتاتیں۔" آنٹی نے کہا۔ "تم نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کرایا ہے؟"

میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھ رہی تھیں۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تم وہاں صوفے پر آرام سے بیٹھ جاؤ اور کل پہلی فرصت میں کسی لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ ضرور کرا لینا۔"

"جی آنٹی!" میں نے کہا اور بوجھل قدموں سے واپس چلی آئی۔ میں نے ایسا صوفہ منتخب کیا کہ براہِ راست آنے والوں کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔

پھر برات کی آمد کا شور بلند ہوا اور خواتین اور مرد گیٹ سے اندر داخل ہونے لگے۔

میں ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ اندر داخل ہونے والے ہر فرد کو دیکھ سکتی تھی لیکن ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

اچانک عمران مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا اور بولا۔ "افشین! آنٹی نے بتایا ہے کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔ اگر زیادہ مسئلہ ہے تو میرے ساتھ ابھی ڈاکٹر کے پاس چلو، ابھی زیادہ رات نہیں گزری ہے۔ کوئی نہ کوئی ڈاکٹر مل جائے گا۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اب میں اتنی بھی بیمار نہیں ہوں۔ بس سر میں درد ہے اور شاید کھڑے کھڑے تھک گئی تھی اس لیے چکر سا آ گیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' عمران نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا تم کچھ دیر اور آرام کر لو، پھر نکاح کی رسم شروع ہو جائے گی تو تمہیں وہاں جانا پڑے گا۔''

''عمران! مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اگر میرے سر کا درد کچھ ٹھیک ہو گیا تو میں ان رسموں میں شرکت کر لوں گی۔'' میں نے کہا۔

''تم نے سر درد کے لیے کوئی دوا لی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بچے سے ڈسپرین کی گولیاں منگوائی تھیں۔'' میں نے اسے ٹال دیا۔

وہ دوبارہ مہمانوں کی طرف چلا گیا۔ میں ایک مرتبہ پھر آنے والے مہمانوں پر نظریں جما کر بیٹھ گئی۔

آہستہ آہستہ تمام مہمان آ گئے۔ اب ہال میں ہر طرف رنگ و نور کی برسات ہو رہی تھی۔ میں بھی مطمئن ہو گئی کہ مجھے مہمانوں میں کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔

میں نے سوچا کہ میں اٹھ کر مہمانوں سے ملاقات کر لوں ورنہ آنٹی سوچیں گی کہ بیماری کا بہانہ کر کے بیٹھ گئی۔ مہمانوں میں عمران کے کچھ دوسرے دوست اور ان کی بیویاں بھی تھیں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک زمین نے گویا میرے قدم جکڑ لیے۔

ہال کے مرکزی دروازے سے سجاد داخل ہو رہا تھا۔ گرے کلر کے سوٹ میں وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی گر گئی تھی۔

اچانک وہاں فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں دہل کر رہ گئی اور خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

ایک بچے نے مجھے بتایا کہ شادی کی خوشی میں ہوائی فائرنگ ہو رہی ہے۔ اس میں اصل فائر تو کم، پٹاخے زیادہ تھے۔

سجاد اپنے کسی دوست سے باتیں کرتا ہوا اندر کی طرف آ گیا تھا۔ اچانک میں نے اسے زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔

میں چیخ مار کر اس کی طرف دوڑی لیکن اس سے پہلے ہی مہمانوں نے اسے گھیر لیا۔ پھر کسی نے ایمبولینس بلا لی لیکن اس وقت تک ایک صاحب اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔

اسی وقت مجھے عمران نظر آیا۔ وہ بھی خاصا حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''افشین! یہاں سے نکل چلو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس آ جائے گی اور فضول میں دردِ سری گلے پڑ جائے گی۔''

''تم اپنے دوست کو اس مصیبت میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟'' میں نے کہا۔ ''آنٹی کیا سوچیں گی اور عامر بھائی کیا سوچیں گے کہ ان کا بہترین دوست انہیں اس مشکل میں چھوڑ گیا۔''

''سمجھا کرو افشین!'' عمران نے کہا۔ ''میں اس وقت پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیوں؟'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ تم تو یوں ڈر رہے ہو جیسے پولیس آ کر تمہیں گرفتار کر لے گی۔''

''لیکن افشین!''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ زخمی ہونے والا کون ہے؟''

''نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' عمران نے کہا۔

''وہ سجاد ہے۔'' میں نے کہا۔

''سجاد؟'' عمران نے چونک کر پوچھا۔ ''کون سجاد؟''

''وہی سجاد جس کے ساتھ میری شادی ہونے والی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میرا پھوپی زاد بھی ہے۔''

''تو یہاں بیٹھ کر تم کیا کرو گی؟'' عمران نے کہا۔

''میں سجاد کی خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ تم ایسا کرو، مجھے اسپتال لے چلو۔''

''اچھا، پہلے میں پولیس سے تو نمٹ لوں۔'' اس نے مرکزی دروازے سے پولیس انسپکٹر اور دو سپاہیوں کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔

پولیس آتے ہی اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئی۔ مجھے یہ فکر تھی کہ سجاد کی حالت کیسی ہے؟ اسے کہاں گولی لگی ہے؟

میں ٹہلتی ہوئی اس طرف چلی آئی جہاں پولیس والے لڑکوں سے سوال جواب کر رہے تھے۔

''فائرنگ کس نے کی تھی؟'' انسپکٹر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ہم نے نہیں دیکھا۔'' وہاں موجود لڑکوں نے جواب دیا۔

''احمد خان! اس ہال سے کوئی بندہ یا کوئی چیز باہر نہ جانے پائے۔ تم موبائل سے دو بندے اور بلا لو۔'' پھر اس نے وہاں موجود ایک صاحب سے کہا۔ ''جناب! آپ تو مجھے معزز



آدمی نظر آتے ہیں۔ آپ بتائیے فائرنگ کس نے کی تھی؟''

''لڑکوں نے پہلے تو پٹاخے چلائے تھے پھر اچانک ہی کسی نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میں یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ پٹاخے چلانے والے لڑکے کون تھے۔ آپ انہی سے معلوم کر لیں کہ فائرنگ کس نے کی تھی۔''

''فائرنگ بھی مختلف ہتھیاروں سے کی گئی ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''یہاں موجود لوگوں نے مجھے یہی بتایا ہے۔ مجھے پورے ہال کی تلاشی لینا پڑے گی۔''

''آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں۔''

''زخمی کی حالت اب کیسی ہے انسپکٹر صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔ دعا کریں کہ وہ ہوش میں آ جائے۔ ورنہ بہت بُرا ہو گا۔''

'واقعی بُرا ہو گا۔' میں نے دل میں سوچا۔ 'سجاد کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'

اچانک میرے اندر سے آواز آئی۔ ''سجاد سے اب تیرا کیا تعلق ہے؟ وہ تو تیری شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہو گا۔ وہ مرے یا جیے، تجھے کیا فکر ہے؟''

اسی وقت عمران مجھے نظر آیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''سجاد بہت شدید زخمی ہو گیا ہے عمران! پلیز مجھے اسپتال لے چلو۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ وہ آئی سی یو میں ہو گا۔ تمہیں اس سے کون ملنے دے گا؟''

''کوئی نہ ملنے دے لیکن میں اس کی حالت سے باخبر تو رہوں گی۔ عمران پلیز!'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اچھا، کچھ دیر ٹھہرو، یہ پولیس والے یہاں سے ٹل جائیں تو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔''

اس دوران میں خاندان کے کئی بزرگ پولیس والوں کے پاس پہنچ گئے۔ باوقار سے ایک صاحب انسپکٹر کو ایک طرف لے گئے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر ان میں بحث ہوتی رہی پھر ان صاحب نے جیب سے سیل فون نکالا تو انسپکٹر نے کچھ کہہ کر انہیں روک دیا۔ ان کے درمیان پھر کچھ بات چیت ہوئی، پھر وہ دونوں مزید سنسان گوشے کی طرف چلے گئے۔

انسپکٹر وہاں سے واپس آ کر بلند آواز میں بولا۔ ''میں اسے اتفاقی حادثہ ظاہر کروں گا لیکن دعا کریں کہ زخمی زندہ بچ جائے ورنہ آپ کے لیے بہت مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صورت میں تو میں بھی کچھ نہیں کرسکوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

میں نے ہال میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو عمران مجھے آنٹی کے پاس نظر آیا۔ میں سیدھی اس کے پاس پہنچی اور اس سے کہا۔ ''عمران! اب تو پولیس بھی چلی گئی ہے۔ اب چلنے میں کیا قباحت ہے؟''

''میرے دوست کی شادی میں پہلے ہی رنگ میں بھنگ پڑ چکا ہے۔ مجھے اس کی شادی میں شریک تو ہونے دو۔''

''تم ہوتے رہو شریک۔'' میں نے بھنّا کر کہا۔ ''میں اسپتال جارہی ہوں۔''

اسی وقت وہ صاحب واپس آگئے جو سجاد کو لے کر اسپتال گئے تھے۔ یہ بھی مجھے دوسروں سے معلوم ہوا کہ مقبول صاحب اپنی گاڑی میں زخمی کو اسپتال لے گئے تھے۔

''مقبول صاحب! اب زخمی کا کیا حال ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''گولی اس کے پیٹ میں لگی ہے۔ پولیس اور ڈاکٹر دونوں حیران ہیں کہ گولی پیٹ میں کیسے لگی؟''

''گولی تو اچٹ کر کہیں بھی جاسکتی ہے۔'' ایک اور صاحب نے کہا۔ ''ویسے اب زخمی کا کیا حال ہے؟''

''اس کی حالت نازک ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔''

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ تو کیا سجاد اپنی زندگی کی بازی ہار جائے گا؟ میں نے دہل کر سوچا، پھر چیخ کر عمران سے کہا۔ ''عمران! مجھے اسپتال لے چلو۔''

وہاں موجود لوگ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ عمران نے درشت لہجے میں کہا۔ ''خود کو سنبھالو افشین! یہاں تماشا کیوں بن رہی ہو؟''

''تو پھر مجھے اسپتال لے چلو۔'' میرے لہجے میں وحشت تھی۔

''چلو۔'' عمران نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔

ہم اسپتال پہنچے تو وہاں ایمرجنسی وارڈ کے باہر رش لگا تھا۔ مریضوں اور زخمیوں کے لواحقین اپنے اپنے پیاروں کے لیے پریشان تھے۔

میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے سجاد کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے کہا کہ پیشنٹ کو ابھی او ٹی میں لے گئے ہیں اور اس کا آپریشن ہورہا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ بچ تو جائیں گے نا؟''

''ہم پوری کوشش کررہے ہیں۔ آپ بھی دعا کریں کہ ان کا آپریشن کامیاب ہوجائے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔

میں ایک بینچ پر ڈھے گئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں لیکن بمشکل تمام خود پر ضبط کررہی تھی۔

میں نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ عمران نے میرا شانہ چھو کر کہا۔ ''افشین! اب گھر چلیں؟''

''تمہیں جانا ہے تو چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک سجاد کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہوجاتی۔''

اسی وقت قریبی مسجد کے مؤذن نے اللہ کی بڑائی بیان کی۔ ''اللہ اکبر، اللہ اکبر!''

''بے شک اللہ سب سے بڑا ہے۔ وہ عظیم ہے۔'' میں نے کہا اور وضو کے ارادے سے باتھ روم کی طرف آگئی۔

وضو کرنے کے بعد میں نے ایک وارڈ بوائے سے جائے نماز مانگی اور کوریڈور میں..... نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔

نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے میری ہچکی بندھ گئی۔

آنسوؤں سے میرا پورا چہرہ تر بتر ہوگیا۔ اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگنے کے بعد میرے دل کو کچھ قرار آگیا۔

عمران بھی وہیں ایک بینچ پر بیٹھا تھا اور شدید ٹینشن میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نماز پڑھ کر اٹھی ہی تھی کہ وہی ڈاکٹر مجھے دکھائی دیا جس سے میں نے سجاد کے بارے میں پوچھا تھا۔

''مبارک ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ کے مریض کا آپریشن کامیاب ہوگیا اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد مریض کو او ٹی سے کمرے میں شفٹ کردیا جائے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب! انہیں ہوش کب تک آجائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''مریض کی دل پاور کافی مضبوط ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''پھر وہ جوان آدمی ہے اس لیے میرا اندازہ ہے کہ اسے اگلے ایک گھنٹے میں ہوش آجائے گا۔''

میں نے دیکھا یہ سن کر عمران کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''افشین! اب تو سجاد کی حالت خطرے سے باہر ہے، اب تو گھر چلو۔ ساری رات سے یہاں بیٹھی ہو۔''

''تم اتنے سنگ دل کب سے ہوگئے عمران؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس اجنبی شہر میں سجاد کا ہے ہی کون؟ میں ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔''

''بھئی وہ عامر کی شادی میں آیا تھا تو یقیناً عامر کا دوست ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر میں عامر کے گھر والے یہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرلیں گے۔''

''عامر کے گھر والوں کو آنا ہوتا تو رات میں یہاں آگئے ہوتے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ تو اس وقت شادی کی خوشیوں میں مگن ہوں گے۔ مجھے تو یہاں سوائے پولیس والوں کے کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ لوگ تو شاید بھول گئے ہیں کہ ان کا ایک مہمان فائرنگ میں شدید زخمی بھی ہوگیا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد عامر کے گھر سے کچھ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے عمران سے پوچھا۔ ''زخمی ہونے والے صاحب کی حالت اب کیسی ہے؟''

''آپریشن کرکے ان کے جسم سے گولی نکالی جاچکی ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' ایک صاحب نے بلند آواز میں کہا۔ ''تو نے زخمی کو بچالیا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔''

مجھے ان کی بات سن کر شدید غصہ آیا۔ انہیں سجاد سے زیادہ اپنے بیٹے یا بھتیجے کی فکر تھی جس نے غالباً فائرنگ کی تھی۔

جب ان لوگوں نے یہ سنا کہ زخمی کی حالت خطرے سے باہر ہے اور اسے روم میں منتقل کردیا گیا ہے تو وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ گویا وہ رسم دنیا نبھانے آئے تھے۔

''تم رات سے بھوکی ہو، میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے آؤں؟'' عمران نے کہا۔

''ابھی ٹھہر جاؤ۔ میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

عمران پھر بینچ پر بیٹھ گیا۔ بیزاری اس کے چہرے سے ظاہر تھی لیکن وہ میری وجہ سے اس بیزاری کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

اسپتال کے وال کلاک نے آٹھ بجائے تو میں چونک اٹھی۔ عمران اسی بینچ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ میں اٹھ کر اس روم کی طرف چل دی جہاں سجاد کو رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اب پیشنٹ کو ہوش آگیا ہے اور آپ چاہیں تو اس سے مل سکتی ہیں۔

''تھینک یو ڈاکٹر!'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

سجاد بیڈ پر بالکل سیدھا لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے آہستہ سے آواز دی۔ ''سجاد!''

سجاد نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''تم آخر میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں افشین! ہر لمحہ، ہر وقت میرے تصور میں چلی آتی ہو۔''

''سجاد!'' میں نے اسے پھر پکارا۔ ''میں تمہارا وہم نہیں ہوں بلکہ جیتی جاگتی تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چہرے کی زردی اچانک لمحے بھر کو سرخی میں تبدیل ہوئی۔ پھر وہ بولا۔ ''تم... تم افشین ہی ہو نا؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

''تم خواب نہیں دیکھ رہے سجاد! میں افشین ہی ہوں۔''

''تم کہاں چلی گئی تھیں افشین؟'' سجاد نے پوچھا۔ اسی وقت ڈاکٹر اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''خاتون! آپ مریض کو زیادہ پریشان نہ کریں۔''

''میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔'' سجاد نے کہا۔

''آپ ابھی ٹھیک نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''خاتون! آپ تو خاصی سمجھ دار لگ رہی ہیں۔ ان سے اس وقت زیادہ باتیں مت کریں اور پلیز باہر جائیں۔ شام تک ان کی حالت اس قابل ہو جائے گی کہ آپ ان سے جی بھر کر باتیں کر سکیں گی۔''

میں کمرے سے نکل آئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ عمران سجاد کے ملنے سے خوش کیوں نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سجاد میرا منگیتر ہے۔ اگر اس نے پرانی رنجش بھلا دی تو پھر وہ مجھ سے کبھی شادی نہیں کر سکے گا۔ میں نے سوچ لیا کہ عمران کو نہیں بتاؤں گی کہ سجاد سے میری کیا بات چیت ہوئی ہے۔

میں دوبارہ عمران کے پاس پہنچی تو وہ اسی بینچ پر بیٹھا تھا لیکن اب وہ سو نہیں رہا تھا۔

''کہاں چلی گئی تھیں افشین؟''

''سجاد کو ہوش آ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

عمران کے چہرے کا رنگ پھر فق ہو گیا۔

''لیکن اس نے تو مجھے بُری طرح ذلیل کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر کا خیال بھی نہیں کیا اور مجھے بُری طرح جھڑک دیا کہ تم کمرے میں آئیں کیسے... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

میرے اس جملے سے عمران کے چہرے کی رنگت بحال ہو گئی۔

''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم گھر چلو۔ وہ تمہاری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے۔''

''ہاں عمران! گھر چلو۔'' میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

مجھے واقعی تھکن ہو گئی تھی۔ میں رات بھر بیٹھی رہی تھی۔ جسمانی تھکن سے زیادہ مجھے ذہنی تھکن تھی۔ میرے اعصاب چیخ کر رہ گئے تھے اور میں کچھ دیر سونا چاہتی تھی۔

یوں بھی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ سجاد شام سے پہلے تفصیلی بات کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔

میرے کہنے پر عمران فوراً مجھے گھر لے آیا۔ میں آرام سے لمبی تان کر سو گئی۔ میری آنکھ کھلی تو وال کلاک میں چار بج رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا۔ کچن میں جا کر ایک انڈا فرائی کیا اور سلائس کے ساتھ کھا لیا۔ پھر چائے کا ایک کپ پی کر گویا میں تازہ دم ہو گئی اور اپنا پرس اٹھا کر باہر نکل گئی۔

عمران ابھی تک لمبی تانے سو رہا تھا۔

اسپتال کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ عامر نے کراچی اطلاع کر دی ہوگی اور وہ لوگ بھی اب تک پہنچ چکے ہوں گے۔ سجاد تو خیر دل کے ہاتھوں مجبور تھا لیکن اکبر بھائی اور انور بھائی تو میرا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے۔

میرے پاس عامر کا بھی نمبر موجود تھا۔ میں نے سوچا پہلے وہاں سے کنفرم کر لوں کہ کراچی سے لوگ وہاں پہنچے ہیں یا نہیں؟

میں نے عامر کا نمبر ملایا تو اس نے دوسری ہی بیل پر فون اٹھا لیا۔

''ہیلو!'' عامر نے کہا۔

''ہیلو عامر بھائی! میں افشین بول رہی ہوں۔''

''ہاں افشین! خیریت تو ہے، عمران کہاں ہے؟''

''وہ کہیں باہر گئے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''آپ یہ بتائیے کہ رات جو صاحب زخمی ہوئے تھے، آپ نے ان کے گھر اطلاع کرا دی تھی؟''

''ہاں، میں نے اس کے گھر ٹیلی فون کر دیا تھا... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''دراصل سجاد صاحب سے ہمارے بھی کچھ خاندانی تعلقات ہیں۔ کراچی سے وہ لوگ آ رہے ہیں یا آ چکے ہیں؟''

''میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پھر ٹیلی فون کیا تھا۔'' عامر نے کہا۔ ''سجاد کے ماموں زاد نے بتایا کہ انہیں جہاز میں سیٹیں نہیں مل سکی ہیں۔ وہ لوگ آج رات بارہ، ساڑھے بارہ بجے تک پہنچ جائیں گے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا اور عامر سے کہا۔ ''تھینک





''اس شخص نے تم سے جھوٹ بولا ہے افشین! ماموں جان کو اللہ زندگی دے، وہ بہ فضلِ خدا ابھی ہمارے سروں پر موجود ہیں۔''

''کیا؟'' میں خوشی سے چیخی۔ ''بابا... زندہ ہیں!'' میں ایک مرتبہ پھر رونے لگی۔

''ہاں، وہ زندہ ہیں لیکن بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اکبر بھائی اور انور بھائی مہینوں تک پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ وہ تو یوں بلک بلک کر روتے تھے جیسے خدانخواستہ تمہاری موت واقع ہو گئی ہے۔ وہ دونوں تم پر جان چھڑکتے ہیں، بھلا تمہیں مارنے کی بات کر سکتے ہیں؟ اور جہاں تک میرا سوال ہے، تو یہ واقعی جھوٹ ہے کہ میں نے بابا کی قبر پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے سجاد کہ میرے بھائی مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ اس واقعے کے بعد بھی میرے لیے روتے تھے۔ امی کا کیا حال ہے؟''

''امی تمہارے غم میں بیمار ہو گئی ہیں لیکن اب وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''لیکن سجاد! تم تو کینیڈا کی طرف سے بیرونِ ملک جانے والے تھے؟''

سجاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں کیسے جا سکتا تھا؟ میرے جانے کے دو دن پہلے امی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں۔''

''کیا... پھوپی جان... اب...''

میں بلک بلک کر رونے لگی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پھوپی جان کا انتقال آج ہی ہوا ہو۔

''دیکھو افشین! اگر تم یونہی روتی رہیں تو میری حالت پھر بگڑ جائے گی۔ تم جانتی... ہو کہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

میں گھبرا کر خاموش ہو گئی لیکن آنسوؤں پر تو کسی کا بس نہیں چلتا۔ میں نے بمشکل تمام اپنے آنسو ضبط کیے۔

پھر اچانک کمرے میں اکبر بھائی داخل ہوئے۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکے پھر چیخ کر بولے۔ ''افشین!''

''اکبر بھائی!'' میں نے کہا اور بے ساختہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

''تو کہاں چلی گئی تھی گڑیا؟'' اکبر بھائی نے پوچھا۔

میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''یہ عمران تو بہت ہی کمینہ اور گھٹیا شخص ہے۔'' اکبر بھائی نے کہا۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

یو عامر بھائی! رات کو بھابی سے بھی ملاقات نہ ہو سکی، انہیں میرا اسلام کہیے گا۔ میں کل ضرور آؤں گی۔''

پھر میں نے رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھی اسپتال پہنچ گئی۔

میں پہلے ڈیوٹی ڈاکٹر سے ملی۔ اس نے بتایا۔ ''پیشنٹ کی حالت اب بہت بہتر ہے، اب آپ ان سے مل سکتی ہیں۔''

میں سجاد کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دروازے ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''افشین! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔''

''تو پھر تمہیں کیسے یقین دلایا جائے؟'' میں نے کہا۔

''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔'' اس نے کہا۔

یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ بچپن میں جب کبھی میں پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتی تھی تو وہ ہاتھوں سے پہچان جاتا تھا کہ یہ میں ہوں۔

میں نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا، اسے محسوس کیا اور بولا۔ ''ہاں، یہ تم ہی ہو۔ تم کیوں چلی گئی تھیں؟''

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔

''مجھے سردار جہانگیر کے آدمیوں نے کسی اور کے دھوکے میں اغوا کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کیسے میں وہاں سے رہا ہوئی اور کیسے عمران مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

''پھر تم گھر کیوں نہیں آئیں؟''

''کس منہ سے آتی؟'' میں نے کہا۔ ''عمران حالات کا جائزہ لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہاں سب لوگ تمہارے خلاف ہیں اور تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔''

''بکواس کی تھی اس نے۔'' سجاد نے کہا۔

''تو کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم نے بابا کی قبر پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے؟''

''کس کی قبر پر؟'' سجاد نے حیرت سے پوچھا۔

''بابا... کی قبر پر!'' میں نے آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اپنی ہتھیلی کی پشت سے خشک کیے۔

''تم کس بابا کی بات کر رہی ہو؟'' سجاد کے لہجے میں الجھن تھی۔

''میرے بابا۔'' میں نے کہا۔ ''عمران نے بتایا تھا کہ میرے صدمے سے ان کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا؟''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر عمران کا نام تھا۔

''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''ہیلو افشین صاحبہ! میں سب انسپکٹر زاہد بول رہا ہوں۔''

''سب انسپکٹر زاہد؟'' میں نے کہا۔ ''آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''میں آپ ہی کے گھر سے بول رہا ہوں۔ آپ کے شوہر عمران نے ابھی تھوڑی دیر پہلے خودکشی کر لی ہے۔ اس نے اپنے ہی پستول سے اپنی کن پٹی پر گولی مار لی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہی ہوں۔''

''کیا ہوا؟'' اکبر بھائی نے پوچھا۔

''عمران نے خودکشی کر لی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کسی سب انسپکٹر زاہد کا ٹیلی فون تھا۔ وہ عمران ہی کے سیل فون سے بات کر رہا تھا۔''

''چلو، میں بھی چلتا ہوں۔'' اکبر بھائی نے کہا۔

''ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔'' سجاد نے کہا۔ ''یہاں میرا ایک دوست سعید ہے۔ وہ پولیس میں ایس ایس پی ہے۔ میں پہلے اسے ٹیلی فون کر دوں ورنہ پولیس والے فضول میں افشین کو پریشان کریں گے۔''

سجاد نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔

نمبر ملنے کے بعد اس نے ایس ایس پی کو مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ سلسلہ منقطع کر کے اکبر بھائی سے بولا۔ ''اکبر بھائی! آپ تو رات کو گیارہ بجے آنے والے تھے؟''

''یار شام کی فلائٹ میں صرف ایک سیٹ تھی۔ بابا نے کہا کہ تم پہلے چلے جاؤ۔ ہم لوگ بعد میں آ جائیں گے۔'' پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''چلو افشین!''

ہم ٹیکسی کے ذریعے وہاں پہنچے تو گھر کے باہر لوگوں کا مجمع تھا لیکن پولیس والوں نے لوگوں کو روک رکھا تھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے مجھے اندر جانے دیا۔

اندر کا منظر بہت ہولناک تھا۔ عمران نے اپنی کن پٹی پر پستول کی نال رکھ کر گولی چلائی تھی۔ وہ شاید اس وقت بستر پر لیٹا تھا یا بیٹھا تھا۔ بستر پر خون کا بڑا سا دھبا تھا۔ اس کی شکل بہت بھیانک ہو گئی تھی۔

''آپ افشین ہیں؟'' سب انسپکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، میں ہی افشین ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مرنے والے سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''وہ میرا منگیتر تھا۔'' میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''وہ آپ کا منگیتر تھا اور آپ اس کے ساتھ رہتی تھیں؟''

''جی ہاں، آپ کو کوئی اعتراض؟'' میں نے پوچھا۔

''بی بی! مجھے ہی کیا، پوری دنیا کو اس پر اعتراض ہو گا کہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی آزادانہ ایک ساتھ رہیں۔'' پھر وہ مکروہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''مرنے والے نے آپ کے نام ایک خط بھی چھوڑا ہے۔'' سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ نہ جانے کیوں وہ اس لہجے میں بات کر رہا تھا۔ شاید عام مجرموں سے بات کر کر کے ان کا لہجہ ہی بگڑ جاتا ہے۔

''اس کے نام خط چھوڑا ہے تو اسے دے دیں۔'' اکبر بھائی نے کہا۔

سب انسپکٹر نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے پہلی دفعہ ان کے وجود کا احساس ہوا ہو۔

''آپ کی تعریف؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں افشین کا بھائی ہوں، اکبر۔''

''افشین صاحبہ!'' سب انسپکٹر کا لہجہ اچانک سرد ہو گیا۔ ''آپ کو تھانے چلنا ہو گا۔''

''کیوں؟'' افشین نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں۔''

''اگر یہیں تفتیش کرنی ہوتی تو میں آپ کو تھانے کیوں لے جاتا؟ بات یہ ہے محترمہ کہ تھانے کی دیواریں دیکھ کر بندہ خود بہ خود سچ بولنے لگتا ہے۔''

اس دوران میں اکبر بھائی جیب سے سیل فون نکال چکے تھے۔ وہ سلسلہ ملنے پر بولے۔ ''ہیلو سعید صاحب! السلام علیکم... میں سجاد کا بھائی بول رہا ہوں... جی ہاں... کچھ ایسی ہی بات ہے۔ جی بہتر۔'' یہ کہہ کر انہوں نے سیل فون سب انسپکٹر کے حوالے کر دیا۔

''کیا کروں اس موبائل کا؟'' سب انسپکٹر انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، مجھے یہ موبائل دے کر تم لوگ چھوٹ جاؤ گے؟''

''ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو چھوٹ جائیں گے۔ تمہارا ٹیلی فون ہے، بات کرو۔'' اکبر بھائی نے درشت لہجے میں کہا۔

''میرا ٹیلی فون؟'' سب انسپکٹر نے الجھن آمیز لہجے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کہا۔ ''میرا ٹیلی فون تمہارے موبائل پر کیسے آسکتا ہے؟''

''بات کرتے ہو یا میں منع کر دوں؟'' اکبر بھائی نے کہا پھر سیل فون کان سے لگا کر بولے۔ ''ایس ایس پی صاحب! آپ کا یہ سب انسپکٹر تو آپ سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''ایس ایس پی صاحب!'' سب انسپکٹر چونک کر بولا۔ ''لائیں دیں جناب! میں سمجھا کہ آپ مخول کر رہے ہیں۔'' اس نے سیل فون لیا اور بولا۔ ''یس سر... جی سر... نہیں سر! موقع پر تو نہیں تھیں... جی بہتر ہے سر...''

پھر اس نے سیل فون اکبر بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ اکبر بھائی نے کہا۔ ''ایس ایس پی صاحب! مرنے والے نے افشین کے نام ایک خط بھی چھوڑا ہے۔ شاید سب انسپکٹر موقع سے غائب کرنا چاہتا ہے... اچھا خط اس سے لے لوں؟ تھینک یو سر... تھینک یو ویری مچ۔''

''جی سب انسپکٹر صاحب!'' افشین نے کہا۔ ''ذرا مجھے وہ خط دے دیں اور آپ اپنی کارروائی کرتے رہیں۔''

سب انسپکٹر نے جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور افشین کی طرف بڑھا دیا۔

عمران نے لکھا تھا۔

''ڈیئر افشین! مجھے انتہائی شرمندگی اور ندامت ہے کہ میں نے جھوٹ بول کر اتنے دن تک تمہیں گھر والوں سے دور رکھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب شاید تم مجھے پر تھوکنا بھی پسند نہ کرو۔ میں جب سو کر اٹھا تو تم موجود نہیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ تم ضرور اسپتال گئی ہو گی۔ میں بھی اپنی گاڑی میں وہاں پہنچ گیا۔ تم اس وقت تک سجاد کو سب کچھ بتا چکی تھیں۔ میں اس موقع پر بُری طرح مات کھا گیا۔ اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں اپنی جان دے دوں... کیونکہ میں تمہارا سامنا کر ہی نہیں سکتا۔ شاید میری اس ندامت کو میرے خون کا داغ بھی نہیں دھو سکے۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

☆☆☆

سب انسپکٹر نے عمران کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔

میں دوبارہ اسپتال پہنچی تو بابا، انور بھائی، امی سبھی آ چکے تھے۔ بابا مجھ سے لپٹ کر اتنا روئے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

مجھے اس موقع پر بھابی کی گفتگو یاد آئی جو انہوں نے مجھ سے ٹیلی فون پر کی تھی۔ میں اسے اپنے بھائی کے سامنے دہرا کر ان کا گھر نہیں بگاڑنا چاہتی تھی اس لیے میں خاموش رہی۔

سجاد بھی اب اتنے صحت یاب ہو گئے تھے کہ ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے کی اجازت دے دی۔ کراچی چھوڑتے وقت مجھے جتنا افسوس تھا، وہاں آتے وقت اس سے دگنی خوشی تھی۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ عمران نے جو کچھ بتایا، سب غلط تھا۔ اس کے والدین ابھی بھی زندہ تھے۔ وہ بچپن ہی سے بُری صحبت میں پڑ گیا تھا۔ البتہ اس نے تعلیم ضرور حاصل کی تھی۔ اچھی گفتگو کر لیتا تھا اور پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ بھی جانتا تھا۔

میری نشاندہی پر پولیس نے یاسر کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس نے بتایا کہ عمران دراصل سردار جہانگیر ہی کے لیے کام کرتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ افشین کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے پسند آ گئی۔ پھر تو وہ روز اس کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ وہ اس امید پر روزانہ صبح، دوپہر اس کے راستے میں کھڑا ہوتا تھا کہ شاید وہ کبھی پگھل جائے۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ افشین کی منگنی ہو چکی ہے اور کچھ دن بعد سجاد سے شادی ہو رہی ہے۔ اس نے سردار جہانگیر کی خوشامد کی کہ میں آپ کے لیے ہر وقت اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہوں۔ آپ بھی تھوڑی مدد کر دیں۔ میں افشین کو اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس کام کے لیے مجھے ارباب اور بنفشل کی ضرورت پڑے گی۔ پھر میں ہیرو بن کر اسے ان لوگوں کے چنگل سے نکال لوں گا۔

یوں میرے اغوا کا ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ سردار جہانگیر نے جھوٹ بولا تھا کہ اس کے آدمی کسی اور کے دھوکے میں مجھے اٹھا لائے تھے۔ یہ بھی عمران کی ایک چال تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو میرا شبہ فوراً عمران پر جاتا کیونکہ وہی میرے راستے میں کھڑا ہوتا تھا۔ لیکن وہ تو خود کو اس اغوا سے بالکل لاتعلق ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

اور اس کے بعد کی کہانی تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ ہاں، عمران واقعی مجھے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس نے اپنا لاہور والا بنگلا، کراچی کا مکان اور پورا بینک بیلنس میرے نام کر دیا تھا۔

سجاد نے میرا وہ بنگلا اور مکان ایک ٹرسٹ کو دے دیا اور عمران کا سارا کیش بھی ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔

میں نے سجاد کے کہے پر ایسا کیوں کیا؟ یہ تو آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔ ہاں، بھابی آج بھی مجھ سے نظریں نہیں ملا پاتی ہیں۔ اللہ انہیں معاف کرے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk